



مُشتاق احمد یوسفی

دانیال

ایم



مُشتاق احمد یوسفی

آبِ حَمِيم

دانیال

Madina Publishing Co.

M. A. Jinnah Road

Karachi-Ph: 72 67 67

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

ناشر حوری نورانی
مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲
عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی
طلب حرم پریس، آرام باغ - کراچی
اشاعت اول فروری ۱۹۹۰ء
قیمت - ۱۵۰ روپے

اپنے بچوں
ارشاد، سرورش،
رُخسانہ اور سیما
کے نام

ترتیب

۹	غنودیم، غنودیم (پس و پیش لفظ)
۳۲	حویلی
۸۰	اسکول ماسٹر کا خواب
۱۴۹	کار، کابلی والا اور الہ دین بے چراغ
۲۳۷	شہر دو قصہ
۳۲۹	دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

غنودیم، غنودیم

(پس و پیش لفظ)

”احسان بھائی! منور حسین بھی رخصت ہو گئے۔ انتقال سے پہلے....“
”کس کے انتقال سے پہلے؟“ میاں احسان الہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے پنکھے کو
تکتے اور اپنے فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ انہیں رہ رہ
کر لین جانتا کے درد کا شبہ ہو رہا تھا۔

یہ جنوری ۱۹۸۷ کا ذکر ہے۔ مجھے اپنا مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔
میاں احسان الہی پانچ سال سے صاحب فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراض قلب کے
اسپتال میں دس بارہ دن ”کوما“ میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا آدھا جسم
مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوت گویائی بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ حافظہ آنکھ پھولی کھیلنے
لگا۔ صرف تکلیف دہ باتیں یاد رہ گئیں۔

اگر اب انہیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سواچھ فٹ، دوسو دس
پونڈ اور پہلوانی ڈبل ڈول والا شخص ہے جو بہتر سال کی عمر میں صبح چار بجے ڈیڑھ گھنٹے ڈنڈ بیٹھک
لگاتا، پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل بیدل چلتا تھا۔ ۱۹۶۰ میں دل کے پہلے
شدید دورے کے بعد انہوں نے بد پرہیزی، میٹھکوں اور بزم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن
گئے تو ابن الحسن برنی کی طرح انہیں بھی کہیں کوئی زینہ نظر آ جاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے
تھے ”اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا ہے۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں
کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں“۔ ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید

کی۔ انہوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا، لیکن چنیوٹی کُٹا، * سندھی بریانی، برنس روڈ کی تر تراقی تافٹان، کوٹھ کے سبھی کباب، بادام کی حیدر آبادی لوزات، ملتان کے انور رٹول — مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خود کشی کے نسخے کے جملہ اجزا — نہیں چھوڑے۔ خود ہی نہیں، اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھلاتے۔ کہتے تھے، لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے! وہ بدستور اپنے خلاف وضع طبی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح پنج وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کروں تو لوگ کہیں گے، میاں صاحب ایک ہی بارٹ اٹیک میں اٹھک بیٹھک کرنے لگے! ذیابیطس بھی ہو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤفل کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے، اس سے زیادہ خود رائے۔ ہر مسئلہ پر — خواہ طبی ہی کیوں نہ ہو — وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے، آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی ہے، بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سمدھیانے جاتا ہوں تو تکلف میں رات کو آئس کریم کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں، اس رات مجھ پر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں، آپ کو معلوم ہے، یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن تک بریانی نہیں ملی۔ چنانچہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا! آپ میرے پٹھور پن اور بد پرہیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھیے۔ ساری عمر ناقدری اور عُشرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے، خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمائیے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کی پیختی۔ تین شامی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر (+)۔ بھائی میرے! یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلووریز میسٹر نہیں۔ اور ہاں، شراب کے ضمن میں بادہ پرستی کے بجائے خانہ سازی کی شرط توجہ طلب ہے۔ علاوہ انہیں، صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اُس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر استنا ہی عرق شیر بھی زہر مار کر ناپڑتا۔ بھائی میرے! میں تو دودھ کی آئس کریم صبر و شکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشدہ کی قید نہیں لکائی۔“

* کُٹا: گھڑے یا شئی کے برتن میں پکا ہوا سوند حاسالن۔ چنیوٹ کی خاص دُش۔

(+) عرق شیر: پھاڑے ہوئے دودھ کا عرق جو ضعیف معدہ کے مریضوں کو دیا جاتا تھا۔ غالب سے بعید نہیں کہ اسے شراب کے مصلح یا بدرقہ کے طور پر پیتے ہوں۔

غنومیم، غنودیم

ڈاکٹروں سے ایکس رے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر یا یو کیسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسی قوتِ ارادی کے مالک اور ایسے بقراطِ مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا، ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقہ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل ان کے رخسار ہی میں نہیں، فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بد پرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ شدید فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائیونگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاؤڈ اسپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی، جس کی سیکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انہوں نے نظامِ دکن کے شاہی جلد ساز سے بطور خاص بنوائی تھیں، چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انہوں نے میرا تعارفِ نیاز فتح پوری، مولانا محمد ایوب دہلوی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے کرایا تھا۔ اور یہیں سے انہوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استادِ بوندو خان کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے ہر شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کر کے اپنی خوشی دوبالا کرنے کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش، پرائی عورتوں کے فوٹو (مراد ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے تو خلاف تھے ہی، مگانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ فرماتے تھے ”پیشاجی! موسیقی حرام تو، ہئی ہے۔ منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھر وچ گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دوالے اور قرتی کا ڈھول بجننا لازمی ہے۔ وہ گھر اُڑے ہی اُڑے۔ اسے میری وصیت جانو۔“ وصیت کے احترام میں میاں احسان الہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمد للہ! مرحوم کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرتی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا، جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔ میاں احسان الہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اول، مگانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے مگانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں مگانے والا بالکل تنہا مگائے۔ یعنی نہ طبلہ کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ مگانے کے بول سمجھ میں آجائیں گے۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم، مگانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ مگانے والا فی سبیل اللہ

کلو کاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی، وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی ڈلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں تنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کنڈہ) مردہ نیل کائے کی تھو تھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی نئی ان ویلڈ چٹیر (معذروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں سچی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظے کا قائل ہونا پڑا، اس لیے کہ انہوں نے میری تواضع کے لیے فریسکو سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے ملا حلوائی کے کلاب جامن منگوائے تھے۔ دائیں طرف دیوار سے لگے ساکوان کے کنگ ساڑھیڈ پر تکیے نہیں تھے۔ ان کی تیکم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پینتیس برسوں میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھا کہ سے، کلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوائے تھے۔ فالج کے پیش منظر پنکھا، ائیر کنڈیشنر، کھڑکیاں، بری خبروں کی اطلاع، بچوں کا داخلہ — سب بند تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چلی ہے۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا:

”ہمارے یار جانی منور حسین مر گئے۔“

”ہاں، مجھے کسی نے بتایا تھا۔“ انہوں نے بڑی لگنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

میری بات پر وہ اپنی توجہ بیس پیچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پارہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رخت سفر باندھا تو پہلے اپنے دونوں دوستوں (جن کے نام رسمی خانہ پُری کی خاطر میاں احسان الہی اور منور حسین فرض کر لیجیے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ دوست کو کسی بھی نام

سے پُکھدس، ٹکلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی باتیں اور یادس انہیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصل نوٹ بھی لیے۔ ان یادداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بڑی تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسبِ عادت پال میں لکادیے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نہ رہے سوختتی ہیں۔ میاں احسان الہی اور منظور حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انہوں نے بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔ میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منظور حسین کا ایک مختصر سا خط موصول ہوا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تاثر یا اعتراض نہیں، لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو کروں، دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سن کر میاں احسان الہی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کہہ س۔ پھر کہنے لگے، بہت دن ہو گئے۔ اب پاکستان آ بھی جائے۔ ہمارے بعد آئے تو کیا آئے۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پُچھوٹ پُچھوٹ کر رونے لگے۔ سینتیس سال میں میں نے انہیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں کی یادس اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح کٹتی اور گندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیاسی تحریروں کو بے ضرر عملِ جراحی سے علاحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام، مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کر دوں اور دوسرے کی تبلییس لباس کر کے افسانوی لبادہ پہنا دوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودے کو یک قلم مسترد کر کے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں، بلکہ اوّل تا آخر سب کچھ fictionalise کر دوں، جس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور میں نے یہی کیا۔

چنانچہ ”آبِ گم“ کے پانچ کہانی نما خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے، اس کا ان دوستوں کے واقعات زندگی یا ان کے احباب، بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی تعلق یا مماثلت نہیں ہے۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار

”اصلی“ نظر آئے تو اسے محض سوء اتفاق تصور فرمائیے۔ تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں ”بہ بدی“ یا برہنائے تنقیص آیا ہے، اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ استاضہ ضرور ہے کہ میں نے حتیٰ الامکان منور حسین اور میاں احسان الہی کے مخصوص پیرایہ بیان اور انداز گفتگو کی لٹک — اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھونک کے دوران شرارِ جستہ و فقرہ بر جستہ — کو جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملبغوبہ جسے آج کل Faction (Fact + Fiction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانہ کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور محرک اور باعثِ تصنیف ہر دو یارانِ رفتہ کی صحبت اور مطاببات تھے جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ صحبت یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے تھے۔ اس قرض اور نعمتِ عظمیٰ کا اخفاءِ بدویا تہی ہوگی۔

جس انگریزی انگریزی گفتگو کا اُپر ذکر آیا ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الہی بھی اپنے رب سے جا ملے اور دس سونا کر گئے۔ اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے زیرِ زیرِ سستی گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان کا کلمہ اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

پچھلے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی، ادبی، پیشہ ورانہ، سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرہِ رائگاں میں زیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومنے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بین فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہل وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے۔

سفر کردم بہر شہری دویدم

بہ لطف و حسن تو کس را ندیدم *

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو اُدھر سے آتی ہے، دل دہلانے اور خون جھلانے والی ہوتی ہے۔

* مطلب یہ کہ میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھوما۔ لیکن یہ تیرے لطف اور حسن کا فیضان ہے کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

غزوہ دیم، غزوہ دیم

پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ ٹھکتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو حساس آدمی کی کیفیت سیسہ موگراف کی سی ہو جاتی ہے، جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکنے، بیکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھا ہے۔

دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض، علما مصلحت میں، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دانش ور خوشامدی اور ادارے لٹو کھٹے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو رع کامل اس فرقہ تجارت سے ٹھکانہ کوئی) تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزمایا آمر ملک کو غضب ناک ٹھاکوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بٹلایا جاتا ہے۔ اور جب آجاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ رواسیتی اونٹ کی طرح بڑوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بڑو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں ٹھکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابعدار اونٹ تلاش کر کے اسے دعوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں، تاکہ اس کی پیٹھ پر پیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں۔ اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرا بھینچ سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس معنی میں کہ وہ خلوص دل سے یہ سمجھتا ہے کہ ملک و ملت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تنہا کر سکتا ہے، وہ پوری قوم کے بونے کا کام نہیں۔ وہ سچ مچ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہی نہیں، درماں بھی ہے۔ نیز اسی کی ذات واحد خلاصہ کائنات اور بلا شرکت غیرے: سرچشمہ ہدایت ہے۔ لہذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفہ سماوی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ فرامیں خیال میں

اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان لامسائل (Non-issues) اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو وہ خود اپنی جو دت طبع سے کھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اخباری معنے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح پہلے وہ بہت سے حل اکٹھے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہن معما ساز کی مدد سے ان سے آڑے تر چھے مسائل گھڑتا چلا جاتا ہے۔

رائے کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ یہ کہ وہ بند کان خدا سے اس طرح

خطاب کرتا ہے جیسے وہ سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں۔ اور وہ انہیں ظلمت سے نکال کر اپنے دورِ ناخدائی میں لانے اور بنِ مانس سے آدمی اور آدمی سے انسان بنانے پر مامور من اللہ ہے۔ وہ ہم وقت اپنی شیشہ پلائی ہوئی دیوار سے خطاب کرتا رہتا ہے، مگر قدِ آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر نہیں آتا۔ مطلق العنانیت کی چڑیس دراصل مطلق الانانیت سے پیوست ہوتی ہیں۔ چنانچہ اوامر و نواہی کا انحصار اس کی جنبشِ ابرو پر ہوتا ہے۔ انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اونچے نیچے پلڑوں کو، اپنی تلوار کا پاسبانگ، کبھی اس پلڑے اور کبھی اُس پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔

ہر کہ آمدِ عدالتِ نو ساخت

ایسی سرکارِ دولت مدار کو مابدولت مدار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ منقل کفر، کفر نہ باشد، مرزا عبد الودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شد و حد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے، میں تو جب اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے یہی regime مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔

پھر جیسے جیسے امورِ سلطنت پر وفورِ تکنت اور ہوسِ حکمرانی غالب آتی ہے، آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے۔ اور جو اس کے دستِ آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے، ان پر اللہ کی زمین کا رزق، اُس کی چھائوں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور تک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیحہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کرتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں۔ مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں ہوں گے۔ بامثالِ امر، قصائدِ نو کے انبار لگ جاتے ہیں۔

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے

سورج کی پرستش کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نہ جانے پھر کب اور کدھر سے نکل آئے۔ کبھی کسی نے کوئی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں۔ اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی وغیرہ منصبی حالتِ سجدہ ہی میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا۔

ارجنٹائن ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق و مصر و شام، اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔۔۔ سیٹ، مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

متذکرہ صدر دس تحریریں، جو اپنی ساخت، ترکیب اور دانستہ و آراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے، موثر اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں، اسی دور ضیاع کا تلخاب ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے امینول جوزف سائیز سے پوچھا کہ آپ نے انقلابِ فرانس میں کون سا شان دار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا ”J’ai Vécu“ (I survived) یعنی میں اپنے آپ کو بچا لے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا یا نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مہجوری کا جواثر طبیعت پر مرتب ہوتا ہے، اس کی پرچھائیاں آپ کو جہاں تہاں ان تحریروں میں منظر آئیں گی۔ یوں لندن بہت دلچسپ جگہ ہے۔ اور اس کے علاوہ بظاہر اور کوئی خرابی منظر نہیں آتی کہ غلط جگہ واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی ضرور ہے۔ مثلاً مطلع بہ وقت ابرو کہہ آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ A.M اور P.M بتانے والی ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہو۔ گھراتے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعراء فلپ لارکن یہ کیسی مجبوری کہ

“Nowhere to go but indoors!”

روشن پہلو یہ کہ شائستگی، رواداری اور بُردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلافِ تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ سوائے پب (شراب خانہ) اور بار کے! کبھی اور نازک مسائل پر صرف نشے کی حالت میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ بے حد خوش اطوار اور ہمدرد۔ کاروائے اتنے خوش اخلاق کہ اکلوتے

ہیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کر کے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ کہ سدا کے جذباتی ٹھہرے، سر راہے اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشاجی چاہتا ہے زیرالائن پر ہی کھڑے ہو کر پہلے سب کو جھک جھک کر فرد آفر داکورنش بجالائیں، پھر سوک کر اس کر س۔ مختصر یہ کہ کنج قفس میں اچھی گزرتی ہے۔

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیناد

بس ایک حشر پیا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصرا ندیوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے تباوے ان خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہاسواں آدمی، سواس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منہ اندھیرے اور شام ڈھلے ان پر ہچکچاتے ہیں۔ اور نہ اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتا سکتے ہیں جس کے ساتھ رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی۔۔۔۔۔ گولڈن آبرن، کلپر آبرن، ایش بلانڈ، چیسٹنٹ براؤن، پینڈل براؤن، برگنڈی براؤن؟۔۔۔۔۔ کچھ معلوم نہیں۔ ان کی خیرہ ہکلیاں تو، جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہوں، کے فلمی مقام پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزیم، آرٹ گیلری، تھیٹر، نائٹ کلب، سو ہو کی شب تاب کلیوں کے طواف، ایسٹ اینڈ میں ڈلٹ آمیز ”مگنگ“ یا چیئرنگ کر اس پر مگہگ کی منتظر شب زاد یوں کی عنایات عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانوی شہریت حاصل کر کے وہ رہی سہی عزت بھی گنوا دی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی، یا ایک وقت برٹش پاسپورٹ اور ”اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام“ لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی کر لی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکلیں کس دیں۔ نک سب اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا ”اشٹاک“ بہت اچھا ہے۔ قد کاٹھ، رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوبصورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بد صورت انگریز عورت rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے! لیکن انگریز عورت کو جالہ کلاخ میں لانے سے نہ تو انگلستان فتح ہوتا ہے، نہ سمجھ میں آتا ہے۔ بلکہ

جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چنانچہ جلاوطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلاوطنی اختیار کی ہو) پر پھر کر اُسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جسے مرورِ ایام، غربت اور فاصلے نے اب آؤٹ آف فوکس کر کے کلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلاوطن و ہاٹ روسی ادیب اس کی بہترین مثال ہیں۔ لندن میں مقیم یا آباد اردو ادیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا۔

کوئی اُن کی بزمِ جمال سے کب اٹھا، خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس راندہ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز واہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو صاف چُھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے انشاء اللہ جلد ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ”زرگزشت“ کی اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچہ سود خواراں میں اپنی خواری کی داستان آخری باب میں جہاں ختم ہوئی ہے، وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا۔ لیکن درمیان میں لندن، ایک اور بینک، ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور ”آپ لم“ آپڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمرازیہ نہ سمجھیں کہ بینکنگ کیرئیر تو محض کیونفلاژ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ء یعنی ملازمت کے روزِ اوّل ہی سے میری نیت میں فحور تھا۔ محض مزاح بھاری اور خود نوشت کے لیے سوانح اکٹھے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیشے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی — سود!) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو ”زرگزشت“ حصہ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی، یہ تھی کہ یہ اردو فکشن کا سنہری دور ہے۔ آج کل اردو میں بہترین فکشن لکھی جا رہی ہے — خود نوشت اور سفر ناموں کی شکل میں! افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس، میرے یہاں سوانح کا استا فقدان ہے کہ تادم تحریر، زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامہ خود بین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس اثنا میں لارڈ کوئٹن کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹرینیٹی کالج، آکسفورڈ کا پریسیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیرمین ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں

عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا۔ مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں! عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عیش و عشرت کرتا رہا کہ اس کی خود نوشت سوانح عمری زرگزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹل جیسا ہے۔۔۔۔۔ زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں۔۔۔۔۔ بالخصوص جوانی میں۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروین دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے، ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ مند اور جفاکش لوگ اپنے زور بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں، اسی طرح وہ زورِ تخیل سے اپنا ماضی آپ بنا لیتا ہے۔ یادوں کا سرشور دریا دشتِ امروز میں بہتے بہتے خوابِ سراب کے آبِ کم میں اتر جاتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں اُبھرتی، گم ہوتی سوتِ ندیوں اور کہیں کالہ زروں کی صورت، خیالِ بکولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کو سینچتا رہتا ہے۔ اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چٹمے آبِ زندِ گمانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ، در ماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدسی تناسب (inverse geometrical ratio) میں، استباہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے۔ اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیرا ستہ کیا ہے۔۔۔۔۔ ماضی تمنائی۔ اس پاکستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقصِ دیدنی ہوتا ہے کہ مورِ فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنکل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ناپختہ ناپختہ ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنکل ناپختہ لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناسٹل جیسا اسی لمحے کی داستان ہے۔

شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ اپنے اپنے ذوق، ظرف، تابِ ہزیمت اور طاقتِ فرار پر منحصر ہے — — — تصوف، تنقشف، مراقبہ، شراب، مزاج، سیکس، ہیروئن، ویلیم، ماضیِ متناہی، فینٹسی (خوابِ نیم روز) — — — جس کو جو نشہ راس آجائے۔ آرئلڈ نے ہار جانے والے مگر بارہ ماتے والے، دھیان دُھول میں لت پت مشرق کی بار سہار کے بارے میں لکھا تھا:

The East bow'd low before the blast
In patient, deep disdain
She let the legions thunder past
And plunged in thought again.

اور اس مغرور مراقبے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے، خود اپنے لہو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسٹر آجائے تو پھر سب گوارا، سب کچھ پندہ را۔ ہزار آشفتمندی مجموعہ ایک خواب ہو جائے

صاحبِ مرآۃ الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و برہنگی کے الزام میں سرمہ کو پا بجولاں شہادت کاہ لے جایا گیا تو وہ تیغِ کف جلاؤ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا ”قدائے تو شوم! بیابیا کہ تو بہر صورتے می آئی من ترا خوب می شناسم“ (۱) پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلوار کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم (۲)

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گمبھیر بات کہتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح ہمارا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ (۳) اتار کر پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچہ سود خواراں میں سر پر دستار رہی یا نہیں، تاہم آپ اس کتاب کا موضوع، مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ

(۱) مطلب یہ کہ میں تجھ پر قربان جاؤں۔ تو آور جلد آ کہ تو جس بھیس میں بھی آئے، میں تجھے خوب پہچانتا ہوں۔

(۲) ایک شور مچا ہوا اور ہم نے خوابِ عدم سے آنکھ کھولی۔ دیکھا کہ شبِ فتنہ ابھی باقی ہے تو ہم پھر سو گئے۔

(۳) فولس کیپ: کلاؤن یا مسخرے کی ٹوپی

اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی غرے چوٹنے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رُسوا کی امراؤ جان ادا اور طوائفوں سے متعلق مثنوی کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جَنّاتی زبان (۴) میں کر کے انہیں (طوائفوں کو) بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سُن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ، خود ہم اپنے طرزِ بیکارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ بہر کیف، اس بار موضوع، مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

قصہ گو قلندر کو اپنی عیناری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو، اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ ترشوار کھا ہو، بائند کانِ حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اچانک اس کا رنگ، رُخ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہانی کہنے والے کو کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وہ نہیں رہتا کہ جو تھا۔ سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہِ راقمِ سطور کے ساتھ ہوئی۔ وَأَنْتَ هُوَ أَضْحَكٌ وَأَبْكِي (۵)

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں (۶)

یہ نہ ادعا ہے، نہ اعتذار، فقط گزارشِ احوالِ واقعی ہے۔

حمد اللہ! میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے اس درجہ مستغنی ہو جاتا ہے کہ ناکردہ خطاؤں تک کا اعتراف کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اب مجھے ”کسے کہ خنداں نہ شد از قبیلہ ما نیست“ پر اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبعاً، اصولاً اور عادتاً یا اس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاحِ بیکاروں کا مقدر ہے۔ مزاحِ بیکاری کے باوا آدم ڈین سو فٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتی لباس پہنتا اور فاقد کرتا تھا۔ مارک ٹوین پر بھی اخیر عمر میں کلیبت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیر محترم

(۴) اس کا ایک نمونہ ”عوبلی“ کے باب سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۵) اور یہ کہ وہی ہنسنا ہے اور وہی رُلانا ہے۔ قرآن مجید۔ ۲۷ قال فَاظْهَمُکُمْ۔ النجم ۵۳

(۶) میرے ہاتھ سے ساز لے لو کہ میرا کام تام ہو چکا۔ میرا نغمہ خون ہو کر ساز کے تاروں سے بہہ نکلا ہے۔

سے تمہاری ماضیت بس اسی حد تک ہے۔ بہر حال، قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا ہے۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان پچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں، تاکہ آگے چل کر کوئی ناہنجار مخالف پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔ مزاح کو میں دفاعی میکے نزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اُس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زمین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے جب کھبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیدھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہادت یہ بھی سنی کہ بندر پہرے کی پھنگ پر سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

”حویلی“ کی کہانی ایک متروکہ ڈسٹڈار حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد گھومتی ہے۔ ”اسکول ماسٹر کا خواب“ ایک دکھی گھوڑے، حجام اور منشی سے متعلق ہے۔ ”شہر دو قصہ“ ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچتر سال گزار دینے والے سنی آدمی کی کہانی ہے ”دھیرج کالج کا پہلا یادگار مشاعرہ“ میں ایک قدیم قصبائی اسکول اور اس کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کچھور * پیش کیے گئے ہیں۔ اور ”سار“ کاہلی والا اور الہ دین بے چراغ“ ایک کھٹارا کار، ناخواندہ پٹھان آرہتی اور شیخی خورے اور لپاڑی ڈرائیور کا حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار مرکزی، ثانوی یا محض ضمنی حیثیت سے ابھرتے ہیں، وہ سب کے سب اصطلاحاً بہت ”عام“ اور سماجی رتبے کے لحاظ سے بالکل ”معمولی“ ہیں۔ اسی لیے خاص التفات اور تامل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بد نصیبی ہی کہنا چاہیے کہ جن ”بڑے“ اور ”کامیاب“ لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، انہیں بحیثیت انسان بالکل ادھورا، گرہ دار اور یک رخ پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر تعداد میں قادرِ مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بنانے میں اسے خاص لطف آتا ہے، ورنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن باقرن سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جانتا چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی الف لیلیٰ ایک ہزار ایک راتوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتی کہ، ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ۔

مکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور ”پلاٹ“ کا فقدان گراں گزرے۔ میں نے

* کیری کچھور: مسخ کے۔ (سخ خا کے)

پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو فلموں، ڈراموں، ناولوں اور سازشوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی زندگی میں دور دور اس کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی غصہ کوئی عیب نہیں۔ اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر محض خوردہ گیری پر مبنی نہیں، اور سچی اور جاندار ہیں تو اپنی کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں تو ژورنلر اور افسانوی سانچے میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شکلے میں لسنے کی ضرورت نہیں۔ کنگول، چیخند او کلاڈ سیون زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اپنے کینوس پر بظاہر بڑی لاہروائی سے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ دوست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے total recall (مکمل باز آفرینی) کی بہترین مثال ہے (+) انگریزی کے عظیم ترسن (بغیر پلاٹ کے) ناول Ulysses کی کہانی ۱۶ جون ۱۹۱۶ کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Day's Journey Into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں، سراسر میری کم سوادی اور بے ہنری ہے کہ پیہر گنتارہ گیا، جنگل کا سماں نہ دکھلا سکا۔ آشکار نیارگری کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں، کلاہ پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بدعتی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً، نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ان کے معنی معلوم نہیں۔ دوم، خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمال پر ملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور ”آہ نامہ“ کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائیونگ لے لی۔ ہرچند کہ اس میں گردان نہیں تھی، لیکن مقامات آہ و فغاں کہیں زیادہ ٹکے۔ اس میں میٹرک تک میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ اور میں ہر دو اشیا ڈرائیونگ میں اسپیشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسی ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائیونگ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محنت اور محنت سے لکھتے ہو

(+) ہم نے ”یادوں کی برات“ کا قصہ اُذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس میں دو لہجہ باتوں کے کاندھے پر سواں انہیں چھوہاروں سے مارتا، اپنی شہنائی آپ بجاتا جاتا ہے۔ آرسی مصحف کے دوران، آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھ کر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ دُہن کا چہرہ اُسے نظر ہی نہیں آتا۔ اس کے بعض کرداروں کے نام اور کارنامے آپ رز سے لکھنے کے لائق ہیں۔

اور تمہاری lettering (حرف کشی) اتنی خوبصورت ہے کہ تمہیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اس کی نیچے یہ نہ لکھو کہ یہ انکو کی سیل ہے تو تمہیں گھڑو نچی بنانے کے سو میں سے سو نمبر ملیں۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت، دوستانہ درگزر اور مودبانہ نا فہمی کے عالم میں یہ سب کچھ جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن اجاب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفحہ) ہے، انہیں ان اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعبِ فارسی دانی میں دس گنا اضافہ اور لطفِ صحبت و مراسلت میں اسی قدر کمی واقع ہو گئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں تہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے ریا و ریش برادر م منظور الہی شیخ (مصنف درِ دلکش اور سلسلہ روز و شب) جو پر سش حال کے لیے بصرِ کثیر لاہور سے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اردو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپرے ٹر لائن کاٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجیے، کل سارا وقت ترجمے میں ہی ضائع ہو گیا۔ میں نے ٹیلی فون دراصل یہ پوچھنے کے لیے کیا تھا کہ آپ کا آپریشن کس چیز کا ہوا تھا۔ اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے بہت تر د ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ بدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا واہ!!۔۔۔۔۔

دوسرے کرم فرما ہیں ڈاکٹر ضیا الدین شکیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں، بک اسٹال سے ایک خوبصورت اور سمجھ میں آنے والا تصویر پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی، سیدل یا طالب آملی کے شعرے پانی پھیر کر مجھے پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے ہیں جمیب لیبیب و صاحب طرز ادیب محبی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عتیق علمی خلا کو پُر کرنے میں رُبع صدی سے جُٹے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بٹین بجاتے اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے پوچھا، حضور والا، آپ کو یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں؟ مگر وہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں

لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی اٹھکی سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی اٹھکی سے اپنا کان توبہ کے انداز میں پکڑ کر اگر بیٹھیے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار و استغفار کے مخلوط اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست دشمن سب قتیل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ ان ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیے ہیں تاکہ سندر ہے اور بحول جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آر۔ سی۔ ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں اور مزارِ پیر روی کے نواح میں درویشوں کا والہانہ رقص ہچشم حیراں دیکھ آئے ہیں، فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے اک اور دیرینہ کرم فرما، پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے، بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور وفور سے ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

آسان زِ توجہ تو مشکل

مشکل زِ تجاہل تو آسان (+)

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کل کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے، ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے کاڑھے کاڑھے لعابِ ذہن سے فارسی شعر کے گرد بنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے کا زمانہ قدیم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے۔ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ مرنے جائے، ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔

(+) معذرت کے ساتھ۔ ”آسان“ اور ”مشکل“ کی ترتیب الٹی کر دی ہے۔

تحریف کے بعد مطلب یہ کہ تیری توجہ سے تو آسان بات بھی مشکل بن جاتی ہے۔ اور تجھ سے رجوع نہ کر دس تو مشکل بات بھی آسان ہو جاتی ہے۔

خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیر پر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے، ان کی طرف سے مترددرہتا ہوں۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔

ایک دفعہ میں نے منظور الہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوبصورت اشعار منقل کیے ہیں۔ لیکن میری طرح، قارئین کی نئی نسل بھی فارسی سے نااہل ہے۔ یوں ہی شد بد اور اٹکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے، بند ہونٹوں سے اپنے دلاویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا، مگر بھائی صاحب، پھر مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس پر مرزا کہنے لگے ”تم نے اس کتاب میں جو ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے دھڑنگ (مرزا بے درنگ کا یہی تلفظ کرتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کیے ہیں، ان پر بھی یہی فقرہ چُست کیا جاسکتا ہے۔ انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پینے کے سیٹھے اور بد مزہ ہوتے ہیں۔ لہذا اعلیٰ ریسٹورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنچ میں دیے جاتے ہیں۔ فرنچ آج بھی شائستگی اور سوفسٹیکیشن کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ لہذا انگریزوں کو کوئی آرٹسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنچ فقرے کا گھونکھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہو گا کہ سیمول پیپس (۱۷۰۳-۱۶۳۳) نے اپنی شہرہ آفاق ڈائری (جس میں اس نے اپنی آوازیوں اور شبینہ فتوحات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ سینڈ میں لکھی تھی تاکہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسریانی (understatement) سے کام لیتے ہوئے، naughty کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، تو وہ اس واردات کا اندراج فرنچ میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو — جو کہ اکثر ہوتی تھی — کہ فرنچ زبان بھی سلگ اٹھے تو وہ اس رات کی بات کو بلا کم و کاست ہسپانوی زبان میں قلم بند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی باعتبار مدارج بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف بھاگئیے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ دانائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں اٹے واہین کے اندر منقل کرتے ہیں

تاکہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے مکانوں کے لیے اٹالین اور فلسفہ کی اوق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر ناقابلِ فہم کو ناقابلِ برداشت بنا دیتے ہیں۔“

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا ”لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اردو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جاسکتا ہے۔“

اس بروقت تنبیہ کے باوجود آپ کو انگریزی الفاظ بجا بجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اردو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی ہنت میں پیوست ہیں۔ بصورتِ دیگر، بہت مانوس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انہیں اردو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انہیں پہچانتے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

”اسکول ماسٹر کا خواب“ اور ”دھیرج کتج کا پہلیا دوکار مشاعرہ“ پر محب و مشفق دیرنہ محمد عبدالحمیل صاحب نے بکمال لطف و توجہ نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر مزاج وہ خود تھے ویسے ہی دھیمے ان کے اعتراضات تھے جو انہوں نے میرے مسودے کے حاشیے پر اتنی ہلکی پنسل سے نوٹ کیے تھے کہ انہی بھی پھیر دس تو میٹ جائیں۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامہ ہدیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ٹرش مکالمے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلوایا تھا ”ہم اس سالے لنگڑے گھوڑے کو لے کے کیا کر سکا؟“ جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تادمیاً پورا جملہ تو نہیں کاٹا، صرف سالے کو قلم زد کر کے اس کے اوپر برادرِ نسبتی لکھ دیا! پھر فرمایا کہ ”حضرت! یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا ہکا لکھیے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا۔“ عرض کیا ”ہکا ہکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ نظر آتا ہے، جب کہ ہک دک میں ایسا لگتا ہے جیسے دل بھی دھک سے رہ گیا ہو۔“ فرمایا ”تو پھر سیدھے سُبھاؤ دھک دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں! مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لُو طی لکھا ہے! زَلّتِ قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجیے۔ یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا۔“

پوچھا ”تو پھر آپ کے ہاں لُو طی کو کیا کہتے ہیں؟“

فرمایا ”کچھ نہیں کہتے۔“

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال کیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے ”ایسا ہی ہے تو اس کی جگہ بد تمیز لکھ دیجیے۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے۔“ یہ سن کر میں ہنکا ہنکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بد تمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بد تمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مہذب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے ملبل کے کرتے کی آستین الٹ کر مسوڑے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے ”دواب خانہ، سنگوٹیاں، آر اور جوجنا شرفائے لکھنؤ نہیں بولتے“ عرض کیا ”میں نے اسی لیے لکھے ہیں۔“ پھر دیکھ اٹھے۔ کہنے لگے ”بہت دیر بعد آپ نے ایک سمجھ داری کی بات کہی۔“ پھر اس خوشی میں سکرٹ سے سکرٹ سلکاتے ہوئے بولے ”مگر مشتاق صاحب، یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا۔“ عرض کیا ”جوان اور مست بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے دائرہ میں ہوتی ہے اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندہ اور ریشے دار۔“ فرمایا ”واللہ! ہم نے یہ لفظ ہی نہیں، ایسا بکرا بھی نہیں دیکھا۔ لفظ، مفہوم اور اس کے گوشت تینوں سے کراہت آتی ہے۔“ مقنی ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبودار جانور استعمال نہیں کر سکتے؟ کراچی میں اس لفظ کو کون سمجھے گا۔“ عرض کیا ”وہی جو مقنی (قے آور) کو سمجھے گا۔ آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا غالب نے عجیب سیاق و سباق میں ذکر کیا ہے۔ علانی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ تم خضی بکروں کے گوشت کے قلیے اڑا رہے ہو گے۔ لیکن نجد میں تمہارے پلاؤ قلیے پر رشک نہیں کرتا۔ خدا کرے تمہیں یہ کانیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ کہ اس مصری کی ڈلی سے دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی، دلی میں منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین و شارحین کی طبع بدگماں ادھر نہیں گئی، حالانکہ غالب نے مصری کے تلازمے کو عشق عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی استعمال کیا ہے“

فرمایا ”جاچھوڑ دیا حافظ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت، یہ روہڑ کس زبان کا لفظ ہے؟ کر یہہ الضوت۔ بالکل گنوارو لگتا ہے۔ کیا راجستھانی ہے؟“ عرض کیا ”خود ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ لہذا

ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا....“

”کون ماجد بھائی؟“

”ماجد علی صاحب۔ سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے، اپنے بیگانے، باس اور ماتحت۔۔۔۔۔ سب انہیں ماجد بھائی کہتے ہیں، سوائے ان کی ٹیم، زہرا کھاہ کے۔ وہ انہیں ماجد چچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ لحاف کی پرانی روٹی کو، جسے غریب غریباں تھوں سے ٹوم کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں، روہڑ کہتے ہیں۔

یوں تو وہ عاجز کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے، تاہم میں نے مزید تفتیش کے لیے پوچھا ”کیا بد اوں میں بھی بولا جاتا ہے؟“ چہرے پر ایک بناوٹی خشونت اور لہجے میں خفیف سے مصنوعی لگنت پیدا کرتے ہوئے، جو بحثا بحثی میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے، بولے ”دیکھیے، ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ، علمی مباحث اپنی جگہ، بدایوں کو بد اوں کہنے کا حق صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثالیوں سمجھیے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد چچا کہنے لگیں تو لندن پولیس مجھے پولی گمی (تعدا زواج) میں دھر لے گی۔ آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ بہر کیف، روہڑ صحیح ہے۔ بد اوں میں تو پجیری والے گھر گھر صدالکا کے روہڑ خریدتے تھے اور اس کے بدلے ریوڑیاں دیتے تھے جنہیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔“ علمی تحقیق و صدق کا جذبہ اب مجھے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں مزید سوال کرنا گویا اپنی دستارِ فضیلت سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنجی کے سامنے اچھے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راوی غیبت میاں کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے، کچھ دُور پر لوگ عزت مآب کے خلاف ”ایوب خاں کا چچو! ایوب خاں کا چچو!“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا ”یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا ”سر، کٹھری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔“

جمیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ سیجے۔ ناک سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے ”اگر آپ کو صاف روٹی سے الرجی ہے تو روہڑ بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات آپ کو بہت فیسی نیٹ کرتے ہیں۔ خیر، مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے اٹھیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجیے گا۔“

عرض کیا ”مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو جنہوں نے متروکہ جائیداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفتہ کھود کر، سموچا ڈھو کر پاکستان لے آئے! متفقین برطرف، اگر ان میں سے ایک لفظ، جی ہاں، صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔“

بولے ”پھر وہی!“

افسوس، جمیل صاحب صرف دو ابواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا اگیا۔ اب ایسا نکلتے داں، نکلتے سنج، نکلتے شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکلتے پروری، استعداد آفرینی اور دل آسانی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات اور یس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے اپنے تبسم، تقسم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشان دہی کی۔ تاہم بے شمار سخن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجہ باقی رہ گئی ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا ”راجستھانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں پر چٹری کے رنگ چٹھٹائے نہیں چھوڑتے۔“

Out, damned spot! out, I say! *

حیرت ہے اس دفعہ تم نے زبان کی ایک بھی غلطی نہیں نکالی!“

کہنے لگیں ”پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر ————— گڑھی میں آگئی۔ تینتالیس برس ہو گئے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی، اور تمہاری بولی کیا۔ اب تو جو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے۔“

ایک دوسرے کی چھاپ، تلک سب چھین کر اپنا لینے اور دریائے سندھ اور راوی کا ٹنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا۔ اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ فالحمہ للہ رب العالمین۔

مشتاق احمد یوسفی

لندن

۶ اکتوبر ۱۹۸۹

* شیکسپیئر۔ لیڈی میکبیتھ، عالم خواب میں اپنے ہاتھ پر خون کا دھبہ دیکھ کر اسے چھٹانے کی کوشش کرتی ہے، مگر وہ ہے کہ کسی طرح چھوٹ کر نہیں دیتا۔

حوالی

۱

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یارِ طرح دارِ بشارت علی فاروقی کے خُسر کا ہے، لہذا تعارف کچھ انہی کی زبان سے اچھا معلوم ہو گا۔ ہم نے بارہا سنا، آپ بھی سنئے:

”وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خُسر نہیں بنے تھے تو پھوپھا ہوا کرتے تھے۔ اور پھوپھا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور میں رشتے ناتے اُہلی ہوئی سوئیوں کی طرح اُجھے اور بیچ در بیچ لگتے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی ادھر، آدھی ادھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہوگی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی، ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی، بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی بالکل خونِ کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خُونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جنے کیوں۔ کالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگِ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ ٹکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجہ کالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے، لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم کالی منظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے اُلٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے! آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کرے گا۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ ”نہیں“ سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ”آج بڑی سردی ہے، بولے ”نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی۔“

”وہ چچا سے پھوپھا بنے اور پھوپھا سے خسر الخذر لیکن مجھے آخر وقت تک بکا اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ بکا کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا، قبول ہے؟“ ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مودبانہ ٹھونگیں مار دیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کے لئے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کرکڑ کر بولے ”لوٹوئے! بولنا کیوں نہیں؟“ ڈانٹ سے میں زروس ہو گیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے ”جی ہاں! قبول ہے کہہ دیا۔ آواز تلکھت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اُچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنکار ہے ہیں کہ اتنے زور کی ”ہاں“ سے بیٹی والوں کی بیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمران کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کرب قربات داری و قربت قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

”حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مائیوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لئے اُبٹن ملا جا رہا تھا، کہلا بھیجا کہ دو لہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد کاہ تک آئے گا۔ عقد کاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پچانسی لگاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براقی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو، میری حوصلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا۔ اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو، Over my dead body اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔“

”کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہر الہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ان کے گھر برات چڑھے۔ داماد کے

خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ کاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ کاڑ دینے کے حق میں تھے۔

”چہرے، چال اور تیور سے کو تو ال شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ نکلتا ہوا قد۔ چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں، تینوں یک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں۔ اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبھو کا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندی، آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم، میک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلاتے سیتما تے رہتے۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرزہ بر اندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، مالی کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ کچھی کچھی موٹھیں جنہیں مالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چُنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چُنی ہوئی دوپٹی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلانی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علحدہ بانس پر دستاں کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرات نہیں کر سکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہو گا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بٹے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بیکار ہو گئے تھے ان کی چابیاں بھی اس پتھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ محلے میں اس چوری کا برسوں چرچا رہا، اس لیے کہ چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرہ نسب پُر کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتہ دار ہی کر سکتا ہے۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے۔ مٹی جون میں ٹمپر پھر ۱۱۰ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے اٹیکر نہیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر سر پر انگوچھا ڈالے، تربوز کھاتے۔ خس

خانہ و برقاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو بزنس، پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی۔ لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا کباب آ نکلے تو برا بھلا کہہ کے بھکا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کچا کچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لئے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بنی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔

لفظ کے پچھن اور بازاری پان

”مٹاکو، قوام، خربوزے اور کڑھے ہوئے گرتے لکھنؤ سے، حقہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ کالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چنری آپ کے بچے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستھان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس دن آپ نے؟ ————— کھانڈ، سانڈ، بھانڈ اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھہ، ڈاور ڈ لکھا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لئے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت نور علی نور بلکہ حور علی حور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سو سو سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نینتیں خراب ہوئیں، اس لفظ کے پچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بانی، مہدی حسن اور ریشماں۔

”ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈیا اور بٹوہ رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے، بازاری پان صرف رنڈو سے، تماشین اور بیٹی والے کھاتے ہیں۔ صاحب، یہ منافست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈیا چاندی کی۔ نقشین۔ بھاری۔ ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے

تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈیسا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مضر و ب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش، ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے پٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹوہ آپنی آپ مصاحبوں کی باجھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گٹکا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے، میٹھا پان، ٹھمری، گٹکا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ردیف قافیے سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی، بقول شخصے، آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن استاضور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھوئیں، ہیکڑی، لڑ مرنے، ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزلت گزین اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیاریک پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیاریک کے ٹسر کی پہنی۔“

واہ کیا بات کورے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری، کچھ ان کی زبانی سنیں اور رہی سہی، زبانِ خلق سے، جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور میں پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اسی کو آپ ان کا حیلہ معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلائے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیڑم سوختی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی نا آشنائے مزاج کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے۔ فرماتے تھے، لوہے کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو بازوؤں میں بھر کے، سینے سے لٹکا کے اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے، کبھی کسی کو یہ جرات نہ ہوتی کہ ان کے پتھر کے باٹوں ہی کو تلو کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لونٹائی ہوئی ریز کماری کو گرین کر دیکھے۔ اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ سال اور چیر کا رواج عام تھا۔

بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوائے۔ ساگوان تو صرف امراء رؤسا کی ڈائٹنگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چارپائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر رکھی جاتی تھی۔ اول، جب حکیم، وید، ہومیوپیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کر وہ جگہ جگہ اسٹے تھس کوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی دواؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پُر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمی یا مہین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں، یا سولہ بیٹ پہنے ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو چکو کرتا ہوا تیمار دار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔ درحقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں تختوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دو لہا کی طرح سجا بنا اور مٹی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھادیا جاتا تھا۔ اس جلدی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی ہنسی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لئے نئے ماٹ یا لمبی وضع کے کورے میٹھے * کو الٹا کر کے سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

* کورے میٹھے کا ذکر آیا تو نوکِ قلم پر بے اختیار نظیر اکبر آبادی کا شعر آ رہا ہے جسے منقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا:

تازگی دل کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

نظیر اکبر آبادی کی کیا بات ہے۔ کوئی سی نظم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ انہیں جہاں کہیں قدرت کی کارِ مگری یا خدا کی شان نظر آ جاتی ہے، وہیں پائے بیٹاں پہ سر بسجود ہو کر شائے سراپا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنہاری کے سر پر کورا مٹکا دیکھا تو ردیفِ قافیے کی کافی اوٹ لے کر سارے سراپا کو نظروں سے کھوند ڈالا۔ پھر تو ”اس کا جو بن کچھ اور ہی مٹکا“ اس میں وہ اپنے دل اور قافیہ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جہاں جہاں وہ لے جائیں، چاؤ سے جاتے ہیں۔ حد یہ کہ گھڑو غجی اور لونا دیکھ کر صبر و قرار و قافیہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ دل میں خیالات فاسد پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کوری ٹھلیا پہ دیکھ کر لونا
دل لٹا ہونے کچھ کھرا کھونا

اس میں بچارے (نوٹی دار؟) لوٹے کا بظاہر صرف اتنا قصور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے معشوق سے مشابہت رکھتا ہے۔

چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت، نہ گنجائش، نہ تنگ۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کر لی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیر سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ چارپائی چھوڑ کر کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا۔ ”اور ورکرڈ“ سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہنے کے لئے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پرمیکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے! بولے، ادوان کسے سے جان چراتے ہیں! راقم الحروف کے خیال میں، ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لئے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدی، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچہ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

اسٹیشن، لکڑ منڈی اور بازارِ حسن میں بچوگ

مقصد اس تمہید غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہئے یا ہیوزم غیر سوتختی، دھند اس کا بھی ہمیشہ منہ ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد کابکوں سے زیادہ تھی۔ لہذا کوئی شخص ایسا نظر آجائے جو خلیے اور چال ڈھال سے ذرا بھی مکاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دوکاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر مکاہک گرد و نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کا پتہ پڑتا ہے۔ ان بچاروں کا لکڑی سے دوہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک، اپنا گھر بناتے وقت۔ دوسرے، اپنا کریا کریم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے، وہ اس جھینٹا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا، قلعی

نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں اُدھر اٹھا لیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بخود ڈبے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر و سہا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی بھی جس کے ہاتھ لگی، سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے میں مسافر پر ہونٹوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون، سفید قمیص، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے، سفید موزے، سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی، سوائے چہرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا تو اہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرتے جیسے اٹھلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تک و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں، بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلی اور یوپی سے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹوٹی دار لوٹے، مستورات، کثرتِ اطفال اور قیمے پر اٹھے کے بھبکے سے فوراً پہچان لیتے اور ”اسلام علیکم Brother in Islam“ کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دھینکا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط تہ بن حصے پر پڑتا وہی اسے کھینچتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا، وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا، اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لاتعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود کو اس پر چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی بچھلی سیٹ پر راجندر جی کی کھڑاؤں کی طرح سجادیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کے کمر بند کا سہارا تانگے والے کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا، کوئی پیچھے سے زلیغائی کرتا۔ آخری راؤنڈ میں ایک ٹکڑا سا تانگے والا سواری کا دلیاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈ اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کے tug of war کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دست اکھیر کر لے جائیں، ایک تیسرا پھر تیل تانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے چمٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو سیکھت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوہ پرنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا، جس کے قلب میں قبلہ کی دکان

تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے۔ مہاک پکڑنے کے لئے قبلہ اور دو تین چڑیمار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کین بنا لیے۔ قبلہ کا کین مستد تکیے، حقے، اگالداں اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کین گویا ایک نوع کا پیمان تھا جہاں سے مہاک کو مار گراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیام سے مہاک لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے ”مہاراج! مہاراج!“ ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پنجے سے چھڑانے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھ پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پناہ جتنی فیصلہ کیا کہ مہاک کو صرف وہی دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقہ تشدد میں داخل ہو گا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کسٹم پچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چوڑے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کستی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مار پیٹ، مہاکوں کا ہٹا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لئے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لئے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں مہاکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازارِ حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور ”مپ“ ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یاد کر دار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں اپنے زور بازو پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مار کٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلاتِ اخراجِ خون: جونک، سینگی، لاٹھی

بہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیداشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی معمولی سی بات پر آجائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں

رکھنے دیتی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشا کی نماز کے بعد گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آگیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانیاں ہی کون سے رفع کر دیں جواب یہ نئی پریشانی دور کرے گا۔ اس رات مُصلّاتہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلے محلوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف، دنیا جہان کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑھی، کھاٹ کھٹولے کی۔۔۔ یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ سیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لئے نائینیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلائیاں گھر آکر سیتی تھیں تاکہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوانہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کی زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لے کر سئے جاسکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حدیہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی۔ اس کے لئے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فساد خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں، یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا جہوم دن دہاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکالوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لئے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کر کے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاٹھی کو آلہ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ چونک اور سینگی * لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی
تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے کا جس کی زبان پر حکیم صاحبان چونک نہ لگوا دیں۔

* سینگی: درو یا فساد خون کے مقام پر ہلکا سا شکاف لکھایا جاتا تھا۔ پھر سوراخ کئے ہوئے سینک کے بڑے دہانے کو اس پر رکھ کر اور سوراخ والے سرے کو منہ سے لگا کر سارا فاسد و غیر فاسد خون کشینچ لیا جاتا تھا۔ اس عمل کو یونانی طب کی اصطلاح میں سینگی لگانا اور اردو شاعری میں قافیہ کہتے ہیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلوہ کر رہے تھے کہ اجانک کن میلے نے کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی ”کان کامیل“۔ خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں کابک ان سے نکلنے داموں دھڑا دھڑا لکڑی خرید رہے تھے، ہڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تودہل گئے۔ چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہوئے۔ کیبن کی یہ جراثیم کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہو کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لئے کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، جارحانہ انداز میں لکڑی لٹھی گھماتا ہرگز نہ جانتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔ اس ویشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اڑس رکھے تھے، زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈیبا بھی نکلی جس میں اس نے کان کامیل جمع کر رکھا تھا۔ منظر پکا اسی میں سے تولہ بحر میل نکال کر دکھاتا کہ دیکھو، یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولر کے بھنگے برآمد کر کے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آواز آ رہی تھیں وہ انہیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بحول بھلیوں میں اتنی دور تک سہج سہج سلانی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا بھی کان کے راستے آستیں بھی نکال کر، تھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو بلی پر چڑھا کر بلی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح کاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبر اولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن، بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کے لئے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی میٹھی کہ کان کے سامنے سے بڑھتی، کھٹ بنے، سینگی لگانے والیوں اور سحری کے لئے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریمہ الصوت مؤذن بھی عقب والی گلی ہے آنے جانے لگا۔

کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چکی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ، محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ ”محبت کا اضافہ ہم نے اس لئے کیا کہ وہ کابک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساکوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (Veins) کا طغریٰ، اگر وہ چاہیں

تو، یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑی منڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو مہاک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلی کا شجرہ نسب ازبر کر دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرہ نسب بلی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جدِ اعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بلی کی قامت نسب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے، سوا اُستالیس فٹ لمبی ہے! گوئدہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گوئدوی کے غوغائے شاعری نے گوئدہ کی بلیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لکھ کہو، اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گوئدے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلیاں تھیں۔ اصغر گوئدوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گناہ بلی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھٹا چھوڑو تو بے روک، سیدھا نیچے جھن سے آکے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اسیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود مشکل سے چرتے تھے۔ کبھی قبلہ کوئے میں پڑے ہوئے گرم و سرد سیلاب پوشیدہ seasoned تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک ”دانہ“ آپ کے approval کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی برمی ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! بچہ ہے۔ بہت سے بہت اسی سال۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان ارادوی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سیزنڈ۔ سیکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی کے یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگر مجھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (اٹھکی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آرہی ہے، اس پر۔ مگر مجھ جس لکڑی پہ موت دے اس کو حشر تک نہ دیک لگ سکتی ہے، نہ آگ! اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لئے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچھ بیٹھے ”کیا مگر مجھے بجلی کے کھمبے کے بجائے درخت پر.....“ وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تک کر بولے ”جی نہیں! مگر مجھ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے مین کے کھلاس سے پانی پی کے، سڑک پر ٹھل ٹھل کے استنجا نکھاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق چڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے ”تحت طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی گلوئی تھی۔ شیشم کے گن مہاک اور قدردان تو قبر میں جاسوئے۔ مگر کیا بات

ہے شیشم کی اجتناء استعمال کروا تے ہی جو ہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا، اسی پر دادامیاں کی ولادت ہوئی تھی۔“ اپنے حسن تولد و توار کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لئے باعث سعادت و افتخار سمجھتے تھے۔ حاجی محمد اسحاق بولے ”یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی۔“ قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹٹکنی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ”یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی ٹٹیا، بالی غمرا اور چکی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیر واتی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ کہ آرا، رندہ، برماسب گھنڈے (گنڈ) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیڑ تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر ے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیڑ سے بن مہکار کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیڑ کی کٹائی ہونے والی ہو، اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔“

قبلہ کاموڈبلا توحاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے، یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے، مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا ”سیزنڈ! کتنے فاقوں میں سیکھا ہے یہ لفظ؟ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسلِ میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیسا ہے اس نے! لاؤں؟ اسی پہ لٹال دوں گا۔“

سائی کے ساتھ عزتِ سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کاری کی کے ہر اصول کی اول تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن بزنس میں انہوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کئے تھے۔ ماکھک سے جب تک یہ نہ کہلوالیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جائیے۔ گھر کی بات ہے۔“ ماکھک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر، ہاتھ پھیلا کر یہ عانہ طلب کرتے۔ سستا سماں تھا۔ وہ دوٹی یا چوٹی کی سائی پیش کرتا جو اس سووے کے لئے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو)۔ وہ بچارا شرماء حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی کھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لئے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹانہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے، مبادا سودا بیٹنے سے پہلے ہی ماکھک

بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے ”مبارک ہو! سودا پکا ہو گیا“۔ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہٹکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے ”عجب گھن چکر ہو۔ سائی دے کے پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کے سودا پکا گیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو کہو“ قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں مکاپک دُبدھا میں پڑ جائے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں زیادہ نقصان ہے یا اس بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دورانِ حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھ پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مٹھی کبھی بند نہیں کرتے تھے تاکہ بے آبرو ہوتے ہوئے مکاپک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سر پھرے مکاپک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤں لٹاکر زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تاکہ اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیا ناچاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی بقول ان کے ”تمہیں باغ بہشت میں شاخِ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہوگی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا“۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر ”اوپنچی دکان، صحیح مال، غلط دام“ پر سختی سے کاربند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور ”ہیرڈز“ کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے! ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

۲

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول۔ بے روزگاری۔ بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھجوا لائے تھے۔ ”ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو مکالم کا ہے۔“ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں“ جن دھڑوں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں

کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوتِ استحقاق دکھاتے: ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“
 واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہویا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا
 وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیڈٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبییاں، کبھی ڈربے، کبھی کالک کہتے۔
 لیکن جب تین مہینے جو تیاں چٹھانے کے باوجود ایک کالک میں بھی سرچھپانے کو جگہ نہ ملی تو
 آنکھیں کھلیں۔ اجاب نے سمجھایا ”فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے۔ کسٹوڈین کی ہتھیلی پر
 پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو۔“ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی
 تھے، وہ کہاں ماستے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال
 سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد
 کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔

”اب کیا ہوئے گا؟“

انسان جب کسی گمخدا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک
 ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی
 اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن
 اب؟ صبح سرجھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے
 کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز
 سے بنوائے، اس لئے کہ اس کے بنائے ہوئے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے
 اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں
 ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمہیانی والوں کی نیند
 خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ملل کے کُرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چُنٹیں بھٹنے
 کے بعد آستینیں اٹکیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں
 گیا، لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر
 لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں ”اب کیا ہوئے گا؟“ ہو گا کہ
 بجائے ہوئے گا ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری

سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسا۔۔۔۔۔ سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور ٹکھنت سے ”دیکھتے ہیں“ کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

یہ زور دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

ہر دُکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیمبا کی چھاؤں تلے بُدھ بھی ایک دُکھ بھری تپتیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی، تو گو تم بُدھ پر بھی ایک بھید کھلتا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دُکھ بھوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو کھلی کھلی خاک پھانکنے اور دُختر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلبِ حمید پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لئے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لکام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھالے۔ بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، آخری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی تھے اور صراحی کے سبز کیر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علیگڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا القاکے بعد برنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کافلیٹ اپنے لئے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیک تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آباد کاری بلامنت سرکار کر لی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر ”کسٹوڈین متروکہ املاک“ کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالمِ جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکٹھا لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا ”آپ شاعر کب سے ہو گئے؟“ فرمایا ”میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا۔ نہ ڈگری، قُربتی ہوتے دیکھی!“

فلپٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھنٹنار فوکر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا، آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہد سے کی چپڑاس ان کے منہ پر اٹھا کے دے ماری: ”افسر، محکمہ کسٹوڈین، ایویکوی پراپرٹی“ پھر ڈپٹ کر کہا ”بڑے میاں! فلپٹ کا الٹ منٹ آرڈر دکھاؤ“ قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“ اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا ”بڑے میاں! سنا نہیں؟ الٹ منٹ آرڈر دکھاؤ“۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شامی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے ”یہ ہے یاروں کا الٹ منٹ آرڈر! کاربن کا پی بھی ملاحظہ فرمائیے کا؟“ اس نے اب تک، یعنی تادم تذلیل، رشوت ہی رشوت کھائی تھی، جو تے نہیں کھائے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور اور ویٹیلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آٹھکا کھاتے، رجسٹریشن، روکڑہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے ”مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جو تیاں چٹھاتا، دفعوں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیتا کون ہو! اب دل لگی دیکھئے، کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مارخان دندناتا آیا۔ لٹھ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھادی ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں“ چند را کر پوچھنے لگا ”یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا ”ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں۔“

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلپٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آکر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیا یا نٹی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے ”یہ

چھوڑ کر آئے ہیں۔“

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موٹا منظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعفِ بصارت کو قبلہ اپنے زورِ بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔ نہ ہوا اگر یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گنوار و گھروند معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ منظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی دسپچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی دسپچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دسپچہ ہو گا جس میں جڑے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جو توں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھتہ تھا جس پر سرِ دست ایک چیل قبولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلامی آنکھیں مند نے لگتیں تو وقفے وقفے سے منقری کلاب پاشوں سے حضار محفل پر عرق کلاب مقطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ ”جتے پھول غلیچے پہ تھے وتے ہی باہر غلیچے میں تھے“۔ یہاں اطالوی منحل کے کار چوبی زیر انداز پر لنگا جمنی منقش اکالہ ان رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی کلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو ہلوریں گلے میں اترتی پڑھتی صاف منظر آتی، جیسے تھرما میٹر میں پارا۔

وہ ازدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم تصور کے رہین منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں باز لٹپینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے منظر آرہے تھے۔ ان پر Moorish arches کی تہمت تھی۔ چراغ رکھنے

کا ایک آلا (طاقہ) ایسے آرٹسٹک زاویے سے ڈھاتا تھا کہ پریمالی آرچ کے آثار دکھلائی پڑتے تھے۔ فوٹو میں، اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑوچی نظر آرہی تھی جس کا شاہ جہانی ڈیزائن ان کے جد نے آب دارخانہ خاص سے بدست خود پڑایا تھا۔ شاہ جہانی ہویا نہ ہو، اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں، لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رُلے پھرتے تھے۔ شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اوتھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا، Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملے میں دبے ہونے کے باعث، اس کے گرنے کے لئے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ نشینی (سیڑھی) اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے کھڑا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا Grand staircase ہوا کرتا تھا۔ اُس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمکاؤںس بھی نہیں لٹک سکتی تھیں، قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشاندہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے، جن کی چمچی روشنی میں وہ کھٹکھالی خجریاں بچتیں جو کبھی دو کوہان والے بانجری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رینگ کنٹری کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھرائی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا کھمسان کا ازدحام ہو کا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرا ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

وہ ترا کوٹھے پہ تنگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھورے پر ایک کالا مرغا گردن پُھلائے اذان دے رہا تھا، وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے پتھروں کے جوڑوں اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کر باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ یہاں آبِ مصفا سے لبریز سنگِ سرخ کا بہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف

میاں اس میں پایو نیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے کہتے قبلہ جوش بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھینچی تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بد ذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشان دہی کی جس کا جی ماندہ تھا۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے، لیکن ہم سمجھ گئے کہ اس مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کھانے کو بھی چاہ رہا ہو گا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مٹی جون کی ٹیک دو پہر یا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کو ٹھوس تنگے پیر ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا، اب تک (مع ڈائلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لئے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی، جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر تنگے پیر ہو اور زیور حیا اتارنے کے لئے اساولی بھی ہو، تب بھی یہ کر تب ممکن نہیں، تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولت بھی نہ ہو جائے۔

پلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتار پلکھن * اداس کھڑی تھی۔ اس کا ٹخم ان کے جد اعلیٰ سمنہ سیاہ زانو پر سواں کارچوبی کام کے پُغے میں چھپا کر قوط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق، ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ ”بے سرو سامانی کے عالم میں یہ تنگِ خلائی، تنگِ اسلاف، تنگِ وطن ——— تنگے سر، تنگے پیر، گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر، تنگی تلوار ہاتھ میں لئے ——— خیبر کے سنگلاخ تنگے پہاڑوں کو پھلانگتا، وارد ہندوستان ہوا۔“ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لئے گھوڑے کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائداد، محل سرا، خدام، مال و متاع ———

* پلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا، وہ اس کی تصویر قراۃ العین حیدر کے ”کار جہاں دراز ہے“ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے پاس جتنے لغات ہیں ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ تذکرہ و تانیث کا بھی علم نہیں۔ لیکن جس پیار اور لک سے اس کا ذکر کیا گیا اس پر ہم نے قیاس کیا کہ مؤنث ہی ہو گا۔

سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاثہ البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرہ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطن مالوف سے میزار تھا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ میٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسر کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادارہ روزگار تھا، اور اُن کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ میٹھا اونگھ رہا تھا۔ قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر کھجوا یا تھا جہاں ان کی نال گڑی تھی۔ فرماتے تھے، اگر کسی تخمِ ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پُرکھوں کی پڈیاں کہاں دفن ہیں، تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال، پُرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر، غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں، جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماوراء النہری اور خیر کے اُس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لئے اپنا (فرضی) استاد ملا عبد الصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عُسرت سے تنگ آکر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دستِ افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول، ایک دوسرے کی دائرِ حسی پر ہاتھ پھیر کے استغفر اللہ! استغفر اللہ! کہتے۔ تازہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جانوں ہو گئے

پھر یہی پیارے لوگ بتدریج

پہلے خاں، پھر خانِ خاں، پھر خانِ خاں ہو گئے!

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ پچپن میں دائیں

رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی ٹکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ فرماتے تھے، جس سال میرے یہ اورنگ زہبی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی جس بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زیرِ عشق سے مار ڈالا۔ مگر خود اسی، گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ بُرے بُرے پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دسے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر ادھاسانس کسی طور نہیں سما رہا! اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض، قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی۔ یونانی بتاتے تھے۔

۳

”مردہ“ از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے۔ پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جائنسل تھا۔ دوسرا غم دراصل استا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھیں۔ اس غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکیے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چُھپ چُھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے:

مردہ از غیب بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ پچا جس کے سرھانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پُھوٹ پُھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہل قبر کے پسماندہ گمان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اُس زمانے کے اہل القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں، کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانتے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے جس کا اس دھوم سے عرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہوں کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا

جائے گا۔ بعد نماز مغرب لشکر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں ”شریف“ پر تاکید آ استازور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی، لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پڑا ہے، ہم بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحب مزار کے۔

خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولادِ مرید کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے رٹھی، موتی چور کے لٹو اور کچوری لاکر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیازہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انہیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے۔ البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر حاضری پر قدغن بڑھا۔ بیوی بہت روئیں دھوئیں تو قبلہ کچھ کھیلے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی، مگر اس شرط پر کہ مزار کامکین ”ذات کا کبہ نہ ہو۔ کبہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ وہ مُردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں۔“ ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور تھیل کی طرف سے کبہ تھے۔ اکثر فرماتے ”مرگ کبہ جسنے دارد۔“

کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آ گیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انہیں اس حد تک صبر آ گیا کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا۔ اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا۔ اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی جہمیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی، ضرورتِ رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبولِ صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے۔ ہمیں آتشِ نرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں، لیکن و شوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتشِ نرود میں بے خطر کودنے سے

کہیں زیادہ خطرناک کام فرود کے شجرہ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپھا، چچا اور اللہ جالے کیا کیا لگتے تھے۔ دکان اور مکان، دونوں اعتبار سے، پڑوسی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھینچنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے، لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہوگی۔ بشارت نے ریل کی پٹری سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کی شرط خود اس لئے لگا دی کہ عین وقت پر اٹھ کر جھاک نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہیں گھنٹی ڈالو۔

قبلہ ”مُذْمُغ“ بد لحاظ، منہ پھٹ مشہور ہی نہیں، تھے بھی۔ وہ دل سے ——— بلکہ بے دلی سے بھی ——— کسی کی عزت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً اگر کسی کی عمران سے ایک مہینہ بھی کم ہو تو اسے لونڈا کہتے اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑھٹو!

بوسہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی۔ اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان، بقول ان کے، فُفْشُ فُفْشُ تھا۔ فُفْشُ فُفْشُ اتنے زور، فُز اور وُثوق سے کہتے تھے گویا اپنی کانٹا تول نصفا نصف نالاشقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلنے۔ روحوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوال کرتے کہ زندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پُر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب و تعزیرات ہند خالی چھوڑ دیے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا ”ٹھیکا“ لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی جگ کامنی شرکی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں، اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی ماتہ۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گدوالیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اردو مثنوی زمانے میں فیل پامیں مبتلا تھی۔ اس میں کچھ افادہ ہوا تو معجون فلک سپر کھا کر ٹیکوری ادب پاروں کے اڑن غالیچے پر سوار ہو گئی۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا:

”انجم آرا کی حُسن آفرینیوں، سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے مشام جان معطر تھا۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرط حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دُزدیدہ دُزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آرا کے دستِ حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساقِ بلوریں کو دیکھا اور ٹکناڑ سے لبوں پر۔۔۔ چار نقطے ثبت کر دیے۔“ اس زمانے میں لفظ ”بوسہ“ فحش سمجھا جاتا تھا۔ لہذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے۔ بشارت گن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جن کی اجازت اُس وقت کے حالات، حیایا ہیروئن نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپتا تھا۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا، وہاں مولوی عبدالحق نے برہنائے تہذیب اس کے بجائے یعنی ب و س ہ چھاپ کر اُلٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ فرما دیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیبِ لبیب کی طرزِ نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں۔ ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فُولس کیپ، کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندرناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیداؤش اس طرح بتاتے ہیں:

”یہ غریب الدیارِ عہد، ناآشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پروردہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیِ عدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہمم۔“

اب لوگ اس طرح نہیں کہتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی فحالت، طوالت و اذیت تو آج کل سیزہِ بدن پیداؤش میں بھی نہیں ہوتی۔ *

* اسی طرح نو طرزِ مریض کا ایک جملہ ملاحظہ فرمائیے:

”جب ماہِ تابِ عمر میرے کاہرِ رجب چہارہ سالگی کے پہنچا، روزِ روشنِ ابتہاج اس تیرہ بخت کا تاریک ترشبِ یلہ سے ہوا، یعنی بیمانہ عروند کافی مار و پدِ بزرگوارِ حظوظِ نفسانی سے لبریز ہو کے اسی سال دستِ قضا سے دہلا۔“ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب میں چودہ برس کا ہوا تو ماں باپ فوت ہو گئے۔ لیکن پیرایہ ایسا گنجلک اختیار کیا کہ والدین کے ساتھ مطلب بھی فوت ہو گیا۔

مرزا عبد اللہ وودیک نے ایسے pompous style کے لئے سبکِ ہندی کی طرز پر ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے: طرزِ اسطو خودوس۔ اس پر راقم الحروف کا نوٹ ”دحیرج لنج کا پہلا یادگار مشاعرہ“ کے باب پنجم میں ملاحظہ فرمائیے۔ ویسے اس کے لغوی معنی ہیں: نزلے اور پاگل پن کی ایک دوا جسے الطبّاء دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں۔

کوہِ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سُبھانی صبح بشارت نے بقلمِ خودِ رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوا دیا، حالانکہ مکتوبِ الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے، لیکن اس رقعے کے لئے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا۔ لہذا صرف القاب و آداب زعفران سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے زینڈ کے موٹے نب سے لکھا۔ جن حصوں پر بطورِ خاص توجہ دلائی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ مدعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامد تھا۔ قبلہ کے حسنِ اخلاق، شفقت، خوش خوئی، خوش معاملگی، صلہ رحمی، نرم گفتاری، مردانہ وجاہت ——— مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی نام بنام ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھل کر نا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسنِ سیرت اور دشمنوں کی حرمزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہ بھی نہیں کہا تھا۔ دودفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کئے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبینہ اوصافِ حمیدہ پر دل ہی دل میں اترا یا کئے۔ مگلیشیئر تھا کہ پکھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے، منشی جی سے گویا ہوئے، بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کرے تک سارے حروف تہجی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عیدِ مکہ میں غازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جراتِ رندانہ کی کہانی جس نے سنی شہرِ رد گیا۔ خیال تھا کہ کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ قبلہ نے اگر ازراہِ ترجمہ سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کر لیا۔

راون کیوں مارا گیا؟

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کر دیں۔ کوئی کھاہک اشارۃً یا کنایۃً بھی ان کی کسی بات یا بھاد پر شک کرے تو پھر اس کی عزت ہی نہیں، ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ عجلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹتے ہی دس روپے بتادی۔ دیہاتی کھاہک نے پونے دس روپے لکائے اور یہ کالی دیتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرأت کیسے ہوئی۔ دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی، جس کے بانوں کو چڑا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سلفے کے دم لکاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹی محال کر اپنے دشمن یعنی کھاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکار تے ہوئے فرماتے ”عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس میں فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور لاٹھی چلانا، قصابی، کنجڑوں، غنڈوں اور پولیس کا کام ہے۔“ استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونجھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ چارپائی تک جانے اور سیروا ہٹانے کے وقفے میں اگر غصے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہو جائے۔ اور اگر ان کے معتبوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بھل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوٹ ہے کہ لڑائی کے جو ۳۷ سینترے ڈانٹوں نے گنوائے ہیں، ان میں جو سینتر اسب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو! اس کی تصدیق ہندو دیومالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سراور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لئے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خوشیاں تاکہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچالے۔ فرماتے تھے، آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکانی کرنے سے پہلے میں نے اسے کالی دے کر خبردار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پشہ سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی

جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

انسانی کردار میں پتھر کی صفات پیدا کر کے استغفر کرتے ہم نے انہی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے

مجموعہ بعنوان ”خطبات چاکو“ کی آؤٹ لائن بنائی۔ ”مشرقی شعور و روایت میں پُشتہ کامقام: تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے“ اور ”موازنہ پُشتہ و شاہین“ ہمارے قارئین ماشاء اللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ہوں لائقِ تعزیر پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی بینیت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کارہنے والا، نہایت خود سر، ہتھ پُٹھت، بد معاملہ اور بد زبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہو گا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا۔ پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مہاکب قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ ”مہاراج! مہاراج!“ پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر مہاکب کو چُھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ کالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چارپائی سے پٹنی نکالی اور تنکے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ مہاکب نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کارروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹری میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جالیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹنی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹری پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلتیاسی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے multiple فریکچر میں گنگرین ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسہ کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کر دیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سے دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فرد جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گر فنتار کر کے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا ”اب کیا ہوئے گا؟“ کندھے اُچکاتے ہوئے بولے ”دیکھیں گے۔“ عدالت مجسٹریٹی میں میج بچاؤ کرنے والے مہاکب کا دانت اور آلہ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹنی کے بطور exhibits پیش

ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہو گیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مچٹیوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور مانتے لگے۔

ان کی طرف سے، یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق سیرسٹر مصطفیٰ رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ میں حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ سیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹری پر گرنے سے آئی ہے، نہ کہ ملزم کی مبتدئہ ضرب سے۔ اُدھر قبلہ کمرۂ عدالت میں فلمی سیرسٹروں کی طرح ٹھل ٹھل کر اور کٹھڑے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لئے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شان سپہ گری اور شیوہ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سرپاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجیے۔ ہوں لائقِ تعزیر یہ الزام غلط ہے۔

ایام اسیری اور جُوں کا ”بلڈ ٹیسٹ“

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا پھٹتا۔ اعزہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آگئی۔ پولیس انہیں ہتھکڑی پہنائے سارے شہر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں ”بھینا! کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟“ عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجیے۔ اپنے کان ہی پور کے * مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے

* کان ہی پور کے: کانپور والے اکثر ”کانپور ہی کے“ کہنے کے بجائے ”کان ہی پور کے“ کہتے ہیں!

بڑی حقارت سے جواب دیا ”لاحول ولا قوۃ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہو گا غم روزگار نہ سکا۔“

میووی نے کئی مرتبہ پُچھوایا ”آپ کیا ہوئے گا؟“
ہر بار ایک ہی جواب ملا ”دیکھ لیں گے۔“

طیش کے عالم میں جوابات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے، اس پر انہیں کبھی نادام ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کر ثوت یعنی اصل کردار پر پریشیمان یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کے مننے سے جوئیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جاسکتا ہے۔ جوں اور دیکھ مارنے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جوں کے پیٹ سے کالا گہرا اعتابی خون نکلے تو فوراً جاری دوا ”اکسیر جالینوس“ مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجیے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھئے جب تک کہ جوں کے پیٹ سے صاف شدہ سُرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگل کے اس طرف سے اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ بر خور دار! زندگی کا بھروسہ انہیں۔ دنیا، اس جیل سمیت، سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لئے روئی اخباروں کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر آئن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ آئن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوٹوں کی ایسی ٹھکانی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پُرزد بھتیجے کو تھما دیا، جس کے حاشیے پر ان چچہ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے، جن کو پُٹوانے کا انہوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک باسانی سفارش پہنچائی جاسکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے، شوق کی مثنوی، سگرٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آرہی ہے۔ رورو کر آنکھیں سُجالی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھڈر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا، مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹو گرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کے لے آنا۔ کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کے کمرے کی چق ہے، اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بٹو کی تصاپ لکاتے اور تھری ناٹ تھری رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔ عید کا خیال کر کے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منہ تک لانے کے بعد کہا، ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو، کم از کم چھ انچ کے پتھل والا، ڈبل روٹی یا عید کی سوئیوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم، بھئی میں Pentangular* شروع ہونے والا ہے۔ کسی ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو واللہ! ہر روز روزِ عید ہو، ہر شب شبِ برات! خصوصاً وزیر علی کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔

سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید با مشقت۔ فیصلہ سنا۔ سرائٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں ”تو دیکھ رہا ہے! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ How's that? پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جدِ اعلیٰ کی روح پُر فتوح کتنی مسرور ہوگی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا ڈولہا (جی) ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرامزادے کی ٹھکائی کر کے مردوں کا زیور پہنے، جیل جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا، یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے بیچھوایا، اب کیا ہوئے گا؟
جواب ملا، دیکھا جائے گا۔

ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چُپ

* Pentangular: بیٹی میں سالانہ کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا، جس میں ہندو، مسلم، پارسی، لہنگوانڈین اور یورپین میمیں حصہ لیتی تھیں۔

چُپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی سڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بند درخت سے زمین پر گر پڑے، پھر بھی بند رہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح AAuuuuuu! چنکاٹاتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائنتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیے۔ دوسرے دن دکان کھولی۔ کیبن کے باہر ایک بلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھائی سے بنا کر لٹکادی۔ صبح وشام اس کو رسی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھانڈیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم بار کھی تھی انہیں یاد دہانی کے دھکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سز یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے ”تنگ اسلاف“ لکھا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔ اتفاق تو درکنار، مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ تنگ اسلاف کے بجائے ”سز یافتہ“ اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی برائے میں قطعیت کے علاوہ فقطیت بھی پیدا ہو گئی۔ ان کا فرمایا ہوا مستند تو پہلے ہی تھا، اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مخمل کی راسپوری ٹوپی اور زیادہ تر چھپی ہو گئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب کبھی بیوی گھبرا کے ”اب کیا ہوئے ماہ؟“ کہتیں تو وہ ”دیکھتے ہیں“ کے بجائے ”دیکھ لیں گے“ اور ”دیکھتی جاؤ“ کہنے لگے۔ رہائی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی کپتے دار مونچھوں میں شامل کر لئے جواب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر انہیں اٹھاتے، تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے ”یہیں تیسری سیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت یار خاں۔ غبن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کاٹ رہا ہے۔ باشقت۔ پہلے شعلہ، اب حنہس تختص کرتا ہے۔ بلا کا بیارگو۔ چکی پیتے میں اپنی ہی تازہ غزل کا تارہ بتاتا ہے۔ موٹا پیستا ہے اور پٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ ترس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ مائلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا

کھائی - خود کو روپیلا بتاتا ہے - ہو گا - لگتا نہیں - قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے - اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں - جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا - زنداں کہتا ہے - اور خود کو قیدی کے بجائے اسیر! ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیز مصر نہیں کہتا - اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی، مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں - شاید وہ سمجھتا ہے کہ استقراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے، بدبو جاتی رہتی ہے - ٹھیک ہی سمجھتا ہے - کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال پیٹھے میں ہوا تھا - ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کے تھوڑا ہی آیا ہوں - شیر کو پنجرے میں قید کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے - گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو، اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا - اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھنٹا (گھنٹوں تک نیک) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو جائے - بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پٹھا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنتِ یوسفی سمجھتے ہیں - ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی - کوئے پر کتنے ہی صدے گزر جائیں، کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے پروبال کالے ہی رہتے ہیں - اکل کھرے، کھرے، کھرے کھرے کھرے یا کھوٹے، وہ جیسے کچھ بھی تھے، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا -

تن أبرا (أجلا) من كادلا (گدلا) بکلا جیسے بھیس

ایسے سے کا کا بھلے، باہر بھیترا ایک

فرماتے تھے، الحمد للہ! میں مُناقق، ریاکار نہیں - میں نے کناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔

دکان دو سال سے بند پڑی تھی - چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا:

”اب کیا ہوئے گا؟“

”بیوی، ذرا تم دیکھتی جاؤ۔“

”لبِ معشوق“

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی - دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کیمین میں اسی ٹھسے سے کاؤتلیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے - مگر زاویہ پسر گیا تھا - پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا - جیل میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے قبلہ کاہک کو ہاتھ کے مُتجیمانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے - اب صرف انگشتِ شہادت

کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ اٹھکی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقے کی نئے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقہ اب پیتے کم، گڑ گڑاتے زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھٹا اس طرح چھوڑتے کہ کاکہ کی ناک میں تھک کی طرح لٹک جاتا۔ اکثر فرماتے ”واجد علی شاہ، جان عالم پیانے، جو خوبصورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، حقے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا۔۔۔ لب معشوق! جو شخص کبھی حقے کے پاس سے بھی گزرا ہے، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیسا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہو گا۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقہ اپنے ہمراہ مٹیابرج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے۔ اس لئے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گڑ گڑایا نہیں جا سکتا۔

”بتلی پہ لٹکا دوں گا“

منشی دیانرائن نلم کے رسالے ”زمانہ“ کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر اٹالے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا:

عرفی تو میندیش زغوغائے رقییاں

آوازِ سکاں کم نہ کند رزقِ گدا را *

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کی بو آتی ہے۔ کتنے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا:

آوازِ گدا کم نہ کند رزقِ سکاں را (+)

کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھکی دینے لگے کہ سالے کو بتلی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس کاکہ کی طرف بھاگ اٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں بلاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پریوں ہی کوئی راہ گیر منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے اٹھکی سے اندر آنے کا

* مطلب یہ کہ عرفی تو رقییوں کے شور و غوغا کرنے سے اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ کتنوں کے بھونکنے سے گدا کار رزق کم نہیں ہوتا۔

(+) گدا کی صدا سے کتنوں کا رزق کم نہیں ہوتا۔

اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا، اس کا مالک اور منیم اسے کھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روبانسا ہو کر کہا کہ میں تو مول گنج پتنگوں کے بیچ دیکھنے جا رہا تھا!

۵

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یہ کایک ان کا روبر ٹھپ ہو گیا۔ وہ کفر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنیتے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ مہاکوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ لکڑ منڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز واقارب، جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوج کے کراچی سدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ”بے نامی“ سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر ”اپنی بلا سے بوم بے یا ہمارے“ والی صورت حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پیرہنیوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پُر کھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر اُن کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تولی مارکٹ میں ہر چند رائے روڈ پر لکھن کوں دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پرانے منگے پر نیام نہ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ آئے کو تو وہ ایک نئی سرسبز سرزمین میں آ گئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پلکھن تو درکنار، انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتاتے تھے وہ دراصل بجائیں تھی جس کی ’نبولی‘ کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم، پیش اور بوا سیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

کہاں کانپور کے دیہاتی مہاک، کہاں کراچی کے غریب ساگوان خریدنے والے۔ درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب وجوار میں، یعنی اپنے سایہ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ بے وجہ بے خطر مالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے ”یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے۔ ایک دیدہ دہن بڑھئی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا، اے! پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا، حضرت عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا، کیا کُفر بکتا ہے؟ ابھی بتلی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا، اوہ لوک وی ابھی کہیندے ساں! (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے!)

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مُسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا:

”حضرت! یہ مجھ میں یا مگر مجھ سے؟ کراچی کا مجھ ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد امرتا ہے۔ نرود مردود کی موت ناک میں مجھ گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مجھروں کا شجرہ نسب کئی نرودوں کے واسطے سے اسی مجھ سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلارہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چیر اسی کو پٹے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھٹا اور لفظ ہوتا رہتا ہے۔ ٹوکو تو کہتے ہیں، اردو میں اس صورتحال کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے! اردو میں یہ صورت حال بھی تو نہیں ہے۔ بھٹی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ کاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لئے بات نہ کی کہ ”زبانِ غیر سے اپنی زبان بگڑتی ہے۔“ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھاننا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لئے جاتے۔ اماں! ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے ’صاحب‘ لگا دیں تو مراد نواب صاحب السبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری کاٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دودن لاہور کا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوٹلوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے! اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ کمانے والے کو مگلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے

لگے ہیں۔ میاں! ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکو کار اور بد کار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

”میں نے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کو آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں!) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کافد تک کے پھول منظر نہ آئے۔ کاپتور میں ہم جیسے شرفاء کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی میل ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا! یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے! حد ہو گئی، کراچی میں لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ لکڑی اس طرح پھوٹا رہا ہے گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور بُرادہ خریدنے والے پچاس! میں نے برسوں اُپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن بُرادے کی انٹیکٹیٹی پر جو کھانا کپکے کا وہ صرف دوزخی مُردوں کے چالیسویں کے لئے مناسب ہے۔

”بھرپائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر سبھی کچھ تو نہیں۔ زکو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم۔ مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہوگی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کافی کھتری لکڑی نہیں بیچی۔ نہ فروختی، نہ سوختی۔ بڑھئی کی یہ مجال کہ چھاتی پہ چڑھ کے کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیٹے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کاپتور! بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا! اپنی جُروا کو دین مہر میں دے دینا! واللہ! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازارِ حسن نیپیئر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زادیاں اپنے اپنے درشن درپچوں میں لال بٹیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوتی کہ اوچھے کے گھر تیتیر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سرو کار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مُجرے کے لئے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے! رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا۔ نقد عیش عند الطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہُنڈیوں کا کیا کام۔“

مرزا عبد الودود بیگ اس صورتِ حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC (نوا بکشن سرٹیفکٹ) اس لئے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جارہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا

ایک دن قبلہ فرمانے لگے ”ابھی کچھ دن ہوئے۔ کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں! اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے! ایک زمانہ تھا کہ شرفاپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لئے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوس پر بھیجتے تھے۔“

اس باب میں بھی مرزا مؤظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوس پر تو اس لئے بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں!

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ مجھ سمجھا کہ بار بار کہتے ”اماں! یہ شہر ہے یا جہنم؟“ مرزا کسی دانا کے قول میں تصرف بجا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دارالحسن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدا خواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف منظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا!

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ ”تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔“ ارشاد فرمایا ”سنو! میں نے ایک زمانے میں پی ڈیلیو ڈی کے کام بھی کئے ہیں، مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔“

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ، تلک اور چمب پچھنوانے سے پہلے وہ جس آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اترایا کئے، اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتداد زمانہ سے *** distorting mirror** بن چکا تھا جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔ ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں ہڑا دکھ ہوا:

* ہم نے کہیں اور اس کا ترجمہ ”مستائینہ“ کیا ہے۔ یعنی وہ آئینہ جس کا کام ہی شکل کو مسح کرنا اور مضحکہ خیز بنانا ہے۔

نہ پوچھ حال مرا، چوبِ خشکِ صحرا ہوں

لکھا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لئے کہا، آپ کو چوبِ خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں بہشتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلافِ معمول مسکرائے۔ جب سے ڈیخرز ٹوٹے، منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے۔ ”ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ احوال ہوا کہ

”منفعل“ ہو گئے قویٰ غالب

اب عناصر میں ”ابتدال“ کہاں

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا ”برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹہن میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا منظر آتا ہے۔“

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتیٰ الامکان اپنے غصے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے، میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے رُوٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سُکھتے رہتے:

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

میں ہی اگنی، میں ہی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اُداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بُزدلی کی بات ہے۔ بُزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماں کی زندگی نے ماضی میں اپنی پنائیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دُھندلاتے سپیارینگ کی تصویریں چشمِ تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی: دُحسپ میں ابرق کے ذروں سے چمکتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نر مہکار۔ بھیڑ کے نوازیدہ بچے گوگلے میں مظفر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سبالی میں ساون کے تھو تھو بادلوں کو رہ کر تکتی نر آس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑا توں میں

ٹھہرتے نگیدڑوں کی منحوس آواز نس - چراغ جلے باڑے میں لوٹتی کایوں کے گلے میں بچتی ہوئی گھنٹیاں - کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی گستی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش - موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی گولامہکار - ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی ہوئی اگر بتی کابل کھاتا دھواں - دیکتی بالوئیں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ سے پھرکتے ہوئے تھنے - میونسپلٹی کی مٹی کے تیل کی لالٹین کا بھبکا - یہ تھی ان کے کاؤں کی ست سنگند - یہ ان کے اپنے نافذ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی -

اولتی کی ٹپاٹپ

ستر سالہ بچے کے ذہن میں تصویریں گڈھ ہونے لگتیں - خوشبوئیں ، نرمابھیں اور آواز نس بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں - اسے اپنے کاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی - ٹین کی چھت پر تڑتڑ بچتے ہوئے تاشے - سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کا شور - پکے فرش پر جہاں اٹکل بھرپانی کھڑا ہو جاتا ، وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اُچھل پڑتا - تپتی کھیریلوں پر اُڑتی بدلی کے جھالے کی سنسناہٹ - گرمی دانوں سے اُپرے بالک بدن پر برکھاک پہلی پھوار ، جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا ہو - جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا تنگ سر آنگن میں آکر آسمان کی طرف دیکھنا - پھبک اٹھنے کے لئے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادل کی ہراول گرم لپٹ - ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بچتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے - سوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹی میں پڑی ہوئی دراڑوں کے لوزاتی جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے - تھوئی سے لٹکی ہوئی لالٹین کے سامنے ، تاجہ روشنی ، موتیوں کی رم جھم جھالر ، ہمک ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پر نالے - آموں کے پتوں پر جمیرے بجاتی نرسل بوچھاڑ - اور جھولوں پر پینگلیں لیتی دوشیرائیں -

اور پھر رات کے سنائے میں ، پانی تھمنے کے بعد ، سوتے جاگتے میں ، اولتی *

ٹپاٹپ!

* اولتی: چھپنا یا کھپیل کا نچلا کر اناجہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا رہتا ہے -

اولتی کی ٹپائپ تک پہنچتے پہنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔ بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور اور تھمیا مگلی کی ایسی دکھا سکتے تھے کہ عمر رفتہ کی ساری ٹپائپ بھول جاتے۔ پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسی طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کر سکتے تھے۔ دسہری۔ لنگڑا۔ ثمر بہشت۔ انور رٹول۔ لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں۔

چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش، ہم تن گوش، بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپائپ سنتے رہتے۔

قبلہ کاریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے، دریا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سیکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیا گرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے۔ یا یوں کہیے کہ تمام عمر نیچے اترنے والے ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو کالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ”مشتاق میاں! یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تیز۔ نہ خوردی کے آداب۔ نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ۔ میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا، ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک دردِ سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے لے جاتے اور چارج ہونے کے لئے آرا مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی تھی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنے لگتیں اور میں اٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پیچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی، بے کاٹھ بلی کا ڈکریسٹل لٹکا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ اُلجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی، ایریل خراب ہو جاتا۔ ارے صاحب، ایریل کیا تھا، پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا۔ اس پر یہ کٹی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑپھڑاتی رہتیں جیسے سرک کے کنارے کسی نوفوتیدہ پیر کے مزار پر جھنڈیاں۔ پیچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا، نہ پوچھئے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا۔ بہر حال جب برنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے

لکا تو سوچا، وہاں تو بجلی ہے۔ چلو ریڈیو سیتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آ گئے تھے۔ کہتے تھے، اس سے تو پتنگوں کی پھر پھر ٹاپٹاپ براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دُور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پنکا ہو گیا۔ علی الصبح وہ منقرض لے آیا اور میں نے ریڈیو بس کے حوالے کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے پچانک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اور اس کے میل جیسی گردن والے دو بیٹے کُدال پھاؤڑا لئے مزے سے ایریل کی بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھئے! کہتے ہیں، بڑے میاں، بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ ہماری ہے۔

”ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے۔ بلی سے کیا تعلق؟“

”تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلی کے بغیر بچا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی accessory ہے۔“

”نہ ہوا کانپور۔ سالے کی زبان گڈی سے کھینچ لیتا۔ اور ان حرامی پلوں کی میل جیسی

گردن ایک ہی وار میں بھٹاسی اڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ، بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثنا میں وہ نابکار بلی اکھاڑ کے زمین پہ لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آئی کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ ہندو ق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اور کمینے کے منہ کیا لگنا۔ اس کی بے قصور بیوی راند ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا تو میں نے کہا، جا، جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بلی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ، یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔“

قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلی اٹھا کر لے گئے۔

۶

معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے ان کو اشارتاً بھی ذکر کرتے نہیں سنا۔ ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چو نچلے سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت، نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال

بعد ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں، شادی غمی میں شرکت، سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکھ کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹے بے چٹنا ہو۔ یا جمعہ کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ سال گزرتے چلے گئے۔ وقت نے سر پر کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے کالے جادے۔ مگر ان کی توجہ اور پیار میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سُبھاؤ کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں۔ مگر انہوں نے اس معذوری بنی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلپٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصطفیٰ پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انہوں نے چالیس برس تک کی وہی ان کی عبادت و ریاضت، وہی ان کا ورد و وظیفہ اور وہی ان کی دُعاؤں نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشش ہار ہے۔ شاید یہی ان کا وسیلہ بخشائش بن جائے۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ خود کہا، کسی رائٹ بیوہ سے شادی کر لو۔ بولے، ہاں! بھاگوان! کہہ سگے۔ کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری برات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا سہاگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمین اوڑھ کے ہم بھی۔

بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو بات کا رخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری امیجری، لکڑی، حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے، بیوی! یہ رائٹ بیوہ کی قید تم نے کیا سوچ کے لٹائی؟ مانا کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں، زن بیوہ ممکن اگر چہ خور است۔ مگر تم نے شاید وہ پُوربی مثل نہیں سنی: پہلے پیوے بھکوا۔ پھر بیوے نگوا۔ پیچھے پیوے چلم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ دراصل وہ تو چلم سُلاکانے اور تاؤ پر لانے میں ہی بُھار ہوتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حقے میں آتا ہے۔ اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلتے ہوئے تمباکو سے خالی

بھک بھک کرتا ہے ۔

جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی ، مگر قبلہ بالکل نہیں چلے ۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو ان کا چلتا ۔ حوادث کو روکا نہیں جاسکتا ۔ ہاں ، تہذیب و اس سے حوادث کا زور توڑا جاسکتا ہے ۔ شخصیت میں پہنچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی متکلیف دیتے ہیں ۔ لیکن جب وہ ٹکنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے ۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی ، وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی ۔ یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا ۔ کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھاکٹے یہاں شیر بنے دندنا تے پھرتے ہیں ۔ اور اچھے اچھے شرفا ہیں کہ گیدڑ کی طرح دم کٹوا کے بٹھ میں جا بیٹھے ۔ ایسا بھوک پڑا کہ

خود بخود ”پل“ میں ہے ہر شخص سما یا جاتا

جو دانا میں وہ اپنی دُمیں چھپائے پلوں میں گھسے بیٹھے ہیں ۔ باہر ٹکنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا:

انیس ”دم“ کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جو کھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آ سکتا ۔ حالات بدل گئے ہیں ۔ آپ بھی خود کو بدلیے ۔ مسکرائے ۔ فرمایا، خربوزہ خود کو گول کر لے تب بھی تر بوز نہیں بن سکتا ۔

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رخ پہچانتے کی صلاحیت ، حلم و بردباری ، نرمی اور چمک نہ ان کی سرشت میں تھی ، اور نہ زمیندارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خوبیوں میں ہوتا تھا ۔ سختی ، خود رائی ، تکنت ، خشونت اور جلالی مزاج عیب نہیں ، بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصور کیے جاتے تھے ۔ اور زمیندار تو ایک طرف رہے ، اس زمانے کے علما تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے ۔

ہم نہ نکلتے ہیں ، نہ مکل ہیں، جو مہکتے جاوےں
اُگ کی طرح جدھر جاوےں دہکتے جاوےں

قبلہ کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو ان کے بھی خواہ میاں انعام الہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف ان کے مزاج اور معاملات میں درخور رکھتے تھے، عرض کیا کہ دکان ختم کر کے ایک بس خرید لیجیے۔ گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے۔ روٹ پر مٹ میرا ذمہ۔ آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے۔ ایک بارگی جلال آگیا۔ فرمایا، چاندی تو قبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے۔ ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آرہی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا مقدر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے۔ بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم
کونین بھی گو دے ہے، نہیں لیتے ہم
ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ
جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

آخری کالی

کاروبار مند ابکہ بالکل ٹھنڈا۔ طبیعت رنگ رنگ۔ بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔ دکانداری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زمین مکمل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے، لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انہوں نے ایک ساٹھ سالہ منشی آدھی تنخواہ پر رکھا تھا، جو گیر وے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا جبہ پہنے، تنگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔ وارثی سلسلے کے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس، ایمان دار، پابندِ صوم و صلوٰۃ، زودرنج، کام میں چوپٹ۔ قبلہ نے طیش میں آکر ایک دن اسے حرا خور کہہ دیا۔ سفید داڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسان سے کہا ”بچا! حضور کے ہاں جو شے وافر ملتی ہے وہی تو فقیر کھائے گا۔ سلام علیکم۔“ یہ جاوہ جا۔ دوسرے دن سے منشی جی نے نوکری پر آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بہتیرے لفظ ہیں۔ زمین مکمل خان کو سخت سست کہتے کہتے ان کے منہ سے روانی اور سرکرائی میں وہی کالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا کرتی تھی۔ کالی کی بھیانک گونج درہ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زمین مکمل کی بیوہ ماں رہتی

تھی ۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے میو کی کچا در اوڑھی تھی ۔ بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ماں! میں اور بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھینجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ کالی نہیں دی تھی ۔ جوان خون ، غصیلہ مزاج ۔ پٹھان کی غیرت اور پختہ کا سوال تھا۔ زمین محل خان نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ”بڈھے! میرے سامنے سے ہٹ جا ، نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کے کلیجہ کچا جھاڑوں گا ۔ تیرا پلید مردہ بٹلی پہ لٹکا دوں گا“۔

ایک ماہک نے بڑھ کر چاقو چھینا ۔ بڈھے نے جھک کر زمین سے اپنی نمٹلی ٹوپی اٹھائی اور گرد جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی ۔

کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا ، اب ہم دکان نہیں جائیں گے ۔ کچھ دیر بعد محلے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی ۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے ۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے ، اس لئے کہ انہیں دوسو توں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ و تر بھی ادھر سے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں ۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے ۔ اوریوں ٹوٹتا ہے! اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنیوں بیگانوں سے ، حدیہ کہ اپنے سب سے بڑے دشمن سے بھی صلح کر لیتا ہے ۔ یعنی اپنے آپ سے ۔ اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے ۔ دانش و بینش کے باب کھلتے ہیں ۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے نیچ

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشار زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے علی کے حصارِ عافیت میں قید رکھتے ہیں ۔ یہ بھاری اور قیمتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیر لیر ہو جاتے ہیں ۔ کچھ کم صم کبھیر لوگ اس دیوار کی مانند تڑختے ہیں جس کی مہین سی دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے باسانی چھپ جاتی ہے ، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نیواں در ہی اندر کسی صدمے سے

زمین میں دھنس رہی ہے۔ بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں کہ مسالے سے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں مگر بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے، برتن بعد میں۔ اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چمکو لوگ ایسے اٹوٹ ماڈے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ کم کی طرح کتنا ہی چباؤ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ کھینچنے سے کھینچتے ہیں، چھوڑے سے جاتے ہیں ٹکڑ۔ آپ انہیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں کہ چھٹائے سے نہیں چھوٹتے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو دانتوں تلے ہی بھلے تھے کہ پیپل تو لیتے تھے۔ یہ چیونگ کم لوگ خود آدمی نہیں، پر آدم شناس ہیں۔ یہ کامیاب و کامران و کامکار لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے انسان کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہو گئے۔ وقت کی اٹھتی موج نے اپنے جباب کا تاج ان کے سر پہ رکھا اور ساعت گزراں نے اپنے تخت رواں پہ بٹھایا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈ اسکیمین کی مانند ہوتے ہیں۔ ثابت و سالم ہیں تو سینہ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کر لو۔ اور بیکایک ٹوٹے تو ایسے ٹوٹے کہ نہ بال پڑا، نہ درکے، نہ تڑنے۔ یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ نہ عارف رہا، نہ دو عالم کی جلوہ گری، نہ آئینے کا پتہ کہ کہاں تھا، کہہ گیا۔ نہ حذر رہا نہ خطر رہا، جوہری تو بے خبری رہی۔

اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹتی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال، یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لٹکائے وہ کھڑے تھے کہ رُوحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استاد رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بے رُوح کھڑے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبہ سے کاروبارِ سلطنت حسبِ معمول سابق چلتا رہا۔ اُدھر عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن وہ پٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسدِ خاکی فرشِ زمین پر آ رہا۔ اس وقت ان کی امت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔

سو وہ دیک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بل قبلہ نے بے غل و غش زندگی گزاری آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ طنطنہ اور ہمہ سرنگوں ہوا۔

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھٹی نہ راکھ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ٹبر مارکٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا

کانپتا آیا اور خبر دی کہ ”صاحب جی! آپ کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آگئے تھے۔ سارا مال کوئلہ ہو گیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے۔“ وہ جس وقت دکان پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا، جس میں فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لئے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی لپ لپاتی دو شاخہ زبانیں کالی ہو چلی تھیں۔ البتہ چیرے کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ ہوا، کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ گودام کی انشورنس پالیسی لے لو، تو انہوں نے ملل کے کرتے کی چٹنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا ”یہ نہری یاروں کی انشورنس پالیسی!“ پھر اپنے ڈمٹر پھلکا لالہ رمیش چندر سے کہا ”ذرا اچھو کر دیکھو۔“ لالہ جی نے اچنبھے سے کہا ”لو ہا ہے! لو ہا!“ بولے ”نہیں۔ فولاد کہو۔“

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لب بے سوال پر کوئی لرزش۔ انہوں نے اپنے دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چیرے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا کچھاندر آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ، دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر، دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر گھر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا، اب کیا ہوئے گا؟

انہوں نے سر جھکا لیا۔

اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انہیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہوگی اور کاسنی بادل، تو وہ باپ بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے:

”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“

اسکول ماسٹر کا خواب

۱

فیوڈل فینٹسی

ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹھ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے، وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ بلاشرکتِ غیرے۔ بالکل نجی، بالکل انوکھا۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔ جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ہے ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا، نہ ہو گا۔ اس کے برعکس، ٹھاٹھ باٹ کا بلو پرنٹ ہمیشہ دوسروں سے پُرایا ہوا ہوتا ہے۔ بشارت کے ذہن میں عیش و تنعم کا جو صد رنگ و ہزار پتہوند نقشہ تھا وہ بڑی بوڑھیوں کی اس رنکار رنگ رلی * کی مانند تھا جو وہ مختلف رنگ کی کتروں کو جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔ اس میں اُس وقت کا جاگیردارانہ طنطنہ اور ٹھاٹھ، بگڑے رئیسوں کا تیہا اور ٹھٹھا، مڈل کلاس دکھاوا، قصبائی اتروناہن، ملازمت پیدہ شفاست، سادہ دلی اور نمدیدہ پن۔۔۔ سب بُری طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ انہی کا بیان ہے کہ بچپن میں میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ تختی پھینک پھانک، قاعدہ پھاڑ پھوڑ کر مداری بن جاؤں۔ شہر شہر ڈگڈگی بجاتا، بندر، بھاؤ، جمہور انجاتا اور ”بچہ لوگ“ سے تالی بجواتا پھروں۔ جب ذرا عقل آئی، مطلب یہ کہ بد اور بدتر کی تمیز پیدا ہوئی تو مداری کی جگہ اسکول ماسٹر بننے لے لی۔ اور جب موضعِ دھیرج گنج میں سچ مچ ماسٹر بن گیا تو میرے نزدیک انتہائے عیاشی یہ تھی کہ مکھن زمین کی پتلون، دو گھوڑا بوسکی کی قیض، ڈبل کفوں میں سونے کے چھٹانک چھٹانک بھر کے بٹن، نیا سولاہیٹ جس پر میل خور اغلاف نہ چڑھا ہو اور پیٹنٹ لیدر کے پپ شوز پہن کر اسکول جاؤں اور لڑکوں کو صرف اپنی غزلیات پڑھاؤں۔ سفید سلک کی اپکن جس میں بدری کے کام والے بٹن نر خرے تک لگے ہوں۔ جیب میں گنگا جمنی کام کی پانوں کی ڈبیا۔ سر پر سفید کُخواب کی رامپوری ٹوپی۔ ترچھی، مگر ذرا شریفانہ

زاویے سے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ نرے شریف ہی ہو کے رہ جائیں۔ چھوٹی بوٹی کی چکن کا سفید کرتا جو موسم کی رعایت سے عطر چٹایا خس میں بسا ہو۔ چوڑی دار پاجامے میں خوب رو ووشیزہ کے ہاتھ کا بنا ہوا سفید ریشمی ازار بند۔ سفید نری کا سلیم شاہی جوتا۔ پیروں پر ڈالنے کے لیے اٹالین کبیل جو فٹن میں جتے ہوئے سفید گھوڑے کی دم اور دُور مار بول و براز سے پاجامے کو محفوظ رکھے۔ فٹن کے پچھلے پائیدان پر ”ہٹو! پچو!“ کرتا اور اس پر لگنے کی کوشش کرنے والے بچوں کو چابک مارتا ہوا سائیس، جس کی کمر پر زردوزی کے کام کی پیٹی اور ٹخنے سے گھٹنے تک خالی نمہ کی نواری پٹیاں بندھی ہوں۔ بچہ اب سیانا ہو گیا تھا۔ بچپن رخصت ہو گیا، پر بچپنا نہیں گیا۔

بچہ اپنے کھیل میں جیسی سنجیدگی اور ہمہ تن محویت اور خود فراموشی دکھاتا ہے، بڑوں کے کسی مشن اور مہم میں اس کا عشرِ عشر بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ کھلونا ٹوٹنے پر بچے نے روتے روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھل جھل کرنے لگی تھی۔ پھر وہ سبکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔ وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جاو کے زور سے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو وہ بخونچنا رہ جائے گا کہ اس کے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اس طرح جی جان سے روتا ہے۔ یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ ہاں، عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔ کچھ کھلونے پر موٹ ہو کر دیوتا بن جاتے ہیں اور کچھ دیویاں دل سے اُترنے کے بعد گودڑ بھری گڑیاں نکلتی ہیں۔ پھر ایک ابھان گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔ اُس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

آج ان طفلانہ متناؤں پر خود ان کو ہنسی آتی ہے۔ مگر یہ اس وقت کی حقیقت تھی۔ بچے کے لیے اس کے کھلونے سے زیادہ ٹھوس اور اصل حقیقت ساری کائنات میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب خواب۔۔۔ خواہ وہ خواب نیم شبی ہو یا خواب بیداری۔۔۔ دیکھا جا رہا ہوتا ہے تو وہی اور صرف وہی اس لمحے کی واحد حاضر و موجود حقیقت ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹا کھلونا، یہ آنسوؤں میں بھیگی پتنگ اور انجھی ہوئی دُور جس پر ابھی اتنی مار کٹائی ہوئی، یہ جلتا بجھتا جنگجو، یہ تنہا و غبارہ جو اگلے لمحے ربر کے کھلے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا، میری ہتھیلی پہ سرسراہی یہ مٹھلی بیر ہوئی، آواز کی رفتار سے بھی تیز چلنے والی یہ ماچس کی ڈبیوں کی ریل گاڑی، یہ صابن کا بلبلا جس میں میرا

سانس تھرا رہا ہے، دھنک پر یہ پریوں کا رتھ جسے ستیلیاں کھینچ رہی ہیں۔۔۔ اس پل، اس آن بس یہی اور صرف یہی حقیقت ہے۔

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

کچھ قوس قزح سے رنگ لیا، کچھ نور چرایا تاروں سے

یہ قصہ کھلونا ٹوٹنے سے پہلے کا ہے۔

وہ اس زمانے میں نئے نئے اسکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور سیاہ فٹن ان کی تمنائوں کی معراج تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس یونی فارم یعنی سفید اچکن، سفید جوتے، سفید کرتے پاجامے اور سفید ازار بند وغیرہ کی کھکھیڑ فقط خود کو سفید گھوڑے سے بیچ کرنے کے لیے تھی، ورنہ اس بطنیا بھیس پر کوئی بطنی ہی فریفتہ ہو سکتی تھی۔ انہیں چوڑی دار سے بھی سخت چڑ تھی۔ صرف خوہرو دوشیزہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے سفید ازار بند کو استعمال کرنے کی خاطر یہ ستار کا غلاف ٹانگوں پر چڑھانا پڑا۔ اس ہوائی قلعے کی ہر اینٹ فیوڈل کار سے بنی تھی جو یورٹو خوابوں سے گندھاتا تھا۔ استباہی نہیں کہ ہر اینٹ کا سائز اور رنگ مختلف تھا، ہر ایک پر ان کی اُبھرواں شبیہ بھی بنی تھی۔ کچھ اینٹیں گول بھی تھیں! باریک سے باریک جزئیات، یہاں تک کہ اس حد ادب کا بھی تعین کر دیا تھا کہ ان کے حضور سفید گھوڑے کی دُم کتنی ڈگری کے زاویے تک اٹھ سکتی ہے۔ اور ان کی سواری بادِ بہاری کے ”زوٹ“ پر کس کس جھروکے کی چق کے پیچھے کس کلائی میں کس رنگ کی چوڑیاں چھنک رہی ہیں۔ کس کی ہتھیلی پر ان کا نام (مع بی اسے کی ڈگری) مہندی سے لکھا ہے۔ اور کس کس کی سرمگیں آنکھیں چلن سے لگی راہ تک رہی ہیں اور تیلیوں کو بار بار انگلیوں سے چوڑا کر کر کے دیکھ رہی ہیں کہ کب انقلابی شہزادہ یہ دعوت دیتا ہوا آتا ہے کہ

تم پرچم لہراناسا تھی، میں بربط پر ہماؤں کا

یہاں استاعرض کرتا چلوں کہ اس سے زیادہ محفوظ تقسیم کار اور کیا ہوگی کہ کھمسان کے رن میں پرچم تو محبوب اٹھائے اٹھائے گھٹا مرنے پھرے اور خود شاعر دور کسی مرمر میں مینار میں بیٹھا ایک متروک اور دقیانوسی ساز پر ویسا ہی کلام یعنی خود اپنا کلام کا رہا ہو۔ نثر میں اسی سیمپوایشن کو دوسرے کو سولی پر چڑھ جانے کی تلقین اور رام بھلی کرنے والی کہاوت میں ذرا زیادہ پھوہڑا ایمان داری سے بیان کیا گیا ہے۔ لیجیے، مطلع میں ہی سخن گستر ادب بات آپڑی۔ ورنہ کہنا صرف استا تھا کہ مزے کی بات یہ تھی کہ اس سوتے جاگتے خواب کے دوران، بشارت نے خود کو اسکول ماسٹر ہی

کے ”رول“ میں دیکھا۔ منصب بدلنے کی خواب میں بھی جرأت نہ ہوئی۔ شاید اس لئے بھی کہ فٹن اور ریشمی ازاربند سے صرف اسکول ماسٹروں پر ہی رعب پڑ سکتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے یہ چیزیں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انہیں اپنی پیٹھ پر بیس برس بعد بھی اس آتشیں لکیر کی جلن محسوس ہوتی تھی جو چابک لگنے سے اس وقت اُپڑی تھی جب محلے کے لوندوں کے ساتھ شور مچاتے، چابک کھاتے وہ ایک رئیس کی سفید گھوڑے والی فٹن کا پیچھا کر رہے تھے۔

چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر

شعر و شاعری چھوڑ کر اسکول ماسٹری اختیار کی۔ اسکول ماسٹری کو دھتکتا بتا کر دکانداری کی۔ اور آخر کار دکان بیچ کھوچ کر کراچی آ گئے، جہاں ہر چند رائے روڈ پر دوبارہ عمارتی لکڑی کا کاروبار شروع کیا۔ نیا ملک۔ بدلا بدلا سا رہن سہن۔ ایک نئی اور مصروف دنیا میں قدم رکھا۔ مگر اس سفید گھوڑے اور فٹن والی فینٹسی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خواب نیم روز (day-dreaming) اور فینٹسی سے دوہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اول، جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔

Heart-breaker, dream-maker, thank you for the dream!

اور اس کھونٹ نکل جائے جہاں سے کوئی نہیں لوٹا۔ یعنی گھر، ہستی کی طرف۔ لیکن بشارت کو اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ بھرا پُر اگھر اوانے پونے بیچ کر اپنے حسابوں لٹے پٹے آئے تھے۔ پاکستان میں ایک دو سال میں ہی اللہ نے ایسا فضل کیا کہ کانپور تیج معلوم ہوئے لگا۔ سارے ارمان پورے ہو گئے۔ مطلب یہ کہ گھراشیا لٹے غیر ضروری سے اثاث بھر گیا۔ بس ایک کی تھی:

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے گھوڑے کے سوا!!

اب وہ چاہتے تو نئی نہ سہی، سیکنڈ ہینڈ کار باسانی خرید سکتے تھے۔ جتنی رقم میں آج کل چار ٹائر آتے ہیں، اس سے کم میں اس زمانے میں کار مل جاتی تھی۔ لیکن کار میں انہیں وہ رئیسانہ ٹھاٹ اور زمیندارانہ ٹھٹھا نظر نہیں آتا تھا جو فٹن اور بچھی میں ہوتا ہے۔ گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

گھوڑے کے ساتھ شجاعت بھی گئی

مرزا عبد الودود بیگ کہتے ہیں کہ آدمی جب بالکل جذباتی ہو جائے تو اس سے کوئی عقل کی

بات کہنا ایسا ہی ہے جیسے بگولے میں بیج بونا۔ چنانچہ بشارت کو اس شوقِ فضول سے باز رکھنے کے بجائے انہوں نے اُلٹا خوب چڑھایا۔ ایک دن آگ کو پٹرول سے بجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب سے گھوڑا رخصت ہوا، دنیا سے شجاعت و سرفروشی، جاں بازی اور دلاوری کی ریت بھی اٹھ گئی۔ جانوروں میں کتنا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور پکے رفیق ہیں جنہوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ کتنا تو خیر اپنے کتے پن کی وجہ سے چمٹا رہا، لیکن انسان نے گھوڑے کے ساتھ بے وفائی کی۔ گھوڑے کے جانے سے انسانی تہذیب کا ایک سا وقتی باب ختم ہوتا ہے۔ وہ باب جب سورما اپنے دشمن کو لٹکار کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے لڑتے تھے۔ موت ایک نیزے کی دوری پر ہوتی تھی اور یہ نیزہ دونوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ موت کا ذائقہ اجنبی سہی، لیکن مرنے والا اور مارنے والا دونوں ایک دوسرے کا چہرہ پہچان سکتے تھے۔ غافل سوتے ہوئے، بے چہرہ شہروں پر مشروم بادل کی اوٹ سے آگ اور اسٹمی موت نہیں برستی تھی۔ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہو جاتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو۔ بہادر گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ دل دھک دھک کرتے اور دھرتی تھراتی تھی۔ پیچھے دوڑتے ہوئے بگولے، سُموں سے اڑتی چنگاریاں، نیزوں کی آبی پر کرن کرن بکھرتے سورج اور سانسوں کی پانپتی آندھیاں کوسوں دور سے شہ سواروں کی یلغار کا اعلان کر دیتی تھیں۔ گھوڑوں کے ایک ساتھ دوڑنے کی آواز سے آج بھی لہو میں ہزاروں سال پرانی وحشتوں کے الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں۔

لیکن مرزا! ذرا ٹھہرو۔ اپنے توجہ کو خطابت کو لگام دو۔ یہ کس گھوڑے کا ذکر کر رہے ہو؟
تائنگے کے گھوڑے کا؟

مُل جی کے گھوڑے

لیکن یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر طالع آزمائی، ملک گیری، شجاعت اور ”شور لری“ کے عہد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ”گھوڑے کی کاٹھی ہی ہمارا راج سنگھاسن ہے۔۔۔“ مائیکو اڑوں کو اپنے قدیم شاہی ”ماٹو“ پر بڑا ناز تھا۔ یورپ کو تاخت و تاراج کرنے والے ہن شہ سواروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی گھوڑے سے نہیں اترتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہی سوتے، سستاتے، کھاتے، شراب نوشی اور خرید و فروخت کرتے۔۔۔ یہاں تک کہ حوائجِ ضروری سے فارغ ہوتے۔ اٹکلینڈ میں اسٹب نامی ایک آرٹسٹ گزرا ہے جو صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے پسینٹ کرتا تھا۔ یورپ میں گھوڑوں، کتوں اور رائٹلی کی حد تک ولدیت اور شجرہ نسب اب بھی تھوڑے بہت معنی رکھتے ہیں۔ گھوڑے کو برہنہ ماڈلوں پر ترجیح دینے کی وجہ

ہیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے دم نہیں ہوتی۔ اس میں یہ عافیت بھی تھی کہ گھوڑا کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ تصویر اصل کے مطابق نہ ہو۔ بہتر ہو۔ ہم پاکستان کے ممتاز اور نامور آرٹسٹ گل جی کے گیارہ سال دیوارینچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انہیں بہت قریب سے پینٹ کرتے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو، اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پینٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انہیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب سے خود ہم نے اس کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بدگمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

انہیں بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں بنا کے لاکھوں کماتے ہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ کسی نے (ہم نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے باسانی آسکتے ہیں۔ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اس کے بعد وہ کینوس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا کہ جتنے پیار تفصیل وار موشاری اور انسپریشن سے وہ گھوڑے کی دم بناتے ہیں، اس کا سواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں، سوار کی بھی ساری پر سنلٹی کچھ کر دم میں آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک بال پر مالکانہ شفقت سے ہاتھ پھیر پھیر کے دم بنائی ہے۔ چنانچہ ہر دم منفرد، الیسی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھیے تو وہ فقط دم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقی ماندہ گھوڑا انہیں فقط دم کو اٹکانے کے لیے طوعاً و کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوبصورت بنانی مقصود ہوتی تو اس کے بالوں کی پونی ٹیل بطور خاص ایسی بناتے تھے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو ہو جائے۔

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط دم

یوں بنانے کو تو انہوں نے البیلے اونٹ بھی بکثرت بنائے ہیں اور اُلٹے بانس بریلی بھیجے ہیں۔ یعنی درجنوں کے حساب سے عرب مالک کو روغنی اونٹ ایکسپورٹ کیے ہیں۔ ان کے بعض اونٹ تو اتنے مہنگے ہیں کہ صرف بینک، شیوخ، غیر ملکی سفارت کار اور مقامی اسمگلر ہی خرید سکتے ہیں۔ یونائیٹڈ بینک نے ان سے جو نایاب اونٹ خریدے وہ اتنے بڑے تھے کہ ان کے ٹانگے کے لیے بال کے بیچوں بیچ ایک دیوار علیحدہ سے بنوانی پڑی لیکن انہیں دیکھ کر شیوخ اتنے

خوش ہوئے کہ بعض نے اصل یعنی بالکل انہی جیسے اونٹوں کی فرمائش کر دی۔ اب بینک اس شخصے میں پڑ گیا کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں ہے

پروڈالر ڈپازٹ کے لالچ میں بینک کو ان سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے والے اونٹ تلاش کر کے چارے سمیت ایکسپورٹ کرنے پڑے۔ جب ہم یونائیٹڈ بینک سے متعلق وٹمنسک ہوئے تو ایک دن ہمت کر کے محل جی سے کہا کہ حضور! اگر آپ آئندہ ایسے اونٹ بنائیں جو اس عالم آب و ہل میں آسانی دستیاب ہو جایا کر س تو بینک کو شیوخ کی فرمائش پوری کرنے میں آسانی رہے گی۔ نوکری کا سوال ہے۔ اور ہاں! ان پر کبھی کسی بے پردہ خوبصورت عورت کو سوار نہ دکھائیں۔ محل جی بلا کے ذہین، زود رنج اور حاضر جواب آرٹسٹ ٹھہرے۔ بہت منقص ہوئے۔ پھر کچھ خیال آیا تو سنبھل کر انگریزی میں بولے ”بابا! ہم سیدھے سادے اسماعیلی آغا خانی مزدور! تابعدار! مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں آئل پینٹ کو بد چلن اونٹنی کے دودھ میں میکس کر کے کنواری گھوڑی کی دُم کے بالوں کے برش سے اونٹ بناؤں۔ لاکٹ اور قیمت دگنی ہو جائے گی۔ سوچ لیجیے۔ (اردو میں) صاحب! آپ فقیروں سے مسخری کرتے ہیں! پکاسو کہتا ہے کہ پینٹنگ اندھوں کا پیشہ ہے آرٹسٹ وہ پینٹ نہیں کرتا جو وہ دیکھتا ہے، بلکہ جو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔“ ہم نے ان کے طنز کا برا نہیں مانا۔ اول تو

مرد و نادار پر کلام گرم و گنجلک بے اثر

دوسرے، ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ تین چار سو سال پرانی راجپوت پینٹنگز میں جو شوخ اور نایاب ہلدی سے بھی پیلارنگ نظر آتا ہے، وہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ پہلے کانے کو مسلسل کئی دن آم کے پتے کھلاتے۔ پھر اس کے پیشاب سے یہ پیلارنگ بناتے تھے۔ یہی رنگ پکے ہوئے رس بھرے آموں، بسنتی چولیوں اور راجاؤں کی پُر غرور پگڑیوں میں بھرتے تھے۔

بہر کیف، محل جی کے اونٹ میں وہ گھوڑے والی بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ کہاں گھوڑے کی تباہ زانو گھنیری چنور شاہی دُم، کہاں اونٹ کی پونچھڑی! دُم نہیں دُم کا ٹوٹا کہیے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس سے تو ڈھنگ سے شتر پوشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ہر جانور کی دُم کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً لنگور کی دُم درختوں سے لٹکنے اور گردے رائے ہوئے پھل اور مادہ پر کند ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آقا کے سامنے بے اختیار ہلنے والی کتے کی دم پچھلے جنم میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتنا اس کام کے لیے اپنی زبان استعمال نہیں کرتا۔ شتر مرغ کی دُم

مغربی خواتین کے سر کی زینت کے لئے بنی ہے۔ بعضے جانور کو دم محض اس لیے دی گئی ہے کہ دکھیا کے پاس دبا کر بھاگنے کے لیے کچھ تو ہو۔ دانا اس رمز کو جانتے ہیں کہ بعض اوقات غریب کو مونچھ صرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقت ضرورت نیچی کر کے جان کی امان پائے۔ مور کی دم شہریوں کو ناچ دکھانے کے لیے نہیں، بلکہ جنگل میں مورنی کو رجھانے اور پیروں کے مزاروں پر جاروب کشی کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ لالچ نہ ہوتا تو ذرا سے بچنے پر استاجھاڑ جھنکاڑ کا ہے کہ اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ ذرا ایک لحظہ کے لیے آنکھ بند کر کے غور فرمائیے، مور کو اگر شیو کر دیا جائے تو بالکل الو معلوم ہو گا۔

افضل ترمین دم

لیکن اونٹ کی دم سے مادہ کو رجھانا تو درکنار، کسی بھی معقول یا نامعقول جذبے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو تو ٹھیک سے لٹکنا بھی نہیں آتا۔ سچ پوچھیے تو دم تو بس مور، برڈ آف پیراڈائزر اور کسینو کی Bunnies کی ہوتی ہے۔ آخر الذکر ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی، اور اس کا مقصد آدمی کے اندر سوئے ہوئے اور ہارنے والے خرگوش کو گدگد کر جکانا ہے۔ برڈ آف پیراڈائزر چکور کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن نر کی دم، خدا جھوٹ نہ بلوائے، پندرہ پندرہ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اگر بہت سے نراونچے اونچے درختوں پر اپنی متعلقہ دمیں لٹکائے اسید وار کرم بیٹھے ہوں تو مادہ ان کی شوہرانہ اہلیت جاپننے کے لیے وہی پیمانہ استعمال کرتی ہے جس سے اگلے زمانے میں علما و فضلا کا علم ناپا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ فقط معلقات یعنی داڑھی، شملہ اور دم کی لمبائی پر فیصلے کا انحصار۔ جس کی دم سب سے لمبی ہو، مادہ اسی کے پرلے سرے پر لگی ہوئی مٹی سی چونچ میں اپنی چونچ ڈال دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بامقصد دم بچھو کی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر پکلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بچھو کا زہر ٹنک میں رہتا ہے اور پائل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ لگتے لگتے یوں ہی خیال آیا کہ ہم بچھو ہوتے تو کس کس کو کاٹتے۔ اپنے ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زندگی تو اس مشن کے لیے بالکل نامکافی ہوتی۔ لیکن یہاں تک نوبت ہی نہ آتی، اس لیے کہ ہمارے معنویین کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ رہی سانپ کی دم، تو وہ ہمیں پسند تو نہیں، fascinate (لبھاتی) ضرور کرتی ہے۔ اس میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جو ہماری پیشانی میں ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پھن کو چھوڑ کر ہمیں تو سارا سانپ دم ہی دم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ و افضل وہ دم

قرار پائے گی جو جھڑپکی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا درجہ ملا ہے۔

ہماری سواری: کیلے کا چھلکا

فٹن اور گھوڑے سے بشارت کی شیفٹنگی کا ذکر کرتے کرتے ہم کہاں آ گئے۔ مرشدی و آقائی مرزا عبدالودود بیگ نے ایک دفعہ بڑے تجربے کی بات کہی۔ فرمایا ”جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر رُکنے، بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیئے اور پھسلنے کو انجوائے کرنا چاہیئے۔ بقول تمہارے استاد ذوق کے، تم بھی چلے چلو یہ جہاں تک چلی چلے۔ کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رک جائے گا۔“ ”Just relax“، لہذا قدم ہی نہیں، قلم یا کچھ تصور بھی پھسل جائے تو ہم اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ صاف صاف کیوں نہ اقرار کر لیں کہ زندگی کے طویل سفر میں کیلے کا چھلکا ہی ہماری واحد سواری رہا ہے۔ یہ جو کبھی بھی ہماری چال میں جوانوں کی سی تیزی اور صحت مند چلت پھرت آ جاتی ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے۔ ایک دفعہ ریٹ جائیں تو پھر یہ قلم چال جو بھی کنوئس جھکوائے اور جن گلیوں گلیاروں میں لے جائے وہاں بے ارادہ لیکن بر غبت جاتے ہیں۔ قلم کو روکنے تھامنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے۔ اور جب پیروں کی پوٹ پھٹ کر کاغذ پر بکھر جاتی ہے تو ہماری مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جس کی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی جیب کے تمام رازوں کو کوئی اچانک نکال کر سب کے سامنے میز پر نمائش نکا دے۔ زیادہ خفت بڑوں کو ہوتی ہے کہ انہیں اپنا بھولا بسرا پچپن اور اپنی موجودہ میز کی دراندس یاد آ جاتی ہیں۔ جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نصیب نہیں ہوگی۔

ریس کو رس سے تانگے تک

جیسے جیسے بزنس میں منافع بڑھتا گیا، فٹن کی خواہش بھی شدید تر ہوتی گئی۔ بشارت ہمینوں گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں۔ اور بادشاہ رچرڈ سوم کی طرح وہ ہر چیز گھوڑے کی خاطر تاج دینے کے لیے تیار ہیں:

“A horse! a horse! my kingdom for a horse!”

ان کے پڑوسی چوہدری کرم الہی نے مشورہ دیا کہ ضلع سرگودھا کے پولیس اسٹڈ فارم سے رجوع

کیجیے۔ وہاں پولیس کی نگرانی میں ’تخارو بریڈ‘ اور اعلیٰ ذات کے گھوڑوں سے افزائش نسل کروائی جاتی ہے۔ گھوڑے کا باپ خالص اور اسیل ہو تو بیٹا لامحالہ اسی پر پڑے گا۔ مثل ہے کہ باپ پر پُوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر بشارت کہنے لگے کہ ”میرا دل نہیں ٹھکتا۔ بات یہ ہے کہ جس گھوڑے کی پیدائش میں پولیس کا محل دخل ہو، وہ خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ گھوڑا پولیس پر پڑے گا۔“

گھوڑے کے بارے میں یہ گفتگو سن کر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے۔ بی ٹی نے وہ مشہور شعر پڑھا اور حسب معمول بے محل پڑھا، جس میں دیدہ وری کی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نرگس ہزاروں سال روتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی دانائی کی بات کہنے کے لیے اگر بیچ میں بولیں تو بے وقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بے وقوف لگتے ہیں۔ گویا

گویم مہمل و گرنہ گویم مہمل

پروفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ ادھیچ میں اٹک جاتی ہے۔

خدا خدا کر کے ایک گھوڑا پسند آیا جو ایک اسٹیل ری رولنگ مل کے سیٹھ کا تھا۔ تین چار دفعہ اسے دیکھنے گئے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ مطمئن لوٹے۔ اس کا سفید رنگ ایسا بھایا کہ اٹھتے بیٹھتے اسی کے چرچے، اسی کے قصیدے۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا ”بیچ کھیاں ہے؟“ حقارت آمیز انداز سے ہنسے۔ فرمایا ”بیچ کھیاں تو بھینس بھی ہو سکتی ہے۔ فقط چہرہ اور ہاتھ پیر سفید ہونے سے گھوڑے کی ذم میں سُرخاب کا پر نہیں لگ جاتا۔ گھوڑا وہ جو آٹھوں کانٹھہ کمیت ہو۔ چاروں ٹخنوں اور چاروں گھٹنوں کے جوڑ مضبوط ہونے چاہئیں۔ یہ بھاڑے کاٹھو نہیں، ریس کا خاندانی گھوڑا ہے۔“ یہ گھوڑا ان کے اعصاب پر اس بری طرح سوار تھا کہ اب اسے ان پر سے کوئی گھوڑی ہی اتار سکتی تھی۔ سیٹھ نے انہیں ایسوسی ایٹڈ پرنٹرز میں طبع شدہ کراچی ریس کلب کا وہ کتابچہ بھی دکھایا جو اس ریس سے متعلق تھا جس میں اس گھوڑے نے حصہ لیا اور اول آیا تھا۔

اس میں اس کی تصویر اور تمام کوائف مع شجرہ نسب درج تھے۔ نام White Rose ولد Wild Oats ولد Old Devil۔ جب سے یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیکھا، انہوں نے اپنے ذاتی بزرگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے دادا نے بیٹی میں تین ریسیں

جیتیں۔ چوتھی میں دوڑتے ہوئے ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی دادی بڑی نرچک تھی۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی ولایتی گھوڑوں سے اس کا تعلق رہ چکا تھا۔ اس کے دامن عصمت سے تمسک و تنوع کی بدولت چھ فرسہ اولادیں ہوئیں۔ ہر ایک اپنے متعلقہ باپ پر پڑی۔ سیٹھ سے پہلے وہاٹ روز ایک بگڑے رئیس کی ملکیت تھا جو ہاتھ آئی لینڈ میں ایک کوٹھی ”ونڈر لینڈ“ نام کی اپنی ایٹکوانڈ، بن بیوی ایلس کے لیے بنوا رہا تھا۔ ری رولنگ میل سے جو سریا وہ خرید کر لے گیا تھا اس کی رقم کئی مہینے سے اس کے نام کھڑی تھی۔ ریس اور سٹے میں دوالاتھنے کے سبب ونڈر لینڈ کی تعمیر رگ گئی اور ایلس اسے حیرت زدہ چھوڑ کر ملتان کے ایک زمیندار کے ساتھ یورپ کی سیر کو چلی گئی۔ سیٹھ کو ایک دن جیسے ہی یہ خبر ملی کہ ایک قرض خواہ اپنے واجبات کے عوض پلاٹ پر پڑی ہوئی سینٹ کی بوریاں اور سریا اٹھوا کے لے گیا، اس نے اپنے منبر کو پانچ لٹھ بند چوکیداروں کی منفردی ساتھ لے کر ہاتھ آئی لینڈ بھیجا کہ بھاگتے بھوت کی جو چیز بھی ہاتھ لگے، کھوٹ لائیں۔ لہذا وہ یہ گھوڑا اصطبل سے کھول لائے۔ وہیں ایک سیاہی بلی نظر آگئی۔ سوائے بھی بوری میں بھر کے لے آئے۔ گھوڑے کی ٹریجڈی کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لیے بشارت نے ضمناً ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ فرمایا ”یہ گھوڑا تانگے میں جتنے کے لیے تھوڑا ہی پیدا ہوا تھا۔ سیٹھ نے بڑی زیادتی کی۔ مگر قسمت کی بات ہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ آپ یوں بینک میں جوت دیے جائیں گے۔ کہاں ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چارٹ اونچا اٹھول!“

شاہی سواری

انہیں اس گھوڑے سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ اور محبت اندھی ہوتی ہے، خواہ گھوڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ تک سنجائی نہ دیا کہ گھوڑے کی مدح میں اساتذہ کے جو اشعار وہ اوٹ پٹانگ پڑھتے پھرتے تھے، ان کا تعلق تانگے کے گھوڑے سے نہیں تھا۔ یہ مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ گھوڑا شاہی سواری ہے۔ رعب شاہی اور شوکت شہانہ کا تصور گھوڑے کے بغیر ادھورا بلکہ بالکل آدھا رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کے قدمیں گھوڑے کے قد کا اضافہ کیا جائے تب کہیں وہ قد آدم نظر آتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو شاہی سواریوں میں گھوڑا دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری درحقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری کا ٹھہ لیں تو پھر انہیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوش شہ زوری و شہ سواری میں نوشتہ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ نوشتہ دیوار اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے جب تک وہ

Braille میں نہ لکھا ہو۔ جسے وہ اپنا دربار سمجھتے ہیں، وہ دراصل ان کا محاصرہ ہوتا ہے جو انہیں یہ سمجھنے سے قاصر رکھتا ہے کہ جس منہ زور سر شور گھوڑے کو صرف پہنچانے کی اجازت دے کر باسانی آگے سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے، اسے وہ پیچھے سے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ لحام کے بجائے دُم مروڑتا ہے۔ مگر اس بظاہر مسکین سواری کا اعتبار نہیں کہ یہ ابلق لقاسدا ایک چال نہیں چلتی:

اکثر یہ بدر کاب، بنی اور بگڑ گئی

غرباکستن روزِ اوّل

لیکن جو حکمران ہوشیار، مردم شناس اور رموز و مصلحتِ ملکیت سے آشنا ہوتے ہیں، وہ پہلے ہی دن غریبوں کی سرکوبی کر کے خواص کو عبرت دلاتے ہیں۔

غرباکستن روزِ اوّل

ویسے خواص اور عائد کو کسی تنبیہ اور آنکس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو بھی ان پر سونے کی عاری، چاندی کی گھنٹیاں، زربفت کی جُھول اور تنغوں کی مالا ڈال دے، اسی کا نشان کا ہا تھی * بننے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ پہلے کمر بستہ و دست و پا بستہ۔ پھر لب بستہ۔ اور آخر میں فقط بستہ بردار۔ چار دن کی زندگی ملی تھی۔ سودو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے، دوجی حضوری میں۔

ہمارا کجاوہ

ہم نے ایک دن گھوڑوں کی جناب میں کچھ گستاخی کر دی تو بشارت بھٹا گئے۔ ہم نے بر سبیل تضحیک ایک تاریخی حوالہ دیا تھا کہ جب منگول ہزاروں کے غول بنا کر گھوڑوں پر ٹکتے تو بدبو کے ایسے جھبکے اٹھتے تھے کہ بیس میل دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا، معاف کیجیے، آپ نے راجستھان میں، جہاں آپ نے جوانی گنوائی، اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلف دار راجپوتی صاف، چڑھواں داڑھیاں اور دس فٹ لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں سچی ہوتی تھیں۔ اور نیچے۔۔۔ کندھے پر رکھی لاٹھی کے سرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لٹکائے، اردلی میں تنگے پیر جات۔ کھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الہی گواہ ہیں، انہی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر نال پلٹن میں رسالدار تھے۔ جب ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔

* وہ ورثی ہاتھی جو جھنڈا یا علم لے کر آگے آگے چلتا ہے۔

اودے پور تور اوٹنی پہنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوادیے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پُرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شکرگنی رنگ کا صاف باندھے، سینے پر تنے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے میان کر رہے تھے اور میڈل جھن جھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے اپنے عمودی سفر پر روانہ ہو گیا۔ دم واپس لبوں پر مسکراہٹ اور جنگ بہادر کا نام۔ معاف کیجیے، یہ سب آپ ہی کے لیے ہوئے اسنیپ شائٹس ہیں۔ بندہ پرور! آپ بھی تو اپنے کجاوے سے نیچے نہیں اترتے۔ نہ اتریں۔ مگر یہ کجاوہ خاکسار کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ صاحب، آپ گھوڑے کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سمنہ سیاہ زانو کس چٹیا کا نام ہے۔ خچر کا کراس، کیسے ہوتا ہے؟ کھیرا کس شکل کا ہوتا ہے؟ کنوتیاں کہاں ہوتی ہیں؟ میل کے آر کہاں چبھوٹی جاتی ہے؟ چلغوزہ کس زبان کا لفظ ہے؟

آخری دو سوال کلیدی اور فیصلہ کن تھے۔ اس لیے کہ ان سے پتہ چلتا تھا کہ بحث کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ کج بحثی ہیں اس لیے اور بھی ناگوار گزری کہ ہمیں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ وہ ”اوکے“ * نہیں، طبعاً بہت دھیمے اور میٹھے آدی ہیں۔ لیکن جب وہ اس طرح پڑی سے اتر جائیں تو ہمیں دور تک کپے میں کھدے بڑتے، کھسیٹتے لے جاتے ہیں۔ کہنے لگے ”جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھا، وہ کبھی سیر چشم، غیور اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا۔“ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے تھے۔

جنازے سے دور رکھنا

انہیں ایک عرصے سے زندگی میں جو روحانی خلا محسوس ہو رہا تھا، وہ اس گھوڑے نے پُر کر دیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس کے بغیر اب تک کیسے بلکہ کاہے کوجی رہے تھے!

I wonder by my troth what thou and I did till we loved. ——— Donne

اس گھوڑے سے ان کی شیفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ فتن کا خیال چھوڑ کر سیٹھ کا تانگہ بھی ساڑھے چار سو روپے میں خرید لیا، حالانکہ انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ بہت بڑا اور گنوار و تھا۔ لیکن کیا کیا جائے، سارے کراچی میں ایک بھی فتن نہیں تھی۔ سیٹھ گھوڑا اور تانگہ ساتھ بچنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں، اس نے دانے کی دو بوریوں، گھاس کے پانچ پلوں، گھوڑے کے فریم کیے

* اوکے: (پنجابی) میڑھے۔ مشکل۔

ہوئے فوٹو، ہاضمے کے نمک، دوا اور تیل پلانے کی نال، کھیرے اور توڑے کی قیمت ساڑھے اسیس روپے علیحدہ سے دھروالی۔ وہ اس دھاندلی کو ”پینک کچن ڈیل“ کہتا تھا۔ گھوڑے کے بھی منہ مانگے دام دینے پڑے۔ گھوڑا اگر اپنے منہ سے دام مانگ سکتا تو یقیناً سیٹھ کے مانگے ہوئے داموں یعنی نو سو روپے سے کم ہی ہوتے۔ گھوڑے کی خاطر بشارت کو سیٹھ کا تکیہ کلام ”کیا؟“ اور ”سالا“ بھی برداشت کرنا پڑا۔ چلتا حساب کر کے جب انہوں نے لکام اپنے ہاتھ میں تھام لی اور یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کے خواب کی تعبیر نہیں چھین سکتی تو انہوں نے سیٹھ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا گھوڑا کیوں بیچ دیا؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”دو مہینے پہلے کی بات ہے، میں تانگے میں لارنس روڈ سے لی مارکٹ جا رہا تھا۔ میونسپل ورک شاپ کے پاس پہنچا ہوں ماکہ سامنے سے ایک سالا جنازہ آتا دکھلائی پڑا۔ کیا؟ کسی پولیس افسر کا تھا۔ گھوڑا آل آف اے سڈن بدک گیا۔ پر کندھا دینے والے اس سے بھی زیادہ بدکے۔ بے فصول ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا؟ بیچ سڑک یہ جنازے کی مٹی خراب ہوئی۔ ہم سالا اُلو کے موافق بیٹھا دیکھتا پڑا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، یہ کار بندھا کھا رہا ہے۔ دل سے اتر گیا۔ کیا؟ ویسے عیب کوئی نہیں۔ بس جنازے سے دور رکھنا اچھا۔ سلاما لیکم۔“

”آپ نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا؟“
 ”تم نے پہلے کیوں نہیں پوچھا؟ سلاما لیکم۔“

۲

جگ میں چلے پون کی چال

انہوں نے ایک کوچوان رحیم بخش نامی ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ منہ مانگی، یعنی پنتالیس روپے اور کھانا کپڑا۔ گھوڑا انہوں نے صرف رنگ، دانت اور گھنیری دُم دیکھ کر خریدا تھا۔ اور وہ ان حصوں سے اتنے مطمئن تھے کہ باقی ماندہ گھوڑے کی جانچ پڑتال ضروری نہ سمجھتی۔ کوچوان بھی کچھ اسی طرح رکھا۔ یعنی صرف زبان پر ربحہ کر۔ باتیں بنانے میں طاق تھا۔ گھوڑے جیسا چہرہ۔ ہنستا تو معلوم ہوتا گھوڑا ہنہنارہا ہے۔ تیس سال گھوڑوں کی صحبت میں رہتے رہتے اُن کی تمام عادتیں، عیب اور بدو عین اپنائی تھیں۔ گھوڑے کے اگر دو ٹانگیں ہوتیں تو یقیناً اسی طرح چلتا۔ بچوں کو اکثر اپنا بایاں کان ہلا کر دکھاتا۔ فٹ بال کو ایڑی سے دولٹی مار کر پیچھے کی طرف گول کرتا تو بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ گھوڑے کے چنے کی چوری کرتا تھا۔ بشارت کہتے تھے

”یہ منحوس چوری چھپے گھاس بھی کھاتا ہے، ورنہ ایک گھوڑا اتنی گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔ جبھی تو اس کے بال ابھی تک کالے ہیں۔ دیکھتے نہیں، حرام خور تین عورتیں کر چکا ہے!“ موضوع کچھ بھی ہو تمام تر گفتگو سائسی اصطلاحوں میں کرتا اور رات کو چابک لے کر سوتا۔ دو میل کے دائرے میں کہیں بھی گھوڑا یا گھوڑی ہو، وہ فوراً بُو پالیتا اور اس کے تھننے پھڑکنے لگتے۔ راستے میں کوئی خوبصورت گھوڑی نظر آجائے تو وہیں ٹک جاتا اور آنکھ مار کے تانگے والے سے اس کی عمر پوچھتا۔ پھر اپنے گھوڑے کا چرمی چشم بند اٹھاتے ہوئے کہتا ”پیارے! تو بھی جلوہ دیکھ لے۔ کیا یاد کرے گا!“ اور پینچ ملک کی آواز اپنی لے اور گھوڑے کی ٹاپ کی ٹال پر ”جگ میں چلے پون کی چال“ کا تانہا آگے بڑھ جاتا۔ مرزا کہتے تھے کہ یہ شخص پچھلے جنم میں گھوڑا تھا اور اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی ہو گا۔ یہ سعادت صرف مہاتماؤں اور رشیوں مثنیوں کو حاصل ہوتی ہے کہ جو وہ پچھلے جنم میں تھے، اگلے میں بھی وہی ہوں۔ ورنہ ہماشما کی تو ایک ہی دفعہ میں جُون پلٹ جاتی ہے۔

دست بدبو دار واں گیا

گھوڑے تانگے کا افتتاح کہیے، مہورت کہیے، breaking-in کہیے۔۔۔ اس کی رسم بشارت کے والد نے انجام دی۔ ستر کے پیٹے بلکہ لپیٹے میں آنے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے بہت باتھ پاؤں مارے، مگر نہ کوئی مکان اور جائداد الاٹ کرا سکے، نہ کوئی ڈھنگ کی بزنس شروع کر پائے۔ بنیادی طور پر وہ بہت سیدھے آدمی تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ اپنے بندھے نکلے اصولوں اور آؤٹ آف ڈیٹ طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کو سراسر بد معاشی گردانتے تھے۔ چنانچہ ناکامی سے دل گرفتہ یا شرمسار ہونے کے بجائے ایک گونہ افتخار و طمانیت محسوس کرتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی میں ناکام ہونے کو اپنی نیکی اور راست بازی کی سب سے روشن دلیل سمجھتے ہیں۔ بے حد حساس، کم آمیز اور خود دار انسان تھے۔ کبھی کسی کے سامنے باتھ نہیں پھیلایا تھا۔ پاسٹ کے سامنے بھی نہیں۔ اب یہ بھی کیا۔ خوشامد سے زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا تھا۔ یہ قسم بھی ٹوٹی۔ مگر کاربر آری نہ ہونی تھی، نہ ہوئی۔ بقول مرزا عبد الوود و دیگ، جب غیور اور با اصول آدمی حتی المقدور دھکے کھانے کے بعد ”ڈی موریلانز“ ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی کوشش کرتا ہے تو رہی سہی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ یکایک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا بالیاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ ذیابیطس، الرجی، پارکنسن کا عارضہ اور اللہ جانے کیا کیا لاحق ہو گیا۔ کچھ لے کہا،

ان کی مجروح انا نے بیمار یوں میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ خود مستدرست نہیں ہونا چاہتے کہ پھر کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ اب انہیں اپنی ناکامی کا استعمال نہیں تھا جتنا کہ عمر بھر کی وضع داری ہاتھ سے چھوٹنے کا قلق۔ لوگ آکر انہیں حوصلہ دلاتے اور کامیاب ہونے کی ترکیبیں سمجھاتے تو ان کے آنسو رواں ہو جاتے۔

تم تو کرو ہو صاحبی * بندے میں کچھ رہا نہیں

سُبکی، بے وقریٰ اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ ہے کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے۔ سو وہ اس جہنم سے گزرے:

جانا نہ تھا جہاں مجھے، سو بار واں گیا
ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلب کار واں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار میں گیا

اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک ذنی کے سماجت مری گئی
نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی
ایسا پھر آیا اس نے کہ طاقت مری گئی

مشہور شہر اب ہوں سُبک سار و بے وقار

بشارت بیان کرتے ہیں کہ ”باواجب‘ دست بدیوار‘ والا مصرع پڑھتے تو ہوا میں دائیں ہاتھ سے دیوار پکڑ پکڑ کر چلنے کی تصویر سی کھینچ دیتے۔ ہاں بے جان ہاتھ لٹکا الگ اپنی بات تصویر کہانی سناتا رہتا۔ لیکن بے کسی اور بے بسی کی تصویر کھینچنے کے لیے انہیں کچھ زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ساری عمر داغ کی غزلوں پر سر دھنا کیے۔ انہوں نے کبھی کسی طوائف کو فانی یا میر کی غزل گاتے نہیں سنا۔ دراصل ان دنوں محفلِ رقص و سرود میں کسی شعلہ رُو، شعلہ گلو سے فانی یا میر کی غزل گوانا ایسا ہی تھا جیسے شراب میں برابر کا نیو کارس نچوڑ کر پینا

* میر کی مراد صاحبی سے ”صاحب پن“ نہیں بلکہ ناز و غمزہ اور تغافلِ معشوقانہ ہے۔

پلانا! گستاخی، معاف، ایسی 'مئے مرد افکن' پینے کے بعد تو آدمی صرف طبلہ بجانے کے لائق رہ جائے گا! تو صاحب، باواساری عمر فانی اور میر سے نفور رہے۔ اب جو پناہ ملی تو انہیں کے ایسات میں ملی۔ وہ قوی اور بہادر آدمی تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ان کو روتے ہوئے دیکھوں گا۔ مگر دیکھا۔ ان آنکھوں سے۔ اکثر۔“

کراچی میں ان کا آدھا وقت تو یارانِ رفتہ کی یاد میں گزرتا تھا۔ بقیہ آدھا یارانِ از کارِ رفتہ ضائع کر دیتے تھے۔

الہ دین ہشتم

بزرگوار کے امراض نہ صرف متعدّد تھے، بلکہ متعدّد بھی۔ ان میں سب سے موذی مرض بڑھا پاتا تھا۔ ان کا ایک داماد ولایت سے سرجری میں تازہ تازہ ایف آر سی ایس کر کے آیا تھا۔ اس نے اپنی سسرال میں کسی کا پنڈ کس سلامت نہیں چھوڑا۔ کسی کی آنکھ میں بھی تکلیف ہوتی تو اس کا پنڈ کس محال دیتا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی کہ آنکھ کی تکلیف جاتی رہتی تھی۔ بزرگوار حالانکہ تمام عمر دردِ شکم میں مبتلا رہے، لیکن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہتے تھے کہ میں نے آج تک کسی ڈاکٹر کو اپنے پنڈ کس پر ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ ایک مدت سے صاحبِ فراش تھے، لیکن ان کی معذوری ابھی نامکمل تھی۔ مطلب یہ کہ سہارے سے چل پھر سکتے تھے۔ انہوں نے رسمِ افتتاح اس طرح ادا کی کہ اپنے کمرے کے دروازے میں جس سے نکلے انہیں کئی مہینے ہو گئے تھے، ایک سُرخ ربن بند حوا کر اپنے ڈانواں ڈول ہاتھ سے فینچی سے کاٹی۔ تالی بجانے والے پتوں میں لڈو تقسیم کرنے کے بعد دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ پھر گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے گیند سے کاہار پہنایا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑی سی بخو نری تھی۔ زعفران میں اٹھکی ڈبو کر اس پر اللہ لکھا اور کچھ پڑھ کر دم کیا۔ چاروں سُموں اور دونوں پہیوں پر شگون کے لیے سیندور لگا کر دعائیہ کہتے رہو، سدا سرپٹ چلتے رہو۔ رحیم بخش کو چوان کا منہ کھلوا کے اس میں سالم لڈو فٹ کیا۔ خود ورقِ شُقرہ میں لپٹی ہوئی گلووری کٹے میں دبائی۔ پرانا کشمیری شمال اوڑھ لپیٹ کے تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ اور اٹھکی سیٹ پر اپنا بیس سال پرانا ہارمونیم رکھوا کر اس کی مرمت کرانے ماسٹر باقر علی کی دکان روانہ ہو گئے۔

گھوڑے کا نام بدل کر بزرگوار نے بلبن رکھا۔ کوچوان سے کہا، ہمیں تمہارا نام رحیم بخش بالکل پسند نہیں۔ ہم تمہیں الہ دین کہہ کر پکار دیں گے۔ جب سے ان کا حافظہ خراب ہوا تھا

وہ پر نوکر کو الہ دین کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ الہ دین ہشتم تھا۔ اس کا پیش رو الہ دین ہشتم کثیر العیال تھا۔ حقے کے تبا کو اور روٹیوں کی چوری میں نکالا گیا۔ گرم روٹیاں پیٹ پر باندھ کر لے جا رہا تھا۔ چال سے پکڑا گیا۔ بزرگوار موجودہ الہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور سے الہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی خاص کام مثلاً پیر دیوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الہ دین میاں کہہ کر بھارتے۔ لیکن کالی دینی ہو تو اصل نام لے کر کالی دیتے تھے۔

ہاف ماسٹ چابک

دوسرے دن سے تانگہ صبح بچوں کو اسکول لے جانے لگا۔ اس کے بعد بشارت کو دوکان چھوڑنے جاتا۔ تین دن یہی معمول رہا۔ چوتھے دن کو چوان بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آیا تو بے حد پریشان تھا۔ گھوڑا پھانک سے باندھ کر سیدھا بشارت کے پاس آیا۔ ہاتھ میں چابک اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے زمانہ قدیم میں علم بردار جنگی علم لے کر چلتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، جس طرح نیویارک کے اسٹیچو آف لبرٹی نے اپنے ہاتھ کو آخری سینٹی میٹر تک اونچا کر کے مشعل آزادی بلند کر رکھی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ کوئی بچوگ پڑ جائے یا منحوس خبر سنائی ہو تو وہ اسی طرح چابک کا علم بلند کیے آتا تھا۔ چابک کو عمودی حالت میں دیکھ کر بشارت ایسے سراسیمہ ہوتے جیسے ہیملٹ ghost دیکھ کر ہوتا تھا۔

Here it cometh, my lord!

بشارت کے قریب آکر اس نے چابک کو ”ہاف ماسٹ“ کیا اور پندرہ روپے طلب کیے۔ کہنے لگا؟ ”اسکول کی مکھی کے نکلنے پر اچانچ چالان ہو گیا۔ گھوڑے کے بائیں پاؤں میں لنک ہے! اسکول سے نکلا ہی تھا کہ ”بے رحمی والوں“ (۱) نے دھریا۔ بڑی منتوں سے پندرہ روپے دے کر گھوڑا بچھڑایا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ سرکار بھی بے فضول کچے کچے پھرتے۔ میری آنکھوں کے سامنے ”بے رحمی والے“ ایک گدھا گاڑی کے مالک کو چابک سے مارتے ہوئے ہنگال کے تھانے لے گئے۔ اس کے گدھے کا لنک تو اپنے گھوڑے کا پانگ بھی نہیں۔“ کو چوان نے گدھے کے خفیف سے لنک کا ذکر اتنی حقارت سے کیا اور اپنے گھوڑے کے لنک کی شدت اور برتری بیان کرنے میں اتنے فخر اور غلو سے کام لیا کہ بشارت نے غصے سے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پندرہ

(۱) بے رحمی والے: کو چوان انجمن انسداد بے رحمی جانوراء (SPCA) کو اسی مختصر نام سے پکارتا اور کوستا تھا۔

روپے دے کر اسے خاموش کیا۔

شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور

اسی وقت ایک سلوتری کو بلا کر گھوڑے کو دکھایا۔ اس نے بائیں نلی ہاتھ سے سوتی تو گھوڑا چمکا۔ تشخیص ہوئی کہ پرانا لنگ ہے۔ سارا گھلا اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ غالباً کیا یقیناً، اسی وجہ سے گھوڑا ریس میں ڈس کوالی فائی ہوا ہو گا۔ ایسے گھوڑے کو تو اسی وقت گولی مار دی جاتی ہے جو اس کے حق میں تانگے میں ذلیل و خوار ہونے سے بد رہا بہتر ہوتی ہے۔ تاہم سلوتری نے امید دلائی کہ لنگ اس صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک حواصل کے تیل کی مالش کرائیں۔ مالش کی اجرت پانچ روپے یومیہ! یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار۔ چھ مہینے کے نو سو روپے ہوئے۔ نو سو کا گھوڑا، نو سو کی مالش۔ گویا ٹاٹ کی گدڑی میں لمخواب کا پیوند! ابھی کچھ دن ہوئے انہوں نے اپنے والد کی مالش اور پیہ دبانے کے لیے ایک شخص کو اسی روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کی کمائی کا نصف حصہ تو انکم ٹیکس والے دھروالین کے اور ایک تہائی چمپی مالش والے کھا جائیں گے۔ حلال کی کمائی کے بارے میں انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ اس تناسب سے غیر مستحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔ چار بجے تانگہ بٹوا کر سیٹھ سے تھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے گہرے رنگ کی دھوپ کی عینک لٹائی، تاکہ سخت بات کہنے میں حجاب محسوس نہ ہو اور چہرے پر ایک پُر اسرار خوشخواری کا ایکسپریشن آجائے۔ آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک شخص نے بم (۲) پکڑ کر تانگہ روک لیا۔ کہنے لگا، آپ کا گھوڑا بُری طرح لنگڑا رہا ہے۔ چالان ہو گا۔ بشارت بک دک رہ گئے۔ معلوم ہوا ”بے رحمی والے“ آج کل بہت سختی کر رہے ہیں۔ ہر موڑ پر ایک انسپکٹر گھات میں کھڑا ہے۔ قدم قدم پہ بات بے بات چالان ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح نہ مانا تو بشارت نے قانونی مُوشکافی کی، آج صبح ہی اس کا چالان ہو چکا ہے۔ سات گھنٹے میں ایک ہی جرم میں دو چالان نہیں ہو سکتے۔ انسپکٹر نے یہ بات بھی فرد جرم میں ٹانگ لی اور کہا کہ اس سے تو جرم کی نوعیت اور سنگین ہو گئی۔ کوئی جائے فرار منظر نہ آئی تو بشارت نے کہا ”اچھا بابا! تمہیں سچے سبھی۔ دس روپے پہ معاملہ رفع دفع کرو۔ برانڈ نیو گھوڑا ہے۔ خریدے ہوئے تیسرا دن ہے۔“ یہ سنتے ہی وہ شخص تو آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”بڑے صاب! کا گلز کے باوجود آپ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو

(۲) بم: گاڑی کے آگے لگانے والی لکڑی جس میں گھوڑا جوتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پیسے سے لنگڑا کھوڑا خرید سکتے ہیں۔ آدمی نہیں خرید سکتے۔“ چالان ہو گیا۔ اسٹیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے یہاں ایک بزرگ کی نیاز میں ڈھ ڈھ دو سو فیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس سے مہینے بھر کی کمائی پاک ہو جاتی ہے۔ اور یہ laundering (شست و شو) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں پندرہ بیس برس تک یہ دستور رہا کہ ہر رانچ میں روزانہ جتنے نئے اکاؤنٹ کھلتے شام کو اتنے ہی فقیر کھلائے جاتے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کھانا اکاؤنٹ کھلنے کی خوشی میں کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں بڑھوتری کا کفارہ تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اُس دن بینک کے مالکان میں سے ایک بہت سینئر سیٹھ انسپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو رانچ میں مساوات کا یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فیروں کے ساتھ زمین پر اکڑوں بیٹھے پلاؤ کھا رہے ہیں اور فردا فردا ہر فقیر اور اس کے اہل و عیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالودود بیگ کو غبارے پنچر کرنے کی بڑی بُری عادت ہے۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہماری ساری خوشی کر کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتنہ ہے۔ محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں بیٹھ کر پلاؤ کھانا بھی ”آڈٹ اینڈ انسپکشن“ کا حصہ ہے۔ سیٹھ صاحب دراصل یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کھانے والے اصلی فقیر ہیں یا منیجر نے اپنے یاروں، رشتے داروں کی پنکٹ (۲) بٹھادی ہے۔

ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ ذکر اسٹیل مل والے سیٹھ کا تھا جو سات اٹھ سال سے کالے دھن کو ماہ بہ ماہ نیاز فاتحہ کے لوہان کی دھونی سے پاک اور ”ہوائٹ“ کرتا رہتا تھا۔ نئی جادوئی چھڑی (۳) ایجاد ہونے میں ابھی کافی دیر تھی کہ ہمارے ذہین اور طبائع و زہر خالی خزانہ اور ماہرین اقتصادیات تو اس زمانے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ لہذا ایساہ کو سفید کرنے کا شعبہ ہنوز پیر فقیر، نوسرباز، سفلی عمل اور باورچی خانے پر سفیدی کرنے والے انجام دیتے تھے۔

(۲) پنکٹ: فرشی دعوت میں مہمانوں کی قطار۔

(۳) ۱۹۸۵ میں سترہ ارب روپے کو حکومت نے ایک لکھڑی قلم بلیک سے ہوائٹ کر دیا۔۔۔ اس امید میں کہ اب لوگ بلیک کرنا چھوڑ دیں گے، جب کہ کالا دھن اس اساطیری ہزار سروالے اڑدے کی طرح ہے جس کا ایک سر کاٹیں تو اس کی جگہ سونے سر نکل آتے ہیں۔

مہاتما بدھ بہاری تھے!

سیٹھ نے گھوڑے کے لنگ سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اُلٹا سر ہو گیا کہ ”تم گھوڑے کو دیکھنے ہاف ڈزن ٹائم تو آئے ہو گے۔ گھوڑا تلک تم کو پچھانتے لگا تھا۔ دس دفعہ گھوڑے کے دانت گنے۔ کیا؟ تم ایک دفعہ اس کے لیے نان خطائی بھی لائے! تم نے ہم کو یہاں تلک بولا کہ گھوڑا نو ہاتھ لمبا ہے۔ اس سے تمہیں یہ نوکڑا دکھلائی پڑتا تھا۔ آج چار پانچ دن بعد گھوڑے کے مکمل خود پہن کے بہتان طوفان لگانے آئے ہو۔ کیا؟ تین دن میں تو قبر میں مُردے کا بھی حساب کتاب بروبر خلاص ہو جاتا ہے۔ اُس ٹیم آپ کو مال میں یہ ڈیفکٹ دکھلائی نٹیں پڑا۔ تانگے میں جوت کے غریب خانے لے گئے تب بھی نجر نٹیں آیا۔ بشارت سیٹھ کے سامنے اپنے گھر کو اتنی دفعہ غریب خانہ کہہ چکے تھے کہ وہ یہ سمجھا کہ یہ ان کے گھر کا نام ہے۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو قطع کلام کرتے ہوئے بولا ”ارے بابا! گھوڑے کا کوئی پارٹ کوئی پُرزہ ایسا نہیں جس پہ تم نے دس دس دفعہ ہاتھ نٹیں پھیرا ہو۔ کیا؟ تم بزنس مین ہو کہ ایسا کچی بات منہ سے نکالیں گا تو ہم کہہ کر کو جائیں گا؟ بولوئی! ہلکٹ مانس (گھٹیا آدمی) کے موافق بات نٹیں کرو۔ کیا؟“ سیٹھ بری الذمہ ہو گیا۔

بشارت نے زچ ہو کر کہا ”حد تو یہ کہ سودا کرنے سے پہلے یہ بھی نہ بتایا کہ گھوڑا جنازہ الٹ چکا ہے۔ آپ خود کو مسلمان اور پاکستانی کہتے ہیں!“

” (سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) تو کیا تمہارے کو بُدھشت دکھلائی پڑتا ہوں؟ ہم نے جونا گرھ کا ٹھیاواڑ سے مائی گریٹ کیا ہے۔ کیا؟ اپنے پاس بروبر سندھ کا ڈومیسائل ہے۔ مہاتما بدھ تو بہاری تھا! (اپنے منہ میں پان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرے منہ میں رزق ہے۔ تم بھی بچوں کی قسم کھا کے بولو۔ جب تم نے پوچھا گھوڑا کالے کو بیچ رہے ہو، ہم نے پچی البھور (فی الفور) بول دیا۔ سودا پکا کرنے سے پہلے پوچھتے تو ہم پہلے بول دیتے۔ تم لکڑی بیچتے ہو۔ تو کیا گراہک کو لکڑی ہر کاٹھ، ہر داغ پہ اٹھلی رکھ رکھ کے بتاتے ہو کہ پہلے اسے دیکھو؟ ہم سالہ اپنا بیچ بیوپار کر کے تمہارے کو گھوڑے کی میا گرا بھی (با یو گرافی) بتائے۔ فادر میرے کو ہمیش بولتا تھا کہ گراہک ۴۲۰ ہو تو پہلے دیکھو بھالو۔ پھر سودے کی ٹیم بولو کم، تو لو زیادہ۔ پر تمہارے اوپر تو کھولو، ابھی کھولو! کی دُھن سوار تھی۔ تمہارے منہ میں پیسے بچ رہے تھے۔ گجراتی میں کہناوت ہے کہ پیسہ تو شیرنی کا دودھ ہے! اسے حاصل کرنا اور بچم کرنا دونوں بروبر مُسکل ہیں۔

پر تم تو سالاشیر کو ہی دوہنا مانتا ہے۔ ہم کروڑوں کا بجنس کر بیلا ہے۔ آج دن تلک جہان دے کے نٹیں پھر بیلا۔ اچھا! اگر تم قرآن اٹھا کے بول دو کہ تم گھوڑا خریدتے ٹیم پئے لا (پئے ہوئے) تھا تو ہم فوراً ایک ایک پائی ریپینڈ (رفنڈ) کر دیں گا۔“

بشارت نے گرگڑاتے ہوئے درخواست کی ”سیٹھ، سوڈیٹھ سو کم میں گھوڑا واپس لے لو۔ میں عیال دار آدمی ہوں۔ تاجر ممنون و احسان مند رہوں گا۔“

سیٹھ آپے سے باہر ہو گیا۔ ”ارے بابا!؛ پختہ کے موافق ہم سے اڑی نٹیں کرو۔ ہم سے ایک دم کرک اردو میں ڈانٹاگ مت بولو۔ تم پھلم کے ولین کے موافق کا کلز لکا کے ادھر کاٹے کو تڑی دیتا پڑا ہے۔ بھائی صاحب! تم پڑھیلا مانس ہو۔ کوئی پختے سے باز موالی، ملباری نٹیں جو شریپتھوں سے داد گیری کرے۔ تم نے سائن بورڈ نٹیں پڑھا۔ بابا! یہ ری رولنگ مل ہے۔ اسٹیل ری رولنگ مل۔ ادھر گھوڑوں کا دھندا نٹیں ہوتا۔ کیا؟ کل کو تم بولیں گا کہ تانگہ بھی واپس لے لو۔ ہم سالاکھا (تام) عمر ادھر بیٹھا گھوڑے تانگے کا دھندا کرہں گا تو ہمارا فیملی پر یوار کیا گھر میں بیٹھا قتوالی کرہں گا؟ بھائی صاب! اپن کا گھر تو گرہستیوں کا گھر ہے۔ کسی بڑھک کا مجار نٹیں کہ بائی لوگ کج کج بھر لے بال کھول کے دھمال ڈال دیں۔ دھما دم مست کلندر!“

بشارت نے تانگہ اسٹیل ری رولنگ مل کے باہر کھڑا کر دیا۔ اور خود ایک تھڑے پر پیر لٹکائے انتظار کرنے لگے کہ اندھیرا ڈراگہرا ہو جائے تو واپس جائیں تاکہ نو گھنٹے میں تیسری مرتبہ چالان نہ ہو۔ غصے سے ابھی تک ان کے کان کی لوس تپ رہی تھیں اور حلق میں کیکٹس آگ رہے تھے۔ بلبن گولڈ مہر کے پیڑ سے بندھاسر جھکائے کھڑا تھا۔ انہوں نے پان کی دکان سے ایک لیمونڈ کی گولی والی بوتل خریدی۔ ایک ہی گھونٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے انتظار میں یہ بوتل کئی مہینوں سے دھوپ میں تپ رہی تھی۔ پھر یک لخت یاد آیا کہ اس افراطی میں آج دوپہر بلبن کو چارا اور پانی بھی نہیں ملا۔ انہوں نے بوتل ریت پر انڈیل دی۔ اور کا کلز اتار دیے۔

”باوجود دھریا“

تانگہ شتم پشتم چلتا رہا۔ رحیم بخش اس کے بعد تین چار دفعہ اور دھریا گیا۔ لیکن بات سات آٹھ روپے پر ٹل گئی۔ دس پندرہ دن کا بھلا واوے کر ایک دن پھر چابک بلند کیے آیا۔ کہنے

لگا ”سرکار! باوجود دھریا۔ ہرچند کہ آج میرے پاس نانواں (روپیہ) نہیں تھا، مگر بہت منہ پھاڑا ریا ہے۔ ہرچیس مانگتا ہے۔ چنانچہ تانگہ اس کے پاس گروی رکھ کے آیا ہوں۔ اگرچہ بچے تانگے میں بعد گھوڑے کے ہیں۔ آپ ہر دفعہ سمجھتے ہیں کہ رحیم بخش ڈیرامہ کھیل ریا ہے۔ چنانچہ خود چل کے چھڑا لیجیے۔ اگرچہ زحمت۔۔۔“ بشارت اس وقت اکڑوں بیٹھے ایک دغیلے تختے کی گرہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک لخت بھوک کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تو کسی پہ بس چلا نہیں، بُری خبر لانے والے کے ہاتھ سے چابک چھین کر اسے تڑے زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگے ”ہرچند کے بچے! اگر تو نے آئندہ میرے سامنے باوجود اگرچہ اور چنانچہ کیا تو اسی چابک سے چڑی اُدھیر دوں گا۔“

دورانِ سرزنش رحیم بخش نے یکایک اپنا بایاں کان ہلایا تو بشارت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ غصے کو لاجول اور ایک مگلاس پانی سے بجھا کر چابک ہاتھ میں لیے، وہ رحیم بخش کے ساتھ ہو لیے کہ آج جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ جائے واردات پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک ”بے رحمی والا“ سچ مچ گھوڑے کی راس تھاے کھڑا ہے۔ بچے گلے میں بستے اور تھر مس لٹکائے، دھوپ میں سہمے کھڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے خون کی کولن یکبارگی نقطۂ انجماد پر اتر آئی۔ گلے میں اون کا گولاسا اٹکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ چابک کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ ”بے رحمی والے“ کو علمدہ لے جا کر انہوں نے رحم کی اپیل کی۔ اور اپنے مخصوص دکاندارانہ انداز میں اس پہلو پر بھی توجہ دلائی کہ ہم تو آپ کے مستقل کلائنٹ ہیں۔ اٹھاؤ چوہا پاونڈے نہیں کہ آج ہیں، کل نہیں۔ اس نے بیس روپے کا ڈسکاؤنٹ دے کر صرف پانچ روپے میں معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اسی اثناء میں ”بے رحمی کا ہفتہ“ جو اکیس دن تک منایا گیا، شروع ہو گیا۔ جب تک وہ بلاخیر و خوبی ختم نہ ہو گیا، گھوڑا، سلوتری اور رحیم بخش تینوں بالترتیب بندھے، کھڑے اور چٹھے کھاتے رہے۔ رحیم بخش کو گھوڑے کے ساتھ بریکٹ کرنا یوں بھی ضروری ہو گیا کہ اس کی خوراک گھوڑے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گھوڑے کو تو خیر تیسرے چوتھے بد ہضمی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن رحیم بخش کا نظامِ ہضم نہ صرف ہر قسم کے میکسیریا سے بلکہ مقدار سے بھی immune ہو گیا تھا۔ نئے pet، نئی نویلی دلہن اور لاڈلے بچے کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنے کا ہمارے ہاں لے دے کے ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص انہیں کچھ نہ کچھ کھلا کر اور فیڈ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گھوڑے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نتیجتاً اسے بار بار رچمنڈ کر افورڈ

ہسپتال (جانوروں کا اسپتال) بھیجنا پڑتا۔ بشارت کا بیان ہے کہ ایک دن شام کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رحیم بخش گھوڑے کے جلاب کا سارا پاؤ ڈر پھٹنے مار کے کھا گیا۔

”ہفتہ“ ختم ہوتے ہی بچوں کو پھر تانگے میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کی اپنی دکان زیادہ دور نہیں تھی، لہذا پیدل چلے جاتے تھے۔ تین ہفتے خیریت سے گزرے۔ مطلب یہ کہ گھوڑے کا لنگ بڑھ گیا، مگر چالانوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چوتھا ہفتہ شروع ہی ہوا تھا کہ رحیم بخش چالبک کا علم اٹھائے، آہ و بکا کرتا، بائیں ٹانگ سے لنگڑاتا آیا۔ گھوڑے کی دیکھا دیکھی اب وہ بھی بائیں ٹانگ سے لنگڑانے لگا تھا۔ کہنے لگا ”سرکار! آج پھر دھر لیا! آگاہ کیے بغیر نامہ دھر لیا! چناں چہ بیس روپے بھر کے آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے بہتیرے ٹھڈی میں ہاتھ دیے۔“ بشارت نے بادستِ ناخواستہ بیس روپے اس کے منہ پر مارے۔ اب جو تابر توڑ چالان ہونے شروع ہوئے تو چوٹ سہلانے تک کی مہلت نہ ملی۔ انہوں نے رحیم بخش کو سختی سے ہدایت کی کہ چُھپ چُھپ کر راستے بدل بدل کر، گلیوں گلیوں جایا کرے۔ اس وضع احتیاط میں اس نے اپنی طرف سے استثناء اور کر لیا کہ خود بھی چھپ کر یعنی سر سے پیر تک ایک لال کھیس اوڑھ کے تانگہ چلانے لگا۔ گھونگٹ میں سے صرف اس کا سگرت باہر نکلا رہتا تھا۔ لیکن اس سے واقعی بڑا فرق پڑا۔ وہ اس طرح کہ انسپکٹر اب گھوڑے کو پہچانے بغیر ہی، دور سے صرف لال کھیس دیکھ کر چالان کر دیتا تھا۔

۳

بزرگوار کی حکمتِ عملیات

رشوت اور مالش کی مجموعی رقم اب گھوڑے کی قیمت اور ان کی قوت برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ عاجز آکر انہوں نے رحیم بخش کی زبانی انسپکٹر کو یہ تک کہلایا کہ تم میری دکان میں اگاہی کے کام پر ملازم ہو جاؤ۔ موجودہ تنخواہ سے زیادہ دوں گا۔ اس نے کہلا بھیجا ”سیٹھ کو میرا سلام بولنا اور کہنا کہ ہم تین ہیں۔“

انہوں نے گھوڑا تانگہ بیچنا چاہا تو کسی نے سو روپے بھی نہ لگائے۔ بالآخر اس پریشانی کا ذکر اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ انہوں نے سارا احوال سن کر فرمایا ”اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دعا کر سگے۔ تانگے میں جوتے سے پہلے ایک گلاس دم کیا ہوا دودھ پلا دیا کرو۔“

اللہ نے چاہا تو لنگ جاتا رہے گا اور چالانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وظیفے کا اثر تو دیکھو۔“

بزرگوار نے اسی وقت رحیم بخش سے بستریہ ہارمونیم منگوایا۔ وہ دھونکنی سے ہوا بھرتا رہا اور بزرگوار کا نپتی، کپکپاتی آواز میں حمد گانے لگے۔

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا، تری شان جل جلالہ،

تری شان جل جلالہ،

آنکھ جہاں پڑتی وہاں اٹھکی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور جس پردے پر اٹھکی پڑتی، اس پر پڑی ہی رہ جاتی۔ ایک مصرع گانے اور بجانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ اس ہارمونیم کے کالے پردوں کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ ماسٹر باقر علی نے خاک مرمت کی ہے۔

دوسرے دن بزرگوار کی چارپائی ڈرائینگ روم میں آگئی۔ اس لیے کہ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جہاں گھوڑا علی الصبح اپنے ماتھے پر ”اللہ“ لکھوانے اور دم کروانے کے لیے اندر لایا جاسکتا تھا۔ صبح تڑکے بزرگوار نے دو منٹوں کے بعد عرق کلاب میں اٹھکی ڈبو کر گھوڑے کی پیشانی پر اللہ لکھا اور نمونوں کو لوہان کی دھونی دی۔ کچھ دیر بعد اس پر ساز کسا جانے لگا تو بشارت دوڑے دوڑے بزرگوار کے پاس آئے اور کہنے لگے، گھوڑا دم کا دودھ نہیں پی رہا۔ بزرگوار متعجب ہوئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں بعد انہیں نیم واکر کے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں۔ کوچوان کو پلادو۔ گھوڑا وجع الاسنان * میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ دم کا دودھ رحیم بخش نوش جان کرنے لگا۔ بظاہر ایسی کراہت سے بیتا جیسے اس زمانے میں یونانی دواؤں کے قدسے پیے جاتے تھے۔ یعنی ناک پکڑ کے، منہ بنا بنا کے۔ اللہ شافعی! اللہ شافعی! (نعوذ باللہ) کہتا جاتا۔ دودھ کے لیے نہ جانے کہاں سے دھات کا بہت لمبا کلاس لے آیا جو اس کی ناف تک پہنچتا تھا۔ بزرگوار کی عملیاتی تدابیر کا اثر پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس دن چالان ایک داڑھی والے نے کیا! رحیم بخش اپنا ہارنا ہوا چابک ہاف ماسٹ کر کے کہنے لگا ”سرکار! باوجود دھریا“۔ پھر اس نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ ایک داڑھی والا آج ہی جمشید روڈ کے حلقے سے تبدیل ہو کے آیا ہے۔ بڑا ہی رحم دل، اللہ والا آدمی ہے۔ چنانچہ صرف

* وجع الاسنان: دانتوں کے درد کو کہتے ہیں۔ جس شخص کے دانتوں میں درد ہو، وہ اس کا تلفظ بھی نہیں کر سکتا۔

ساڑھے تین روپے لیے ۔ وہ بھی بطور چندہ ۔ پڑوس میں ایک بیوہ کے بچے کے علاج کے لیے ۔ آپ چاہیں تو چل کے ملاقات کر لیں ۔ مل کے بہت خوش ہوں گے ۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں وظیفہ پڑھتا رہتا ہے ۔ اندھیری رات میں سجدے کے گٹے سے ایسی روشنی نکلتی ہے کہ سوئی پر لو ۔ (اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے) گھوڑے کے لیے یہ تعویذ دیا ہے ۔

کہاں پیچیس روپے ، کہاں ساڑھے تین روپے! بزرگوار نے رشوت میں کمی کو اپنے وظیفے اور کشف و کرامات پر محمول کیا ۔ اور فرمایا کہ تم دیکھتے جاؤ ۔ انشاء اللہ چالیسویں دن ”بے رحمی!“ کے انسپکٹر کو گھوڑے کی ٹانگہ نظر آنی بند ہو جائے گی ۔ بزرگوار کی چارپائی کے گردان کا ساز و سامان بھی ڈرائیونگ روم میں قرینے سے سجا دیا گیا ۔ دوائیں ، بیڈ پین ، حقہ ، سلفی ، ہارمونیم ، آغا حشر کے ڈرامے ، مولانا آزاد کے ”الہلال“ کے مجلہ فائل ، انیمائے آلات اور کچن ایکٹرس کی تصویر ۔ ڈرائیونگ روم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس میں گھوڑے اور بزرگوار اور ہر دو کا فضلہ اٹھانے والی مہترانی کے علاوہ کوئی اور پانچ منٹ بھی ٹھیر سکے ۔ بشارت کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا ۔ لیکن وہ گھوڑے کی خاطر بزرگوار کو برداشت کر رہے تھے ۔

ایک گھوڑا بھرے گا کتنے پیٹ؟

جس دن سے داڑھی والے مولانا تعینات ہوئے ، رحیم بخش ہر چوتھے پانچویں دن آکے سر پہ کڑا ہو جاتا ۔ ”چندہ دیجیے“ ۔ لیکن ڈھائی تین روپے یا زیادہ سے زیادہ پانچ میں آئی بلا ٹل جاتی ۔ اس سے جرح کی تو معلوم ہوا کہ کراچی میں تانگے اب صرف اسی علاقے میں چلتے ہیں ۔ تانگے والوں کا حال گھوڑوں سے بھی خستہ ہے ۔ انہوں نے پولیس اور ”بے رحمی والوں“ کا برائے نام ملہانہ باندھ رکھا ہے جو ان کی گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہے ۔ ادھر تنگے بھوکے گدھا گاڑی والے مکرانی سر پہاڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ زخمی گدھا ، پسینے میں شرابور گدھا گاڑی والا اور پھٹے حالوں ”بے رحمی“ کا انسپکٹر ۔ ۔ ۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون زیادہ خستہ اور مظلوم ہے ۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے ایک سونگھی بھوکی جونک دوسری سونگھی بھوکی جونک کا خون پینا چاہے ۔ نتیجہ یہ کہ ”بے رحمی والے“ پھر پو پھٹے ہی اکلوتی موٹی اسامی یعنی ان کے تانگے کے انتظار میں مگلی کے ٹکڑے کھڑے ہو جاتے اور اپنے پیسے کھرے کر کے چل دیتے ۔ اکیلا گھوڑا سارے غلے کے بال بچوں کا پیٹ پال رہا تھا ۔ لیکن کرامت حسین (داڑھی والے مولانا کا یہی نام تھا) کا معاملہ قدرے مختلف تھا ۔ وہ اپنے حلیے اور پھٹے حالوں سے اتنے مسکین لگتے تھے کہ

محسوس ہوتا تھا گویا انہیں رشوت دینا کارِ ثواب ہے۔ اور وہ رشوت لے کر درحقیقت رشوت دینے والے کو داخلِ حسنات کر رہے ہیں۔ وہ رشوت مانگتے بھی خیرات ہی کی طرح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سارا رزق اس گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ کے تو تسل سے نازل ہوتا ہے۔ ایسے پھٹیچر رشوت لینے والے کے لیے ان کے دل میں نہ کوئی ہمدردی تھی نہ خوف۔

کتوں کے چال چلن کی چوکیداری

اجباب نے مشورہ دیا کہ گھوڑے کو رچمنڈ کرا فورڈ ہسپتال میں انجکشن سے ٹھکانے لگوا دو۔ لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ بزرگوار تو سنتے ہی روہانے ہو گئے۔ کہنے لگے آج لنگڑے گھوڑے کی باری ہے۔ کل اپناج باپ کی ہوگی۔ شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ وہ خود تین دہنوں کے جنازے نکال چکے تھے، اس لیے گھوڑے کے بارے میں بھی ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ رحیم بخش بھی گھوڑے کو ہلاک کرانے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی ذکر آتا، اپنے تیس سالہ تجربات بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا کہ تاریخ درحقیقت بڑے لوگوں کی بایوگرافی ہے۔ لیکن رحیم بخش کوچوان کی ساری آٹو بایوگرافی دراصل گھوڑوں کی بایوگرافی تھی۔ اس کی زندگی سے ایک گھوڑا پوری طرح نکل نہیں پاتا تھا کہ دوسرا داخل ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ اس کے تین سابق آقاؤں نے ”ویٹ“ سے گھوڑوں کو زہر کے انجکشن لگوائے تھے۔ پہلا آقا تین دن کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گیا۔ دوسرے کا چہرہ لقتوے سے لپسا ٹیڑھا ہوا کہ دائیں باچھ کان کی کو سے جاملی۔ ایک دن غلطی سے آئینے میں خود پر منظر پڑ گئی تو کھنکھی بندھ گئی۔ تیسرے کی بیوی جاکے ساتھ بھاگ گئی۔ دیدہ عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو ان تینوں میں جو فوراً مر گیا، اسی کا انجام نسبتاً باعزت معلوم ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک سائیس خبر لایا کہ لاڑکانہ میں ایک گھوڑی تیلیا کمیت بالکل مفت یعنی تین سو روپے میں مل رہی ہے۔ بس وڈیرے کے دل سے اتر گئی ہے۔ گئے کی فصل کی آمدنی سے اس نے گئے ہی سے لمبائی ناپ کر ایک امریکی کار خرید لی ہے۔ آپ کی صورت پسند آ جائے تو ممکن ہے مفت ہی دے دے۔ اس کی مخالفت پہلے ہم نے اور بعد میں بزرگوار نے کی۔ ہمیں ان دنوں کتے پالنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ہر بات انہی کے حوالے سے کرتے تھے۔ کتوں کے لیے من حیث الجنس ہمارے دل میں دفعتاً استنا احترام پیدا ہو گیا تھا کہ کتیا کو مادہ کتنا کہنے لگے تھے۔ ہم نے بشارت کو سمجھایا کہ خدارا! مادہ گھوڑا نہ خریدو۔ عامل کالونی میں

دستگیر صاحب نے ایک مادہ کتاپال لیا ہے۔ کسی خیر خواہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جس گھر میں کتے ہوں، وہاں فرشتے، بزرگ اور چور نہیں آتے۔ اس ظالم نے یہ نہ بتایا کہ پھر صرف کتے آتے ہیں۔ اب سارے شہر کے بالغ کتے ان کی کوٹھی کا محاصرہ ڈالے پڑے رہتے ہیں۔ عقیفہ خود غنیم سے ملی ہوئی ہے۔ ایسی تن داتا نہیں دیکھی۔ جو بوائے اسکاؤٹ کا ”ماٹو“ ہے وہی اس کا: ‘Be prepared’۔ مطلب یہ کہ ہر حملہ آور سے تعاون کے لیے ہم تن تیار رہتی ہے۔ پچانک کھولنا نامکن ہو گیا ہے۔ خواتین نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ مرد اسٹول رکھ کے پچانک اور کتے پھلانگتے ہیں۔ دستگیر صاحب ان کتوں کو دونوں وقت باقاعدگی سے راتب ڈلواتے ہیں تاکہ آنے جانے والوں کی پنڈلیوں کے بوٹوں سے اپنا پیٹ نہ بھرے۔ ایک دفعہ راتب میں زہر ڈلو کر بھی دیکھ لیا۔ مگلی میں کشتوں کے پٹتے لگ گئے۔ اپنے خرچ پر ان کی تدفین کروائی۔ ایک صاحب کا پالتو کتتا جو صحبت بد میں پڑ گیا تھا، اس رات گھر والوں کی نظر پچا کر تماش بینی کرنے آیا۔ وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ ان جید کتوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ اسی طرح پُر ہوا، جس طرح ادب اور سیاست میں پُر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اس تیزی سے پُر کیا کہ خلا بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ ہم تو استنا جاتے ہیں کہ خود کو indispensable یعنی بے مثل و بے بدل سمجھنے والوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ درحقیقت صرف دو گز زمین میں ہوتا ہے جو انہیں کے جسدِ خاکی سے اسی وقت پُر ہو جاتا ہے۔ خیر یہ علمدہ قصہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اب دستگیر صاحب سخت پریشان ہیں۔ ”پیڈگ ری“ (خاندانی) مادہ ہے۔ نیچ ذات کے کتوں سے شجرہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے تو دستگیر صاحب سے کہا تھا کہ ان کی تو جہات divert کرنے کے لیے کوئی معمولی ذات کی کتیا رکھ لیجئے تاکہ کم از کم یہ دھڑکا تو نہ رہے۔ راتوں کی نیند تو حرام نہ ہو۔ تاریخ میں آپ پہلے آدمی ہیں جس نے کتوں کے چال چلن کی چوکیداری کا یہڑ اٹھایا ہے۔

مونس تنہائی

اس قصے سے ہم نے انہیں عبرت دلائی۔ بزرگوار نے دوسرے سینئر سے گھوڑی خریدنے کی مخالفت کی۔ وہ اس پر بہت برا فروختہ ہوئے کہ بشارت کو ان کے کراماتی وظیفے پر یقین نہیں۔ وہ خاصے کلیر تھے۔ بیٹے کو کھل کر تو کمالی نہیں دی۔ بس استا کہا کہ اگر تمہیں اپنی نسل چلانے کے لیے پیڈگ ری گھوڑی ہی رکھنی ہے تو شوق سے رکھو۔ مگر میں ایسے گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ دھکی بھی دی کہ جہاں بلبن گھوڑا جائے گا وہ بھی

جائیں گے۔ قفسہ دراصل یہ تھا کہ بزرگوار اور گھوڑا ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو چکے تھے کہ اگر گھر والے مانع نہ ہوتے تو وہ اسے ڈرائینگ روم میں اپنی چارپائی کے پائے سے بندھوا کر سوتے۔ وہ بھی ان کے قریب آکر خود بخود سر نیچا کر لیتا تاکہ وہ اسے بیٹھے بیٹھے پیار کر سکیں۔ وہ گھنٹوں منہ سے منہ بھڑائے اس سے گھر والوں اور بہوؤں کی شکایتیں اور برائیاں کرتے رہتے۔ بچوں کے لیے وہ زندہ کھلونا تھا۔ بزرگوار کہتے تھے جب سے یہ آیا ہے میرے ہاتھ کا ریشم کم ہو گیا ہے۔ اور بُرے خواب آنے بند ہو گئے۔ وہ اب اسے بیٹھا کہنے لگے تھے۔ سدا روگی سے اپنے پرانے سب اکتا جاتے ہیں۔ ایک دن وہ چارپانچ گھنٹے درد سے کراہتے رہے۔ کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو اختلاج اور مایوسی زیادہ بڑھی تو خانساں سے کہا کہ بلین بیٹے کو بلاؤ۔ بڑھاپے اور بیماری کے بھیانک سنائے میں یہ دُکھی گھوڑا ان کا واحد ساتھی تھا۔

اک لقمہ ترکی صورت

گھوڑے کو جوت نہیں سکتے۔ بیچ نہیں سکتے۔ ہلاک نہیں کروا سکتے۔ کھڑے کھلا نہیں سکتے۔ پھر کہیں تو کیا کریں۔ جب بلیک موڈ آتا تو اندر ہی اندر کھولتے اور اکثر سوچتے کہ سیٹھ، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور بڑے افسر اپنی شقاوت اور کرپشن کے لیے زمانے بھر میں بدنام ہیں۔ مگر یہ ”بے رحمی والے“ دو ٹکے کے آدمی کس سے کم ہیں۔ انہیں اس سے پہلے ایسے رجعتی اور غیر انقلابی خیال کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی سوچ میں ایک مردم گزیدہ کی کلہمیت اور جھنجھلاہٹ در آئی۔ یہ لوگ تو غریب ہیں۔ مظلوم ہیں۔ مگر یہ کس کو بختتے ہیں؟ سنتری بادشاہ بھی تو غریب ہے۔ وہ رڑھی والے کو کب بختتا ہے؟ اور غریب رڑھی والے نے کل شام آنکھ پچا کر ایک سیر سیبوں میں دوداغ دار سیب ملا کر تول دیے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے۔ صرف ایک چھٹانک اس لیے کہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائق صدر رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے جیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کو چوان سے زیادہ مسکین کون ہو گا؟ ظلم، ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پھیمہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اژدہا سالم بھگتا ہے۔ شادک داتوں سے خونم خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چپا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی، چھپکلی، مکڑی اور مچھر سب حسب مقدور و مقدار خون کی چُسکی لگاتے ہیں۔ بھائی

میرے! بخشنا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈیل بھی کھاتے یاد آگئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ بھائی میرے! بخشنا کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا زوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

تب نظر آتی ہے اک لقمہ ترکی صورت

۴

سطح سمندر اور خطِ ناداری سے نیچے

آئے دن کے چالان تاوان سے وہ عاجز آچکے تھے۔ کیسا اندھیر ہے۔ سارے پاکستان میں یہی ایک جرم رہ گیا ہے! بہت ہو چکی۔ اب وہ اس کا دو ٹوک فیصلہ کر کے چھوڑیں گے۔ مولانا کرامت حسین سے وہ ایک دفعہ مل چکے تھے اور ساری دہشت منحل چکی تھی۔ پون انچ کم پانچ فٹ کا پودنا! اس کی گردن ان کی کلائی کے برابر تھی۔ گول چہرے اور تنگ پیشانی پر پرچپک کے داغ ایسے چمکتے تھے جیسے تابنے کے برتن پر ٹھنکے ہوئے کپڑے۔ آج وہ گھر کا پتا معلوم کر کے اس کی خبر لینے جا رہے تھے۔ پورا ڈائلاگ، ہاتھ کے اشاروں اور آواز کے زیر و بم سمیت، تیار تھا۔ آج اس کا داڑھا پکڑ کے پوچھوں گا کہ ماتھے پر یہ ادھورے سدھورے گئے کا ٹریڈ مارک لگائے پھرتے ہو۔ ایک دفعہ پیسہ آگ میں دھکا کر اچھی طرح دغوا کیوں نہیں لیتے کہ پانچ وقت نکمیں مارنے کی جھنجھٹ سے نجات ملے۔ داڑھی پر انہیں کسی دل چلے کی پھبتی بھی یاد آئی۔ ”قصرِ تقدس کا چھتیا!“ ان کے طنز کا سارا زور نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے پر تھا، گویا اصل گناہ وہی ہے!“ سمجھتے کیا ہو؟ تم جیسے چہرے تو اپنے نیچے میں رکھتا ہوں۔ حلوہ پلاؤ کھا کھا کے تم ملاں لوگ ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اللہ کی رسی کو پکڑ رہے ہو! تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! میں بھی اپنی پہ آگیا تو پائی پائی آیتوں میں سے نکلا لوں گا۔“ رہبرِ سلاستیا مکمل تھا کہ ذہن میں یہ تک نوٹ کر لیا تھا کہ اللہ کی رسی کہنے سے پہلے دل میں نعوذ باللہ ضرور کہیں گے۔

انہیں لیاری میں مولانا کرامت حسین کی جھگی تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی، حالانکہ بتانے والے نے بالکل صحیح پتہ بتایا تھا کہ جھگی بجلی کے کھمبے نمبر ۲۳ کے عقب میں کپڑی کے دلدل کے اس پار ہے۔ تین سال سے کھمبے بجلی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پتے میں اس کے

دائیں جانب ایک گیا بھن بھوری بھینس بندھی ہوئی بتائی گئی تھی۔ سرکین نہ راستے۔ مگلیاں نہ فٹ پاتھ۔ ایسی بستیوں میں گھروں کے نمبر یا نام کا بورڈ نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا ایک انسانی چہرہ ہوتا ہے۔ اسی کے پتے سے گھر ملتا ہے۔ کھبا تلاش کرتے کرتے انہیں اچانک ایک جھگی کے ٹاٹ کے پردے پر مولانا کا نام کرامت حسین سرخ روشنائی سے لکھا نظر آیا۔ بارش کے ریلوں نے بد خط لکھائی کو خط غبار بنا دیا تھا۔ کراچی کا یہ سب سے پسماندہ علاقہ سطح سمندر اور خط ناداری (Poverty Line) سے گزروں نیچے تھا۔ سمندر کا حصہ ہوتے ہوتے اس لئے رہ گیا تھا کہ درمیان میں انسانی جسموں کا ایک ڈھیٹ پُشتہ کھڑا ہو گیا تھا۔ زمین سے ہر وقت کھاری پانی رستا رہتا تھا جو لکڑی اور لوہے کو چند مہینوں میں کھاد بنا دیتا تھا۔ ہوا میں رُکے ہوئے سمندری پانی کی سڑاند بسی ہوئی تھی جو سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو سے بھی بدتر تھی۔ چاروں طرف ٹخنوں ٹخنوں بج بجاتا کچھو۔ خشک زمین کہیں نظر نہ آئی۔ چلنے کے لیے لوگوں نے پتھر اور اینٹیں ڈال کر پگ ڈنڈیاں بنالی تھیں۔ ایک نو دس سال کی بچی سر پر خود سے زیادہ بھاری گھڑا رکھے، اپنی گردن اور کمر کی جنبش سے پیروں کو دگمکاتے پتھروں پر اور گھڑے کو سر پر میلنس کرتی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے ریلے بہہ رہے تھے۔ راستے میں جو بھی ملا اُس نے بچی کو احتیاط سے چلنے کا مشورہ دیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ چھ اینٹوں کا ٹریفک آئی لینڈ آتا تھا، جہاں جانے والا آدمی گھڑے رہ کر آنے والا کو راستہ دیتا تھا۔ جھگیوں کے اندر بھی کچھ ایسا ہی منقشہ تھا۔ بچے، بزرگ اور بیمار دن بھر اونچی اونچی کھانٹوں اور کھٹوں پر ٹنگے رہتے۔ قرآن شریف، لپٹے ہوئے بستر، برتن بھاڑے، متروکہ جائداد کی دستاویزات، میٹرک کے سرٹیفکیٹ بانس کے چمان پر۔۔۔ ترپال تلے۔ اور ترپال کے اوپر مرغیاں۔ مولانا کرامت حسین نے جھگی کے ایک کونے میں کھانا پکانے کے لیے ایک ٹیکری پر ایک چبوترہ بنا رکھا تھا۔ ایک کھاٹ کے پائے سے بکری بھی بندھی تھی۔ کچھ جھگیوں کے سامنے بھینسیں کچھڑ میں دھنسی تھیں اور ان کی پیٹھ پر کپڑا پلا سٹریٹا رہا تھا۔ یہ بھینسوں کی جنت تھی۔ ان کا گوبر کوئی نہیں اٹھاتا تھا، اس لیے کہ اُپلے تھاپنے کے لیے کوئی دیوار یا خشک زمین نہیں تھی۔ گوبر بھی انسانی فضلے کے ساتھ اسی کچھڑ میں مٹھ جاتا تھا۔ ان ہی جھگیوں میں ٹین کی چادر کے سلنڈر ناڈے بھی نظر آئے جن میں دودھ بھر کے صدر کی سفید ٹائلوں والی ڈیری کی دکانوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ایک لنگڑا کتا جھگی کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے اچانک خود کو جھڑ جھڑایا تو اس کے زخم پر بیٹھی ہوئی مکھیوں اور ادھ سوکھے کچھڑ کے چھڑے اُڑ اُڑ کر بشارت کی قمیض اور چہرے پر لگے۔ جن پڑھنے والوں

نے اس زمانے کی بہار کالونی ، چاکی واڑہ اور لیاری نہیں دیکھی وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ انسان ایسی گندی ، اگھوری حالت میں نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ نئی زندگیوں کو جنم بھی دے سکتا ہے ۔ ایسا تعفن ، ایسی بھیانک غلاظت تو مشرقی پاکستان میں بھی نظر نہ آئی ۔ وہاں انسان نہ سہی ، کم از کم نیچر تو مہربان تھی ۔ دھوپ ، پانی اور ہوا ہر چیز کو پاک اور صاف کرتے رہتے تھے ۔ چلچلاتی دھوپ ، لال آندھیاں ، بچے کے آنسوؤں جیسی برسات ، کف در کنار سیلاب ، سائیکلون ۔۔۔ ان سے زیادہ تیز و تند ، ظالم اور بے خطا ڈس انفکٹنٹ اور کیا ہو گا ۔ تاہم بارہ سال کے دو منظر نہیں بھولتے ۔ لگتا ہے کسی نے ذہن پر تیز زبانی قلم سے کندہ کر دیے ہیں ۔

سونار بنگلہ

۱۹۶۷ء میں ہمیں کار اور ”فیری“ سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا ۔ چھ سات سو میل کے سفر میں کوئی فرلانگ ایسا نہ تھا جس میں اوسطاً پانچ چھ آدمی سڑک پر پسیدل چلتے نظر نہ آئے ہوں ۔ اوسطاً بیس میں سے صرف ایک کے پیر میں چپٹل ہوں گے ۔ نہ ہمیں کسی کے پورے تن پر کپڑا نظر آیا ، سوائے میت کے ! راستے میں تین جنازے ایسے دیکھے جن کے کفن کی چادر دو مختلف رنگوں کی لنگیاں جوڑ کر بنائی گئی تھی ۔ ایک ضعیف شخص ایک جنازے پر پھٹی چھتری لگائے چل رہا تھا ۔ یہ مرنے والے جوان کا باپ تھا ۔ اس کی سفید داڑھی اور آنکھوں سے بارش کے ریلے بہہ رہے تھے ۔ ہم بارہ سال سے گزر رہے تھے ۔ بلا کی اُس تھی ۔ پیاس سے بُرا حال ۔ پانی یا لیمنیڈ پینے کا سوال ہی نہ تھا ، اس لیے کہ ان دنوں ہر جگہ ہیضہ پھیلا ہوا تھا ۔ سڑکوں پر جنازے ہی جنازے نظر آتے تھے ۔ ایک بے تکلف دوست نے ٹپ دیا تھا کہ راستے میں خود کشی کرنے کو جی چاہے تو بازار سے کوئی بھی چیز لے کر کھا لینا ۔ ناریل کے بارے میں البتہ ایک بنگالی دوست نے کم و بیش وہی بات کہی جو غالب آم کے بارے میں کہہ گئے ہیں :

انگیں کے بحکم رب الناس

بھر کے بھیجے ہیں سر مہر مگلاس

اس دوست نے کہا تھا کہ ناریل میں جراثیم کا گزر نہیں ۔ پانی کے بجائے یہی توڑ توڑ کر پینا ۔ السر کو بھی فائدہ کرتا ہے ۔ ہم نے چھ چھ پیسے کے دو ناریل خریدے ۔ ڈرائیو نے ناریل والے ہی سے مانگ کر پانی پیا اور اپنے حصے کا ناریل کار کے بوٹ میں سنگوا کر رکھ لیا ۔ ہم نے ناریل وہیں توڑا ۔ اندر کھوپرے کی بہت پتلی اور نرم تہ نکلی ۔ ایسے ادھ کچرے ناریل کی ڈاب بہت

مفرح، ملین اور شیریں ہوتی ہے۔ ڈاب پی کر نارمل ہم نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ پان والے سے ”تھری کاسل“ سکرٹ کی ڈیبا خریدی۔ سکرٹ نکالا تو بے حد پرانا اور سوکھا کھڑنک۔ کیڑے نے اس میں مہین مہین سوراخ کر دیے تھے جن کی وجہ سے کش میں جگہ جگہ پنکچر ہو جاتے تھے۔ ایسے سکرٹوں سے ہمارے یہاں ان گھروں میں تواضع کی جاتی ہے جہاں صاحب خانہ خود سکرٹ نہیں پہنتا۔ اور عید الفطر پر خریدے ہوئے سکرٹ کے پیکٹ سے دوسری عید الفطر تک بالاصرار اپنے ملاقاتیوں کے حلق اور اخلاق کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ کون سا ظالم کیڑا ہو گا جو تمباکو سے اپنا بیٹ بھر کے زندہ رہتا ہے۔ اس کا تو مالحم اور گشتہ بنا کر کینسر کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھی عورت کوڑے کے ڈھیر کی طرف بڑھی۔ اس نے گھوڑے کی گہرائیوں میں سرنگیں لٹائی ہوئی بلیوں اور ایک آٹول سے جڑی آلائش کو بھنبھوڑتے ہوئے کتے کو ڈھیلے مار مار کر بھگا دیا۔ اس کے تن پر بغیر چولی کی لیر لیر ساری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ قدم جا جا کر گھوڑے پر چڑھی۔ جیسے ہی اس نے پیر سے آٹول پر بے ہشایا ایک چیل جھپٹا مار کر اسے لے گئی، مگر ابھی پوری طرح اٹھی بھی نہ تھی کہ پنچے سے چھوٹ گیا۔ بڑھیا رسان سے نارمل اٹھالائی کہ اس کا کوئی اور دعوے دار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک مٹی سے بچی اور دو تیک دھڑنگ لڑکے تھے جن کی یہ غالباً نانی یادادی ہوگی۔ وہ نارمل کا گودا کھرچ کھرچ کے بڑے ندیدے پن سے کھاتی رہی، یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو تھوڑا سا کھوپرا دیا۔ بچی اتنی چھوٹی تھی کہ بڑھیا نے کھوپرے کو پہلے خود اپنے پوپلے منہ سے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر منہ سے منہ ملا کر اُمال بچی کے منہ میں ڈالا۔ جب وہ نارمل اٹھانے کے لیے گھوڑے پر جھکی تو اس کی تنگی چھاتیماں بھلبھلائے بینگن کی مانند جھریائی ہوئی اور خالی او جھڑی کی طرح جھول رہی تھیں۔ لگتا تھا کھمبیوں کی طرح یہ بھی اسی زمین سے اگی ہیں۔ نہ تو دیکھنے والوں کو، نہ خود اس مائی کو اپنے تنگے ہونے کا احساس تھا، لیکن اس دن میں نے اپنے آپ کو بالکل تنکا محسوس کیا۔

دوسرا منظر ذرا آگے چل کر بازار میں دیکھا۔ بینک کے دفتر کے سامنے کوئی چار فٹ اونچے تھڑے پر ایک شخص مچھلی بیچ رہا تھا۔ اس کے بنیان میں بے شمار آنکھیں بنی تھیں۔ اس پر اور لنگی پر مچھلی کے خون اور آلائش کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ بہت گندے ہو جاتے تو وہ انہیں لنگی پر رکڑ کر تازہ گندگی کو پرانی گندگی سے پونچھ لیتا تھا۔ جب تھوڑے تھوڑے وقفے سے مچھلیوں پر پانی کے چھپکے دینے سے مکھیوں کے چتے اڑ جاتے تو منظر آتا کہ مچھلی کتنی چھوٹی اور

کس ذات کی ہے۔ غلیظ پانی اور پھیلیوں کا کچڑا ایک ٹین کی نالی سے ہوتا ہوا نیچے رکھے ہوئے کنسٹر میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ بغداد سے کسی بڑی مچھلی کے ٹکڑے کر کے بیچتا تو اس کے کھیرے اور پیٹ کی آلائش بھی اسی کنسٹر میں جاتی تھی۔ وہ جب بھر جاتا تو اسے ہٹا کر دوسرا کنسٹر رکھ دیا جاتا۔ بلیاں بار بار پھلی ٹانگوں پہ کھڑی ہو کر منہ مارتیں اور چھچھڑوں کو کنسٹر میں گرنے سے پہلے ہی بڑی تیزی سے اچک لیتیں۔ دیکھنے والے کو ہول آتا تھا کہ تیز چلتے ہوئے بغداد سے بلی کا سر کچھ سے اب اڑا کر اب اڑا۔ کوئی جوان عورت مچھلی لینے آتی تو مچھلی والا ڈھال ڈھال کر بلی کو آرزو بھری مالمالیاں دینے لگتا۔ کوئی ایک گھنٹے میں اس نے دو بھرے ہوئے کنسٹر ایک ایک آنے میں بیچے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ غریب غربا اس پانی میں چاول بکاتے ہیں، تاکہ چاولوں میں پھر اند (مچھلی کی باس) بس جائے۔ مچھلی کی بدبو کے اس ایسنس کے ایک کنسٹر سے تین گھروں میں ہنڈیا پکتی ہے۔ غریبوں میں جو لوگ نسبتاً آسودہ حال ہیں، وہی یہ لکڑی افور ڈر پاتے ہیں!

خاندانِ مغلیہ کا زوال و نزول

بشارت نے جھکی کے باہر کھڑے ہو کر مولانا کو آواز دی، حالانکہ اس کے ”اندر“ اور ”باہر“ میں کچھ ایسا فرق نہیں تھا۔ بس چٹائی، ٹاٹ اور بانسوں سے اندر کے کچڑا اور باہر کے کچڑا کے درمیان حد بندی کر کے ایک خیالی privacy (تخلیہ) اور ملکیت کا حصار کھینچ لیا تھا۔

یہ میری لحد، وہ تیری ہے

کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے حیدر آبادی انداز سے تالی بجائی، جس کے جواب میں اندر سے چھ بچوں کا تلے اوپر پتیلیوں کا ساسیٹ نکل آیا، جن کی عمروں میں بظاہر نو نو مہینے سے بھی کم فرق نظر آ رہا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے کہا، مغرب کی پڑھنے گئے ہیں۔ تشریف رکھیے۔ بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہاں تشریف رکھیں۔ ان کے پیر تلے اینٹیں ڈگلا رہی تھیں۔ تعفن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ جہنم اگر روئے زمین پر کہیں ہو سکتا ہے تو۔

ہمین است و ہمین است و ہمین است

وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریرہ سل کرتے ہوئے آئے تھے۔ یہ کیا اندھیر ہے، مولانا؟ کچکا کر مولانا کہنے کے لیے انہوں نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت سڑی مالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن جھکی اور کچڑا دیکھ کر انہیں اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر

اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو اٹے عیش آجائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے کے لئے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے، ان سب پر داڑھیاں لٹا کر جاننا زینس لپیٹ دی تھیں تاکہ چوٹ بھلے ہی نہ آئے، شرم تو آئے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس شخص کو کمالی دینے سے فائدہ؟ اس کی زندگی تو خود ایک کمالی ہے۔ ان کے گرد بچوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلہ ملامت ٹوٹا۔ انہوں نے ان کے نام پوچھنے شروع کئے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب۔ یا اللہ! پورا دودمان مغلیہ اس ٹپکتی جھٹکی میں تاریخی تسلسل سے ترتیب وار اتر رہا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو گیا، مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ چھٹ بھتیوں پر اتر آئے تھے۔ مثلاً ایک لختِ جگر کا پیار کا نام (مرزا) کو کا تھا، جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا جس کو اس نے قلعے کی فصیل پر سے نیچے پھنکوا دیا تھا۔ اگر حقیقی بھائی ہوتا تو اس سے بھی زیادہ سخت سزا دیتا۔ یعنی قزاقوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے حج پر بھیج دیتا یا آنکھیں نکلوا دیتا۔ وہ رحم کی اپیل کرتا تو ازراہِ ترجم خسروانہ و شفقتِ برادرانہ جلاؤ سے ایک ہی وار میں سر قلم کروا کے اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ جو شیر خوار یا گھٹنوں چلتے بچے اندر رہ گئے تھے ان کے ناموں سے بھی شکوہ شاہانہ ٹپکتا اور تاج و تخت سے وابستگی کا نشان ملتا تھا، حالانکہ یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے کون تخت پر متمکن ہونے کے بعد قتل ہوا اور کون پہلے۔ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد استراخ سلطنت اور طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ بارہ سال میں آٹھ بادشاہ اس طرح سریر آرائے سلطنت ہوئے کہ ایک بادشاہ ٹھیک سے تخت پر بیٹھ نہیں پاتا تھا کہ اس کا تختہ الٹ دیا جاتا۔ تاج اور سروا میں بازی مگر کی گیندوں کی طرح اچھلنے لگے۔ ہر چند کہ اورنگ زیب کو موسیقی سے نفرت تھی، لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت و تاج کے دعویداروں نے شاہی تخت کے گرد میوزیکل چئیرز کھیلنا شروع کر دیا۔ اس ادنیٰ تصرف کے ساتھ کہ میوزک کے بجائے شاعر لہک لہک کر قصیدے پڑھتے اور جب پڑھتے پڑھتے اچانک رگ جاتے تو ایک نیا شہزادہ جھٹ سے تخت پر بیٹھ جاتا۔ نادر شاہ کو یہ مغنی کھیل ایسا بھایا کہ تخت طاؤس اٹھوا کے وطن لے گیا۔ اس کے باوجود کھیل جاری رہا۔ تخت اٹھوانے کے ضمن میں ہم نے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری کا محاورہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ چین کی بانسری بجانے کے لیے بادشاہوں اور آموں کو بانس کی محتاجی کبھی نہیں رہی۔ شاہوں کا نالہ پابند لے ہی نہیں، پابند نے بھی نہیں ہوتا۔

ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ خانوادہ تیمور کے جو باقی ماندہ چشم و چراغ جھگی کے اندر تھے ان کے نام بھی تخت نشینی بلکہ تختہ الٹنے کی ترتیب کے اعتبار سے درست ہی ہوں گے، اس لیے کہ مولانا کا حافظہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لائحہ عمل بناتے وقت انہوں نے خاندانی منصوبہ شکنی کو تاریخ مغلیہ کے تقاضوں اور تخت نشینی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تابع رکھا ہے۔ بشارت نے پوچھا، تم میں سے کسی کا نام اکبر نہیں؟ بڑے لڑکے نے جواب دیا، نہیں جی۔ وہ تو دادا جان کا تخلص ہے۔

گفتگو کا سلسلہ کچھ انہوں نے کچھ بچوں نے شروع کیا۔ انہوں نے دریافت کیا، تم کتنے بھائی بہن ہو؟ جواباً ایک بچے نے ان سے پوچھا، آپ کے کتنے چچا ہیں؟ انہوں نے دریافت کیا، تم میں سے کوئی پڑھا ہوا بھی ہے؟ بڑے لڑکے تیمور نے ہاتھ اٹھا کر کہا، جی ہاں! میں ہوں۔ معلوم ہوا یہ لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی، مسجد میں بغدادی قاعدہ پڑھ کر کبھی کا فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ تین سال تک پنکھے بنانے کی ایک فیکٹری میں مفت کام سیکھا۔ ایک سال ہوا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مشین میں آگیا۔ کاٹنا پڑا۔ اب ایک مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا ہے۔ ہمایوں اپنے ہم نام کی طرح ہنوز خواری و آوارہ گردی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر تک پہنچتے پہنچتے پاجامہ بھی طوائف الملوکی کی نذر ہو گیا۔ البتہ شاہ جہاں کا ستر پھوڑوں پھنسیوں پر بندھی ہوئی پٹیوں سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے تن پر صرف اپنے والد کی ترکی ٹوپی تھی۔ بشارت کو اس کی آنکھیں اور اسے بشارت منظر نہ آئے۔ سات سال کا تھا مگر بے حد باتونی۔ کہنے لگا، ایسی بارش تو میں نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہاتھ پیر ماپس کی تیلیاں، لیکن اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد تھی نور جہاں آئی۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں کاجل اور کٹائی پر نظر گزر کا ڈورا بندھا تھا۔ سارے منہ پر میل، کاجل، ناک اور گرد لہپی ہوئی تھی، سوائے ان حصوں کے جو ابھی ابھی آنسوؤں سے دھلے تھے۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سنہری بالوں میں گیلی لکڑیوں کے کڑوے کڑوے دھوئیں کی بوبسی ہوئی تھی۔ ایک بھولی سی صورت کا لڑکا اپنا نام شاہ عالم بتا کر چل دیا۔ آدھے راستے سے واپس آکر کہنے لگا کہ میں بھول گیا تھا۔ شاہ عالم تو بڑے بھائی کا نام ہے۔ یہ سب مغل شہزادے کچھ زمینیں ایسے مزے سے پھچاک پھچاک چل رہے تھے جیسے ان کا سلسلہ نسب امیر تیمور صاحبقران کے بجائے کسی راج ہنس سے ملتا ہو۔

ہر کو نے کھد رے سے بچے اُبلے پڑ رہے تھے۔ ایک کمانے والا اور یہ تیرا دماغ چکرانے

عالم تمام حلقہ دایم عیال ہے

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ دیر بعد مولانا آتے ہوئے منظر آئے۔ کپڑوں میں ڈنگ ڈنگ کرتی اینٹوں پر سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس ڈانواں ڈول پگڈنڈی پر اس طرح چلنا پڑتا تھا جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکی تھیں ہوئے تار پر چلتی ہے۔ لیکن اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود کو کھلی چھتری سے میلنس کرتی رہتی ہے۔ ذرا ڈنگا کر گرنے لگتی ہے تو تماشائی پلکوں پر جھیل لیتے ہیں۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر بوکھلا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاؤں اینٹ پر پھسل گئی، وہ دائیں ہاتھ کے بل جس میں دم کے پانی کا گلاس تھا، گرے۔ ان کا تہمد اور داڑھی کپڑوں میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کپڑا کا موزہ سا پڑھ گیا۔ ایک بچے نے بدقلبی لوٹے سے پانی ڈال کر ان کا منہ ہاتھ دھلایا۔ بغیر صابن کے۔ انہوں نے انگوچھے سے تسبیح، منہ اور ہاتھ پونچھ کر بشارت سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ بشارت ڈھس چکے تھے۔ ریہرسل کیے ہوئے طعن آمیز ابتدائی فقرے جو داڑھی، ناز اور گتے سے متعلق تھے، اس کپڑوں میں غرق ہو گئے ”قصر تقدس کا چھتجا“ والی پھبتی بھی اسی بچ بجاتی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ ان کا بے اختیار جی چاہا کہ بھاگ جائیں۔ مگر دلدل میں آدمی جتنی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، اتنی ہی تیزی سے دھنستا چلا جاتا ہے۔

ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی شش و پنج میں انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے، جس سے ذرا دیر پہلے بہ کراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھایا تو اُبکائی آنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے اس ہاتھ کو اپنے جسم اور کپڑوں سے ایک بالشت دور رکھا۔ مولانا غایت آمد بھانپ گئے۔ خود پہل کی۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ میں آپ کے کوچوان رحیم بخش سے پیسے لیتا رہا ہوں۔ پڑوسن کی بچی کے علاج کے لیے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میری تعیناتی سے پہلے یہ دستور تھا کہ آدمی رقم آپ کا کوچوان رکھ لیتا تھا۔ اب جتنے پیسے آپ سے وصول کرتا ہے وہ سب مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا حصہ ختم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ مجھ سے اپنی بیوی کے لیے تعویذ لے گیا۔ اللہ نے اس کا مرض دور کر دیا۔ وہی شافی و کافی ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ اس کے بعد وہ میرا محقق ہو گیا۔ بہت دکھی آدمی ہے۔

مولانا نے یہ بھی بتایا کہ پہلے آپ چالان اور رشوت سے بچنے کے لیے جب بھی اسے راستہ بدلنے کا حکم دیتے، وہ محکمہ والوں کو اس کا پیشگی نوٹس دے دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ برضا و رغبت پکڑا جاتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک دفعہ انسپکٹر کو نمونیہ ہو گیا اور وہ تین ہفتے تک ڈیوٹی پر نہیں آیا تو رحیم بخش ہمارے آفس میں یہ دریافت کرنے آیا کہ اتنے دن سے چالان کیوں نہیں ہوا۔ خیریت تو ہے؟

بشارت نے دو تین سوال کو چوان سے متعلق تو کیے، لیکن مولانا کو کچھ کہنے سننے کا اب ان میں یارا نہ تھا۔ ان کا بیان جاری تھا۔ وہ محبوب خاموشی سے سنتے رہے:

”میرے والد کے کو لھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔ ایک تو استا گہرا ہے کہ پوری انگلی اندر چلی جائے۔ سستی برابر موٹی ایک رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہو چکی ہے۔ ڈالڈا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چاروں پایوں کے نیچے رکھ دیے ہیں تاکہ دوبارہ لال چیونٹے زخموں میں نہ لگیں۔ پڑوسی آئے دن جھگڑتا ہے کہ ”تمہارے بڑھنوں دن بھر تو خڑائے لیتے ہیں اور رات بھر چختے کراہتے ہیں۔ ناسوروں کی سڑاند کے مارے ہم کھانا نہیں کھا سکتے۔ وہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ فقط چٹائی کی دیوار ہی تو مچ میں ہے۔ چار مہینے قبل فضل ایزدی سے ایک اور فرزند تولد پذیر ہوا۔ اللہ کی دین ہے۔ بن مانگے موتی ملیں مانگی ملے نہ بھیک۔ اللہ نبی کی امت کو بڑھاتا ہے۔ جا پے کے بعد ہی بیوی کو white leg ہو گئی۔ ہل نہیں سکتی۔ مرضی مولا۔ رکشامیں ڈال کر جناح اسپتال لے گیا۔ کہنے لگے، فوراً اسپتال میں داخل کراؤ۔ مگر یہاں کوئی میڈ خالی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ اب کی دفعہ کہنے لگے ”اب لائے ہو! لمبی بیماری ہے۔ ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کر سکتے۔ صبر کیا۔ راضی ہیں ہم اسی میں جس میں رضا ہو تیری۔ فجر اور مغرب کی نماز سے پہلے دونوں مریضوں کا گوہ موت کرتا ہوں۔ نماز کے بعد خود روٹی ڈالتا ہوں تو بچوں کے پیٹ میں کچھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ نور جہاں نے ماں کے لیے بکری کا دودھ گرم کیا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اللہ کا لکھ لکھ شکر ہے، میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔“

بشارت اب کہیں اور پہنچ چکے تھے۔ اب نہ انہیں بدبو آ رہی تھی نہ متلی ہو رہی تھی۔ سنائے میں آگئے تھے۔

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے فسانہ دہر
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنانہ گیا

مولانا نے کہا کہ دائی کا علاج ہے۔ عرق مکو، رومی مصطلکی، مغز کنجشک اور افیم کالیپ بتایا ہے۔
بڑی ہمدرد عورت ہے۔ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے پانی دم کروا کے لاتا ہوں۔ سو
ڈیڑھ سو غازیوں کے اشغاس متیر کہ بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ مگر شاید مولانا کو
شفا منظور نہیں۔ مرضی مولانا جہدِ اولیٰ۔

مشیت لیزدی اور مرضی مولانا کے جتنے حوالے اس آدھ گھنٹے میں بشارت نے سنے اتنے
پچھلے دس برسوں میں بھی نہیں سنے ہوں گے۔ مولانا کی باتوں سے انہیں ایسا لگا جیسے اس بے
نوا نگری میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خدا کی عین مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

انہیں اس سُرنگ کے دوسری طرف بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ ایسی ناامیدی،
ایسی بے بسی، ایسے اندھیرے اور اندھیر کی تصویر کھینچنے کے لیے تو داتے کا قلم چاہیے۔

پلید باتھ

مولانا کو جیسے کوئی بات اچانک یاد آگئی اور وہ معذرت کر کے کچھ دیر کے لیے اندر چلے
گئے۔ ادھر بشارت اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اس ایک آپار چھگی میں جس میں نہ کمرے ہیں نہ
پردے، نہ دیوانہ نہ دروازے، جس میں آواز ٹیس اور سوچ تک تنگی ہے، جہاں لوگ شاید
ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک کونے میں بوڑھا باپ پڑا دم توڑ رہا
ہے۔ دوسرے کونے میں زچگی ہو رہی ہے اور درمیان میں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ بھائی
میرے! جہاں اتنی رشوت لی تھی وہاں تھوڑی سے اور لے کر بیوی کو اسپتال میں داخل کر دیتے
تو کیا حرج تھا۔ جان پر بنی ہو تو شراب تک حرام نہیں رہتی۔ لیکن پھر ہانڈی چولہا، جھاڑو
بہارو کون کرتا؟ اس مٹر کا پیٹ کیسے بھرتا؟ مولانا نے بتایا تھا کہ زچگی کے دوسرے ہی دن بیوی
نے بچوں کے لیے روٹی پکائی اور کپڑے دھوئے تھے۔ بشارت سوچنے لگے کہ ان جنگجو تاتاری
عورتوں کے قصیدوں سے تو تاریخ بھری پڑی ہے جو عرب شاہ کے میان کے مطابق تیمور کی فوج
کے شانہ بشانہ نیزوں اور تلواروں سے لڑتی تھیں۔ اگر کوچ کی حالت میں کسی عورت کے دروازہ
شروع ہو جاتا تو وہ دوسرے گھڑسواروں کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو کھڑی ہو جاتی۔
گھوڑے سے اتر کر بچہ جنتی۔ پھر اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گلے میں حائل کرتی اور دوبارہ

گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر سوار ہو کر لشکر سے جا ملتی۔ مگر جھکیوں میں چپ چاپ جان سے گزر جانے والی ان بے نام بی بیوں کا نوحہ کون لکھے گا؟ بشارت کا دم گھٹنے لگا۔ اب تلک مولانا نے کل ملا کر یہی سو ڈیڑھ سو روپے وصول کئے ہوں گے۔ وہ ناحق یہاں آئے۔ انہوں نے موضوع بدلا اور دم کے پانی کی تاثیر کے بارے میں سوچنے لگے کہ ابھی تو یہ بے چاری ایک بیماری میں مبتلا ہے۔ سو آدمیوں کا پھونکا ہوا پانی پی کر سو نئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد مولانا نے اندر پردہ کرایا۔ یعنی جب نور جہاں نے اپنی بیمار ماں کو سر سے پیر تک چیکٹ لحاف اڑھا کر لٹا دیا تو مولانا نے بشارت کو جھکی میں چلنے کو کہا۔ دونوں ایک چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔ اودان پر ایک نقشین سینی میں تام چینی کی نیلی چینک اور دو کپ رکھے تھے۔ کپ کے کناروں پر مکھیوں کی کُٹلتاتی جھالر۔ مولانا نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور اٹھکی سے اچھی طرح رگڑ کر دھویا۔ پھر اس میں چائے بنا کر بشارت کو پیش کی۔ اگر وہ اس اٹھکی سے نہ دھوتے جو کچھ دیر پہلے کپڑوں میں سنی ہوئی تھی تو شاید اتنی اٹھکی نہ آتی۔ مولانا چائے دینے کے لیے جھکے تو ان کی داڑھی سے گٹر کی بو آ رہی تھی۔

مولانا کا بیان جاری تھا۔ بشارت میں اب استاحوصلہ باقی نہیں رہا تھا کہ منظر اٹھا کر ان کی صورت دیکھیں۔ ”مجھے حکمہ انسداد بے رحمی جانو ران ساٹھ روپے تنخواہ دیتا ہے۔ ایک بیٹا سات سال کا ہے۔ ذہن، ڈیل اور شکل صورت میں سب سے اچھا۔ چارپانچ مہینے ہوئے، اسے تین دن بڑا تیز بخار رہا۔ چوتھے دن بائیں ٹانگہ رہ گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ بولا، پولیو ہے۔ انجکشن لکھ دیے۔ خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ میرا بچہ صرف ایک ہی ٹانگہ سے معذور ہوا۔ پڑوس میں، چار جھکی چھوڑ کر، ایک بچی کی دونوں ٹانگیں رہ گئیں۔ وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جو رب چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بن باپ کی بچی ہے۔ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے لائے۔ میں نے اپنے بیٹے کے تین انجکشن اس بچی کو لگوا دیے۔ کیا بتاؤں اس بیوہ بی بی نے کیسی دعائیں دی ہیں۔ پانچوں وقت اس بچی کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔ ہر جمعہ کو جنگلی کبوتر کے خون اور لونگ اور بادام کے تیل سے بیٹے اور اس بچی کی ٹانگوں کی مالش کرتا ہوں۔ ویسے اس ڈاکٹر کا علاج بھی جاری ہے۔ آپ کے کوچوان سے جتنی بار پیسے لیے اسی علاج معالجے کے واسطے لیے۔

بشارت کو ایسا محسوس ہوا جیسے دماغ سُن ہو گیا ہو۔ بیماری، بیماری، بیماری! یہاں لوگ کچر گھان بچے پیدا کرنے اور بیمار پڑنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس آدھ

کھنٹے میں ان کے منہ سے بمشکل دس بارہ جملے نکلے ہوں گے۔ مولانا ہی بولتے رہے۔ بشارت کی زبان پر ایک سوال آکر رہ جاتا تھا۔ کیا سب جھگیوں میں یہی حال ہے؟ کیا ہر گھر میں لوگ اسی طرح رنجہ رنجہ کر جیتے ہیں؟

مولانا جاری تھے ”اے قرض حسنہ سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ آپ کے کوچوان نے دھکی دی تھی کہ ہمارا صاب کہتا ہے دڑھیل کو بول دینا کہ ایسا ذلیل کروں گا، ایسا ملیا میٹ کروں گا کہ یاد کرے گا“۔ یہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ برستا بادل ہمارا اوڑھنا اور کچھ ہمارا بچھونا ہے۔ اس کے آگے اب اور کیا ہو گا؟ مولائے دعا کی تھی، اکل حلال اور صدق مقال عطا ہو۔ عزت کی روٹی ملے۔ گنہ گار ہوں۔ دعا قبول نہ ہوئی۔ اُس پر سب کچھ روشن ہے۔ آج صبح ناشتے میں ایک روٹی کھائی تھی۔ اس کے بعد ایک رکھیل کا دانہ بھی منہ میں گیا ہو تو لحم الخنزیر ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم اتنے بے بس اور عاجز ہو کہ تمہارے ہاتھ سے مکھی بھی ایک ریزہ اٹھا کر لے جائے تو تم اس سے چمچیں نہیں سکتے۔“

مولانا نے کُرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جس میں غار پڑا ہوا تھا۔ دھونکنی سی چل رہی تھی۔ بشارت نے نظریں جھکالیں۔

”مدت سے حضرت ذہین شاہ تاجی سے بیعت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پڑوسی نے جو اس بیوہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس میں حارج سمجھتا ہے، پیر و مرشد کو ایک گمنام خط بھیجا کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ نے رزق حلال کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک تم رشوت کا ایک ایک پیسہ واپس نہ کر دو گے، پلید ہاتھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ خدا مجھ پر رحم فرمائے۔ میرے حق میں دعا کیجیے۔“

مولانا ان کے سامنے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلانے کھڑے تھے۔ ان کے ملیشاکے کرتے پر جذب ہوتے ہوئے آنسوؤں کا ایک سیاہ زنجیرہ سا بن گیا تھا۔ بشارت نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

۵

دواکیلے

ایک ہفتے بعد دیکھا کہ مولانا کرامت حسین، بشارت کی دکان پر منشی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور فیتہ ہاتھ میں لئے دیودار اور ”پین“ لکڑی کی پیمائش کرتے خوش خوش پھر رہے ہیں۔ ان کی تنخواہ تگنی ہو گئی۔ تین چار دن بعد بشارت نے صرف اتنی تنبیہ کی کہ مولانا ایمانداری اچھی چیز ہے، مگر آپ کاہک کے سامنے لکڑی کی گرہ کو اس طرح نہ تنکائیجیے جیسے گھوڑے کی گردن کے زخم کو دیکھ رہے ہوں۔ رحیم بخش کو چوان کو برخاست کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ مولانا کے آتے ہی وہ کہے سنے بغیر غائب ہو گیا۔

گھوڑے کے بکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مولانا کے لحاظ اور مروت میں ”بے رحمی والوں“ نے ستانا چھوڑ دیا۔ بشارت نے بزرگوار سے اشارت کیا کہ آپ کی دعا سے چالانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب آپ ڈرائیونگ روم سے اپنے کمرے میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن بزرگوار گھوڑے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ کسی طرح نفل نماز اور وظیفہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گھوڑا انہیں دیکھتے ہی بقول کو چوان کے پُچیانے لگتا، یعنی مارے خوشی کے اپنے کان کھڑے کر کے دونوں سرے ملا دیتا۔ علی الصبح گھوڑا ڈرائیونگ روم میں بالاصرار وبالالتزام بلوایا جاتا۔ جیسے ہی ”گھوڑا آ رہا ہے!“ کا غلغلہ بلند ہوتا تو جس کو دین و دل یا کچھ اور بھی عزیز ہوتا راستہ چھوڑ کر تماشا دیکھنے دور کھڑا ہو جاتا۔ یہ منظر آرسی مصحف کی یاد دلاتا تھا۔ جب نوشہ کو زنا نے میں بلوایا جاتا ہے تو بار بار اعلان کیا جاتا ہے ”لڑکا آ رہا ہے! لڑکا آ رہا ہے!“ یہ سن کر لڑکیاں بالیاں اور پردہ نشین بیبیاں منقاب اُلٹ کر طباق سے چہرے کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ بدگمانی بے جا نہیں معلوم ہوتی کہ بعض مرد بڑھاپے میں شادی فقط ”لڑکا آ رہا ہے“ سننے کے لالچ میں کرتے ہیں ورنہ جہاں تک محض شکار یا وظیفہ زوجیت کا تعلق ہے تو

اس سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو

بزرگوار اس کی پیشانی پر انگشت شہادت سے ”اللہ“ لکھتے۔ کچھ عرصے سے اس کے پیر پر دم کر کے ہاتھ بھی پھیرنے لگے تھے۔ جس دن وہ ایال میں اٹھکیوں سے کھینچی کرتے ہوئے، اس سے گھروالوں کی شکایتیں نام لے لے کر کرنے لگے، اس دن سے رشتہ انسان اور جانور کا نہیں رہا۔ جب وہ اپنی نئی تکلیفوں کا حال سنا کر چُپ ہو جاتے تو وہ بڑے پیار سے اپنا منہ ان کے

مفلوج جسم سے رگڑنا اور پھر سر جھکا لیتا - جیسے کہ رہا ہو کہ بابا! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ دکھی تھکے! وہ کہتے تھے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری بائیں ٹانگ میں دھیرے دھیرے پھر سے sensation (حس) آ رہی ہے -

غرض کہ بزرگوار اب اسے گھوڑا سمجھ کر بات نہیں کرتے تھے۔ ادھر گھوڑا بھی ان سے اس قدر مانوس ہو گیا اور ایسی یگانگت برتتے لگا جیسے وہ انسان نہ ہوں - وہ اب اسے کبھی گھوڑا نہیں کہتے تھے - بلبلن یا بیٹا کہہ کر پکارتے - وہ آتا تو دونوں کی ملاقات دیدنی و شنیدنی ہوتی:

جیسے مجذوب کے گھر دوسرا مجذوب آئے

بزرگوار ایک دن کہنے لگے کہ گھوڑا دراصل مرغن وحج المفاصل میں مبتلا ہے (انہی کی طرح اب گھوڑے کو بھی ہر مرض عربی میں ہوتا تھا) پھر صراحت فرمایا کہ ٹانگ کے جوڑ جکڑ گئے ہیں - چنانچہ اس کے جوڑ کھولنے کے لیے ڈرائیونگ روم میں انٹیمیٹی جلا کر اپنی نگرانی میں تین سیر کھوئے اور اصلی کھی میں گھیکوار کا حلوہ بنوا کر چالیس دن تک خود کھایا، جس سے ان کی اپنی زبان اور بھوک کھل گئی - ادھر کچھ دن سے وہ یہ بھی کہنے لگے تھے کہ گھوڑے میں جن سما گیا ہے - اسے اتارنے کے لیے جمعرات کی جمعرات مرچوں کی دھونی دیتے اور آدھ سیر دانے دار قلاقند پر نیاز دے کر مستحقین میں تقسیم کرتے - مطلب یہ کہ آدھا خود کھاتے، آدھا اپنے دوست چودھری کرم الہی کے پاس بھجواتے - قلاقند کھاتے جاتے اور فرماتے جاتے کہ بعض جنوں کی نیت کسی طرح نہیں بھرتی - سابق کوچوان رحیم بخش بھی کہتا تھا کہ یہ گھوڑا نہیں، جن ہے - جن پلید آدمیوں کو دکھلائی نہیں دیتے - اسی سے روایت ہے کہ ایک دن میں بلبلن کو صبح ڈرائیونگ روم میں نہ لے جاسکا تو شام کو مغرب کے بعد رتی شڑا کر خود ہی دم کروا کے واپس آ گیا - میں دانہ چارالے کے آیا تو جناب والا ادھر کچھ اور ہی سماں تھا - دیکھا کہ اس کے سُم کا فور کے ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایسی چکا چوند شاعیں نکل رہی ہیں کہ آپ ادھر بٹکا بھر کر دیکھ نہیں سکتے - تنھوں سے لو بان کا دھواں نکل رہا ہے - اس پر عبداللہ گزک والے نے رحیم بخش کے سر کی قسم کھا کر کہا کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے، عین اسی وقت میں نے گھوڑے کو کلفٹن میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کی درگاہ کے سامنے کھڑا دیکھا - اس پر ایک نورانی داڑھی والے سبز پوش بزرگ سوار تھے -

بزرگوار نے گھوڑے کی کرامات کو اپنی کرامات سمجھا - کرید کرید کر کئی بار سبز پوش بزرگ کا حلیہ پوچھا اور ہر بار جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا کہ بزرگ کا حلیہ ان سے نہیں ملتا تھا - اب وہ

بلبن بیٹے کو مغرب کے بعد بھی اپنے پاس بلوانے لگے۔ دونوں عشا تک سر جوڑے ایسی باتیں کرتے کہ

لوگ سن پائیں تو دونوں ہی کو دیوانہ کہیں

اس واقعے کے بعد کوچوان گھوڑے کو بلبن صاحب اور شاہ جی کہنے لگا۔ بزرگوار اکثر فرماتے کہ یہ گھوڑا بھاکوان ہے۔ بشارت کے ہاں لڑکے کی ولادت کو وہ گھوڑے کی آمد سے منسوب کرتے تھے! محلے کی چند بانجھ عورتیں شاہ جی کے درشن کو آئیں۔

”وقوعہ ہو گیا“

ہم یہ بتانا بھول ہی گئے کہ رحیم بخش کے جانے کے بعد انہوں نے ایک نیا کوچوان رکھا۔ نام مرزا وحید الزماں بیگ۔ مگر شرائط ملازمت کے مطابق بزرگوار اسے بھی الہ دین ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات چیت اور شکل صورت سے مسکین لگتا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا کہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ بھلائی کرنے کو جی چاہتا۔ منگول منقوش، سانولارنگ، گٹھا ہوا بدن، چھوٹے چھوٹے کان، کشادہ پیشانی۔ کاٹھی ایسی ٹاٹھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ صدری کی اندرونی جیب میں پستول کے بجائے ایک گھسی ہوئی نعل کا شیر پنجہ تیز کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ بندر روڈ کے عقب میں ٹرام ڈیو کے پاس جو تھیٹر بکل کمپنی تھی، اس کے کھیل ”رستم و سہراب“ میں وہ ڈیڑھ مہینے تک رستم کا گھوڑا ”رخش“ بنا تھا۔ اسٹیج پر پوری طاقت سے ہنہناتا تو تھیٹر کے باہر کھڑے ہوئے تانگوں کی گھوڑیاں اندر آنے کے لیے لگام تڑانے لگتیں۔ اس کی ایکمنگ سے خوش ہو کر ایک تماشائی نے یہ نعل اسٹیج پر پھینکی تھی۔ چھوٹے سے بچے پر بڑی پاٹ دار آواز پائی تھی۔ روزمرہ گفتگو کے دوران اچانک تھیٹر کی یاد آجائے تو گھوڑے کو واسپ، گویے کو راشن گر اور خود کو روسیاء کہنے لگتا۔ آغا حشر کے دھواں دھار ڈراموں کے گرجتے کڑکتے مکالے زبانی یاد تھے، جنہیں گھوڑے کے ساتھ بولتا رہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے مکالموں کے صحیح مخاطب بھی وہی ہو سکتے ہیں۔ آغا حشر کے مکالے جملہ عروسی میں بھی خود اور زرہ بکتر پہنے، برہنہ تلوار لہراتے داخل ہوتے ہیں، جب کہ میدان جنگ میں ان کا ہر قدم منقارے پر پڑتا ہے۔ الفاظ کے دھنی ہمیشہ قبضے پر کھنکرو باندھ کر تلوار چلاتے ہیں۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت یا یہیلک کے پر زور اصرار پر، ایگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ وصال، تو محبوبہ سے بھی اس مقفی شمشیر برہنہ زبان میں گفتگو فرماتے ہیں جس میں جانی دشمنوں کا قافیہ تیک کرتے

ہیں۔ ایسے نازک مقامات پر بھی جہاں صبرِ شائستگی کا جامہ اترنے لگے، وہ قافے کا دامن دانتوں سے پکڑے رہتے ہیں۔ آغا حشر کے ہیرو کی جان اور آن الفاظ کے طوطوں میں بند ہوتی ہے اور طوطا جتنا چھوٹا ہو، اس سے اتنی ہی بڑی توپ چلاوتے ہیں۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے تانگے والے، ملوں کے مزدور اور خوانچہ فروش تک آپس میں انہی مکالموں کے ٹکڑے بولتے پھرتے تھے۔

مرزا وحید الزماں، بیگ جس کے نام کے آگے یا پیچھے کوچوان لکھتے ہوئے کلیجہ خون ہوتا ہے، اپنا ہر جملہ ”قصور معاف!“ سے شروع کرتا تھا۔ ملازمت کے انٹرویو کے دوران اس نے دعویٰ کیا کہ میں موٹر ڈرائیونگ بھی بہت اچھی جانتا ہوں۔ بشارت نے جل کر حقارت سے کہا، تو پھر تم تانگہ کیوں چلانا چاہتے ہو؟ دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا، پاک پروردگار آپ کو کاروے کا تو کار بھی چلا لیں گے۔

بشارت نے اسے یہ سوچ کر ملازم رکھا تھا کہ چلو مسکین آدمی ہے۔ قابو میں رہے گا۔ مرزا عبدالودود بیگ نے ٹپ دیا تھا کہ ذہانت پر رجبہ کر کبھی کسی کو ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔ ملازم جتنا غبی ہو گا اتنا ہی زیادہ تابعہ دار اور خدمت مند ہو گا۔ لیکن اس نے کچھ دن تو بڑی تابعہ داری دکھائی، پھر یہ حال ہو گیا کہ اسکول سے کبھی ایک گھنٹے لیٹ آ رہا ہے، کبھی دن میں تین تین گھنٹے غائب۔ ایک دفعہ اسے ایک ضروری انوائس لے کر پاکستان ٹورسٹیکو کمپنی بھیجا۔ چار گھنٹے بعد لوٹا۔ بچے اسکول کے پھاٹک پر بھوکے پیاسے کھڑے رہے۔ بشارت نے ڈانٹا۔ اپنی پیٹی کی طرف جیسے راجھ اوزار کی پیٹی بتاتا اور تانگے میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، اشارہ کر کے کہنے لگا، قصور معاف، وقوعہ ہو گیا۔ میونسپل کارپوریشن کی بغل والی سڑک پر گھوڑا اسکندر (ٹھوکر) کھا کے گر پڑا۔ ایک تینگ ٹوٹ گیا تھا۔ نعل بھی جھانجنھن کی طرح بجنے لگی۔ انہیں ٹھیک کر رہا تھا۔ قصور معاف، نعل کی ایک بھی میچ ڈھیلی ہو تو ایک میل دور سے فقط ٹاپ سن کے بتا سکتا ہوں کہ کون سا سٹم ہے۔ بشارت نے حیرت سے پوچھا، تم خود نعل باندھ رہے تھے؟ بولا، اور نہیں تو۔ کہاوت ہے، کھیتی، پانی، مینتی اور گھوڑے کا تینگ۔ اپنے ہاتھ سنوار لیے چاہے لاکھوں ہوں سنگ * گھوڑے کی چاکری تو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔

* کھیتی، پانی، دست بستہ التجا اور گھوڑے کی زمین کا تسمہ یہ سب اپنے ہاتھ سے کرنے کے کام ہیں، خواہ تمہارے ساتھ لاکھوں آدمی ہوں۔

وہ ہر دفعہ نئی داستان اور نیا عذر تراشتا تھا۔ جھوٹے لپاٹی آدمی کی مصیبت یہ ہے کہ وہ سچ بھی بولے تو لوگ جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اسی کی بات سچ نکلی۔ تاہم اس کی بات پر دل نہیں ٹھکتا تھا۔ ایک دن بہت دیر سے آیا۔ بشارت نے آڑے ہاتھوں لیا تو کہنے لگا ”جناب عالی“ میری بھی توسینے۔ میں ریس کلب کے اصطل کے سامنے سے اچھا بھلا گزر رہا تھا کہ گھوڑا ایک دم اڑ گیا۔ چابک مارے تو بالکل الف ہو گیا۔ راہ گیر تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں اندر سے ایک بڑھا سلوتری نکل کے آیا۔ گھوڑے کو پہچان کے کہنے لگا ارے ارے! تو اس شہزادے کو کالے کو مارا رہا ہے۔ اس نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ قسمت کی بد نصیبی کو صیاد کیا کرے۔ یہ تو اصل میں دُر شہوار (گھوڑی کا نام) کی بولیتا یہاں آن کے چملا ہے۔ جس ریس میں اس کی ٹانگ میں موج آئی ہے، دُر شہوار بھی اس کے ساتھ دوڑی تھی۔ دو اتوار پہلے پھراول نمبر پر آئی ہے۔ اخباروں میں فوٹو چھپے تھے۔ بھاگوان نے مالک کو لکھ پتی کر دیا“ پھر اس نے اس کے پرانے سائیس کو بلایا۔ ہم تینوں اسے تانگے سے کھول کے اندر لے جانے لگے۔ اسے سارے دستے معلوم تھے۔ سیدھا ہمیں اپنے تھان پہ لے گیا۔ وہاں ایک بے ڈول کالا بھنگ گھوڑا کھڑا پشتک (دولتی) مار رہا تھا۔ ذرا دور پہ، دوسری طرف دُر شہوار کھڑی تھی۔ وہ اسے پہچان کے میکل ہو گئی۔ کہاں تو یہ اتنا چل رہا تھا اور کہاں یہ حال کہ بالکل چپکا، بے ست ہو گیا۔ گردن کے زخم کی مکھیاں تک نہیں اڑائیں، صاحب جی، اس کا گھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ سائیس نے اسے بہت پیار کیا۔ کہنے لگا بیٹا! اس سے تو بہتر تھا کہ تجھے اسی وقت انجکشن دے کے سُلا دیتے۔ یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔ پر تیرے مالک کو ترس آ گیا پھر اس نے اس کے سامنے ریس کلب کا راتب رکھا۔ صاحب، ایسا چیننا تو انسان کو بھی نصیب نہیں۔ پر قسم لے لو جو اس نے چکھا ہو۔ بس سر جھکائے کھڑا رہا۔ سائیس نے کہا، اسے تو بخار ہے۔ اس نے اس کا بقیہ ساز کھول دیا اور لپٹ کے رونے لگا۔

”صاحب جی! میرا بھی جی بھر آیا۔ ہم دونوں جنے مل کر آبدیدہ ہو رہے تھے کہ اتنے میں ریس کلب کا ڈاکٹر آن چپکا۔ اس نے ہم تینوں کو نکال باہر کیا۔ کہنے لگا، اب اسے بھٹکتی پتیا کو یہاں کالے کو لایا ہے؟ اور گھوڑوں کو بھی مارے گا؟“

نتہ کا سائز

ایک اور موقع پر دیر سے آیا تو قبل اس کے کہ بشارت ڈانٹ ڈپٹ کر کہیں، خود ہی شروع

ہو گیا ”صاحب جی ! تصور معاف - وقوم ہو گیا - میونسپل کارپوریشن کے پاس ایک مشکلی گھوڑی بندھی ہوئی تھی - اسے دیکھتے ہی ایسا درپے ہوا کہ دونوں نے کلفٹن پہنچ کے دم لیا - آگے آگے گھوڑی اس کے پیچھے گھوڑا - پھر کیا نام، یہ روسیہ - چوتھے نمبر پر گھوڑی کا دھنی - صاحب جی، اپنا گھوڑا اس طریقوں جاریا تھا جیسے گلے سے ملائی اُتر رہی ہو“

یہاں اس نے چابک اپنی ٹانگوں کے بیچ میں دبایا اور دوڑ کر بتایا کس طرح گھوڑا، آپ کا غلام اور گھوڑی کا مالک، اسی ترتیب سے گھوڑے کی مطلوبہ کے تعاقب میں سرپٹ جا رہے تھے - ”جناب والا! اس شخص نے پہلے تو مجھے کیا نام کہ نہ کسی کوفتے جیسی آنکھوں سے دیکھا - پھر الٹا مجھی پہ غزلا - حالانکہ میرا گھوڑا بے تصور تھا - سارے ستے اسی کی گھوڑی مڑ کے اپن کے گھوڑے کو دیکھتی رہی کہ پیچھے بروں آ رہا ہے کہ نہیں - میں نے اس کو بولا کہ ایسا ہی ہے تو اپنی بے تھی سنکھنی * کو سنبھال کے کیوں نہیں رکھتے - مالک کی آبرو تو گھوڑی کے ہاتھ میں ہوتی ہے - راہ چلتے گھوڑے کے ساتھ زلیخائی کرتی ہے - جناور کو پیٹنبری آزمائش میں ڈالتی ہے - آخر کو مرد ذات ہے - برف کا پیتلا تو نہیں - صاحب جی! میں نے کیا نام کہ اس دیوث کو بولا کہ جا جا! تیری جیسی گھوڑیاں بہت دیکھی ہیں - کراچی ٹھیٹر کو مینی میں اس جیسی ہی ایک اُچھال چھٹکا چھو کر رہی ہے - پر اس کی نائک ماں اسے اب بھی کنوارپتے کی تھ پہنائے رہتی ہے - جیسے جیسے اس پٹانہ کا چال چلن خراب ہوتا جائے ہے، تھ کا سائز بڑا ہوتا جائے ہے - صاحب جی! یہ سنتے ہی اس کا غصہ رفو چکر ہو گیا - مجھ سے ٹھیٹر کو مینی کا پتہ اور چھو کر کا نام پوچھنے لگا - کہاں تو کالی پہ کالی بک رہا تھا، اور اب مجھے استاد! استاد! کہتے زبان سوکھ رہی تھی - بولا استاد! غصہ تھو کو، یہ پان کھاؤ! قسم سے! اپن کا گھوڑا تو نظریں نیچی کئے، تو بڑے میں منہ ڈالے، میونسپل کارپوریشن کے پاس کھڑا جکالی کر رہا تھا - جناب والا! سوچنے کی بات ہے - اس کی گھوڑی تو دو رکابہ (بہت اونچی) تھی ڈھو کی ڈھو! جب کہ گھوڑا بہت سے بہت آپ کے قد کے برابر ہو گا“

بشارت کے آگ ہی تو لگ گئی ”ابے قد کے بچے! تیرے گھوڑے کے ساتھ ہر وقوم میونسپل کارپوریشن کے پاس ہی ہوتا ہے!“

ہاتھ جوڑ کے بولا ”تصور معاف! اب کی دفعہ وقوم گھوڑے کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ“

* سنکھنی: شاستروں میں عورت کی ایک قسم آئی ہے - اس وقت ہمارے پاس جولفت ہے (علی اردولفت) وہ کہتا ہے کہ اس کا قد دران جسم پھر برا، مزاج چڑچڑا اور زلفیں اور خواہش نفسانی بڑھی ہوئی ہوتی ہے!

بشارت ہئیر کٹنگ سیلون

میونسپل کارپوریشن والا عقدہ بھی بالآخر کھل گیا۔ ان دنوں بشارت اپنی دکان میں سڑک کے رُخ کچھ تبدیلیاں اور اضافے کرنا چاہتے تھے۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں میونسپل کارپوریشن جانے کی ضرورت پیش آئی، مگر کوچوان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھک ہار کر وہ تین بجے رکشامیں میٹھ میونسپل کارپوریشن چل دیے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ فٹ پاتھ پر مرزا وحید الزماں بیگ کوچوان پھٹی دری کا ٹکڑا بچھائے ایک شخص کی حجامت بنا رہا ہے۔ وہ اوٹ میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ حجامت کے بعد اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی صابن اور شیو کی قاشیں استرے سے صاف کیں اور اسے چھوٹے اور اپنی کلائی پر تیز کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل نیم قد کھڑے ہو کر بغلیں لیں۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن ”اوزاروں“ کی جانی پہچانی پیٹی سے پھنگری کا ڈالا اور تبت ٹیکلم پاؤڈر نکالتے دیکھا تو اپنی بینائی پر اعتماد بحال ہو گیا۔ اب جو غور سے دیکھا تو دری کے کنارے پر گتے کا ایک سائن بورڈ بھی نظر آیا جس پر نہایت خوش خط اور جلی حروف میں لکھا تھا:

بشارت ہئیر کٹنگ سیلون

ہیڈ آفس

ہر چند رائے روڈ

بیچ بازار میں اسے بے آبرو کرنا مناسب نہ سمجھا۔ غصے میں بھرے، رکشالے کر دکان واپس آ گئے۔ اس روز وہ اسکول سے بچوں کو لے کر سات بجے شام گھر لوٹا۔ بشارت نے آؤ دیکھا نہ تاق، اس کے ہاتھ سے چابک چھین کر دھکی آمیز انداز میں لہراتے ہوئے بولے ”سچ سچ بتا۔ ورنہ ابھی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ حرام خور! تم نائی ہو! پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہر بات میں جھوٹ۔ بات بے بات جھوٹ۔ آج دیکھتا ہوں کیسے جھوٹ بولتا ہے۔ سچ سچ بتا کہاں تھا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور تھر تھر کانپتے ہوئے کہنے لگا ”قصور معاف! سرکار سچ فرماتے ہیں۔ آج سے، قسم وحدہ لا شریک کی، ہمیشہ سچ بولوں گا۔“

چنانچہ اس کے بعد زندگی میں اس کی جتنی بھی خواری ہوئی، وہ سب سچ بولنے کے سبب ہوئی۔ مرزا کہتے ہیں کہ سچ بول کر ذلیل و خوار ہونے کی بہ نسبت جھوٹ بول کر ذلیل و خوار ہونا بہتر ہے۔ آدمی کو کم از کم صبر تو آجاتا ہے کہ کس بات کی سزا مل رہی ہے۔

بشارت کی جرح پر پہلا سچ جو اس نے بولا وہ یہ تھا کہ میونسپل کارپوریشن کے بندھے ہوئے کابکوں کو نمٹا کر میں ساڑھے چار بجے برنس روڈ پر قحط کرے گیا۔ قحط کے ”براتیوں“ کو جمع ہونے میں خاصی دیر ہو گئی۔ پھر لونڈا کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ اکلوتا لاڈلا ہے۔ آٹھ سال کا دھینکڑا۔ اس کے باوا حاجی مقصود الہی پنجابی سوداگر ان دلی نے بہتیرا بھلایا پھسلایا کہ بیٹا! مسلمان ڈرا نہیں کرتے۔ ذرا تکلیف نہیں ہوگی۔ مگر لونڈا بضد تھا کہ پہلے آپ! آپ کے تو داڑھی بھی ہے۔

بشارت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

ایک اور سچ بزور چلبک اس سے یہ بلوایا گیا کہ اس کا اصل نام بڑھن ہے۔ اس کے میٹرک پاس بیٹے کو اس کے نام اور کام دونوں پر سخت اعتراض تھا۔ بار بار خود کشی کی دھمکی دیتا تھا۔ اس نے بہتیرا سمجھایا کہ بیٹا! بزرگوں کے نام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ مجھ بھلا کے بولا ”اباجی! یہ بات تو شیخ پیر (شکسپیئر) نے کہی تھی۔ پر اس کے باپ کا نام بڑھن تھوڑا ہی تھا۔ وہ کیا جانے۔ تم اور کچھ نہیں بدل سکتے تو کم از کم نام تو بدل لو“۔ چنانچہ جب کچھ دن اس نے ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں چپراسی کی ملازمت کی تو اپنا نام مرزا وحید الزماں بیگ لکھوادیا۔ بس اسی زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ دراصل یہ اس افسر کا نام تھا جس کی وہ بیس سال پہلے حجامت بنایا کرتا تھا۔ وہ لا ولد مرا۔ رشوت سے بنائی ہوئی جائداد پر بھتیجیوں بھانجیوں نے اور نام پر اب اس نے قبضہ کر لیا۔

اب جو کم بخت سچ بولنے پہ آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ مرزا عبدالودود بیگ کا قول ہے کہ فی زمانہ ۱۰۰ فیصد سچ بول کر زندگی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بحری ملائے بغیر، صرف سیمنٹ سے مکان بنانا۔ کہنے لگا ”قصور معاف! اب میں سارا سچ ایک ہی قسط میں بول دینا چاہتا ہوں۔ میرا خاندان غیرت دار ہے۔ اللہ کا شکر ہے، میں ذات کا سائیس نہیں۔ سو سال سے بزرگوں کا پیشہ حجامی ہے۔ ماشاء اللہ سے دس بارہ کھانے والے ہیں۔ سرکار کے علم میں ہے کہ ایک گھوڑے پہ جتنا خرچ آتا ہے، اس کی آدھی تنخواہ مجھے ملتی ہے۔ ستر روپے سے کس کس کی ناک میں دھونی دوں۔ ہار جھک مار کر یہ پرائیویٹ پریکٹس کرنی پڑتی ہے۔ برسوں اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کے بڑے لڑکے کو میٹرک کروایا۔ علیم الدین صاحب کے بال بیس برس سے کاٹ رہا ہوں۔ سر پہ تو اب کچھ رہا نہیں۔ بس بھوین بنا دیتا ہوں۔ سرکار! اس فن کے قدردان سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب تو بالبر (باربر) اس طرح بال اتاریں ہیں گویا کہ بھیڑ کو

مونڈ رہے ہیں۔ میری نظر موٹی ہو گئی ہے، مگر آج بھی پیر کے انگوٹھے کے ناخن نہرنی روکے بغیر ایک ہی دفعہ میں تراش لیتا ہوں۔ تو علیم الدین صاحب کے ہاتھ پیر جوڑ کے لونڈے کو مسلم کمرشل بینک میں کلرک لگوا دیا۔ اب وہ کہتا ہے مجھے تمہارے نائی ہونے سے شرم آتی ہے۔ پیشہ بدلو۔ سرکار! میرے باپ دادا نائی تھے، نواب نہیں۔ محنت مشقت سے حق حلال کی روٹی کماتا ہوں۔ پر صاب جی، میں نے دیکھا ہے کہ جن کاموں میں محنت زیادہ پڑتی ہے، لوگ انہیں بچنے اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ بیٹا کہتا ہے کہ میرے ساتھ کے سب لڑکے اکاؤنٹنٹ ہو گئے۔ تجوری کی چایاں بچاتے پھرتے ہیں۔ فقط ولدیت کی وجہ سے میری ترقی رکی ہوئی ہے۔ اگر تم نے نائی کا وندا انہیں چھوڑا تو تمہارے ہی استرے سے اپنا کلا کاٹ لوں گا۔ کبھی کبھی اپنی ماں کو ڈرانے کے لیے رات گئے نر خرے سے ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے بکرا زنج ہو رہا ہو۔ وہ نیک بخت مجھے خدارسول کے واسطے دینے لگی۔ مجبور ہو کے میں نے کوچوانی شروع کر دی۔ یہ پرائیویٹ پریکٹس اس سے لگ چُھپ کے کرتا ہوں۔ اس کی بے عزتی کے ڈر سے بیٹی، اوزاں، کسبت وغیرہ کبھی گھر نہیں لے جاتا۔ یقین جانے، اسی وجہ سے اپنے ہئیر ڈریسنگ سیلون کے سائن بورڈ پہ حضور کا نام پتہ لکھوا دیا۔ بڑی برکت ہے آپ کے نام میں۔ قصور معاف!“

الہ دین بے چراغ

وہ ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ہل ہل کے ان کے گھٹنے دبائے لگا۔ جیسے ہی وہ لیجے، اس نے ایک اور سچ بولا۔ کہنے لگا کہ سرکار کے چہرے پر روزانہ صبح کٹ دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ ویسی بلیڈ بال کم اور کھال زیادہ اتارتا ہے۔ کھونٹیاں رہ جاتی ہیں۔ قصور معاف! قلمیں بھی اونچی نیچی۔ جیسے نونج کے بیس منٹ ہوئے ہوں۔ اس نے درخواست کی کہ اسے گھوڑے کا کھیرا کرنے سے پہلے ان کا شیو بنانے کی اجازت دی جائے۔ مزید خدمات یہ کہ بچوں کے بال کاٹے گا۔ بہاری کباب، بمبیا بریانی، مرغ کا قورمہ اور شاہی نکلٹے لاجواب بناتا ہے۔ اور دیگ کا حلیم اور دُھریوں * کی فیرنی ایسی کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی دعوت کے لیے تین گھنٹے میں پلاؤ زردہ بنا سکتا ہے۔ بشارت چٹورے آدمی

* دُھری: مٹی کی اتھلی پیالی جس میں فیرنی جائی جاتی ہے۔ فیرنی سے کورے برتن کی سوندھی پست آتی ہے جو خوبئی سمجھی جاتی ہے!

ٹھہرے۔ یوں بھی انگریزی محاورے کے مطابق، مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ کارل مارکس بھی یہی کہتا ہے۔

ہر وہ جو ادھر کو جاتی ہے، معدے سے گزر کر جاتی ہے
انہیں یہ حجام اچھا لگنے لگا۔

اس نے یہ بھی کہا کہ گھوڑے کے کھیرے کے بعد وہ ان کے والد کے پیر دبائے گا۔ اور رات کو ان (بشارت) کا مساج کرے گا۔ گردن کے پیچھے جہاں سے رےڑھ کی ہڈی شروع ہوتی ہے، ایک رگ ایسی ہے کہ نرم گرم اٹھلیوں سے ہولے ہولے دبائی جائے تو سارے جسم کی تحکم اتر جاتی ہے۔ یہ آنکھ کو منظر نہیں آتی۔ اس کے استاد مرحوم لڈن میاں کہا کرتے تھے کہ مالشیا اپنی اٹھلی کی پور سے دیکھتا ہے۔ یہی اس کی در دین ہے جو چھوتے ہی بتا دیتی ہے کہ درد کہاں ہے۔ پھر اس نے بشارت کو لالچ دیا کہ جب وہ روغن بادام سے سر کی مالش کرے گا۔ اور انگوٹھے سے ہولے ہولے کنپٹیاں دبائے کے بعد، دونوں ہاتھوں کو سر پر پرندے کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑائے گا تو یوں محسوس ہو گا جیسے بادلوں سے نیند کی پریاں پرے باندھے روٹی کے پہل در پہل کالوں پر ہولے ہولے اتر رہی ہیں۔ ہولے ہولے، ہولے ہولے۔

بشارت دن بھر کے تھکے ہارے تھے۔ اس کی باتوں ہی سے آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔

اور آخری ناک آؤٹ وار اس ظالم نے یہ کیا کہ ”ماشے اللہ سے تھے میاں تین مہینے کے ہونے کو آئے۔ تختے جتنی کم عمری میں ہو جائیں، وئی ہی جلدی کھرنڈ آئے گا“

اب تو چہرے کا کلاب کھل اٹھا۔ بولے ”بھئی خلیفہ جی! تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اماں حد کر دی! تم تو چھپے رستم نکلتے!“

تس پر اس نے جیب سے وہ نعل نکال کر دکھائی جو اسے رستم کا گھوڑا بننے پر انعام میں ملی تھی۔

مرزا وجید الزماں بیگ اس دن سے خلیفہ کہلائے جانے لگے۔ ویسے یہ الہ دین نہم تھا۔ کام کم، ڈینگیں بہت مارتا تھا۔ مرزا عبد الودود بیگ اسے الہ دین بے چراغ کہتے تھے۔ بزرگوار نے اس کو الہ دین کے بجائے خلیفہ کہنا اس شرط پر منظور کیا کہ آئندہ اس کی جگہ کوئی اور

کو جوان یا ملازم رکھا جائے گا تو اسے بھی خلیفہ ہی کہیں گے۔

۶

گھوڑے کے آگے بین

رفتہ رفتہ مولانا، خلیفہ، گھوڑا اور بزرگوار — باعتبار اہمیت، اسی ترتیب سے خاندان کے فرد گردانے گئے اور یہ ادغام و اختلاط استقامت کا گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ بھی کنبے کا ٹوٹ انگ بن گئی۔ گھوڑے کے طفیل گھر کے معاملات میں بزرگوار کا دوبارہ دخل ہو گیا۔ عل دخل ہم نے محاورہ کہہ دیا، ورنہ سراسر دخل ہی دخل تھا۔ ایک عمر ایسی آتی ہے جب انسان دوسروں کے کاموں میں دخل دینے ہی کو اپنا عمل شمار کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگ تو ساری عمر اوروں کی خطائیں گننے اور ان کی حماقتوں کی اصلاح یعنی دخل درنا معقولات میں گزار دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

مشر میں گئے شیخ تو اعمال ندارد

جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

سب گھر والے فرد افرادِ بلبن کو چمکارتے، تھپتھپاتے۔ دانہ چارا تو غالباً اب بھی اتنا ہی کھاتا ہو گا۔ پیار کی نظر سے اس کی ایال اور جلد ایسی چمکیلی اور چکنی ہو گئی کہ مچھلیاں اور مکھیاں پھسلیں۔ بچے چُھپ چُھپ کر اسے اپنے حصے کی مٹھائی کھلانے آتے اور اسی کی طرح کان ہلانے کی کوشش کرتے۔ کچھ بچے اب فٹ بال کو آگے لکھ کرنے کی بجائے لیڈی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرنے لگے تھے۔ بیت بازی کے مقابلے میں جب کسی لڑکے کا گولہ بازو د ختم ہو جاتا یا کوئی غلط شعر پڑھ دیتا تو مخالف ٹیم اور سامعین مل کر ہنہناتے۔ خود بزرگوار کوئی اچھی خبر سنتے یا سورج کے سامنے بادل کا کوئی اُودا ٹکڑا آ جاتا تو فوراً گھوڑے کو ہار مونیم سنانے بیٹھ جاتے۔ اکثر فرماتے کہ جب واقعی اچھا بجاتا ہوں تو یہ بے اختیار اپنی دم چنور کی طرح ہلانے لگتا ہے۔ ہمیں ان کے دعوے کی صداقت میں نہ جب شبہ تھا، نہ اب ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ انہوں نے یہ کبھی غور نہیں فرمایا کہ گھوڑا ان کے کمال فن کی داد کس عضو سے دے رہا ہے !

بلبن بزرگوار کا کھلونا، اولاد کا نعم البدل، مورس تنہائی، آنسوؤں سے بھیجا تکیہ —

سبھی کچھ تھا۔ اس کے آنے سے پہلے وہ تمام وقت اپنی زنگ خورہ چول پر آن گھڑکوار کی طرح

کراہتے رہتے، خواہ درد ہو یا نہ ہو۔ اگر ان کے سامنے کوئی دوسرا بوجھ اٹھاتا تو منہ سے ایسی آواز نہ نکالتے گویا خود بھی بوجھوں میں رہ رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا، طبیعت کیسی ہے تو جواب میں دائیں ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھا کر نفی میں دھمکی کی طرح ہلاتے اور دو تین منٹ تک سُرِ بدل بدل کر کھانستے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی بیماری کو ”انجوائے“ کرنے لگے ہیں۔ بعض کہنہ مشق مریض یہ تسلیم کرنے میں اپنے مرتبہِ علالت کی توہین سمجھتے ہیں کہ اب تکلیف میں افادہ ہے۔ بزرگوار بڑی زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ اگر کبھی مرض دور ہو جاتا تو محض اپنی قوتِ ارادی کے زور سے دوبارہ پیدا کر لیتے۔ آپ نے انہیں نہیں دیکھا، مگر ان جیسے دائم المرض بزرگ ضرور دیکھے ہوں گے جو اپنی پالی پوسی بیماریوں کا حال اس طرح سناتے ہیں جیسے تناوے پر آؤٹ ہونے والا بیٹس میں اپنی ادھوری سینچری اور دیہات کی عورتیں اپنی زچگیوں کے قصے سناتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر دفعہ نئی کمٹری اور نئے پچھتاوے کے ساتھ۔ بلبن کے آنے سے پہلے طبیعت بے حد چڑچڑی رہنے لگی تھی۔ لوگ عیادت سے احتراز کرنے لگے۔ سب نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ ان کے لطفِ علالت میں مغل ہو۔

لیکن اب طبیعت میں نہ صرف اعتدال بلکہ انشراح پیدا ہو چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنے امراض کی تازہ ترین کیفیت سے آگاہی بخشتے۔ ذات الجنب، وجع المفاصل اور احتباسِ بول کی تفصیلات بتاتے۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر نفخ اور آنتوں کی قراقرح کا حال، متعلقہ صوتی اثرات کے ساتھ سناتے۔ رات کو خواب میں جن جن محلے والوں کو مردہ حالت میں دیکھا تھا، ان کے نام گنواتے اور باز آنے اور بکرے کا صدقہ دینے کی تلقین کرتے۔ کبھی فرماتے کہ تین دن سے بلغم میں اس قدر لزوجت ہے کہ سر کو دس بارہ دفعہ زور زور سے جھٹکے دوں تب کہیں ٹوٹ کر اکالہ ان میں گرے گا۔ ان دنوں بہارِ کالونی میں جاہل سے جاہل شخص کو—— حتیٰ کہ مہترانی اور پروفیسر عبدالقدوس کو بھی—— لزوجت * کے معنی مح مثال معلوم ہو گئے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ قبلہ کے امراض کے جراثیم عربی بولتے ہیں۔ انگریزی دواؤں کے قابو میں نہیں آنے کے۔

* لزوجت: پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے، بی۔ اے کے شعور و لا شعور میں یہ لفظ ایسا نیکھا کہ کئی سال بعد اسے اپنے تھیسس کا موضوع بنایا ”ملٹن، جوش، ابوالکلام آزاد، علامہ مشرقی، آغا حشر کاشمیری، عبدالعزیز خالد اور مشتاق احمد یوسفی کے یہاں لزوجت کا عنصر“ ان مشاہیر کو ہمارے ساتھ بریکٹ کرنے میں پروفیسر موصوف کا منشا ہماری توقیر بڑھانا ہرگز نہ تھا۔ غزالوں کو اس عاجز کے ساتھ three-legged race میں تھپی کر کے انہیں رگیدنا اور ہمیں کھدینا مقصود تھا۔ (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

نشہ بڑھتا ہے شرابی جو شرابی سے ملیں

ان کے ایک پرانے وضع دار دوست فدا حسین خاں تائب جمعہ کے جمعہ مزاج پر سی کو آتے تھے۔ کسی زمانے میں بڑے یار باش اور رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ چوری چھپے پیتے بھی تھے، مگر مفت کی۔ گناہ سمجھ کر چوری چھپے پینے میں فائدہ یہ ہے کہ ایک پیگ میں سو بوتلوں کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن ایک عجیب منحوس عادت تھی۔ جب بہت زیادہ چڑھ جاتی تو سب موضوعات چھوڑ کر صرف اسلام پر گفتگو فرماتے۔ اس پر تین چار مرتبہ شراہیوں سے پٹ بھی چکے تھے۔ وہ کہتے تھے ہمارا نشہ خراب کرتے ہو۔ لیکن شیخ حمید الدین جن کے ساتھ تائب پیتے تھے، ان کے انتخاب موضوع پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ شیخ صاحب بڑے اہتمام سے پیتے اور یاروں کو پلاتے تھے۔ عمدہ وہ سکی، چیکو سلوا کیا کے کر سٹل گلاس، تیز مچوں کی بھنی کلیمچی اور کباب، ریاض خیر آبادی کے اشعار۔۔۔ اور ایک تولیے سے مے نوشی کا آغاز ہوتا۔ تائب کو جیسے ہی پڑھتی، اپنی پہلی بیوی کو یاد کر کے بھوں بھوں روتے اور تولیے سے آنسو پونچھتے جاتے۔ کبھی لمبانا نہ ہو جاتا تو شراب پر فقط اس لیے ٹوٹ کر پڑتے کہ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم

کبھی نشہ زیادہ چڑھ جاتا اور گھریا مٹلے میں جا کر چاندنی رات میں مرحومہ کو یاد کر کے دھانس مارتے یا غل غپاڑا کرنے لگتے تو موجودہ بیوی اور مٹلے والے مل کر ان کے سر پر بھشتی سے ایک مشک چھڑوا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جنوری میں ٹھنڈی برف مشک سے انہیں زکام ہو گیا جس نے بعد میں نمونے کی شکل اختیار کر لی۔ اس واقعے کے بعد بیوی ان کو ترکی ٹوپی اڑھا کر مشک چھڑواتی تھی۔

فدا حسین خاں تائب

فدا حسین خان تائب کی عمر یہی ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن تانے جھانکنے کا لپکا نہیں کیا تھا۔ بقول شخصے، جس نظر سے وہ پرانی ہو بیٹیوں کو دیکھتے تھے، اس نظر کے لیے ان کی

سنا ہے اس تھیس کی آؤٹ لائن کو پروفیسروں نے اس بنا پر رد کر دیا کہ ایک پتھر سے اتنی ساری چیزیں نہیں ماری جاسکتیں! اب انہیں کون سمجھاتا کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس تیر، تفتنگ اور پتھر کے محتاج نہیں۔

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ تو سن ڈالے
صید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے

اپنی بیوی ایک عمر سے ترس رہی تھی۔ تیسرے بچے کے بعد ان کی شوہرانہ توجہات میں فرق آ گیا تھا کہ ہمارے ہاں گرجہستی محبت کے لیے بچے اسپید بریکرس (رفنار شکن) کا کام دیتے ہیں۔ طبع آزاد نے ایک بیوی پر توکل نہ کیا۔ مدتوں زنان زودیاب کی خوش بستی میں نروان ڈھونڈا کیے۔ جب تک بدراہ ہونے کی استطاعت رہی، تنگنائے نکاح سے نکل نکل کر شب خون مارتے رہے۔ ادھر بے زبان بیوی یہ سمجھ کر سب کچھ انگیز کرتی رہی کہ

کچھ اور چاہیے وسعت مرے میاں کے لیے

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ موصوف نے کیا سمجھ کے تائب تخلص اختیار کیا۔ کون سا عیب ہے جو ان میں نہیں۔ آخر کس چیز سے تائب ہوئے ہیں؟ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاید اشارہ نیکیوں کی طرف ہو۔

تائب کسی زمانے میں ایک کو آپریٹیو بینک میں ملازمت اور شاعری کرتے تھے۔ اعداد و شمار کے ساتھ بھی شاعری کرنے کی کوشش کی اور غبن کے الزام میں نکالے گئے۔ شاعری اب بھی کرتے تھے، مگر سال میں صرف ایک بار۔ پچاسویں سالگرہ کے بعد یہ وتیرہ بنالیا کہ ہر سال یکم جنوری کو اپنا قطعہ تاریخ وفات کہہ کر رکھ لیتے جو بارہ تیرہ سال سے شرمندہ تعبیر ہونے سے محروم تھا۔ کلام میں صفائی بیان، سلاست، بندش کی چستی، خیال آفرینی اور نحوست کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ دوران سال کسی دوست یا واقف کار کا انتقال ہو جاتا تو اس کا نام کسی مصرع میں ٹھونس کر اپنا قطعہ اسے بخش دیتے

* "Thy need is yet greater than mine"

کلام میں آمد تھی نہ آورد۔ بس مرحومین کی آمد و رفت تھی۔ بزرگوار ان کے کلام کی داد ایک عجیب انداز سے دیتے جس کی نقل اتاری جاسکتی ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں مارے باندھے کی رسمی داد، مجلسی شائستگی، دانستہ طنز اور بے ساختہ ہنسی کی بجمہ غیر مساوی آمیزش ہوتی تھی۔ ہنسی ایسی کہ دور سے کوئی سنے تو طے نہ کر سکے کہ ہنس رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ زار و قطار ہنستے تھے۔

نام کی تبدیلی کے سبب بہت سے قطععات میں سکتہ پڑنے لگتا جسے وہ ضرورت شعری

* سرفلپ سڈنی نے زلفن کے میدان جنگ (۱۵۸۶) میں زخمی حالت میں اپنی موت سے ذرا دیر پہلے پانی کی چھالک ایک دم توڑتے ہوئے سپاہی کو دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے جو امر ہو گئے۔

اور تقاضائے موت کے تحت روا سمجھتے تھے۔ بعض لب گور دوست محض ان کے قطعہ کے خوف سے مرنے سے گریز کر رہے تھے۔ بزرگوار کو تائب صاحب کا آنا بھی ناگوار گزرنے لگا۔ ایک دن کہنے لگے، یہ منحوس کیوں منڈلاتا رہوے ہے؟ میں تو جانوں اس کی نیت مجھ پہ خراب ہو رہی ہے۔ اس سال کا قطعہ میرے سر، گویا کہ میرے سرھانے چسکنا چاہتا ہے۔ پھر بطور خاص وصیت فرمائی کہ اول تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گا، لیکن بالفرض محال، بالفرض محال فدا حسین خاں تائب سے پہلے مر جاؤں۔ گو کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ تو اس کا قطعہ میری پائنتی لگانا۔ جن قبروں کے کتبوں پر یہ قطعے مع مرحومین کے ناموں اور ان کے اپنے تخلص، تائب، کے کندہ تھے، ان سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ درحقیقت قبر میں دفن کون ہے۔ یا بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، انتقال اہل قبر کا ہوا ہے یا شاعر کا۔ بعض لوگ یہ کتبے دیکھ کر تعجب کرتے کہ ایک ہی شاعر کو بار بار کیوں درگور کیا گیا۔ لیکن جب کلام پر بھاہ کرتے تو کہتے کہ ٹھیک ہی کیا۔ کسی شاعر ہی نے کہا ہے کہ ”اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد“ مطلب یہ کہ بہت سے شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ شاعر مر جاتا ہے، مگر کلام باقی رہ جاتا ہے۔ اردو شاعری کو یہی چیز لے ڈوبی۔

محفلِ سماعِ خراشی

یوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ بزرگوار مرنے کی دھمکی نہ دیتے ہوں۔ جنرل شیر علی کی طرح قبرستان میں ایک قطعہ زمین خرید کر اپنا پختہ مزار بنوایا تھا جو کافی عرصے سے غیر آباد پڑا تھا کہ قبضہ لینے سے ہنوز کتراتے تھے۔ اکثر خود پر عالم یاس طاری کر کے یہ شعر پڑھتے:

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے اٹھ جاؤں کامیں
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

شعر میں اپنی چٹ پٹ موت پر زبان کا کھیل دکھایا گیا ہے۔ تذکیر و تانیث کی الٹ پلٹ سے، یعنی دیکھتے ہی دیکھتے اور دیکھتی کی دیکھتی سے بیک وقت نزاکتِ زبان و نزاع اور لذتِ تجنیس دکھانی مقصود ہے۔ اس سے تو بقول مرزا عبدالودود بیک یہی پتہ چلتا ہے کہ بزرگوار کی موت زبان کے چٹخارے سے واقع ہوئی۔ گویا زبان سے اپنی قبر کھودی۔ تاہم حق مغفرت کرے، عجب پابندِ محاورہ و روزمرہ مرد تھا۔

جس دن سے کھوڑا بزرگوار کی محفلِ سماعِ خراشی میں شریک ہونے لگا، انہوں نے اپنی

پرانی کھواب کی اپکن اُدھڑوا کر ہارمونیم کا غلاف بنوا لیا۔ خلیفہ دھونکنی سنبھالتا اور وہ کانپتی لرزتی اٹھلیوں سے ہارمونیم بجانے لگتے۔ کبھی بہت جوش میں آتے تو منہ سے بے اختیار کانے کے بول نکل جاتے۔ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا کہ ان کی آواز زیادہ کپکپاتی ہے یا اٹھلیاں۔ جیسے ہی استرا سانس جھکولے کھانے لگتا، ان کے پڑوسی چودھری کرم الہی، ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ٹلکتے ہوئے آٹھتے۔ عرصہ ہوا، کلاکوما (کالا پانی) سے ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انہوں نے بطور خاص کجرات سے ایک گھڑا منگوا کر اس کی شوخ شنگرفی زمین پر ہالہ (سندھ) ٹائلز کے منقوش پینٹ کروا لیے تھے۔ کہتے تھے، اوروں کو تو نظر آتا ہے۔ وہ جب اپنی آستین چڑھا کر چوڑی کلائی پر چنبیلی کا گجرا لپیٹے گھرے پر سنگت کرتے تو سماں باندھ دیتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب سے آنکھیں گئی ہیں، مالک نے مجھ پر سُر سنگیت اور سنگند کے ان گنت بھید کھول دیے ہیں۔ گمت ہو چلتی اور راگ خوشبو بن کے سارے میں رچ بس جاتا تو بزرگوار فرماتے ”واہ وا! چوٹی صاحب! بھئی خوب بجاتے ہو“۔ اور چودھری صاحب اپنی بے نور آنکھیں و فورِ کیف سے بند کرتے ہوئے کہتے ”لوجی! نسی وی اج بڑا کمال کیتا اے“ اور یہ واقعی کمال فن نہیں تو اور کیا تھا کہ دونوں معذور بزرگ جب جھوم جھوم کے اپنے اپنے ساز پر بیک وقت اپنے اپنے راگ یعنی راگ درباری اور تین تال بے تال میں ماہیاسی کی دھن بجا کر ایک دوسرے کی سنگت کرتے تو یہ کہنا بہت دشوار تھا کہ کون کس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں!

بزرگوار اپنی مفلوج ٹانگ کی پوزیشن چودھری کرم الہی سے بدلواتے ہوئے اکثر کہتے کہ جوانی میں ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ اچھے اچھے ہارمونیم ماسٹر کان پکڑتے تھے۔ ان کا یہ شوق اس دور کی یادگار تھا جب وہ بیٹی سے آئی ہوئی تھیٹر ریکل کمپنی کا ایک ہی کھیل ایک مہینے تک روزانہ دیکھتے اور بقیہ گیارہ مہینے اس کے ڈائلاگ بولتے پھرتے۔ ۱۹۲۵ء سے وہ ہر کھیل آرکسٹرا کے pit میں بیٹھ کر دیکھنے لگے تھے جو اس زمانے میں شوقینی اور رئیسانہ ٹھٹھ کی انتہا سمجھی جاتی تھی۔ ہارمونیم ایک کمپنی کے ریٹائرڈ ہارمونیم بجانے والے سے سیکھا تھا جو پیشی ماسٹر کہلاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ پوروں کے جوڑوں اور اٹھلیوں کے رگ پٹھوں کو نرم اور رواں دواں رکھنے کے لیے میں نے مہینوں اٹھلیوں پر مہین روے کی سوجی کا حلوہ باندھا۔ ان کا رنگ گورا اور جلد بہت شفاف اور نازک تھی۔ اتنی لمبی بیماری کے باوجود اب بھی جاڑے میں رخساروں پر سُرخ جھلکتی تھی۔ غلافی آنکھیں بند کر لیتے تو اور خوبصورت لگتیں۔ سفید اپکن۔ بھری بھری

پنڈلیوں پر پھنسا ہوا چوڑی دار - جوانی میں وہ بہت وجیہ اور جامہ زیب تھے -
اپنی جوانی کا ذکر آتے ہی تڑپ اٹھتے -

اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!

وہ بھی کیسے ارمان بھرے دن تھے، جب ہر دن ایک نئے کنول کی مانند کھلتا تھا - ”جب سائے
دھانی ہوتے تھے، جب دھوپ کلابی ہوتی تھی“ ان کے تصور ہی سے سانس تیز تیز چلنے لگتی -
بیتے ہوئے روز و مہ و سال خزاں کے پتوں کی مانند چاروں اور اڑنے لگتے - ہائے! وہ استاد فیاض
خاں کی وحشی بکولے کی طرح اٹھتی ہوئی الپ - وہ گوہر جان کی ٹھنکتی ٹھنکارتی آواز - اور مختار میکم
کیسی بھری بھری آسودہ آواز سے ماتی تھی - اس میں ان کی اپنی جوانی تان لیتی تھی - پھر
خواب گینے پکھلنے لگتے - یادوں کا دریا بہتے بہتے خواب سراب کے آبِ کم میں اترتا چلا جاتا - موٹی
موٹی بوندیں پڑنے لگتیں - زمین سے لپٹ اٹھتی اور بدن سے ایک گرم مدھ ماتی مہکار
پھوٹتی - بارش میں بھیکے ترہ ستر مہین کرتے کچھ بھی تونہ چھپا پاتے - پھر بادل باہر بھیترا یا
ٹوٹ کے برستا کہ سبھی کچھ بہا لے جاتا -

سینے سے گھٹا اٹھے، آنکھوں سے جھڑی برسے

پھاگن کا نہیں بادل جو چار گھڑی برسے

برکھا ہے یہ بھادوں کی، برسے تو بڑی برسے *

جھما جھم مینہ برستار ہوتا اور وہ ہارمونیم پر دونوں ہاتھوں سے کبھی بین، کبھی استاد جھنڈے خان کی
چھچھاتی دھوم مچاتی سلامیاں بجاتے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ کالے ناگ پلوں سے نکل کے جھومنے
لگتے - درہجوں میں چاند نکل آتے - کہیں ادھورے چھڑکاؤ سے کورے پنڈے کی طرح
سنسناتی چھتوں پر لڑکیاں دھنک کو دیکھ دیکھ کر اس کے رنگ اپنے لہریوں میں اتارتیں - اور
کہیں چندن بانہوں پر سے چٹکی اور کچی چٹری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے - انترے کی لے
تیز ہوتی تو فضا کیسی جھن جھن جھن گونج اٹھتی، جیسے کسی نے مستی میں آسمان اور زمین کو اٹھا
کے مجرے کی طرح ٹکرا دیا ہو اور اب رگ تاروں میں جھنک جھنک رہے کہ کسی طور ٹھننے کا نام
نہیں لیتی -

اخباری ٹوپی

تین چار مہینے بڑے سکون و عافیت سے گزرے۔ بچوں کا اسکول گرمیوں کی تعطیلات میں بند ہو گیا۔ ایک دن بشارت نے تانگہ جتوایا اور کوئی دسویں دفعہ نقشہ پاس کروانے میں نسیل کارپوریشن گئے۔ چلتے چلتے مولانا سے کہہ گئے کہ آج نقشہ پاس کروا کے ہی لوٹوں گا۔ بہت ہو چکی۔ دیکھتا ہوں آج باسٹرڈ کیسے پاس نہیں کرتے۔ یہ فقط کالی بھری شیخی نہیں تھی۔ اب تک وہ نظیریں اور دلائل و براہین ساتھ لے کے جاتے تھے۔ لیکن آج وہ پانچ ”سبزوں“ * سے لیس ہو کر جا رہے تھے کہ شمشیر زرہر تھکی اور گرہ کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ تانگہ گلیوں گلیوں، بڑے لمبے راستے سے لے جانا پڑا، اس لیے کہ بہت کم سڑکیں بچی تھیں جن پر تانگہ چلانے کی اجازت تھی۔ تانگہ اب رکشا سے بھی زیادہ پھٹیچر چیز سمجھی جانے لگی۔ لہذا صرف اتہائی غریب علاقوں میں چلتا تھا جو شہر میں ہوتے ہوئے بھی شہر کا حصہ نہیں تھے۔ نیرنگی زمانہ کو کیا کہیے۔ کانپور سے یہ خواب دیکھتے ہوئے آئے تھے کہ اللہ ایک دن ایسا بھی لائے گا جب فنن میں ٹانگوں پر اٹالین کمبل ڈال کے نکلوں گا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں گے، کس رئیس کی سواری جا رہی ہے؟ لیکن جب خواب کی تعبیر نکلی تو دنیا اتنی بدل چکی تھی کہ نہ صرف تانگہ چھپ کر نکلتا، بلکہ وہ خود بھی اس میں چھپ کر بیٹھتے۔ ان کا بس چلتا تو اٹالین کمبل سر سے پیر تک اوڑھ لپیٹ کر نکلتے کہ کوئی پہچان نہ لے۔ دن میں جب بھی تانگے میں بیٹھتے تو ”ڈان“ اخبار کے دونوں ورق اپنے چہرے اور سینے کے سامنے اس طرح پھیلا کر بیٹھتے کہ ان کی لٹکی ہوئی ٹانگیں اخبار ہی کا ضمیمہ معلوم ہوتی تھیں۔ مرزا عبد اللہ و دیگ نے تو ایک دن کہا بھی کہ تم اخبار کی ایک ٹوپی بنو لو جس میں اپنا منہ چھپا سکو۔ ویسی ہی جلاوی ٹوپی جیسی مجرم کو پھانسی پر لٹکانے سے پہلے پہنائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مجرم کو اخباری ٹوپی ہی پہنا کر پھانسی دینی چاہیے تاکہ اخبار والوں کو بھی تو عبرت ہو۔

اسپ کی ایک جست نے۔۔۔

میں نسیل کارپوریشن کی عمارت کوئی چار پانچ سو گز دور رہ گئی ہوگی کہ اچانک مکی کے موڑ

* سبزے: سو روپے کے نوٹ اپنے سبز رنگ کے سبب سبزے کہلاتے تھے۔ جب نوٹ کا رنگ سرخ ہو گیا تو لوگ نوٹ کو نوٹ ہی کہنے لگے۔ سُرخا کسی نے نہیں کہا۔

سے ایک جنازہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ خلیفہ کو ملازم رکھتے وقت انہوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھوڑے کو بہر صورت جنازے سے دور رکھنا۔ لیکن اس وقت اس کا دھیان کہیں اور تھا اور جنازہ تھا کہ گھوڑے پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ بشارت اخبار پھینک کر پوری طاقت سے چیخے ”جنازہ! جنازہ!! خلیفہ جنازہ!!!“ یہ سنتے ہی خلیفہ نے چابک مارنے شروع کر دیے۔ گھوڑا وہیں کھڑا ہو کے ہنہانے لگا۔ خلیفہ اور بدحواس ہو گیا۔ بشارت نے خود لکام پکڑ کر گھوڑے کو دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اٹیل ہو کر دو لٹیاں مارنے لگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ دراصل یہی وہ جگہ تھی جہاں خلیفہ گھوڑے کو باندھ کر حجامت کرنے چلا جاتا تھا۔ وہ چیخے ”ذرا طاقت سے چابک مار“۔ ادھر خطرہ یعنی جنازہ لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہا تھا۔ ان پر اب دہشت طاری ہو گئی۔ ان کے بوکھلائے ہوئے اندازے کے مطابق جنازہ اب اسی ”رینج“ میں آ گیا تھا جہاں چند ماہ پیشتر، بقول اسٹیل مل کے سیڈھے کے

اسپ کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

وہ خود اس وقت گھوڑے سے بھی زیادہ بد کے ہوئے تھے، اس لئے کہ گھوڑے کے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی ہنہناہٹ ان کی چیخوں میں دب گئی۔ گھوڑے کے اس پار خلیفہ دیوانہ وار چابک چلا رہا تھا۔ چابک زور سے پڑتا تو گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو ہو جاتا۔ خلیفہ نے غصے سے بے قابو ہو کر دو مرتبہ اسے ”تیرا دھنی مرے!“ کی کالی دی تو بشارت سنائے میں آ گئے۔ لیکن سردست وہ گھوڑے کو قابو میں لانا چاہتے تھے۔ خلیفہ کو ڈانٹنے لگے ”اے کیا ڈھیلے ڈھیلے ہاتھوں سے مار رہا ہے، خلفے!“

یہ سننا تھا کہ خلیفہ فاسٹ بولر کی طرح اسٹارٹ لے کر دوڑتا ہوا آیا اور دانت کچکچاتے ہوئے، آنکھیں بند کر کے پوری طاقت سے چابک مارا جس کا آخری سرا بشارت کے منہ اور آنکھ پر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے تیزاب سے لکیر کھینچ دی ہو۔ فرماتے تھے ”یہ کہنا تو understatement (کسرِ میانی) ہو گا کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے دونوں آنکھوں کا فیوزاڑ گیا ہو“۔ خلیفہ سے خلیفہ، خلیفے سے اے اور اے سے آلو کے پٹھے تک کی تمام منزلیں ایک ہی چابک میں طے ہو گئیں۔ عالم وحشت میں وہ خلیفہ تک کیسے پہنچے۔ گھوڑے کو پھلانگ کر گئے یا ٹانگوں کے نیچے سے، یاد نہیں۔ خلیفہ کے ہاتھ سے چابک چھین کر دو تین اسی کو رسید کیے۔ اس نے اپنی چیخوں سے گھوڑے کو سر پر اٹھالیا۔

ایک آنکھ میں اتنی سوزش تھی کہ اس کے اثر سے دوسری بھی بند ہو گئی۔ اور وہ بند آنکھوں سے گھوڑے پر چابک چلاتے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتاً احساس ہوا کہ چابک کو روکنے کے لئے سامنے کچھ نہیں ہے۔ زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بائیں کھولی تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ جنازہ بیچ سڑک پر اُریب (diagonal) رکھا تھا۔ تاکہ بگٹٹ جا رہا تھا۔ کندھا دینے والے غائب۔ خلیفہ لاپتہ۔ البتہ ایک سوگوار بزرگ جو زرد املتاس کے پیڑ سے لٹکے ہوئے تھے، گھوڑے کے شجرہ نسب میں پدری حیثیت سے داخل ہونے اور اپنا وظیفہ زوجیت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔

چند منٹ بعد لوگوں نے اپنی اپنی گھڑپناہ سے نکل کر انہیں نرغے میں لے لیا۔ جے دیکھو اپنی ہی دھائیں دھائیں کر رہا ہے، ان کی سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ طرح طرح کی آوازیں اور آوازے سنائی دیے۔

”اس پر سالے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں!“

”گھوڑے کو شوٹ کر دینا چاہیے“

”گھوڑے کو نہیں مالک کو“

”تھانے لے چلو۔“

(بشارت کی ٹائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے) ”ہماری میت کی بے حرمتی ہوئی ہے“ ”اس کامنہ کالا کر کے اسی گھوڑے پہ جلوس نکالو“

بشارت نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ بلبن کو انجکشن سے ہلاک کروادیں گے۔

گھر آکر انہوں نے بلبن کو چابک سے استاماراکہ محلے والے جمع ہو گئے۔

اس رات وہ اور بلبن دونوں نہ سو سکے۔ اس سے پہلے انہوں نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ خلیفہ نے چابک میں بجلی کا تار باندھ رکھا ہے۔

۸

بلبن کو سزائے موت

صبح انہوں نے خلیفہ کو برخاست کر دیا۔ وہ پیٹنی بغل میں مار کے جانے لگا تو ہاتھ جوڑ کے بولا ”بچوں کی قسم! گھوڑا بے قصور تھا۔ وہ تو چپکا کھڑا تھا۔ آپ ناحق میں پٹوار ہے

تھے۔ اتنی مار کھا کے تو مُردہ گھوڑا بھی اٹھ کے سر پٹ دوڑنے لگتا۔ اسلام علیکم (لوٹ کر آتے ہوئے) قصور معاف! حجامت بنانے کے جمعہ کو کس وقت آؤں؟“

ایک دوست نے رائے دی کہ گھوڑے کو ”فیٹ“ سے انجکشن نہ لگواؤ۔ جانور بے انتہا اذیت اٹھائے، تڑپ تڑپ کر مرتا ہے۔ میں نے اپنے السیشن کئے کو اسپتال میں انجکشن سے مرتے دیکھا تو دو دن تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا۔ وہ میرے کڑے وقتوں کا ساتھی تھا۔ مجھے بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ یہ بڑا بد نصیب، بڑا دکھی گھوڑا ہے۔ اس نے اپنی معذوری اور تکلیف کے باوجود تمہاری، تمہارے بچوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

اسی دوست نے کسی شخص سے فون پر بات کر کے بلبن کو گولی مارنے کا انتظام کر دیا۔

بلبن کو ٹھکانے لگوانے کا کام مولانا کرامت حسین کے سپرد ہوا۔ وہ بہت الجھے۔ بڑی منطق چمٹائی۔ کہنے لگے، پالتو جانور، خدمتی جانور، جانور نہیں رہتا۔ وہ تو بیٹا بیٹی کی طرح ہوتا ہے۔ بشارت نے جواب دیا، آپ کو معلوم ہے گھوڑے کی کتنی عمر ہوتی ہے؟ اس لنگر دین کو آٹھ نو سال تک کھڑا کون کھلائے گا؟ میں نے تمام عمر اسے ٹھسے، زندہ رکھنے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ مولانا اپنی ماتحتانہ حیثیت بھول کر یکایک جلال میں آگئے۔ زمین کے قصبے کا رخ آسمان کی طرف موڑتے ہوئے کہنے لگے کہ انسان کی یہ طاقت، یہ مجال کہاں کہ کسی کو روزی دے سکے۔ رازق تو وہی ہے جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ جو بندہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی کو روزی دیتا ہے، وہ درحقیقت خدائی کا دعویٰ دار ہے، ہر ذی روح اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ وہ ہر حال میں، ہر صورت میں رزق دیتا ہے۔

”بے شک! بے شک! رشوت کی صورت میں بھی!“ بشارت کے منہ سے نکل گیا۔ فقرہ ترازو ہو گیا۔ مولانا ہی نہیں خود بشارت بھی دھک سے رہ گئے کہ کیا کہہ دیا۔ جس کیلئے، استقامی فقرے کو آدمی برسوں سینے میں دبائے رکھتا ہے، وہ ایک نہ ایک دن اچھل کر اچانک منہ پر آہی جاتا ہے۔ پٹی باندھنے سے کہیں دل کی پھانس نکلا کرتی ہے۔ اور جب تک وہ نہ نکل جائے، آرام نہیں آتا۔

وہ جو قرض اک تھا زبان پر، وہ حساب آج چکا دیا

مولانا صبح تڑکے بلبن کو لینے آگئے۔ گیارہ بجے اسے نارتھ ناظم آباد کی پہاڑیوں کی تلیٹی میں گولی ماری جانے والی تھی۔

بشارت ناشتے پر بیٹھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے حلق میں پھندا لگ گیا ہو۔ آج انہوں نے بلبن کی صورت نہیں دیکھی۔ ”گولی تو ظاہر ہے پیشانی پر ہی مارتے ہوں گے“۔ انہوں نے سوچا۔ بائیں آنکھ کے اوپر والی بھونری واقعی منحوس نکلی۔ جان لے کے رہے گی۔ مولانا کو انہوں نے رات ہی کو ہدایت کر دی تھی کہ لاش کو اپنے سامنے ہی گڑھے میں دفن کرادیں۔ جنگل میں چیل کوؤں کے لئے پڑی نہ چھوٹیں۔ انہیں جھرجھری آئی اور وہ کباب پر اٹھا کھائے بغیر اپنی دکان روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے اس کا ساز اور روہڑ کا وہ خون آلود پیٹ پڑا دیکھا جو اس کی زخمی گردن پر باندھا جاتا تھا۔ ایسا لگا جیسے انہیں کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نکل گئے۔

بزرگوار کو اصل صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ انہیں صرف یہ بتایا گیا کہ بلبن دو ڈھائی مہینے کے لیے چرائی پر پنجاب جا رہا ہے۔ وہ کہنے لگے ”کالے بھینسوں کو تو چرائی پر جاتے سنا تھا، مگر گھوڑے کو گھانسن کھانے کے واسطے کراچی سے صوبہ پنجاب جاتے آج ہی سنا! کراچی سے تو صرف سیٹھ اور لکھ پتی سیزن کے سیزن چرائی پہ کوہ مری جاوے ہیں“۔ یہ اُن سے اُبھنے کا موقع نہیں تھا۔ ان کا بلڈ پریشر پہلے ہی بہت بڑھا ہوا تھا۔ انہیں کسی زمانے میں اپنی طاقت اور کسرتی بدن پر بڑانا ز تھا۔ اب بھی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ میرا بلڈ پریشر دو آدمیوں کے برابر ہے۔ ”دو آدمیوں کے برابر والے دعوے کی ہم بھی تصدیق کریں گے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انہیں معمولی سادہ ہوتا تو دو آدمیوں کی طاقت سے چنٹتے تھے۔ لہذا بشارت اپنے دروغ مصلحت آمیز یہ رڈٹے رہے۔ اور ٹھیک ہی کیا۔ مرزا اکثر کہتے ہیں کہ اپنے چھوٹوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، کیوں کہ اس سے انہیں بھی جھوٹ بولنے کی تحریک ہوتی ہے۔ لیکن بزرگوں کی اور بات ہے۔ انہیں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مولانا اس پکڑے بلبن کو بزرگوار سے ملوانے لے گئے۔ ان کا آدھ سے زیادہ سامان ان کے اپنے کمرے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہارمونیم رحیم بخش کے لال کھیس میں لپیٹا جا رہا تھا۔ بلبن کا فوٹو جو ریس جتنے کے بعد اخبار میں چھپا تھا، ابھی دیوار سے اتارنا باقی تھا۔ وہ رات سے بہت مغموم تھے۔ خلاف معمول عشا کے بعد دو مرتبہ حقہ پیا۔ اب وہ صبح وشام کیسے کاٹیں گے؟ اس وقت جب بلبن ان کے پاس لایا گیا تو وہ سر جھکائے دیر تک اپنی ایال میں اٹھکیوں سے

کھینچی کر اٹا رہا۔ آج انہوں نے اس کے پاؤں پر دم نہیں کیا۔ جب وہ اس کی پیشانی پر اللہ لکھنے لگے تو ان کی اٹھلی چابک کے اُپرے ہوئے لمبے نشان پر پڑی اور وہ چونک پڑے۔ جہاں تک یہ درد کی لکیر جاتی تھی وہاں تک وہ اٹھلی کی پورے خود کو زخاتے رہے۔ پھر دکھ بھرے لمبے میں کہنے لگے ”کس نے مارا ہے ہمارے بیٹے کو؟“ مولانا اسے لے جانے لگے تو اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ”اچھا۔ بلبن بیٹے! ہمارا تو چل چلاؤ ہے۔ خدا جانے واپسی پر ہمیں پاؤں گے بھی یا نہیں۔ جاؤ، اللہ کی امان میں دیا۔“

بلبن کی جدائی کے خیال سے بزرگوار ڈسے گئے۔ اب وہ اپنے دل کی بات کس سے کہیں گے؟ کس کی شفا کے لیے دعا کو بے اختیار ہاتھ اٹھیں گے؟ انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ قدرت کو اتنا سا آسرا، ایک جانور کی دُسر اتھ تک منظور نہ ہوگی۔ جو خود کبھی تنہائی کے جان کو گھلا دینے والے کرب سے نہ گزرا ہو وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اکیلا آدمی کیسی کیسی دُسر اتھ کا سہارا لیتا ہے۔ بے مثل انشائیوں کے مصنف چارلس لیمب نے ایک عمر کرب و تنہائی میں گزاری۔ پیر ۱۲ مئی ۱۸۰۰ء کو وہ کولرج کو اپنے خط میں لکھتا ہے ”گزشتہ جمعہ کو میڈی (ضعیف خادمہ) آٹھ دن کی علالت کے بعد چل بسی۔ اس کی میت اس وقت کمرے میں میرے سامنے رکھی ہے۔ میری (چارلس لیمب کی بہن جسے دیوانگی کے دورے پڑتے تھے) اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور اس پر شدید دورہ پڑا۔ لہذا اسے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ اب اس گھر میں میں تنہا ہوں اور دُسر اتھ کے لیے میڈی کی نعش کے سوا اور کوئی نہیں۔ کل میں اسے بھی دفن کر دوں گا تو بالکل ہی تنہا رہ جاؤں گا۔ پھر سوائے اس پٹی کے اور کوئی نہ ہو گا جو مجھے یاد دلائے کہ ان آنکھوں نے کبھی اس گھر کو بھرا پُر ا دیکھا تھا۔ کبھی اس میں بھی مجھ جیسے ذی روح رہتے تھے۔“

مولانا دن بھر غیر حاضر رہے۔ دوسرے دن وہ بند بند اور کچنے کچنے سے نظر آئے۔ کئی سوال ہونٹوں پر لرز لرز کر رہ گئے۔ کسی کو ان سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ بلبن کے گولی کہاں لگی۔ کہتے ہیں جانوروں کو موت کا premonition (پیش آگاہی) ہو جاتا ہے۔ تو کیا جب وہ ویران پہاڑیوں میں لے جایا جا رہا تھا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی؟ اور کبھی آخری لمحے میں معجزہ بھی تو ہو جایا کرتا ہے۔ وہ بہت جفاکش، سخت جان اور حوصلے والا تھا۔ دل نہیں مانتا کہ اس نے آسانی سے موت سے ہار مانی ہوگی۔

Do not go gentle into that good night,
Rage, rage against the dying of the light.

آبا آبا! برکھا آئی!

کوئی دو ہفتے بعد بشارت کی طاہر علی موسیٰ بھائی سے اسپنسر آئی ہاسپٹل کے سامنے بڑبھڑ ہو گئی۔ موسیٰ بھائی بوہری تھا اور اس کی لکڑی کی دکان ان سے اتنے فاصلے پر تھی کہ پتھر پھینکتے تو ٹھیک اس کی سنہری پگڑی پر پڑتا۔ یہ حوالہ اس لئے بھی دینا پڑا کہ کئی مرتبہ بشارت کا دل اس پر پتھر پھینکنے کو چاہا۔ وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ ان کے لگے ہوئے مکاپک توڑتا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا رہتا۔ دراصل وہ ان کی بزنس خراب کر کے ان کی دکان خریدنا چاہتا تھا۔ اس کی چھدری داڑھی طوطے کی چونچ کی طرح مڑی رہتی تھی۔

وہ کہنے لگا ”بشارت سیٹھ! لاسٹ منتھ ہم کو کسی نے بولا آپ گھوڑے کو شوٹ کروا رہے ہو۔ ہم بولا، باپ رے باپ! یہ تو ایک دم ہتھیار ہے۔ وہ گھوڑا تو عشرہ (مخرم) میں جل جنا (ذوالجناح) بنا تھا! ہماری آرا مشین پہ ایک مجبور کام کرتا ہے، تراب علی۔ اس نے ہم کو آکے بولا کہ میری جھکی کے سامنے سے دلدل کی سواری نکلی تھی۔ آپ ہی کا گھوڑا تھا۔ سیم ٹو سیم۔ سولہ آنے۔ تراب علی نے اس کو اپنے ہاتھ سے دودھ جلیبی کھلائی۔ آپ کے کو جوان نے اس کا پورا بھٹا وصول کیا۔ پچاس روپے۔ وہ بولتا تھا بشارت سیٹھ دلدل بھاڑے ٹیکسی پہ چلانا مانگتا ہے۔ دلدل کے آگے آگے وہ شاہ مرداں، شیر یزداں، وگیرہ وگیرہ مگتا جا رہا تھا۔ اس کے پندرہ روپے الگ سے۔ گھوڑے کو ہمارے پاس بھی سلام کرانے لایا تھا۔ گریب بال بچے دارمانس ہے۔“

اس کے اگلے روز مولانا کام پر نہیں آئے۔ دودن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ چار دن قبل جیسے ہی ریڈیو کراچی والوں نے بارش کا پہلا قطرہ گرتے دیکھا، ساون کے گیت موسلا دھار نشر کرنے شروع کر دیے۔ گیتوں ہی سے اطلاع ملی کہ یہ ساون ہے ورنہ ساون کے مہینے کو کراچی میں کون پہچانتا ہے۔ لیکن ذرا سوچیے تو گیت میں اگر ساون کی بجائے جون / جولائی لکھیں تو برکھارت کا سارا رومانس پروا اڑا کے لے جائے۔ وہ مُسکرا دیے۔ آج صبح گھر سے چلتے وقت کہہ آئے تھے ”سیکم! آج تو کڑھائی پڑھنی چاہیے۔ کراچی میں تو ساون کے پکوان کو ترس گئے۔ خستہ سموے، کرارے پاپڑ اور پوریوں۔ کراچی کے سپتے کھا کھا کے ہم تو بالکل پلپلا گئے“ شام کو جب وہ دکان بند کرنے والے تھے، ایک شخص خبر لایا کہ کل شام مولانا کے

والد کا انتقال ہو گیا - آج ظہر و عصر کے درمیان جنازہ اٹھا - انا اللہ وانا الیہ راجعون - چلو اچھا ہوا - اللہ نے پچارے کی سُن لی - برسوں کی جانکشی ختم ہوئی - مٹی عزیز ہو گئی - بلکہ یوں کہیے، کیچڑ سے اٹھا کر خشک مٹی میں دبا آئے - وہ تعزیت کے لئے سیدھے مولانا کے گھر پہنچے - بارش تھم چکی تھی اور چاند نکل آیا تھا - آسمان پر ایسا لگتا تھا جیسے چاند بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے اور بادل اپنی جگہ ساکت ہیں - اینٹوں، پتھروں اور ڈالڈا کے ڈبوں کی پگڈنڈیاں جا بجا پانی میں ڈوب چکی تھیں - تیک و حرمگ لڑکوں کی ایک ٹولی پانی میں ڈبک ڈبک کرتے ایک گھرے میں باری باری منہ ڈال کر فلمی کمانے کا رہی تھی - ایک دُحشی ہوئی جھگی کے سامنے ایک کرپہہ الصوت شخص بارش کو روکنے کے لیے اذان دیے چلا جا رہا تھا - ہر جزو کے آخری لفظ کو استا کھینچتا گویا اذان کے بہانے پکاراگ الاپنے کی کوشش کر رہا ہے - کانوں میں اٹھکی کی پور زور سے ٹھونس رکھی تھی تاکہ اپنی آواز کے عذاب سے محفوظ رہے - ایک ہفتے پہلے اسی جھگی کے سامنے اسی شخص نے بارش لانے کے لئے اذانیں دی تھیں - اُس وقت بچوں کی ٹولیاں گھروں کے سامنے ”مولا میگھ دے! مولا پانی دے! تال، کنویں، منگے سب خالی - مولا! پانی! پانی! پانی!“ کا قاتی اور ڈانٹ کھاتی پھر رہی تھیں -

عجیب کسمپرسی کا عالم تھا - کہیں چٹائی، ٹاٹ، سرکی اور اخبار کی ردی سے بنی ہوئی چھتوں کے پیالے پانی کے لبالب بوجھ سے لٹکے پڑ رہے تھے - اور کہیں گھر کے مرد پھٹی ہوئی چٹائیوں میں دوسری پھٹی چٹائیوں کے پیوند لگا رہے تھے - ایک شخص ٹاٹ پر پگھلا ہوا تار کول پھیل کر چھت کے اس حصے کے لیے تریپال بنا رہا تھا جس کے نیچے اس کی بیمار ماں کی چارپائی تھی - دوسرے کی جھگی بالکل ڈھیر ہو گئی تھی - اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مرمت کہاں سے شروع کرے - چنانچہ وہ ایک بچے کی پٹائی کرنے لگا - جگہ جگہ لوگ نالیاں بنا رہے تھے جن کا مقصد بظاہر اپنی غلاظت کو پڑوسی کی غلاظت سے علیحدہ رکھنا تھا - ایک صاحب آٹے کی بھیگی بوری میں بغل تک ہاتھ ڈال کر دیکھ رہے تھے کہ اندر کچھ بچا بھی ہے یا سارا ہی پیڑے بنانے کے لائق ہو گیا - ایک جھگی کے باہر بکری کی اوجھڑی پر برساتی مکھیاں، جو مصاحبوں کی طرح چپکوں اور لدھڑ ہو گئی تھیں، غارشتی کتے کے اڑائے سے نہیں اڑ رہی تھیں - یہ اس دودھ دینے والی مگر بیمار اور دم توڑتی ہوئی بکری کی اوجھڑی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے اس کے دو مہینے کے بچے سے ایک گز دور تین پڑوسیوں نے مل کر ثرت پُھرت ذبح کیا تھا تاکہ پُھری پھرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے - اس کا خون معاون نالوں اور نالیوں کے ذریعہ دور دور تک پھیل گیا تھا - وہ تینوں

ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ ایک بھائی کی حق حلال کی کمائی کو ضائع ہونے سے بال بال بچا لیا۔ موت کے منہ میں سے کیسا محال تھا انہوں نے بکری کو! چند جھکیوں میں مہینوں بعد گوشت پکنے والا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انہیں اس وقت ہوئی جب وہ اس جھکی کے سامنے سے گزرے جس میں لڑکیاں شادی کے گیت کا رہی تھیں۔ باہر لگی ہوئی کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں تو اب منظر نہیں آ رہی تھیں، لیکن ان کے کچے رنگوں کے باؤلے ریلوں سے ٹاٹ کی دیوار پر psychedelic patterns بن گئے تھے۔ ایک لڑکی آٹا گوند ہنسنے کے تسلے پر سمنگت کر رہی تھی کہ بارش سے اس کی ڈھولک کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

اماں! میرے بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا!

اماں! میرے بھتیجا کو بھیجوری کہ ساون آیا!

کہ ساون آیا

ہر بول کے بعد لڑکیاں بے وجہ بے تحاشا ہنستیں۔ کاتے ہوئے ہنستیں اور ہنستے ہوئے کاتیں تو راگ اپنی سُر سیما پار کر کے جوانی کی دوانی لے میں لے ملاتا کہیں اور ٹکل جاتا۔ سچ پوچھیے تو کنوار پتے کی بکارتی گھنگرالی ہنسی کی مڑکی ہی گیت کا سب سے البیلا ہریالا انگ تھا۔

ایک جھکی کے سامنے میاں بیوی لحاف کو رسی کی طرح بل دے کر نچوڑ رہے تھے۔ بیوی کا بھینکا ہوا گھونگٹ ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹک رہا تھا۔ بیس ہزار کی اس بستی میں دودن سے بارش کے سبب چولہے نہیں جلے تھے۔ نشیبی علاقے کی کچھ جھکیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ جھکیوں کی پہلی قطار کے سامنے ایک نیک نیت، خدا ترس، باریش بزرگ قورمہ اور تنوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہ رکشا میں رکھ کر لائے تھے۔ تین لحاف بھی مستحقین میں بانٹنے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ وہ گھر سے چلے تو اندازہ نہیں تھا کہ بیس ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انجکشن کی سرنگ سے آگ بجھانے کی کوشش کرے۔ پھر یہ بھی تھا کہ کسی بھی جھکی میں دو گز زمین کا ایسا خشک جزیرہ نہ تھا جہاں کوئی یہ لحاف اوڑھ کر سو سکے۔ اس بزرگ کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ دو سو تنگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم تھا جسے وہ کیونہ بنانے کے فوائد سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان آن پڑھ ٹھوٹ بچوں کی حس حساب ان سے کہیں بہتر تھی، کیوں کہ ان کے اندر والا بھوکا حساب داں بخوبی جانتا تھا کہ اگر تیس روٹیوں کو دو سو تنگ بھوکوں اور تین لحافوں کو بیس ہزار مستحقین میں تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم میں مخیر بزرگ کے تن پر ایک دھچی بھی باقی نہ رہے گی۔ اور اس

وقت یہی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بشارت آگے بڑھے تو دیکھا کہ کوئی جھکی ایسی نہیں جہاں سے بچوں کے رونے کی آواز نہ آرہی ہو۔ پہلی مرتبہ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بچے رونے کی ابتدا ہی اترے سے کرتے ہیں۔ جھکیوں میں آدھے بچے تو اس لیے پٹ رہے تھے کہ رو رہے تھے۔ اور بقیہ آدھے اس لیے رو رہے تھے کہ پٹ رہے تھے۔

وہ سوچنے لگے، تم تو ایک شخص کو پُر سادینے چلے تھے۔ یہ کس دُکھ سا گر میں آٹھلے۔ طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا۔ بڑے میاں کو تو کفن بھی بھیجا ہوا نصیب ہوا ہو گا۔ یہ کیسی بستی ہے جہاں بچے نہ گھر میں کھیل سکتے ہیں، نہ باہر۔ جہاں بیٹیاں دو گز زمین پہ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں۔ جب یہ دلہن بیاہ کے پر دیس جائے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہوگی؟ پھر خیال آیا، کیسا پر دیس، کہاں کا پر دیس، یہ تو بس لال کپڑے پہن کر یہیں کہیں ایک جھکی سے دوسری جھکی میں پیرہ بیدل چلی جائے گی۔ یہی سکھیاں سہیلیاں ”کلبے کو بیاہی بدیس رے! لکھی بابل مورے!“ کا قاتی ہوئی اسے دو گز پرائی زمین کے ٹکڑے تک چھوڑ آئیں گی۔ پھر ایک دن مینہ برستے میں جب ایسا ہی سماں ہو گا، وہاں سے آخری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی۔ اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی میں سما جائے گا۔ مگر سنو! بندہ خدا! تم کلبے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں؟ درختوں کو کچھ کارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے۔ کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آئی ہے؟

انہوں نے ایک پھریری لی اور ان کے ہونٹوں کے دائیں کونے پر ایک کڑوی سی، ترچھی سی مسکراہٹ کا بخنوبہڑ گیا۔ جو رونے کا یارا نہیں رکھتے وہ اسی طرح مسکرا دیتے ہیں۔

انہوں نے پہلے پہل اس گھور بستی کو دیکھا تھا تو کیسی اُبکائی آئی تھی۔ آج خوف آ رہا تھا۔ بھیگی بھیگی چاندنی میں یہ ایک شہر آسیب لگتا تھا جو کسی طور کراچی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حدِ نگاہ تک اونچے نیچے بانس ہی بانس۔ اور ٹپکتی چٹائیوں کی گچھائیں۔ بستی نہیں، بستی کا پنجر لگتا تھا جسے اسٹمی دھماکے کے بعد بچ جانے والوں نے کھڑا کیا ہو۔ ہر گڑھے میں چاند ٹکھا ہوا تھا اور مہیب دلدلوں پر آسیبی کرنیں اپنا چھلا واناچ ناچ رہی تھیں۔ جھینگر ہر جگہ بوتلے سنائی دے رہے تھے اور کسی جگہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ بھنگنوں اور پتنگنوں کے ڈر سے لوگوں نے لالٹینیں گل کر دی تھیں۔ عین بشارت کے سر کے اوپر سے چاند کو کاٹتی ایک ٹیڑھی بولتی ہوئی گزری۔ اور انہیں ایسا لگا جیسے اس کے شہ پر کی ہوا سے ان کے سر کے بال اڑے ہوں۔

نہیں - یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب ہے - جیسے ہی وہ موڑ سے نکلے، اگر بتیوں اور لوہان کی ایک سوگوار لپٹ آئی اور آنکھیں لیکا لیکا کی چکا چوند ہو گئیں - یا خدا! ہوش میں ہوں یا عالم خواب ہے؟

کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا کرامت حسین کی جھٹکی کے دروازے پر ایک پیٹرو میکس جل رہی ہے - چار پانچ پُرسا دینے والے کھڑے ہیں - اور باہر اینٹوں کے ایک چبوترے پر ان کا سفید براق کھوڑا بلبن کھڑا ہے!

مولانا کا پولیوزہ بیٹا اس کو پڑوسی کے گھر سے آئے ہوئے موت کے کھانے کی نان کھلا رہا تھا -

کار، کابلی والا اور الہ دین بے چراغ

۱

اعصاب پہ گھوڑا ہے سوار

علامہ اقبال نے ان شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر بڑا ترس کھایا ہے جن کے اعصاب پہ عورت سوار ہے۔ مگر ہمارے جیبب لبیب اور مدوح بشارت فاروقی ان بد نصیبوں میں سے تھے جن کی بے داغ جوانی اس شاعر کے کلام کی طرح تھی جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ موصوف کا کلام غلطیوں اور لطف دونوں سے پاک ہے! بشارت کی ٹرمہ بیڈی شاعروں، آرٹسٹوں اور افسانہ نویسوں سے کہیں زیادہ گھور کبھیر تھی۔ اس لیے کہ دکھیا کے اعصاب پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی سوار رہا، سوائے عورت کے۔ اس دور میں جسے ناحق جوانی دیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے اعصاب پر بالترتیب ملا، ناصح بزرگ، ماسٹر فاخر حسین، ممتحن، مولوی مظفر، داغ دہلوی، سینگل اور خسر بزرگوار سوار رہے۔ خدا خدا کر کے وہ اسی ترتیب سے ان پر سے اترے تو گھوڑا سوار ہو گیا، جس کا قصہ ہم ”اسکول ماسٹر کا خواب“ میں بیان کر چکے ہیں۔ وہ سبز قدم ان کے خواب، ذہنی سکون اور گھریلو بچٹ پر جھاڑو پھیر گیا۔ روز روز کے چالان، جرمانے اور رشوت سے وہ اتنے عاجز آچکے تھے کہ اکثر کہتے کہ اگر مجھے چوائس دی جائے کہ تم گھوڑا بننا پسند کرو گے یا اس کا مالک یا کوچوان تو میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے SPCA کا انسپکٹر بننا پسند کروں گا جو ان تینوں کا چالان کرتا ہے۔

* کابلی والا: ہر صغیر کی تقسیم سے قبل عقرباً ہر بڑے شہر میں سود پر قرض دینے والے افغانی بکثرت منظر آتے تھے۔ ان کی شرح سود یا عموم سو فی صد سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اور وصولی کے طریقے اس سے بھی زیادہ ظالمانہ۔ قرض لینے والے عموماً غریب غربا اور نوکری پیشہ لوگ ہوتے تھے۔ جس نے ان سے ایک دفعہ قرض لے لیا، وہ تادم مرگ سود ہی ادا کرتا رہتا تھا۔ اور تادم مرگ زر اصل اور خان صاحب سر پر چوں کے توں کھڑے رہتے تھے۔ بنگال، اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی، سیانچ پر روہیہ چلانے والے افغانیوں کو کابلی والا کہتے تھے۔ ٹیگور نے اسی عنوان سے ایک بہت خوبصورت کہانی لکھی ہے، جس کا ہمارے قفسے ناقص سے کوئی تعلق نہیں۔

سنگین غلطی کرنے کے بعد پس بینی (hindsight) کا مظاہرہ کرنے والوں کی طرح وہ اس زمانے میں چوائس کی بہت بات کرتے تھے۔ مگر چوائس ہے کہاں؟ مہاتما بدھ نے تو دو ٹوک بات کہہ دی کہ اگر چوائس دی جاتی تو وہ پیدا ہونے سے ہی انکار کر دیتے۔ لیکن ہم و ثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گھوڑے کو اگر چوائس دی جائے تو وہ اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی بننا پسند کرے گا۔ مہاتما بدھ بننا ہرگز پسند نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ گھوڑیوں کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھ سکتا جیسا گو تم بدھ نے یثودھرا کے ساتھ کیا۔ یعنی انہیں غافل سوتا چھوڑ کر بیابان کو تھل جائے یا کسی جاکے کے ساتھ بھاگ جائے۔ گھوڑا کبھی اپنے گھوڑے پن سے شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ نہ کبھی اس غریب کو فلک کج رفتار سے شکوہ ہو گا۔ نہ اپنے سوارِ گردوں رکاب سے کوئی شکایت۔ نہ تن بہ تدریہ، بسیار جُمو داؤں کے ہرجائی پن کا کوئی کلد۔ یہ تو آدمی ہی ہے جو ہر دم اپنے آدمی پن سے نادم و نالال رہتا ہے، اور اس فکر میں غلطیاں کہ

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

گھوڑا تا نگہ رکھنے اور اسے ٹھکانے لگانے کے بعد بشارت میں بظاہر دو متضاد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ گھوڑے اور اس کے دور و نزدیک کے تمام متعلقات سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔ تنہا ایک لنگڑے گھوڑے نے انہیں جتنا نقصان پہنچایا اسی تا تمام ہاتھیوں نے مل کر پورس کو نہیں پہنچایا ہو گا۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ اب وہ سواری کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ آدمی کو ایک دفعہ سواری کی عادت پڑ جائے تو پھر اپنی ٹانگوں سے ان کا فطری کام لینے میں توہین کے علاوہ مناقبت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کی لکڑی کی بزنس اب کافی پھیل گئی تھی جسے وہ کبھی اپنی دوڑ دھوپ کا پھل اور کبھی اپنے والد بزرگوار کی جوتیوں کا طفیل بتاتے تھے، جب کہ خود بزرگوار اسے بھاگوں گھوڑے کے قدموں کی برکت پر محمول کرتے تھے۔ بہر صورت، قابلِ غور بات یہ کہ ان کی ترقی کا محرک اور سبب کبھی پیروں اور جوتیوں کی سطح سے اوپر نہیں گیا۔ کسی نے بلکہ خود انہوں نے بھی ذہانت اور فراست کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا۔ لکڑی کی بکری بڑھی تو دھنروں کے چکر بھی بڑھے۔ اسی قدر سواری کی ضرورت میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں کمپنیوں میں رشوت نہیں چلتی تھی۔ لہذا کام نکالنے میں کہیں زیادہ ذلت و خواری ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں ایمان دار افسر کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ جب تک بیجا سختی، خوردہ گیری اور اٹل اور سٹریل پن سے سب کو اپنی ایمانداری سے عاجز نہ کر دے، وہ اپنی ملازمت کو پتکار خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ بے ایمان افسر سے بزنس مین باسانی منٹ لیتا ہے، ایمان دار افسر سے اسے ہول آتا

ہے۔ چنانچہ صورت یہ تھی کہ کمپنی سے لکڑی اور کھوکھوں کا آرڈر لینے کے لیے پانچ چکر لگائیں تو بل کی وصولی کے لئے دس چکر لگانے پڑتے تھے۔ جب سے کمپنیاں لیپڈ ہوئیں، انہوں نے دس پھیروں کا کارایہ اور محنت بھی لاگت میں شامل کر کے قیمتیں بڑھادیں۔ ادھر کمپنیوں نے ان کی نئی قیمتوں کو لٹس قرار دے کر دس فی صد کٹوتی شروع کر دی۔ بات وہیں کی وہیں رہی۔ فرق صرف استنا پڑا کہ ہر دو فریق ایک دوسرے کو لالچی، کائیاں اور چور سمجھ کر لین دین کرنے لگے۔ اور یہ چوکس اور کامیاب بزنس کا بنیادی اصول ہے۔

اب بغیر سواری کے گزر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سی سواری موزوں رہے گی۔ ٹیکسی ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ٹیکسی صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً ہارٹ اٹیک کے مریض کو اسپتال لے جانے، اغوا کرنے، ڈاکہ ڈالنے اور پولیس والوں کو لفٹ دینے کے لیے۔ اور یہ جو ہم نے کہا کہ مریض کو ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے جاتے تھے تو فقط یہ معلوم کرنے کے لیے لے جاتے تھے کہ زندہ ہے یا مر گیا! کیوں کہ اس زمانے میں بھی جناح اور سول اسپتال میں صرف انہی مریضوں کو داخلہ ملتا تھا جو پہلے اسی اسپتال کے کسی ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں preparatory (ابتدائی) علاج کروا کے اپنی حالت اتنی غیر کر لیں کہ اسی ڈاکٹر کے توسط سے اسپتال میں آخری منزل آسان کرنے کے لئے داخلہ مل سکے۔ ہم اسپتال میں مرنے کے خلاف نہیں۔ ویسے تو مرنے کے لئے کوئی بھی جگہ ناموزوں نہیں، لیکن پرائیویٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مرحوم کی جائداد، جمع جتھا اور بینک میلنس کے بٹوارے پر پسماندگان میں خون خرابا نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصے میں آ جاتے ہیں۔ افسوس! شاہ جہاں کے عہد میں پرائیویٹ اسپتال نہ تھے۔ وہ ان میں داخلہ لے لیتا تو قلعہ آگرہ میں اتنی طویل مدت تک اسیر رہنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے صاف بچ جاتا۔ اور اس کے چاروں بیٹے تخت نشینی کی جنگ میں ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے جتن میں سارے ہندوستان میں آنکھ مچولی کھیلتے نہ پھرتے، کیوں کہ فساد کی جڑ یعنی سلطنت و خزانہ تو بپلوں کی ادائیگی میں نہایت پُر امن طریقے سے جائز وارثوں یعنی ڈاکٹروں کو منتقل ہو جاتا۔ بلکہ انتقالِ اقتدار کے لیے فرسودہ ایشیائی رسم یعنی بادشاہ کے انتقال کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس لیے کہ جیتے جی تو ہر حکمران انتقالِ اقتدار کو اپنا ذاتی انتقال سمجھتا ہے۔

چلی سمتِ غرب سے اک ہوا۔۔۔

ہلوں کی وصولی کے سلسلے میں وہ کئی بار سائیکل رکشامیں بھی گئے۔ لیکن ہر بار طبیعت منقص ہوئی۔ پیڈل رکشا چلانے والے کو اپنے سے دگنی راس ڈھونی پڑتی تھی، جب کہ خود سواری کو اس سے بھی زیادہ بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ اپنے ضمیر سے بوجھوں مرقی تھی۔ ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے۔ اول، اس موقع پر جب دونوں میں سے ایک وفات پا چکا ہو۔ دوسرے، اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اردو متقاد ہو جس پر مردے ڈھونا فرض ہی نہیں، ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔ دودفعہ بسوں کی ہر مثال کے دوران بشارت کو سائیکل پر بھی جانا پڑا۔ ان پر انکشاف ہوا کہ کراچی میں بارہ ماسی باؤ مخالف کے سبب سائیکل اور سیاست دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوا کہ یاسارا شہر ایک بگولے کی آنکھ میں بسا دیا گیا ہے۔ اب اسے مغرب سے چلنے والی سمندری ہوا کی کینہ پروری کیسے یا کراچی والوں کی شومئی قسمت، آپ سیاست میں، یا سائیکل پر کسی بھی سمت نکل جائیں، آپ کو ہوا ہمیشہ مخالف ہی ملے گی۔ ہر دو عمل ایسے ہی ہیں جیسے کوئی آمدی میں پتنگ اڑانے کی کوشش کرے۔

خود کشی غریبوں کی دسترس سے باہر

ایک آدھ دفعہ خیال آیا کہ بسوں میں دھکے کھانے اور اسٹروپ ٹیز کروانے سے تو بہتر ہے کہ آدمی موٹر سائیکل خرید لے۔ موٹر سائیکل رکشا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ تین پہیوں پر خود کشی کا یہ سہل اور شرطیہ طریقہ ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں عام آدمی کو خود کشی کے لیے طرح طرح کی صعوبتیں اور ٹکھیر اٹھانی پڑتی تھی۔ گھروں کا یہ نقشہ تھا کہ ایک ایک کمرے میں دس دس آدمی اس طرح ٹھنسنے ہوتے کہ ایک دوسرے کی آنتوں کی قراقرح سن سکتے تھے۔ ایسے میں استنا تخلیہ کہاں نصیب کہ آدمی پھانسی کا پھندا اکڑے میں باندھ کر تہا سکون سے لٹک سکے۔ علاوہ انیس، کمرے میں صرف ایک ہی کڑا ہوتا تھا جس میں پہلے ہی ایک پنکھا لٹکا ہوتا تھا۔ گرم کمرے کے مکین اس کی جگہ کسی اور کو لٹکنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ رہے پستول اور بندوق، تو ان کے لئے لائسنس کی شرط تھی جو صرف امیروں، وڈیروں اور افسروں کو ملتی تھی۔ چنانچہ خود کشی کرنے والے ریل کی پٹری پر دن دن بھر لیٹے رہتے کہ ٹرین بیس بیس گھنٹے لیٹ ہوتی تھی۔ آخر غریب موت سے مایوس ہو کر کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

موٹر سائیکل میں بشارت کو سب سے بڑی قباحت یہ نظر آئی کہ موٹر سائیکل والا سڑک کے کسی بھی حصے پر موٹر سائیکل چلائے، محسوس یہی ہو گا غلط جگہ چلا رہا ہے۔ ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار پر ریسرچ کرنے کے بعد ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے ہاں پیدل چلنے اور موٹر سائیکل چلانے والے کا نارمل مقام ٹرک اور منی بس کے نیچے ہے! دوسری مصیبت یہ کہ ہم نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو پانچ سال سے کراچی میں موٹر سائیکل چلا رہا ہو اور کسی حادثے میں ہڈی پسلی نہ تڑوا چکا ہو۔ مگر ٹھہریے۔ خوب یاد آیا۔ ایک شخص بے شک ایسا ملا جو سات سال سے کراچی میں بغیر کسی ایسی ڈنٹ کے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ مگر وہ صرف موت کے کنوئس (Well of Death) میں چلاتا تھا۔ تیسری قباحت انہیں یہ نظر آئی کہ مین ہول بناتے وقت کراچی میونسپل کارپوریشن دو باتوں کا ضرور لحاظ رکھتی ہے۔ اول یہ کہ وہ ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ ڈھکنا دیکھ کر چوروں اور اچکوں کو خواہ مخواہ یہ تجسس نہ ہو کہ نہ جانے اندر کیا ہے۔ دوم، دہانہ استا چوڑا ہو کہ موٹر سائیکل چلانے والا اس میں اندر تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلا جائے۔ آسانی کے ساتھ۔ تیز رفتاری کے ساتھ۔ پیچھے بیٹھی ہوئی سواری کے ساتھ۔

خرگزشت

مکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ جب ہر سواری کے حسن و قبح پر باقاعدہ غور اور آپ سے مشورہ کیا گیا تو گدھے اور گدھا کاڑی کو کیوں چھوڑ دیا۔ ایک وجہ تو وہی ہے جو معاً آپ کے ذہن میں آئی۔ دوسری یہ کہ جب سے ہم گدھے پر چیسٹر ٹن کی معرکہ الآرا نظم پڑھی ہم نے اس جانور پر ہنسنا اور اسے حقیر سمجھنا چھوڑ دیا۔ گیارہ برس لندن میں رہنے کے بعد ہم پر بالکل واضح ہو گیا کہ مغرب میں گدھے اور اُلو کو کالی نہیں سمجھا جاتا۔ بالخصوص اُلو تو علوئے فکر اور دانائی کا سمبل ہے۔ یہاں اول تو کوئی ایسا نہیں ملے گا جو صحیح معنوں میں اُلو کہلانے کا مستحق ہو، لیکن اگر کسی کو اُلو کہہ دیا جائے تو وہ اپنے جاسے بلکہ اپنے پروں میں پُھولا نہیں سمائے گا۔ لندن کے چڑیا گھر میں اُلوؤں کے کچھ نہیں تو پندرہ پنجرے تو ضرور ہوں گے۔ ہر بڑے مغربی ملک کا نامندہ اُلو موجود ہے۔ ہر پنجرہ استا بڑا جتنا اپنے یہاں شیر کا ہوتا ہے۔ اور ہر اُلو استا بڑا جتنا اپنے یہاں کا گدھا۔ اپنے یہاں کا اُلو تو ان کے سامنے بالکل ہی اُلو معلوم ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں عینک سازوں کی سب سے بڑی کمپنی Donald Aitcheson کا logo (تجارتی نشان) اُلو ہے جو ان کے سائن بورڈ لیٹر ہیڈ اور پلوں پر بنا ہوتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے ایک بڑے اسٹاک بروکر کا ”لوگو“ اُلو ہے۔ یہ محض سُنی سنائی بات نہیں، ہم نے خود ڈانلڈ ایچسن کی عینک لگا کر

اسٹاک بروکر مذکور کے مشورے اور پیش گوئی کے مطابق کمپنی شیئرز (حصص) اور بونڈز کے تین چار ”فارورڈ“ سوے کیے، جن کے بعد ہماری صورت دونوں کے لوگوں سے ملنے لگی۔

سابق پریسیڈنٹ کارٹر کی ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان گدھا تھا، بلکہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ پارٹی پرچم پر بھی یہی بنا ہوتا ہے۔ اسی پرچم تلے پوری امریکن قوم ایران کے خلاف سیمینٹ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی رہی۔ ہمارا مطلب ہے بے حس و حرکت۔ مغرب کو گدھے میں قطعی کوئی مضحکہ خیز بات نظر نہیں آتی۔ فرانسیسی مفکر اور انشائیہ نگار موتین تو اس جانور کے اوصاف حمیدہ کا اس قدر معترف اور معترف تھا کہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ”روئے زمین پر گدھے سے زیادہ پُر اعتماد، مستقل مزاج، کجسیر، دنیا کو حقارت سے دیکھنے والا اور اپنے ہی دھیان اور دھن میں مگن رہنے والا اور کوئی ذی روح نہیں ملے گا۔“ ہم ایشیائی دراصل گدھے کو اس لیے ذلیل سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اپنی سہارا اور راسط سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے اور جتنا زیادہ پٹتا اور بھوکوں مرتا ہے، اتنا ہی اپنے آقا کا مطیع و فرمانبردار اور شکر گزار ہوتا ہے۔

بے کار مباش

سوار یوں کے حسن و قبح پر مدلل بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ بشارت نے ظاہر یہ کیا کہ وہ فقط استدلال اور رد و قبول کے عمل سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کار خریدنا، کاروباری ضرورت سے زیادہ ایک منطقی تقاضا ہے اور خدا نخواستہ نہ خریدی تو کاروبار تو ٹھپ ہو گا سو ہو گا، منطق کا خون ہو جائے گا اور اسطو کی روح جنت میں، یا جہاں کہیں بھی وہ ہے، تڑپ اٹھے گی، جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انہیں زندگی میں جس شے کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی، وہ دراصل کار نہیں، اسٹیٹس سمبل تھا۔ جب کوئی شخص دوسروں کو قائل کرنے کے لئے زور شور سے فلسفہ اور منطق بگھارنے لگے تو سمجھ جائے کہ اندر سے وہ پچارا خود بھی ڈھلہل ہے، اور کسی ایسے جذباتی اور نامعقول فیصلے کا عقلی جواز اور توجیہ تلاش کر رہا ہے جو وہ بہت پہلے کر چکا ہے۔ ہنری ہشتم نے تو محض اپنی ملکہ کو طلاق دینے اور دوسری عورت سے شادی رچانے کی خاطر پاپائے روم سے قطع تعلق کر کے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انکلینڈ کے مذہب یعنی چرچ آف انکلینڈ کی بنیاد ایک طلاق پر رکھی گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ فی زمانہ نئے مذہب کی ایجاد کا اس سے زیادہ معقول جواز اور ہو بھی نہیں سکتا۔

۲

میوہ میم کی مسکراہٹ کی قیمت

بشارت کافی عرصے سے سیکنڈ ہینڈ کار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ ایک دن خبر ملی کہ ایک برٹش کمپنی کے انگریز افسر کی چھ سلنڈر کی بہت بڑی کار بچاؤ ہے۔ افسر کا دو مہینے قبل اچانک انتقال ہو گیا تھا اور اب اس کی جوان میوہ اسے اونے پونے ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔ بشارت نے میوہ کو ایک نظر دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی کار کو جسے انہوں نے ہنوز دور سے بھی نہیں دیکھا تھا، خرید لیں گے۔ وہ اس کمپنی کو تین سال سے چیڑ کے پیکنگ کیس اور لکڑی سپلائی کر رہے تھے۔ کمپنی کے پارسی چیف اکاؤنٹنٹ نے کہا کہ آپ یہ کار ۱۱-۱۰-۳۲۸۳ روپے میں لے جائیے۔ ممکن ہے پڑھنے والوں کو یہ رقم اور آخری پائی تک کی باریکی عجیب لگے، مگر بشارت کو عجیب نہیں لگی۔ اس لیے کہ یہ وہ رقم تھی جو کمپنی ایک عرصے سے اس بہانے سے دبائے بیٹھی تھی کہ انہوں نے ناقص کھوکھے سپلائی کیے جس کی وجہ سے چنیوٹ اور سیالکوٹ میں سیلاب کے دوران کمپنی کے سارے مال کی گلدی بن گئی۔ بشارت کہتے تھے کہ میں نے بارہ بارہ آنے میں چیڑ کے کھوکھے سپلائی کیے تھے، آبدوز یا کستی نوح نہیں۔ کمپنی کے کھسبانے افسر God of Act (آفتِ سماوی) کا الزام عاجز پر لگا رہے ہیں۔

خوبصورت میم نے، جس کے میوہ ہونے سے وہ ناخوش نہ تھے، لیکن جسے میوہ کہتے ہوئے ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا، یہ بچ اور لگا دی کہ تین مہینے بعد جب وہ Batori جہاز سے لندن جائے گی تو اس کے سامان کی پیکنگ کے لیے مفت کریٹ مع کیلوں اور ترکھان کے سپلائی کرنے ہوں گے۔ اس شرط کو انہوں نے نہ صرف منظور کیا، بلکہ اپنی طرف سے یہ اور اضافہ کیا کہ میں روزانہ آپ کے بنگلے آ کر آپ کی اور اپنی نگرانی میں خود بنفس نفیس (بنفسِ نفسانی؟) پیکنگ کراؤں گا۔ بشارت نے چیف اکاؤنٹنٹ سے کہا کہ کار بہت پرانی ہے۔ ۲۵۰۰ میں مجھے دے دو۔ اس نے جواب دیا، منظور۔ بشرطیکہ آپ اپنے ناقص کھوکھوں کا بل گٹھا کر ۲۵۰۰ کر دیں۔ بشارت نے میم سے فریاد کی کہ ”قیمت بہت زیادہ ہے۔ کہہ سن کے کچھ کم کرا دو“ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اتنی حاشیہ آرائی اور کر دی کہ ”غریب آدمی ہوں۔ تلے اوپر کے سات آٹھ بچے ہیں۔ ان کے علاوہ تیرہ بھائی بہن مجھ سے چھوٹے ہیں۔“

یہ سنتے ہی میم کے چہرے پر حیرت، ہمدردی اور ستائش کا ملا جلا ایکسپریشن آیا۔ کہنے

“Oh! dear, dear! I see what you mean. Your parents too were poor but passionate.”

اس پر انہیں بہت طیش آیا۔ جواباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم میرے باپ تک کیوں جاتی ہو؟ لیکن اس جملے کی با محاورہ انگریزی نہیں بنی اور جو لفظی ترجمہ معاً ان کی زبان پر آتا آتا رہ گیا، اس پر خود انہیں ہنسی آگئی۔ انہوں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کیا کہ اب کبھی اپنے بچوں اور بھائی بہنوں کی تعداد بتانے میں مبالغے سے کام نہیں لیں گے، سوائے راشن کارڈ بنواتے وقت۔ اتنے میں میم بولی کہ ”ان داموں یہ کار مہنگی نہیں۔ اس سے زیادہ تو میرے شوہر کے ٹیک (ساگوان) کے تابوت کی لاگت آئی تھی۔“ اس پر سیلزمین شپ کے جوش میں بشارت کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ ”میڈم! آئندہ آپ بالکل یہ چیز ہم سے آدھے داموں میں لے لیجیے گا۔“ میم مسکرا دی اور سودا پٹکا ہو گیا۔ یعنی ۳۴۸۳ روپے، دس آنے اور گیارہ پائی میں کار ان کی ہو گئی۔

اس واقعے کا ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ آئندہ کسی ماکہک کے نام کا بل بناتے تو یہ لحاظ ضرور رکھتے کہ کم سے کم قیمت پر مال بیچیں تاکہ کم سے کم رقم ڈوبے۔ اور اگر مرحوم ناپسند کی حسین بیوہ سے رقم کے عوض کوئی چیز لینے پڑے تو کم سے کم داموں میں ہاتھ لگ جائے۔

میں خود آئی نہیں، لائی گئی ہوں!

بشارت اس زعم میں مبتلا تھے کہ انہوں نے سستے داموں کار خریدی ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے کھوکھے گھائے سے بیچے تھے۔ لیکن خوش فہمی اور مغالطے سے دل خوش ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ مرزا اسی بات کو اپنے بقراطی انداز میں یوں کہتے ہیں کہ ہم نے باون گز گہرے ایسے اندھے کنوئیں بھی دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ خود کو اوندھا دس یعنی سر کے بل اٹھ کھڑے ہو جائیں تو باون گز کے مینار بن جائیں گے۔ بہر کیف، بشارت نے beige رنگ کی کار خرید لی۔ وہ انتہائی منکسر مزاج آدمی ہیں۔ چنانچہ دوستوں سے یہ تو نہیں کہا کہ ہم بھی کار والے ہو گئے۔ البتہ اب ایک ایک سے کہتے پھر رہے ہیں کہ آپ نے میٹر رنگ دیکھا ہے؟ ہر شخص نفی میں گردن ہلاتا۔ فرماتے ”صاحب! انگریز نے عجب رنگ ایجاد کیا ہے۔ اردو میں تو اس کا کوئی نام بھی نہیں۔“ * نمونہ حاضر خدمت کروں گا۔

* افسوس، ہمیں احساس نہیں کہ ہمارے ہاں رنگوں کے قدیم اور خوبصورت نام بڑی تیزی سے متروک ہو رہے ہیں۔

کار خریدتے ہی وہ بے حد سوشل ہو گئے۔ اور ایسے لوگوں کے گھر بھی میڈرنگ کا نمونہ دکھانے کے لیے جانے لگے جن سے وہ عید بقرعید پر بھی ملنے کے روادار نہ تھے۔ جو دوست احباب یہ عجوبہ دیکھنے ان کے گھر آتے، انہیں مٹھائی کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ اسی مبارک سلامت میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن ایک دوست کے ہاں کار کی رونمائی کروانے جا رہے تھے کہ وہ آدھے راستے میں بچکولے کھانے لگی۔ پھر اس پر کالی کھانسی کا دورہ پڑا۔ جس دم کے سبب دھڑکن کبھی ہلکی ہلکی سنائی دیتی، کبھی بالکل غائب۔ خیال ہوا مگر کئے پڑی ہے۔ دفعتاً سنبھالا لیا۔ ہیڈ لائٹ میں ایک لحظہ کے لیے روشنی آئی۔ ہارن نے کچھ بولنا چاہا، مگر نقابت مانع ہوئی۔ چند لمحوں بعد دھکڑ دھکڑ دھکڑ دھکڑ کر کے جہاں کھڑی تھی وہیں انجر پنجر بکھیر کے ڈھیر ہو گئی۔ radiator کے ایک سرے سے بھاپ اور دوسرے سے تلل تلل پانی نکلنے لگا۔ گدھا گاڑی سے کھچوا کر گھر لائے۔ مستری کو گھر بلا کر دکھایا۔ اس نے بونٹ کھولتے ہی تین دفعہ دائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا پیٹا۔ بشارت نے پوچھا، خیر تو ہے؟ بولا بہت دیر کر دی۔ اس میں تو کچھ رہا نہیں۔ سب پُرزے جواب دے چکے ہیں۔ آپ کو مجھے چھ مہینے پہلے بلانا چاہیے تھا۔ بشارت نے جواب دیا کہ بلاتا کہاں سے۔ خریدے ہوئے کل ایک مہینہ ہوا ہے۔ بولا، تو پھر خریدتے وقت پوچھا ہوتا۔ آدمی صراحت بھی خریدتا ہے تو پہلے ٹن ٹن بجا کر دیکھ لیتا ہے۔ یہ تو کار ہے۔ آپ زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہتے تو میں فی الحال کام چلاؤ مرمت کئے دیتا ہوں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ آنکھوں کو دوں میں پانی اتر آئے تو معجون اور چمپی مالش کارگر نہیں ہوتی۔ پھر تو لاٹھی میساکھی چاہیے۔ یا جوان جوڑو۔ بشارت کو اس کی یہ بے تکلفی بہت ناگوار گزری، مگر غرض مند صرف آئینے کا منہ چڑا سکتا ہے۔

اس کے بعد کار مستقل خراب رہنے لگی۔ کوئی پُرزہ درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔ صرف rear view mirror یعنی پیچھے آنے والا ٹریفک دکھانے والا آئینہ صحیح کام کر رہا تھا۔ بعض اوقات کار کی رفتار گدھا گاڑی سے بھی زیادہ سست ہو جاتی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسی

کل انہیں کون پہچانے گا — شکر فی، ملا گیری، اگر نی، عتابی، کیاسی، کبودی، شُتری، زمردی، پیاسی، قرمزی، کابھی، کارکریزی، کاشی، مرقی، قنابری، موتیا، یلوفری، دھانی، شربتی، فالسی، جامنی، سنواری، چمپی، ترپوزی، مٹیالا، گیروا، مونگیا، شہتوتی، ترنجی، انگوری، کشمش، فاختی، ارغوانی، پستی، شفتالو، طاؤسی، آبنوسی، عودی، عنبری، حنائی، بنفشی، کسبری، طوسی اور ————— صوفیانہ، سوزیانہ۔

ہم نے اپنے لفظ خزانے پر لات ماری سوما، اپنی دھرتی سے چُھوٹنے والی دھک پر بھی خاک ڈال دی۔

میں باندھ کر کشاں کشاں لائی جاتی تھی۔

میں خود آئی نہیں، لائی گئی ہوں

کارا سٹارٹ کرنے سے پہلے وہ گدھا کاڑی کا کرایہ اور باندھنے کے لئے رسی وغیرہ ضرور رکھ لیتے تھے۔ اس مشینی جنازے کو گلیوں میں کھینچے پھرنے کا عمل جسے وہ tow کرنا کہتے تھے، اس کثرت سے دہرایا گیا کہ گھر میں کسی نیفے میں کمر بند اور چارپائی میں ادوان نہ رہی۔ اور ثانی الذکر پر سونے والے رات بھر کروٹ کروٹ جھولا جھولنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن بنارس خاں چوکیدار کی بکری کی زنجیر کھول لائے۔ مرزا کہتے ہی رہ گئے کہ جو زنجیر بالشت بھر کی بکری کو، جو تین دفعہ ”ہری“ (امید سے) ہو چکی ہے، قابو میں نہ رکھ سکی، وہ تمہاری بے کہی کار کو کیا خاک باندھ کے رکھے گی۔

۳

ہرفن (مست) مولا: الہ دین بے چراغ *

ڈرائیور کا مسئلہ خود بخود اس طرح حل ہو گیا کہ مرزا وحید الزماں بیگ عرف خلیفہ نے جو کچھ عرصے پہلے ان کا تانگہ چلا چکا تھا، جس کا مفصل حال ہم ”اسکول ماسٹر کا خواب“ میں بیان کر چکے ہیں، خود کو اس خدمت پر مامور کر لیا۔ تنخواہ البتہ دگنی مانگی جس کا جواز یہ پیش کیا کہ پہلے آدھی تنخواہ پر اس لئے کام کرتا تھا کہ گھوڑے کا دانہ چارا خود بازار سے لاتا تھا۔ پہلے پہل کار دیکھی تو بہت خوش ہوا، اس لیے کہ اس کی لمبائی گھوڑے سے تین ہاتھ زیادہ تھی۔ دوسرے، اس پر صبح شام کھیرا کرنے کا جھنجٹ نہیں تھا۔ آبائی پیشہ جٹامی، لیکن وہ ہرفن مولا نہیں، ہرفن مست مولا تھا۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو اس نے نہ کیا ہو اور بگاڑ نہ ہو۔ کہتا تھا کہ جس زمانے میں وہ

* الہ دین بے چراغ: بشارت کے ضعیف اور دائم المرض والد کو نام یاد نہیں رہتے تھے۔ لہذا وہ ہرنو کر کو الہ دین کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ الہ دین نہم تھا، جس کا مفصل تعارف ہم ”اسکول ماسٹر کا خواب“ میں کر چکے ہیں۔ خود کو ہرفن میں طاق سمجھتا تھا۔ مگر اس کا ہر کام بگڑ جاتا تھا۔ اکثر کہتا کہ میرے ہاتھ میں جادو ہے۔ سونے کو پٹھو لوں تو پیتل ہو جائے۔ مرزا سے طنزاً الہ دین بے چراغ کہتے تھے۔

اصل نام بدھن تھا۔ بشارت بوجہ اسے خلیفہ کہنے لگے تھے۔ ان صفحات میں جہاں بھی خلیفہ کا ذکر آیا ہے، اس سے الہ دین نہم مراد ہے۔

برمافرٹ پر جاپانیوں کو شکست دے رہا تھا، تو ان کی سرکوبی سے جو وقت بچتا، جو کہ بہت کم بچتا تھا، اس میں فوجی ڈرائیونگ کیا کرتا تھا۔ اس کی سواریوں نے کبھی اس کی ڈرائیونگ پر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ بڑے سے بڑا ایکسی ڈنٹ بھی ہوا تو کسی سواری کی موت واقع نہیں ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گوروں کی میت کاڑی چلاتا تھا۔ جو شیخی بھری کہانیاں وہ سناتا تھا ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ رجمنٹ کے مرنے والوں کو اُتھلی قبر تک پہنچانے اور جو فی الحال نہیں مرے تھے ان کی حجامت کے فرائض اس نے اپنی جان پر کھیل کھیل کر انجام دیے۔ اس بہادری کے صلے میں اسے ایک کانسی کا میڈل ملا تھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ایک سردار جی نے کرپان دکھا کر چھین لیا۔

ایسے انا بھرے غباروں میں سوئی چھوٹا چنداں ضروری نہیں۔ البتہ اتنی تصدیق، ہم بھی کر سکتے ہیں کہ جب سے اس نے سنا کہ بشارت کار خریدنے والے ہیں، اس نے مکمل بادشاہ خان ٹرک ڈرائیور سے کار چلانی سیکھ لی۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص لوہار کی شاگردی اختیار کر کے سنار کا کام شروع کر دے۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ اس زمانے میں ایک اینگلو انڈین سارجنٹ لیا کرتا تھا جس کے سارے کنبے کے بال وہ پانچ چھ سال سے کاٹ رہا تھا۔ خلیفہ کا اپنا بیان تھا کہ ”سارجنٹ نے جناح کورٹ کے پاس والے میدان میں میرا ٹیسٹ لیا۔ ٹیسٹ کیا تھا، فقط ضابطے کی خانہ پُری کہئے۔ بولا ’Well! caliph! کار سے انگلش کا figure of 8 بنا کر دکھاؤ۔ صرف اس ایریا میں، جہاں ہم یہ لال جھنڈی لیے کھڑا ہے۔ اس لائن کو کر اس نہیں کرنا۔ 8 ایکڈم ریورس میں بنانا مانگا۔ یہ سنتے ہی میں بچک رہ گیا۔ ریورس میں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مکمل بادشاہ خان سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ استاد! مجھے ریورس میں بھی چلانا سکھا دو۔ وہ کہنے لگا کہ یہ میرے استاد نے نہیں سکھایا۔ نہ کبھی اس کی ضرورت پڑی۔ میرا استاد چنار گل خان بولتا تھا کہ شیر، ہوائی جہاز، گولی، ٹرک اور پٹھان ریورس گیئر میں چل ہی نہیں سکتے۔

”میں نے اپنے دل میں کہا کہ چھندر کی دُم! میں انگلش کا 8 کا ہندسہ بنا سکتا تو تیرے جیسے بھالو کی حجامت کاٹے کو کرتا۔ غلام محمد گورنر جنرل کی چمپی مالش کرتا۔ کیا بتاؤں، اس گئے کار نے کیسے کیسے پاؤں پیلے ہیں۔ جی جی ہاؤس میں مالی کام بھی کیا ہے۔ ہتھیلی پہ سروس تو نہیں اکائی، البتہ کراچی میں، کیا نام اس کا، ٹیولپ اُکا کے دکھایا ہے۔ پر بڑے آدمیوں کی کوٹھیوں میں پھولوں کو کوئی نگاہ بھر کے نہیں دیکھتا۔ بس مالی خود ہی پھول اکاتے ہیں اور خود ہی دیکھ دیکھ کے خوش ہو لیتے ہیں۔ ہدایت اللہ میرا میرے کو بولتا تھا کہ جی جی صاحب کا ہر عضو مافوج ہو گیا ہے۔ زبان بھی۔ اسی حالت میں ہر آئے گئے کو مادر پدر کرتا رہتا ہے۔ پر آدمی

ہے نہ۔ چھوٹوں پہ کالی ضائع نہیں کرتا۔ جیسے جیسے طاقت جواب دے رہی ہے، کالی اور زبان اور موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی بات اب صرف اس کا خدمت کار ہے اس کے منہ سے اپنا کان بھڑا کر سنتا اور سمجھتا ہے۔ وہی اس کی پنجابی کالی کا دلی والوں کی اردو میں ترجمہ کر کے قرۃ اللہ شباب صاحب کو بتاتا ہے۔ وہ فٹافٹ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے جی جی کی امریکی سکریٹری مس روتھ مورل کو بتاتے ہیں۔ پھر وہ پٹاخہ، فارینر لوگوں اور وزیروں سفیروں کو کوٹھے مٹکا کر بتاتی ہے کہ جی جی صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ سے مل کے بہت جی خوش ہوا۔ کئی دفعہ جی چاہا کہ جی جی کو اپنی ماش سے ٹھیک کر دوں۔ دو منٹ میں ناف اور رگ پٹھے ایسے بٹھا دوں کہ ہرن کی موافق قلاںچیں بھرتا پھرے۔ پر یہ سوچ کے چُپ ہو رہا کہ کل کلاں کو وہ فوت ہو گیا، جو کہ اسے ہونا ہے، تو مجھے جیل، اور تیل کی بوتل کو معاہدے کے لیے بھیج دے گا۔

”تو جناب عالی! سار جنٹ نے اپنے بوٹ سے زمین پر 8 بنا کر دکھایا۔ لاحول ولاقوہ! میں بے فضول ڈر گیا تھا۔ اب پتہ چلا کہ سائیس میں جسے ائیرن کہتے ہیں اسے انگریزی میں فکر آف 8 کہتے ہیں۔ جنگلی گھوڑے کو سدھانے اور اس کی ساری مستی نکالنے کے لیے اسے تیزی سے دو گھری پھرت چکر دینے کو ائیرن کہتے ہیں۔ تو گویا ڈرائیونگ ٹیسٹ کا یہ مقصد ہے! پر میں کچھ نہیں بولا۔ بس جل تو جلال تو کہہ کے ریورس میں 8 کے بجائے کسے ہوئے ازار بند کی سی گرہ بنانے لگا کہ یکایک پتے پتے سے سار جنٹ کے چٹخنے چلانے کی آوائس آئیں۔ اسٹاپ! اسٹاپ! یو ایڈیٹ! وہ اپنی جان بچانے کے لیے کار کے بمپر پہ لال جھنڈی سمیت پڑھ گیا تھا۔ ازار بند کی گرہ میں لپٹتے لپٹتے یعنی کار کے نیچے آتے آتے بچا۔ میں نے کہا، سر! دوبارہ ٹیسٹ کے لیے آجاؤں؟ مگر اس نے دوبارہ ٹیسٹ لینا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دن آپ کے غلام کو لائسنس مل گیا۔“

”آپ کی جوتیوں کے طفیل ہر فن میں طاق ہوں مجھے کیا نہیں آتا۔ جڑا جی بھی کی ہے۔ ایک آپریشن بگڑ گیا تو کان پکڑے۔ ہوا یوں کہ میرا دوست آلن اپنی ماموں زاد بہن پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ پر وہ کسی طور شادی پر رضامند نہیں ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں آلن کو یہ وہم ہو گیا کہ اس کی بائیں ران پہ جو مسٹا ہے، اس کی وجہ سے شادی نہیں ہو رہی۔ میں نے وہ مسٹا کاٹ دیا۔ ناسور بن گیا۔ وہ لنگڑا ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے سرجری نہیں کی۔ وہ لڑکی آخر کے تئیں میری زوجہ بنی۔ میری دائیں ٹانگ پہ مسٹا ہے۔“

ماحول پر لاجول اور مار کونی کی قبر پر۔۔۔

کار متعدد اندرونی و غیر اندرونی، خفیہ اور علانیہ امراض میں مبتلا تھی۔ ایک پُرزے کی مرمت کرواتے تو دوسرا جواب دے دیتا۔ جتنا پٹرول جلتا، اتنا ہی مویل آئل۔ اور ان دونوں سے دگنمان کا اپنا خون جلتا۔ آج کلچ پلیٹ جل گئی تو کل ڈائی نمویٹھ گیا۔ اور پرسوں گیئر بکس بد لو اکر لائے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سیٹ کے نیچے کُدا ل چلا رہا ہے۔ خلیفہ نے تشخیص کی کہ صاحب! اب یونیورسل اڑی کر رہا ہے۔ پھر بریک گرڈ کرنے لگے۔ مستری نے کہا، ماڈل بہت پرانا ہے۔ پُرزے بننے بند ہو گئے۔ آپ کہتے ہیں تو مرمت کر دوں گا، مگر مرمت کے بعد بریک یا تو مستقل لکار ہے گا، یا مستقل کھلا رہے گا۔ سوچ کر دونوں میں سے چوڑ کر لیجئے۔ دو ہفتے بعد خلیفہ نے اطلاع دی کہ کار کے Shock Observers ختم ہو گئے۔ وہ Shock Absorbers کو Shock Observers کہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب وہ شاک روکنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ جہاں دیدہ بڑے بوڑھوں کی مانند ہو گئے تھے جو کسی نیم تاریک کونے یا زینے کے نیچے والی تکیوں کی بجاری میں پڑے پڑے صرف observe کر سکتے ہیں۔ جو ناخلف دکھائیں سو ناچار دیکھنا۔ یہ مقام خود شناسی اور دانائی کا ہے۔ جب انسان پچشم خود لغو سے لغو حرکت اور کر توت دیکھ کر نہ آزرہ ہو، نہ طیش میں آئے اور نہ ماحول پر لاجول پڑھے تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلے ہم دوسری وجہ بیان کر دے گے۔ وہ یہ کہ اب وہ جہاں دیدہ، بُردار اور درگزر کرنے والا ہو گیا ہے۔ اور پہلی وجہ یہ کہ وہ حرکت اس کی اپنی ہی ہے۔

ایک دن گیارہ بجے رات کو ظریف جبل پوری کے مکان واقع ایلو منیم کوارٹرز سے واپسی میں گورا قبرستان کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہارن کی آواز میں ریشہ پیدا ہوا۔ منجھکھوسا بولنے لگا۔ خود ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کہ ہیڈ لائٹ کی روشنی جا چکی تھی۔ خلیفہ نے کہا ”جناب عالی! بیٹری جواب دے رہی ہے۔“ انہیں تعجب ہوا، اس لیے کہ وہ روزانہ اپنی لکڑی کی دکان پر پہنچتے ہی بیٹری کو کار سے نکال کر آرا مشین سے جوڑ دیتے تھے تاکہ آٹھ گھنٹے تک چارج ہوتی رہے۔ شام کو گھر پہنچتے ہی اسے نکال کر اپنے ریڈیو سے جوڑ دیتے جو صرف کار بیٹری سے چلتا تھا۔ * پھر رات کو بارہ ایک بجے جب ریڈیو پروگرام ختم ہو جاتے تو اسے ریڈیو سے

* اس زمانے میں ریڈیو میں مارچ بیٹری کے بجائے کار بیٹری لگانی پڑتی تھی اور اسے روزانہ چارج کرنا پڑتا تھا۔ بہار کالونی میں، جہاں وہ رہتے تھے، اس زمانے میں بجلی نہیں آتی تھی۔

علحدہ کر کے واپس کار میں لکادیتے تاکہ صبح خلیفہ ٹرٹرنہ کرے۔ اس طرح بیٹری آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں تین مختلف چیزوں سے جڑی رہتی تھی۔ جواب نہ دیتی تو کیا کرتی۔ بالکل کنفیوز ہو جاتی تھی۔ ہم نے خود دیکھا کہ ان کے ریڈیو سے چھپے ہوئے پروگرام کے بجائے اکثر آرامشیں کی آوانس نشر ہوتی رہتی تھیں جنہیں وہ پتکاراگ سمجھ کر ایک عرصے تک سر دھنا کئے۔ اسی طرح کار کے انجن سے موسم کی خرابی کی ریڈیائی آوانس آنے لگی تھیں۔ عجیب کھپلاتھا۔ رات کو پچھلے پہر کے سنائے میں جب اچانک عجیب و غریب آوانس آنے لگتیں تو گھر والے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ریڈیو کی ہیں، یا کار کی، یا آرامشیں میں قوال پھنس گیا ہے۔ اور ان پچاروں کی معذوری قابلِ معافی تھی۔ اس لئے کہ ان آوازوں کا مخرج دراصل وہ گلا تھا جس سے بشارت خرائے لے رہے ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کراچی ریڈیو سے میرے گلے میں مستقل خراش پڑ گئی ہے۔ ایک اور عذاب یہ کہ جب تک ریڈیو اسٹیشن بند نہ ہو جاتا، تین چار پڑوسی ان کی چھاتی پر سوار پروگرام سنتے رہتے۔ اب بشارت اس مردم آزاد ایجاد سے سخت متنفر ہو گئے تھے۔ غالباً ایسے ہی حالات اور ایسے ہی بلیک موڈ میں عصر حاضر کے سب سے بڑے انگریزی شاعر فلپ لارکن نے کہا تھا کہ مارکونی (+) کی قبر پر پبلک ٹائلٹ بنا دینا چاہیے۔

سوداوی اور صوبائی مزاج کے چار پہیے

چند روز سے جب گرمی نے شدت پکڑی تو چاروں پہیوں کا مزاج سوداوی و صوبائی ہو گیا۔ مطلب یہ کہ چاروں پہیے چار مختلف سمتوں میں جانا چاہتے اور اسٹیئرنگ وہیل سے روٹھے رہتے تھے۔ یہی نہیں، بعض اوقات خود اسٹیئرنگ وہیل پہیوں کی مرضی کے مطابق گھومنے لگتا تھا۔ خلیفہ سے پوچھا ”اب یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے مطلع کیا ”حضور! اسے ویبلنگ (wobbling) کہتے ہیں۔“ انہوں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی اُنھن دور ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر بعد وہ یہ سوچ کر مسکرا دیے کہ کاریہ چال چلے تو wobbling۔ راج ہنس چلے تو waddling۔ ناگن چلے تو wriggling۔ اور ناری چلے تو wiggling۔

یہ کنار چلا کہ ناؤ چلی

واہ کیا بات دھیان میں آئی

اس دفعہ وہ خود بھی ورکشاپ گئے۔ مستری نے کہا، رنگ سے سائی لینسر بھی جھڑنے والا

بندہ مرزا کہتے ہیں کہ ”کراچی کی ہوا میں اتنی رطوبت اور دلوں میں اتنی رقت ہے کہ کھلے میں ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں موند کر کھڑے ہو جاؤ تو پانچ منٹ میں چلو بھر پانی اور تھیلی بھر پیسے جمع ہو جائیں گے۔ اور اگر چھ منٹ تک ہاتھ پھیلائے اور آنکھیں موندے رہو تو پیسے غائب ہو جائیں گے۔ یہاں پال، سائی لینسر اور پٹھن قبل از وقت جھڑ جاتے ہیں۔ لاہور میں کم از کم اتنا تو ہے کہ سائی لینسر نہیں جھڑتے۔“ مستری نے مشورہ دیا کہ ”اگلے مہینے جب نیا ہارن فٹ کرائیں تو سائی لینسر بھی بد لو لیں۔ اس وقت تو یہ اچھا خاصا ہارن کا کام دے رہا ہے۔“ بشارت نے جھنجھلا کر پوچھا ”اس کا کوئی پرزہ کام بھی کر رہا ہے یا نہیں؟“ مستری پہلے تو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جواب دیا کہ ”mileometer“ دگنی رفتار سے کام کر رہا ہے!“ واصل اب کار کی کارکردگی بلکہ ناکارکردگی Murphy's Law کے عین مطابق ہو گئی تھی یعنی اس کی ہر وہ چیز جو بگڑ سکتی تھی، بگڑ گئی تھی۔ اس صورت میں حکومت تو چل سکتی ہے، کار نہیں چل سکتی۔

شتر ترانہ

متواتر مرمت کے باوجود بریک درست نہ ہوئے۔ لیکن اب ان کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ ان کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ جس جگہ بریک لگانا ہو، کار اس سے ایک میل پہلے ہی رگ جاتی تھی۔ اور بشارت نے توجہ سے ڈرائیونگ سیکھنی شروع کی، وہ بجلی کے کھمبوں سے بریک کا کام لے رہے تھے۔ کھمبوں کے استعمال پر ان کا کئی کتوں سے جھگڑا بھی ہوا۔ مگر اب بعض کتوں نے چمکتی وہیل کیپ سے کھبے کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس عمل کے دوران خود کو گردن موڑ کر وہیل کیپ میں دیکھتے جاتے تھے۔ حال ہی میں بشارت نے یہ بھی نوٹس کیا کہ کار کچھ زیادہ ہی زورورنج اور حساس ہو گئی ہے۔ سڑک کر اس کرنے والے کی کمالی سے بھی رکنے لگی تھی، بشرطیکہ انگریزی میں ہو۔ وہ بتدریج خوش خرامی سے سبک خرامی اور مست خرامی، پھر آہستہ خرامی اور خرامی کی منزلوں سے گزر کر اب نری تک حرامی پر اتر آئی تھی۔ اس کی چال اب ان اڈیل اور مٹھے اونٹوں سے ملنے لگی جس کی تصویر ریڈیو کپلنگ نے اونٹوں کے Marching Song میں کیچھنی ہے، جس کی تان اس پر ٹوٹتی ہے:

Can't! Don't! Shan't! Won't!

*Murphy's Law: Any thing that can go wrong will go wrong.

بلاشبہ یہ تان حقیقت ترجمان اس لائق ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک، جو کسی طور آگے نہیں بڑھنا چاہتے، اسے اپنا قومی ترانہ بنالیں۔

”اسٹوڈنٹ کاؤ“ سے مکالمہ

ڈھائی تین مہینے تک بشارت کا تمام وقت، محنت، کمائی، دعائیں اور کالیاں ناکارہ کار پر صرف ہوتی رہیں۔ ابھی اسپر نا بکار (بلبن) کا زخم پوری طرح نہیں بھرا تھا کہ یہ فوہا * ہو گیا۔ بقول استاد قمر جلالوی:

ابھی کھا کے ٹھوکر سنہلنے نہ پائے کہ پھر کھائی ٹھوکر سنہلنے سنہلنے

کاراب اپنی مرضی کی مالک ہو گئی تھی۔ جہاں چلنا چاہیے وہاں ڈھٹائی سے کھڑی ہو جاتی اور جہاں رگنا ہو وہاں ادبہا کے چلتی رہتی۔ مطلب یہ کہ چوراہے اور سپاہی کے اجازتی سگنل پر کھڑی ہو جاتی، لیکن بمپر کے سامنے کوئی راہگیر آ جائے تو اسے صرف نظر کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ جس سڑک پر ٹکل جاتی، اس کا سارا ٹریفک اس کے خرام و قیام کا تابع ہو جاتا جواب فیض کے مصرع کی الٹ ہو گیا تھا:

جو چلے تو کوہ گراں تھے ہم، جوڑ کے تو جاں سے گزر گئے

تھک ہار بشارت اسی میم کے پاس گئے اور منت سماجت کی کہ خدا را! پانچ سو کم میں ہی یہ کار واپس لے لو۔ وہ کسی طرح نہ مانی۔ انہوں نے اپنی فرضی مفلوک الحالی اور اس نے اپنی بیوگی کا واسطہ دیا۔ انصاف کی توقع اٹھ گئی تو رحم کی اپیل میں زور پیدا کرنے کے لیے دونوں خود کو ایک دوسرے سے زیادہ مسکین اور بے آسرا ثابت کرنے لگے۔ دونوں پریشان تھے۔ دونوں دکھی اور مصیبت زدہ تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے لیے پتھر کا دل رکھتے تھے۔ بشارت نے اپنی آواز میں مصنوعی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور بار بار رومال سے ناک پونچھی۔ جواب میں میم سچ مچ رو پڑی۔ اب بشارت نے جلدی جلدی پلکیں پٹ پٹا کر آنکھوں میں آنسو لانے چاہے مگر اٹھی ہنسی آنے لگی۔ بدرجہ مجبوری دو تین نہایت دردناک مگر بالکل فرضی منظر (مثلاً اپنے مکان اور دکان کی قرتی اور نیلام کا منظر۔ ٹریفک کے حادثے میں اپنی بے وقت موت اور اس کی خبر ملتے ہی سیکم کا جھٹ سے سفید موٹی ملل کا دوپٹہ اوڑھ کر چھن چھن

* فوہا: (پنجابی) میرا خیال ہے کہ اس کا اصل ماخذ فرنج faux pas ہے، جس کا تلفظ اور معنی بعینہ وہی ہیں۔

چوڑیاں توڑنا اور رو رو کر اپنی آنکھیں نبجالینا) آنکھوں میں بھر کر خود پر رقت طاری کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ دل پسچانہ آنکھ سے آنسو پکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں اپنے سنی ہونے پر سخت غصہ آیا۔ دفعتاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے نوٹس کا خیال آگیا اور ان کی گھٹی بندھ گئی۔ انہوں نے کوڑا کڑاتے ہوئے کہا کہ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں، اگر یہ کار کچھ دن اور میرے پاس رہ گئی تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا بے موت مر جاؤں گا۔“

یہ سنتے ہی میم پگھل گئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو بھر کے بولی، آپ کے بچوں کا کیا بنے گا، جن کی صحیح تعداد کے بارے میں بھی آپ کو شک ہے کہ سات ہیں یا آٹھ۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے میاں کی ہارٹ اٹیک سے موت بھی اسی منحوس کار کی وجہ سے ہوئی۔ اور اسی میں ——— اسٹیئرنگ ویل پر دم توڑا۔

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ میں گھوڑے کے ساتھ ہی گزارہ کر لیتا۔ اس پر وہ غصیفہ چوکی اور مشتاقانہ بے صبری سے پوچھنے لگی:

“You mean a real horse?”

“Yes. Of course! Why?”

”میرے پہلے شوہر کی موت گھوڑے پر سے گرنے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ بھلا چنکا پو لو کھیل رہا تھا کہ گھوڑے کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ گھوڑا اس پر گرا۔ وہ مجھے بڑے پیار سے Stupid cow کہتا تھا۔“ اس کی ایٹنکو سیکسن بلو کرے آنکھوں میں سچ مچ آنسو تیر رہے تھے۔

ویسے بشارت رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ جوان عورت کو اس طرح آبدیدہ دیکھ کر ان کے دل میں اس کے آنسوؤں کو ریشمی رومال سے پونچھنے اور اس کی حالتِ بیوگی کو فی الفور ختم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ یہ کہنا تو کسرِ سیانی ہوگی کہ ان کے نہاں خانہ دل کی کسی منزل میں خوبصورت عورت کے لئے ایک نرم گوشہ تھا، اس لیے کہ یہاں تو تمام منزلیں، سارے کا سارا خانہ ویران

استظارِ صید میں اک دیدہ بے خواب تھا

۔۔ کہ بنے ہیں دوست ناصح

انسان کا کوئی کام بگڑ جائے تو ناکامی سے اتنی کوفت نہیں ہوتی جتنی ان بن مانگے مشوروں اور نصیحتوں سے ہوتی ہے جن سے ہر وہ شخص نوازتا ہے جس نے کبھی اس کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کسی دانائے کیسی پتے کی بات کہی تھی کہ کامیابی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پھر آپ کو کوئی مشورہ دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے چھوٹے منہ سے بڑی بات نہیں کہہ سکتے۔ نہ چھوٹی۔ لہذا یہ ہمیں بتا سکتے کہ ہم کامیاب ہیں یا ناکام۔ لیکن استانا پتا بتائے دیتے ہیں کہ اگر ہمارے اسکر و اور ڈھیریاں لگی ہوتیں تو ہمارے تمام دوست، احباب اور بھی خواہ سارے کام دھندے چھوڑ چھا، اپنے اپنے پیچ کش اور پائے (spanners) لے کر ہم پر پل پڑتے۔ ایک اپنے چوکور پائے سے ہماری گول ڈھیری کھولنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا تیل دینے کے سوراخ میں ہتھوڑے سے اسکر یو ٹھونک دیتا۔ تیسرا شبانہ روز کی محنت سے ہمارے تمام اسکر و ”ٹائٹ“ کرتا۔ آخر میں سب مل کر ہمارے سارے اسکر و اور ڈھیریاں کھول کر پھینک دیتے۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم ان کے بغیر بھی فقط دوستوں کی قوت ارادی سے چل پھر اور چرچک سکتے ہیں یا نہیں۔ ہماری اور ان کی ساری عمر اسی کھڑ پیچ میں تمام ہو جاتی۔ کچھ ایسا ہی احوال میاں بشارت کا ہوا۔ کار کے ہر بریک ڈاؤن کے بعد انہیں بکثرت ایسی نصیحتیں سننی پڑتیں جن میں کار کی خرابیوں کے بجائے ان کی اپنی خامیوں کی طرف ایسے بلیغ اشارے ہوتے تھے جنہیں سمجھنے کے لیے عاقل ہونا ضروری نہیں۔ ادھر بیدل چلنے والے بشارت کو دیکھ دیکھ کر شکر کرتے کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ کار نہیں رکھتے۔

نصیحت کرنے والوں میں صرف حاجی عبدالرحمن علی محمد بانٹوا والے نے کام کی بات کہی۔ اس نے نصیحت کی کہ کبھی کسی بزرگ کے مزار، انکم ٹیکس کے دفتری ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں جانا ہو تو کار ایک میل دور کھڑی کر دو۔ ایک ہفتے پہلے سے پان کھانے کے بعد ذانت صاف کرنا بند کر دو۔ دہانے کے دونوں طرف ریکھوں میں پیک کے بریکٹ لگے رہنے دو۔ اور چار دن کے پہنچے ہوئے کپڑے اور اتنی ہی مدت کا بڑھا ہوا شیو لے کر ان کے سامنے جاؤ۔ اگر فیکٹری کے مالک ہو تو ریحی والے کا ساحلیہ بنا لو۔ ”نئیں تو سالالوگ ایک دم چڑی اتار لیں گا اور کورے بدن پہ نمک مرہی کی مالش کر کے ہوا بندر کو بھیج دیں گا۔ تم اکٹھا (تمام) عمر تراہ تراہ کرتا پھر بس گا۔ اسے بھائی! ہم تمہارے کو بولتا ہے۔ کبھی انکم ٹیکس افسیر، پولیس، جوان جو رو اور پیر فقیر کے پاس جاؤ تو سولجر کی مافک کھالی ہاتھ ہلاتے، ڈیل مارچ کرتے نئیں جاؤ۔ ہمیش کوئی ڈالی، کچھ

مال پانی، کچھ نخر نخرانہ لے کے جاؤ۔ نٹیں تو سالہ لوگ کھڑے کھڑے کھال کھنچوا کے اس میں ڈان اخبار کی رڈی بھروادس گا۔ سبجا (سبزہ۔ سو روپے کا نوٹ) دیکھ کے جس کی آنکھ میں ٹوہنڈرڈ کینڈل پاور کا چمکارا نہیں آئے تو سمجھو سالہ سولہ آنے کمر بلا ٹیڈ ہے یا اولیا اللہ بنے لا (بن گیا) ہے۔ نٹیں تو پھر ہوئے نہ ہوئے اسٹیٹ بینک کا گورنر ہے جو نوٹوں پر دستکھت (دستخط) کرتا ہے۔“

۴

مکالمہ در مذمتِ نیم

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کار کے عیبوں پر سے پردہ اٹھاتے اٹھاتے خلیفہ اپنا نامہ اعمال کھول کے بیٹھ جاتا، اور اپنے کر توت کو کرامات کی طرح بیان کرنے لگتا۔ یہ تو کوئی مزاج داں ہی بتا سکتا تھا کہ حقیقت بیان کر رہا ہے یا حسرتوں کے میدان میں خیالی گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ ایک دن فقیر محمد خان سماں سے کہنے لگا ”آج تو سعید منزل کے سامنے جاری گھوڑی (کار) بالکل باؤلی ہو گئی۔ ہر پرزہ انا الحق کہنے لگا۔ پہلے تو انجن گرم ہوا۔ پھر radiator جس کے لیک (leak) کو میں نے صابن کی لکڑی سے بند کر رکھا تھا، پھٹ گیا۔ پھر پچھلا ٹائر لیک کرنے لگا۔ میں نے ہوا بھرنے کے لیے کار کا ہم عمر پمپ نکالا تو معلوم ہے کیا ہوا؟ پتہ چلا کہ پمپ میں سے ہوا لیک کر رہی ہے! فین سیلٹ بھی گرمی سے ٹوٹ گئی۔ انگریز کی سواری میں رہنے سے اس کا مزاج بھی سوداوی ہو گیا ہے۔ حکیم فہیم الدین اگرے والے کہا کرتے تھے کہ عورت سوداوی مزاج کی ہو تو مرد آتش مزاج کا چاہیے ہی چاہیے۔ یار! آتش مزاج پہ یاد آیا۔ عبدالرزاق چھیلا کو، ابے وہی چھیلا ناز سنیا کا گیٹ کیپر، آتشک ہو گئی ہے۔ سالہ اپنے کیفر کر توت کو پہنچا۔ کہتا ہے انگلش فلمیں دیکھنے اور گڑکی گڑک کھانے اور نور جہاں کے کمانوں سے خون گرمی کھا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ہمارے یہاں دستور تھا، پتا نہیں تیری طرف تھا کہ نہیں، کہ تماش مینی کے چکر میں کسی کو آبلہ فرنگ یا بادِ فرنگ * (V.D) ہو جائے تو اسے ٹخنوں سے ایک بالشت اونچا تھمد بند حوا کے نیم

* آبلہ فرنگ، بادِ فرنگ: یعنی ارمغانِ فرنگ، ان معنوں میں کہ ان اصطلاحات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آلو، تمباکو، ریلوے، ریس، یورپین پھول، شیکسپیئر، چن اینڈ ٹانگ، چائے، کرکٹ اور دوسرے بے شمار تحفوں کے ساتھ ان امراض کی سوغات بھی انگریز اپنے ساتھ لائے۔ واللہ اعلم۔

کی ٹہنی ہاتھ میں تھما دیتے تھے۔ جوانی میں میں نے اچھے اچھے اشrafوں کو محلے میں ہری جھنڈی لیے پھرتے دیکھا۔ مشہور تھا کہ نیم کی ٹہنی سے چھوٹ کی بیماری نہیں لگتی۔ پر میرے خیال میں تو فقط ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے یہ ڈھونگ رچاتے تھے۔ خون اور طبیعت صاف کرنے کے لیے مریض کو ایسا کڑوا چرانتہ پلایا جاتا کہ حلق سے ایک گھونٹ اترتے ہی پیتلیاں اُپر چڑھ جاتیں۔ اگلے وقتوں میں خود علاج کے اندر بھی سزا پوشیدہ ہوتی تھی۔ مولوی یعقوب علی نقشبندی کہا کرتے تھے کہ اسی لئے دیسی (یونانی) علاج کو حکمت کہتے ہیں!

”یار! ان دنوں سالے نیم نے بھی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ غریب غربا کو یہ رئیسوں کا روک لگ جائے یا معمولی پھوڑے پُھنسیاں نکل آئیں تو کاؤں قصبے کے جراح شروع سے اخیر دم تلک نیم ہی سے علاج کرتے تھے۔ ساری ادویاتیں نیم سے ہی بنتی تھیں۔ نیم کے صابن سے نہلواتے۔ نیم کی نبولی اور بگل کا لیپ بتاتے۔ نیم کا مرہم لگاتے۔ نیم کی سینکوں اور خشک پتیوں کی دھونی دیتے۔ جوان خون زیادہ گرمی دکھائے تو نیم کے بور اور کونپلوں کا عرق پلاتے۔ نیم کے گوند کا لعوق بنا کر چٹاتے۔ نبولی کی گرمی کا سفوف زہر مار کراتے۔ ہر کھانے سے پہلے نیم کی مسواک کرواتے تاکہ ہر کھانے میں اسی کا مزہ آئے۔ فاسد مادہ نکلانے کے بہانے جو نکلوں کو آسے دن سیروں خون پلوا دیتے، یہاں تک کہ اگلا بالکل چُسا آم ہو جاتا اور حرمزدگی تو درکنار دو رکعت نماز بھی پڑھتا تو کھٹنے چٹ چٹ چٹنے لگتے۔ ناسور کو نیم کے اونٹنے پانی سے دھارتے تاکہ مرض کے جراثیم مرجائیں۔ اور اگر مریض جراثیم سے پہلے ہی جراح کو پیارا ہو جائے تو گھر سے نیم کے پتے اُبال، غسل میت دے کے جنازہ نیم تلے رکھ دیتے۔ پھر تازہ قبر پر تین ڈول پانی چھڑک کے سرھانے نیم کی ٹہنی گاڑ دیتے۔ دفنا کے گھر آتے تو مرنے والے کی بیوہ کی سونے کی لونگ اُتروا کر اسی نیم کی سینک ناک میں پہنادی جاتی جس میں جھولا ڈال کے وہ کبھی ساون میں جھولا کرتی تھی۔ پھر ایسے سفید دوپٹے اڑھاتے اور ایک ہاتھ میں سروتہ اور دوسرے میں کوٹے اڑانے کے لیے نیم کی قمچی تھما کر نیم کی چھاؤں تلے بٹھال دیتے۔

”جب میں نے واہگ بارڈر کراس کر کے ہجرت کی تو یقین جان میرے پاس تن کے دو کپڑوں اور ایک اُسترے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ جو تو مجھے اس حالت میں دیکھ ریاضے تو یہ مولا کا فضل اور پاکستان کی دمن ہے۔ دوسرے روز میں اپنے یار جانی محمد حسین کی میت (معیت) میں شالیمار باغ دیکھنے گیا تو اس نے بتایا کہ پاکستان میں نیم نہیں ہوتا! قسم خدا کی! مجھے پاکستان پہ بہت پیار آیا۔ اور میں وہیں مغلیہ پھنوارے (فوارے) کے پاس سجدہ شکر بجالایا۔“

خلیفہ کی پاپ بیتی

خلیفہ کی مصیبت یہ تھی کہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بوڑھا ہو چلا تھا، مگر اس کی ڈینگوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے فینٹسی اور خواہش نفس کو بھی حقیقت نفس الامری بنا دیا ہے۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک پرانی مثل ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی شہوانی قوت زبان میں آجایا کرتی ہے۔ اس کی مشیخت بھری داستان سچی ہو یا نہ ہو، داستان کہنے کا انداز سچا اور کھرا تھا۔ اس کے سادہ دل سننے والے ایسے پندناٹز ہوتے کہ یہ خیال ہی نہ آتا، سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ بس جی چاہتا یونہی بولے چلا جائے۔ خلیفہ کی کہانی اسی کی زبانی جاری ہے۔ ہم نے صرف نئی سرخی لگا دی ہے :

”اور یار فقیر! نگلیا نٹنی * تو جانو آگ بھری چھچھوند ر (+) تھی۔ اُچھتی سی منظر بھی پڑ جائے تو جھٹ نیم کی ٹھنی ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔ یار! جھوٹ نہیں بولوں گا۔ روز قیامت کے دن حشر کے میدان میں اللہ میاں کے علاوہ والد صاحب کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اب تجھ سے کیا پردہ۔ میں کوئی پیر پیغمبر تو ہوں نہیں۔ گوش پوس کا انسان ہوں۔ اور جیسا کہ مولوی حشمت اللہ کہتے ہیں، انسان خطائے نسوان کا پتلا ہے۔ تو یار! واقعہ یہ ہے کہ نیم کی ٹھنی مجھے بھی لہرائی پڑی۔ میٹھا برس بھی نہیں لگا تھا۔ ستر ہواں چل رہا تھا کہ فضیحتا ہو گیا۔ پر یقین جانو، تیزن ایک نمبر اشراف عورت تھی۔ ایسی ویسی نہیں۔ سیاہی تیاہی تھی۔ پڑوس میں رہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جوانی اور پڑوسی کے گھر میں ایک ساتھ ہی قدم رکھا۔ عمر میں مجھ سے بیس نہیں تو پندرہ برس ضرور بڑی ہوگی۔ پر بدن جیسے کسی کسائی ڈھولک۔ ہوا بھی چٹھو جائے تو بجنے لگے۔ میں اس کے مکان کی چھت پر پتنگ اڑانے جایا کرتا تھا۔ وہ مجھے آتے جاتے کبھی گڑک، کبھی اپنے ہاتھ کا حلوہ کھلاتی۔ جاڑے کے دن تھے۔ اس کا میاں جو اس سے عمر میں بیس نہیں تو پندرہ برس بالضرور بڑا ہو گا، اولاد کا تعوید لینے فرید آباد گیا ہوا تھا۔ کھی کھی کھی۔ میں چار پتنگیں کٹوا کر چرخ بفل میں دبائے چھت پر سے اترا تو دیکھا کہ وہ چھدرے بانوں کی چرپائی کی آڑ کر کے نہار ہی ہے۔ آنکھوں میں اب تلک بان کی جالیوں کے پیچھے کا سماں بسا

* نچلے درجے کی کبھی جو نگلیائی کھلاتی تھی، کیوں کہ اس کے پاس جو آتے تھے وہ ٹکے سے زیادہ کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ گویا اصل وجہ تضحیک و تذلیل پیشہ نہیں، قلیل اجرت ہے!

(+) چھچھوند ر: ایک قسم کی جھوٹی سی آتش بازی جو فرش پر گھوم گھوم کر بڑی بے قراری سے چلتی ہے۔

ہوا ہے۔ مجھے آتے دیکھ کر ایک دم الف کھڑی ہو گئی۔ یاں تجھے کیا بتاؤں۔ میری رگ رگ میں پھلجھریاں چھوٹنے لگیں۔ گھڑی بھر میں موزے کی طرح اُلٹ کے رکھ دیا۔ گزک کی خاصیت گرم ہوتی ہے۔

”میرے مرض کا بھانڈا پھوٹا تو والد صاحب، اللہ ان کی بال بال مغفرت کرے، آپے سے باہر ہو گئے۔ جو تاتان کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے ”تو میرا نطفہ نہیں! میرے سامنے سے ہٹ جا۔“ نہیں تو ابھی گردن اڑا دوں گا۔“ حالاں کہ تلوار تو درکنار گھر میں بھونٹی (کُند) چھری تلک نہ تھی جس سے نکلنے کی ناک کٹ سکے۔ پھر میں ان سے قدمیں ڈھبالت بڑا تھا! پر ان کا اتنا رُعب تھا کہ میں اپنے رنگین تہمد میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماں میرے اور ان کے درمیان ڈھال بن کے کھڑی ہو گئی۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ بیچ بچاؤ کرانے میں چوڑیاں ٹوٹنے سے ماں کی کلائی سے خون ٹپکنے لگا۔ دن رات محنت مزدوری کرتی تھی۔ جہاں تک میری چُشپن کی یاد اداں کام کرتی ہے میں نے اس کے چہرے پر ہمیشہ جھریاں ہی دیکھیں۔ آنسو اس کی جھڑیوں سے لکھ لکھ رہے تھے۔ مجھے آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے ماں کے آنسو میرے کالوں پہ بہہ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگی ”اللہ قسم! میرے لال پہ دشمنوں نے بہتان لگایا ہے۔“ میں نے والد صاحب سے بہتیرا کہا کہ ”پرانے باجرے کی کھجری اور پال کے آم کھانے سے گرمی چڑھ گئی ہے۔ سینے تو سہی۔ مُشکی گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر چڑھنے سے مجھے یہ موزی مرض لگا ہے۔“ تھکے مرثاں * سے حدت مٹل جائے گی۔“ پر وہ بھلامتے والے تھے۔ کہنے لگے ”اے تھکے مرثاں کے بچے! میں نے گڑبیں نہیں کھیلی ہیں۔ تو نے ناٹیوں کی عزت خاک میں ملادی۔ بزرگوں کی ناک کٹوا دی۔“ ماں کے سوا کسی نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ چھوٹے بھائی روز مجھ سے جھگڑنے لگے، اس لیے کہ ماں نے ان کے اور والد کے آم اور کھی میں تر تراتی باجرے کی کھجری بند کر دی تھی۔ یار فقیر! کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر اللہ میاں کو اپنے بندوں سے اتنی بھی محبت ہوئی جتنی میری آن پڑھ ماں کو مجھ سے تھی تو اپنا بیڑا پار جانو۔ حشر کے دن سارے گناہ بخش دیے جائیں گے اور مولویوں کی کھجری اور آم بند ہو جائیں گے! انشاء اللہ!

”خیر۔ اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، پر میرے فرشتوں کو ابھی پتا نہیں تھا کہ تمیزن پر میرے چچا جان قبلہ کسی زمانے میں مہربان رہ چکے ہیں۔ جوانی قسم! ذرا بھی شک گزرتا تو میں اپنا دِل مار کے بیٹھ رہتا۔ بزرگوں کی شان میں گستاخی نہ کرتا۔ یار! جوانی میں یہ حالت تھی کہ نبض یہ اٹھکی

* تھکے مرثاں: ختم رحماں۔ گرمیوں میں فالودے میں ڈال کر پیتے تھے۔

رکھو تو ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتی تھی۔ شکل بھی میری اچھی تھی۔ طاقت کا یہ حال کہ کسی لڑکی کی کلائی پکڑ لوں تو اُس کا چھڑانے کو جی نہ چاہے۔ خیر وہ دن ہوا ہوئے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ علاج مرض سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔ بعد کو گرمی چھانٹنے کے لیے مجھے دن میں تین دفعہ قدحے کے قدحے ٹھنڈائی اور دھنیے کے عرق اور کتیرا گوند کے پلائے جاتے۔ اور دو وقتہ پھینکی روٹی، کو تھمیر (ہرا دھنیا) کی بے نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ کھلائی جاتی۔ اسی زمانے سے میرا نام بھینکا کو تھمیر پڑ گیا۔ والد صاحب کو اس وقوعے سے بہت صدمہ پہنچا۔ شکی مزاج آدمی تو تھے ہی۔ کبھی خبر آتی کہ شہر میں فلاں جگہ ناجائز پتہ پڑا ملا ہے، تو والد صاحب مجھی کو آگ بھجھو کا نظروں سے دیکھتے۔ انہیں محلے میں کوئی لڑکی تیز تیز قدموں سے جاتی نظر آجائے تو سمجھتے کہ ہونہ ہو میں درپے ازار ہوں۔ ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ تمیزن نے ایک ہی رات میں داڑھی سفید کر دی۔ خود ان کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے ریلواری کارڈ کی جھنڈی سے بھی زیادہ لہو لہان رنگ کا تھمد بندھوا دیا اور ٹہنی کے بجائے نیم کا پورا گڈا۔۔۔۔۔ میرے قد سے بھی بڑا۔۔۔۔۔ مجھے تھما دیا۔ میں نے شکرات کے دن اس سے آٹھ پتنگیں لوٹیں۔ لڑکپن بادشاہی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں کوئی مجھے حضرت سلیمان کا تخت بعد ہد ہد اور ملکہ سبا بھی دے دیتا تو وہ خوشی نہیں ہوتی جو ایک پتنگ لوٹنے سے ہوتی تھی۔ یار! کسی دن تلے مکھانے تو کھلا دے۔ مدتیں ہوئیں۔ مزہ تک یاد نہیں رہا۔ ماں بڑے مزے کے بناتی تھی۔ فقیر امیں نے اپنی ماں کو بڑا دکھ دیا۔“

خلیفہ اپنی ماں کو یاد کر کے یکایک آبدیدہ ہو گیا۔

بزرگوں کا قتل عام

خلیفہ اپنے موجودہ منصب اور فرائض کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، اس کا دل ابھی تک گھوڑے میں اٹکا ہوا تھا:

ابھی آتی ہے بوبالش سے اُس کی اسپ مُشکی کی *

* یہ مصرع دراصل گھوڑے سے نہیں، معشوق سے متعلق تھا۔ ہم نے صرف استا تصرف کیا ہے کہ ”زلفِ مشکیں“ کے بجائے اسپِ مشک کی بڑ دیا۔ اس سے غزل کی لچک، بتان ہزار شیوہ کی طرف کی اور وزن سے ہماری نادر اقصیت ثابت ہوتی ہے۔ بے شمار اشعار ہماری نظر سے ایسے گزرے ہیں کہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ مدوح کون ہے تو خیال ابد اگر گھوڑے کی طرف جاتا ہے، جب کہ وہ معشوق کے بارے میں ہوتے ہیں۔

ایک دن وہ دکان کے منیجر مولانا کرامت حسین سے کہنے لگا کہ ”مولانا! ہم تو استیجا جاتے ہیں کہ جس بچے کے چپت اور جس سواری کے چابک نہ مار سکو وہ روز قیامت کے دن تلک قابو میں نہیں آنے کی۔ نادر شاہ بادشاہ تو اسی واسطے ہاتھی کے ہودے سے کود پڑا اور جھونگل میں آ کے قتل عام کرنے لگا۔ ہمارے سارے بزرگ قتل عام میں ماجر مولیٰ کی طرح کٹ گئے۔ گود کے بچوں تک کو بلم سے چھید کر ایک طرف کو پھینک دیا۔ ایک مرد زندہ نہیں چھوڑا۔“ مولانا نے ناک کی نوک پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا ”خلیفہ! پچھلے پانچ سو سال میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوئی جس میں تم اپنے بزرگوں کو چُن چُن کر نہ مروا چکے ہو۔ جب قتل عام میں تمہارا بیج ہی مارا گیا، جب تمہارے سارے بزرگ ایکو ایک قتل کر دیے گئے تو اگلی نسل کیوں کر پیدا ہوئی؟“ بولا ”آپ جیسے اللہ لوگ کی دعاؤں سے!“

بزرگوں میں سب سے زیادہ فخر وہ اپنے دادا پر کرتا تھا، جس کی ساری زندگی کا واحد کارنامہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پچاسی سال کی عمر میں سوئی میں تانکا پرو لیتا تھا۔ خلیفہ اس کارنامے سے اس درجہ مطمئن بلکہ مرعوب تھا کہ یہ تک نہیں بتاتا تھا کہ سوئی پرونے کے بعد دادا اس سے کیا کرتا تھا۔

۵

کار کی کایا پلٹ

ایک دن رابن روڈ کے تراہے کے پاس رسالہ افکار کے دفتر کے قریب کار کا بریک ڈاؤن ہوا۔ اسی وقت اس میں گدھا گاڑی جوت کر لارنس روڈ لے گئے۔ اس دفعہ مستری کو بھی رحم آ گیا۔ کہنے لگا ”آپ شریف آدمی ہیں۔ کب تک برباد ہوتے رہیں گے۔ اوچھی پونجی بیوپاری کو اور منحوس سواری، مالک کو کھا جاتی ہے۔ کار تلے آ کر آدمی مرتے تو ہم نے بھی سنے تھے۔ لیکن یہ ڈائن تو اندر بیٹھے آدمی کو کھا گئی! میرا کہنا مانیں۔ اس کی باڈی کٹوا کر ٹرک کی باڈی فٹ کروالیں۔ لکڑی لانے لے جانے کے کام آئے گی۔ میرے سالے نے باڈی بنانے کا کارخانہ بنایا کھولا ہے۔ آدھے داموں میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ دو سو روپے میں انجن کی reboring میں کر دوں گا۔ اوروں سے پونے سات سو لیتا ہوں۔ کایا پلٹ کے بعد آپ پہچان نہیں سکیں گے۔“

اور یہ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ نئی باڈی فٹ ہونے کے بعد کوئی پہچان نہیں سکتا

تھا کہ یہ ہے کیا۔ ملزموں کو عدالت لے جانے والی حوالاتی ویگن؟ کتے پکڑنے والی گاڑی؟ مذبح خانے سے تھلتھلاتی راسیں لانے والا خونی ٹرک؟ اس شکل کی یا اس سے دور پرے کی مشابہت رکھتی ہوئی کوئی شے انہوں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ مستری نے یقین دلایا کہ آپ اسے دو تین مہینے صبح وشام مسلسل دیکھتے رہیں گے تو اتنی بری معلوم نہیں ہوگی۔ اس پر مرزا بولے کہ تم بھی کمال کرتے ہو۔ یہ کوئی میوی تھوڑی ہے! سابق کار یعنی موجودہ ٹرک کی پشت پر تازہ پینٹ کی ہوئی ہدایت ”چل رے جھکڑے تینوں رب دی آس“ پر انہوں نے اسی وقت پچھارا پھروادیا۔ دوسرے فقرے پر بھی انہیں اعتراض تھا۔ اس میں جگت یا یعنی ”پیو یار“ کو ہدایت کی گئی تھی کہ تنگ نہ کرے۔ چودہری کرم دین پینٹرنے سمجھوتے کے لہجے میں کہا کہ جناب عالی، اگر آپ کو یہ نام پسند نہیں تو بے شک اپنی طرف کا کوئی دل پسند نام لکھوا لیجئے۔ اسی طرح انہوں نے اس رسوائے زمانہ شعر پر بھی سفیدہ پھروادیا:

مدعی لکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اس حذف و اصلاح کے بعد بھی جو کچھ باقی رہ گیا وہ خدا کو منظور ہو تو ہو، انہیں قطعاً منظور نہیں تھا۔ لیکن بے ہنگم ہاڈی سے قطع نظر، ری بورنگ کے بعد جب وہ چلی تو ساری کوفت دور ہو گئی۔ اب وہ اسٹارٹ ہونے اور چلنے میں ایسی غیر ضروری اور بے محل پُھرتی اور غائشی چُستی دکھانے لگی جیسے رٹائرڈ لوگ ملازمت میں توسیع سے پہلے یا بعض بڈھے دوسری شادی کے بعد دکھاتے ہیں۔ ہاتھ روم میں بھی جاگنگ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ زینے پر دو دو سیڑھیاں پھلانگتے چڑھتے ہیں۔ پہلے دن صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک اس ٹرک نما کار یا کار نما ٹرک سے لکڑی کی ڈلیوری ہوتی رہی۔ کار کی دن بھر کی آمدن یعنی ۴۵ روپے (جو آج کے ۴۵۰ روپے کے برابر تھے) کو پہلے انہوں نے ۳۰ دن اور بعد میں ۳۶۵ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ۱۶۴۲۵ روپے نکلا۔ دل لے کہا ”جب کہ کار کی کل قیمت ۲۴۸۲ روپے! ہے! پنگلے! اسے حاصل ضرب نہ کہو، حاصل زندگی کہو!“ وہ بڑی دیر تک پچھتایا کئے کہ کیسی حماقت کی، اس سے بہت پہلے کار کو ٹرک میں کیوں نہ تبدیل کر دیا۔ مگر ہر حماقت کا ایک وقت معین ہے۔ معاً ”وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے“ ان کے ذہن میں آیا اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

میرا بھی تو ہے!

تین چار ہفتے گاڑی لستم پشتم چلی گو کہ کرائے کا وہ رُوح کو انشراح بخشنے والا اوسط نہ رہا۔ نو دس مرتبہ ورکشاپ بھیجی پڑی۔ مستری نے پورے ایک مہینے کی کار مٹی دی تھی۔ البتہ گدھا گاڑی کا کرایہ خود دینا پڑتا تھا۔ گدھا گاڑی والا روزانہ صبح دریافت کرنے آتا تھا کہ آج کہاں اور کس وقت آؤں۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بشارت نے اس پر دو کاپوں کی خریدی ہوئی سات ہزار روپے کی لکڑی لدوا کر خلیفہ کو دس بجے ڈلیوری کے لیے روانہ کر دیا۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ وہ ہانپتا کانپتا آیا۔ بار بار انگوچھے سے آنکھیں پونچھ کر ناک سے سُڑسُڑ کر رہا تھا۔ کہنے لگا ”سرکار! میں لُٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ اللہ مجھے اٹھالے۔“ بشارت سمجھ گئے کہ اس کی دائم المرض بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے تلقین کرنے لگے کہ مشیت ایزدی میں کس کا دخل ہے، صبر سے کام لو۔ وہی ہوتا ہے جو۔۔۔۔۔“ لیکن جب اس نے کہا کہ ”لوک کروں تو جگ بنے، چپکے لاکے گھاؤں! سرکار! میرا دل خون کے آنسو رہا ہے۔“ تو بشارت کا تردد کچھ کم ہوا کہ جو شخص انتہائی حزن و غم کے موقع پر بھی شعر اور محاورے کے ساتھ گریہ کرے وہ آپ کی ہمدردی نہیں، اپنی زباں دانی کی داد چاہتا ہے۔ جب خلیفہ انگوچھا منہ پر ڈال زور زور سے بکھان کر کے رونے لگا تو انہیں دفعتاً خیال آیا کہ نقصان اس حرام خورد کا نہیں میرا ہوا ہے! کہنے لگے ”ابے کچھ تو بول۔ اس دفعہ میرا کیا نقصان ہوا ہے؟“

بناؤٹی سسکیوں کے درمیان اس نے ”میرا بھی تو ہے!“ اس طرح کہا جیسے جیب بینک کے اشتہار میں جب ہر عمر اور ہر صوبے کا آدمی اپنے ہلچے میں جیب بینک کو اپنا چکتا ہے تو ایک بچہ سُٹلا کر کہتا ہے ”میلا بھی تو ہے!“ پھر اس نے ساری روداد بیان کی۔ گاڑی بہت ”اوور لوڈ“ تھی۔ فرسٹ گیئر میں بھی بار بار دم توڑ رہی تھی۔ سڑک کے موڑ تک وہ جیسے تیسے لوٹنوں کے دھکوں اور وظیفے کے زور سے لے گیا۔ لیکن چوراہے پر اسپرنگ جواب دینے لگے۔ اس نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آدھی لکڑی اتار کر مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بڑے قرینے سے چُن دی۔ اور بقبہ مال کی ڈلیوری دینے ناظم آباد نمبر ۴ چلا گیا۔ وہاں پلاٹ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ ڈلیوری دیئے بغیر واپس مسجد آیا تو لکڑی غائب! ”سرکار! میں دن دباڑے لُٹ گیا! برباد ہو گیا!“

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

اب انہیں خود اپنی حماقت پر بھی افسوس ہونے لگا کہ ساڑھے تین ہزار کی کھٹار اکار میں

۔۔۔۔۔ قصور اپنا مکمل آیا

وہ سیدھے بولٹن مارکیٹ پولیس اسٹیشن رپٹ لکھوانے گئے۔ افسرانچارج نے کہا، یہ تھانہ نہیں لگتا۔ آپ جہاں سکونت رکھتے ہیں اس کے متعلقہ تھانے میں ایف آئی آر درج کرائیے۔ وہاں پہنچے تو جواب ملا کہ جناب عالی! جرم کی رپٹ آپ کی جائے سکونت والے تھانے میں بے شک درج کی جاسکتی ہے بشرطیکہ جرم آپ نے کیا ہو۔ آپ رپٹ جائے واردات کے تھانہ متعلقہ میں لکھوائیے۔ وہاں پہنچے تو کہا گیا کہ جائے واردات دو تھانوں کے سنگم پر واقع ہے۔ مسجد کی عارت بے شک ہمارے تھانے میں ہے، لیکن اس کی سیرجیوں کی تلیٹی کا علاقہ ملحقہ تھانے میں لگتا ہے۔ ملحقہ تھانے پہنچے تو وہاں کسی کو نہ پایا سوائے ایک شخص کے جس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ میں کپاؤنڈ فریکچر تھا اور بائیں آنکھ سوج کر بند ہو چکی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں دفعہ ۳۲۲ کی رپٹ لکھوانے آیا ہوں۔ دو گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔ اندھیر ہے۔ سول اسپتال والے کہتے ہیں کہ جب تک تھانے والے ایف آئی آر درج کر کے پرچہ نہ کاٹ دیں ہم تمہارا آپریشن نہیں کر سکتے۔ مجروح بڑے فاتحانہ انداز سے وہ چھیننا ہوا آلہ ضرب یعنی شام چڑھی لاٹھی پکڑے تھا جس سے اس کا سر پٹھاڑا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا چچا تھا جو کسی وکیل دیوانی کا منشی تھا۔ وہ بھتیجے کو دلا سادے رہا تھا کہ ملزم نے لاٹھی اور قانون اپنے ہاتھ میں لے کر ثانی الذکر اور تمہارے کاسہ سر کو بیک ضرب توڑا ہے۔ اس حرام زادے کو، پتھڑی نہ پہنوادو تو مجھے نطفہ بے تحقیق سمجھنا۔ اس نے تو خیر سنگین جرم کیا ہے۔ میں نے تو کئیوں کو بغیر جرم کے جیل کی ہوا کھلوا دی ہے! اس نے بشارت کو قانونی مشورہ دیا کہ آپ کو دراصل اس تھانے سے رجوع کرنا چاہیے جس کی حدود میں سر قہ کرنے والے یعنی چور کا مکان مسکونہ واقع ہوا ہے۔ دیوانی مقدمات میں اسی طرح ناش داغی جاتی ہے۔ بشارت اس سے الجھنے لگے۔ دوران بحث معلوم ہوا کہ اس وقت SHO کی دختر نیک اختر کی منگنی کی رسم ہو رہی ہے۔ بیشتر عہد وہیں تعینات ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آئیں گے۔ اسٹنٹ سب انسپکٹر دوپہر سے سڑک پر حفاظتی ڈیوٹی اور اسکول کی لڑکیوں کو جمع کر کے سڑک پر دورویہ کھڑا کرنے میں لگا ہے، اس لیے کہ پرائم منسٹر ایک دختر سے دوسرے دختر جا رہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل دوش پر ٹکلا ہوا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد ایس ایچ او نے ایک وکیل کی کار میں نزول اجلال فرمایا۔ وکیل کا بریف

کیس جس پر خالی زمین کا غلاف چڑھا تھا ایک ملزم ناموکل اٹھائے ہوئے تھا۔ خود وکیل کے ہاتھ میں منگنی کی مٹھائی کے ڈبے تھے جو اس نے عملے میں تقسیم کئے۔ ایک ڈبا بشارت کو بھی دیا۔ ایس ایچ او کے آتے ہی سارا اعلانہ نہ جائے کہاں کہاں سے بھاکم بھاگ نکل کر اکٹھا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب تمام وقت یہیں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مجھے ہوئے تھے۔ ایس ایچ او نے بشارت سے سرسری روداد سن کر کہا، آپ ذرا باہر انتظار کیجیے۔ اصل رپورٹ کنندہ ڈرائیور ہے۔ اس سے استفسار کرنا ہے۔ گھنٹے بھر تک اس سے نہ جائے کیا الٹی سیدھی تفتیش کرتا رہا۔ خلیفہ باہر نکلا تو اس کا صرف منہ ہی لٹکا ہوا نہیں تھا، وہ خود سارا کا سارا لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد ایس ایچ او نے بشارت کو اندر بلایا تو اس کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔ کرسی پر بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ سوالوں کی بھرمار کر دی۔ تھوڑی دیر کے لیے تو بشارت کو خیال ہوا کہ شاید اسے مغالطہ ہوا ہے اور وہ انہیں ملزم سمجھ بیٹھا ہے۔ لیکن جب اس نے کچھ ایسے چہیتے ہوئے سوال کیے جو صرف انکم ٹیکس افسر کو کرنے چاہئیں تو ان کا اپنا مغالطہ دور ہو گیا۔ مثلاً جب آپ نے مسروقہ چوب عمارتی نیچی تو روکڑ بھی میں اندراج کیا یا بالابالاکیش ڈکار گئے؟ ڈرائیور کو جو متخواہ دیتے ہیں تو رسید اتنی ہی رقم کی لیتے ہیں یا زیادہ کی؟ گودام سے لکڑی بغیر ڈلیوری آرڈر کے نکلتی ہے! آپ خود بغیر Learner's Licence کے ٹرک کیسے چلاتے ہیں؟ لکڑی کے تختے جب مبینہ ٹرک میں ناظم آباد لے جانے کے لیے رکھے گئے تو کیا آپ نے حسب قانون مجریہ سن انیس سو کچھ، پیچھے سرخ جھنڈی لٹائی تھی؟ اور ہاں، ناظم آباد پر یاد آیا کہ میرا مکان پی ای سی ایچ سوسائٹی میں ”پلنٹھ لیول“ تک آگیا ہے۔ کتنے فٹ لکڑی درکار ہوگی؟ تخمینہ لگا کر بتائیے۔ چھ سو گز کا ویسٹ اوپن کارنر پلاٹ ہے۔ آپ کے ہاں جو ریڈیو ہے اس کا لائسنس آپ نے بنوایا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کی فرم میں آپ کے پچھتر سالہ والد اور دودھ پیتا بیٹا بھی پارٹنر ہیں؟ لکڑی جب لی مارکیٹ سے ناظم آباد لے جانی تھی تو رنچو ٹرائن کا طواف کرنے کی حاجت کیوں پیش آئی؟ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں اور ہار مونیم بجاتے ہیں؟ (جواب میں بشارت نے وضاحت کی کہ نماز میں پڑھتا ہوں۔ ہار مونیم والد صاحب بجاتے ہیں۔ اس جواب پر ایس ایچ او نے دیر تک ہتھکڑی بچائی اور پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے بولا ہوں! سنا منشی جی؟ گویا عذر گناہ لذیذ تراز گناہ!) لکڑی مبینہ طور پر عین مسجد کے دروازے پر رکھی گئی! تو کیا اس سے نمازیوں کی آزمائش منظور تھی؟ ڈرائیور سے آپ کا سارا خبر حجامت بنواتا ہے۔ قورمہ پکواتا ہے۔ اس نے آپ کے جو نیئر پارٹنر کے تختے بھی کیے۔ میری مراد آپ کے نوموود صاحبزادے سے ہے۔ آپ

نے اس سے گھوڑا تانگہ بھی چلوایا۔ یہی آپ کے گھوڑے اور والد کا بالترتیب کھیرا اور مالش کرتا تھا۔ یہ لیبر لازمی کھلی خلاف ورزی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ کچھ عرصے پہلے ایک آراکش کی آنکھ میں لکڑی کی چھپٹی اچٹ کر پڑنے سے بینائی جاتی رہی تو آپ نے اسپنسر آئی ہاسپٹل سے اس کی پٹی کروا کے گھر بھیج دیا؟ کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ اور آپ نے دگنی قیمت پر لکڑی کیسے بیچی؟ اندھیر ہے۔ مجھے اپنے مکان کے لیے آدھے داموں مل رہی ہے! کھلے بھاؤ۔

تعزیرات و ضابطہ فوجداری سے چھیڑ خانی

جب بشارت ہر سوال کا غیر تسلی بخش جواب دے چکے تو ایس ایچ او نے کہا، میں اسی وقت معائنہ موقع کروں گا۔ کل اتوار ہے۔ تمہانے ہمیں آؤں گا۔ سواری ہے؟ بشارت نے کہا، ہاں! ہے گی۔ اور اسے گاڑی تک لے آئے۔

”مگر یہ ہے کیا؟“ ایس ایچ او نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

”اسی میں لکڑی گئی تھی“

”مگر یہ ہے کیا؟“

اس نے چوری سے بچ جانے والے ان تختوں کو چھو چھو کر دیکھا جو اس میں پئے ہوئے تھے۔ پھر گاڑی کے گرد چکر لگا کر ان کی لمبائی کا تخمینہ لگایا۔ اس کے بعد وہ ایک لخت بچھر گیا۔ کیسی جائے واردات اور کیسا معائنہ موقع۔ اُلٹے دھر لیے گئے۔ ایس ایچ او بکتا جھکتا واپس تھانے میں لے گیا۔ جیسے ہی وہ اپنے کڈھب سوال سے انہیں چاروں خانے چت کرتا، ویسے ہی اس کا خوشامی اسٹنٹ اپنے سینگوں پر اٹھا کر دوبارہ زمین پر بیٹھ دیتا۔ ایک سوال ہو تو۔ پس بھر کار کو کس کی اجازت سے ٹرک میں تبدیل کیا گیا۔ جس کھلی سے اس کا گزرتا بیان کیا جاتا ہے وہ تو وِن وے ہے! اس کی انشورنس پالیسی تو کبھی کی lapse ہو چکی۔ وہیل ٹیکس ایک سال سے نہیں بھر گیا۔ آپ کے ڈرائیور نے ابھی خود اقبال جرم کیا ہے کہ بریک نہ ہونے کے سبب گاڑی گیئر کے ذریعہ روکتا ہے۔ اسی وجہ سے چند روز پہلے مارڈن ایسٹ کی جھکیوں کے سامنے ایک مرغی کار کے نیچے آ گئی، جس کا ہر جانہ خلیفہ کے پاس نہیں تھا۔ جھکی والوں نے رات بھر کار impound کیے رکھی اور مرغی کے بدلے خلیفہ کو برغال بنالیا، ہر چند کہ وہ چیختا رہا کہ قصور کار کا نہیں۔ مرغی خود اڑ کر اس کے نیچے آئی تھی۔ طلوع آفتاب کے بعد خلیفہ نے بطور تاوان مرغی کے مالک اور اس کے ڈیڑھ دو درجن بیٹوں، بختیجوں اور دامادوں اور دور و نزدیک کے پڑوسیوں کی

حجاست بنائی۔ تب کہیں جا کر کلو خلاصی ہوئی۔ ایک پڑوسی تو اپنے پانچ سالہ تنگ دھڑنگ بیٹے کو گولے کی ٹوپی پہنا کر لے آیا کہ ذرا اس کے ختنے کر دو۔ اس مشقت سے فارغ ہو کر وہ ڈیڑھ دو بجے آپ کے پاس پہنچا تو اس کا صلہ آپ نے یہ دیا کہ اس پر الزام لگایا کہ تم کار کے ٹول بکس میں فیئنجی استرار کے جماتیں بناتے پھرتے ہو۔ اور ایک دن کی تنخواہ کاٹنے کی دھکی دی۔ خیر، یہ ایک علیحدہ تفتیش طلب مسئلہ ہے۔ لیکن یہ بتائیے کہ آپ کی کار چمنی کی طرح دھواں کیوں دیتی ہے؟ سڑک پر ہر کہیں کڑی ہو جاتی ہے۔ منشی جی! اماں سن رہے ہیں منشی جی؟ شارع عام پر رکاوٹ پیدا کرنے کی کئی مہینے کی ہے؟ محض؟ یا بامشقت؟ اور جناب والا! اگر یہ صحیح ہے کہ یہ ٹرک ہے تو شام کو اس میں آپ کا پورا خاندان، کچر گھان کیوں نہکا پھرتا ہے؟ اور منشی جی! ذرا ان کو اور لوڈنگ کی دفعہ تو پڑھ کر سنا دیجیے۔

مختصر یہ کہ تعزیرات پاکستان اور ضابطہ فوجداری کی کوئی دفعہ ایسی نہیں بچی جسے توڑ کر وہ اس وقت رنگے ہاتھوں نہ پکڑے گئے ہوں۔ ان کا ہر فعل کسی نہ کسی دفعہ کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ اور انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی ساری زندگی تعزیرات پاکستان اور ضابطہ فوجداری سے چھیڑ خانی میں گزری ہے۔ پہلے تو انہیں اس پر حیرت ہوئی کہ ایس ایچ او کو ان کی تمام قانون شکنیوں کا القایکیسے ہوا۔ پھر وہ بار بار خلیفہ کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے ہی آنکھیں چار ہوتیں، خلیفہ جھٹ سے ہاتھ جوڑ لیتا۔

اتنے میں ایس ایچ او نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور ایک کانٹیل نے آگے بڑھ کر خلیفہ کے ہتھکڑی ڈال دی۔ ہیڈ کانٹیل بشارت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہ انہیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ”پہلے آپ کے خلاف پرچہ کٹے گا۔ از بسکہ محولہ بالا vehicle خود ناجائز ہے، لہذا بعد مال محمولہ، بشمول چوب مسروقہ، قابل ضبطی ہے۔ منشی جی! سپرد نامہ تیار کیجیے۔ شکایت کنندہ سے خود بہت سے ارسدات ہوتے ہیں، لہذا۔۔۔“

بشارت کو چکر آنے لگا۔ وہ اس وقت مال بردار ٹرک محولہ بالا، مال محمولہ، چوب مشمولہ اور مسروقہ میں قطعی تیز نہیں کر سکتے تھے۔

کچھ احوال حوالات کا

تھانے کی حوالات یا جیل میں، آدمی چار گھنٹے بھی گزار لے تو زندگی اور حضرت انسان کے بارے میں استا کچھ سیکھ لے گا کہ یونیورسٹی میں چالیس برس رہ کر بھی نہیں سیکھ سکتا۔ بشارت

پر چودہ طبق سے بھی بڑھ کر کچھ روشن ہو گیا اور وہ دہل گئے۔ سب سے زیادہ تعجب انہیں اس زبان پر ہوا جو تھانوں میں لکھی اور بولی جاتی ہے۔ رپٹ کنندگان کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن منشی جی ایک شخص کو (جس پر ایک نابالغ لڑکی کے ساتھ زبردستی نکاح پڑھوانے کا الزام تھا) عقد الجبر کنندہ کہہ رہے تھے۔ علی کی آپس کی گفتگو سے انہیں اندازہ ہوا کہ تھانہ ہڈانے بنی نوع انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک وہ جو سزایافتہ ہیں۔ دوسرے وہ جو نہیں ہیں، مگر ہونے چاہئیں۔ ملک میں اکثریت غیر سزایافتہ لوگوں کی ہے اور یہی بنائے فتور و فساد ہے۔ گفتگو میں جس کسی کا بھی ذکر آیا، وہ کچھ نہ کچھ ”یافتہ“ یا ”شدہ“ ضرور تھا۔ ”حجرۃ مزاج پُرسی“ میں جو شخص وقفے وقفے سے چیخیں مار رہا تھا وہ سابق سزایافتہ اور پچھلے شدہ تھا۔ شارع عام پریوس و کنار کے الزام میں جن دو عورتوں کو گرفتار کیا گیا تھا، ان میں سے ایک کو اے ایس آئی شادی شدہ اور دوسری کو محض شدہ یعنی گئی گزری بتا رہا تھا۔ ہیڈ کانٹیل جو خود انعام یافتہ تھا، کسی وفات یافتہ کا بیان نزعی پڑھ کر سن رہا تھا۔ ایک پرچے میں کسی غنڈے کے غیر قابو یافتہ چال چلن کی تفصیلات درج تھیں۔ ایک جگہ آتش زدہ مکان مسکونہ کے علاوہ برباد شدہ اسباب اور تباہ شدہ شہرت کے بھی حوالے تھے۔ اے ایس آئی ایک رپورٹ کنندہ سے دورانِ تفتیش پوچھ رہا تھا کہ شخص مذکورہ الصدر کی وفات شدگی کا علم تمہیں کب ہوا؟ یہاں ہر فعل فارسی میں ہو رہا تھا۔ مثلاً سمن کی تعمیل بذریعہ چسپاندگی، متوفی کی وجہ فوتیبدگی، عدم استعمال اور زنگ خوردگی کے باعث جملہ راعفل ہائے تھانہ ہذا بعد کار توس ہائے پارینہ کی مرور ایام سے خلاص شدگی اور علی کی حیرانگی!

اس تھانے میں ہتھیار کی صرف دو قسمیں تھیں۔ دھار دار اور غیر دھار دار۔ جس ہتھیار سے گواہ استغاثہ کے سرین پر نیل پڑے اور کاسہ سرمتورم ہوا، اس کے بارے میں روزنامے میں مرقوم تھا کہ ڈاکٹری معائنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ مذکور کو میچ بازار میں غیر دھار دار آلے سے مضروب کیا گیا۔ مراد اس سے جو تھا! رات کے دس بجے ”حجرۃ مزاج پُرسی“ میں ایک شخص سے جوتے کے ذریعہ سچ بلوایا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ جوتے کھا کر ناکرہ جرم کا اقبال کرنے والے کو سلطانی گواہ کہتے ہیں۔ وہ شخص بڑی دیر سے زور زور سے چیخے چلا جا رہا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا ہنوز جوتے کھانے کو جھوٹ بولنے پر ترجیح دے رہا ہے۔ جوتے کے اس extra-curricular (بالائے نصاب) استعمال کو پنجابی میں چترول کہتے ہیں۔ تھانے میں آمد و رفت کچھ کم ہوئی تو تین کانٹیل صبح درج کیے ہوئے زنا بالجبر کے کیس کے ایک عینی

گواہ کو آٹھویں دفعہ لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت اس واقعہ کو اس طرح بیان کر رہا تھا جیسے بچے اپنے والدین کے دوستوں کو اتر اتر کر نرسری رہائش سنا رہے ہیں۔ ہر دفعہ وہ نئی جزئیات سے اس واردات میں اپنی مجرمانہ حسرتوں کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔ تینوں کانسیٹیل سر جوڑے اسے اچھے شعر کی طرح سن رہے تھے۔ اور بیچ بیچ میں ملزم کو رشک بھری داد اور داد بھری کالیاں دیتے جاتے۔ صبح جب بند کمرے میں مستغیثہ کے اظہار لیے جا رہے تھے تو سب کے۔۔۔ حتیٰ کہ حوالات میں بند ملزموں کے بھی۔۔۔ کان دیوار سے لگے تھے۔

یہاں ہر واردات مبینہ طور پر ہو رہی تھی۔ مثلاً ”ملزم اپنی مبینہ جائے رہائش سے نکل کر گواہان استغاثہ پر جھپٹا اور اپنے آگے کے دندان سے مسماۃ مندراس کے مبینہ آشنا مسٹی شیردل خاں کی ناک بقدر دو انچ بقیہ جسم سے علحدہ کر دی اور مبینہ طور پر Exhibit A یعنی موجودہ ناک کے غائب شدہ حصے کو نکل گیا۔ منحرف گواہ مسماۃ مندراس بنت نامعلوم نے پہلے تو اسے ایس آئی صاحب کے مواجہ میں ب۔ س۔ س۔ ت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بعد ازاں بلا توقيف، نشان انگشت چپ سے ب۔ س۔ س۔ ت کرنے پر رضامند ہو گئی۔“ یہ مخفف تھا: ”میان سن کر صحت تسلیم کی۔“

نوبے ایک شام کے اخبار کا جرائم رپورٹر آیا جس کے اخبار کا سرکولیشن کسی طرح بڑھ کر نہیں دے رہا تھا۔ اسے ایس آئی سے کہنے لگا ”استاد! دو ہفتوں سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ یہ تھانہ ہے یا گورِ غریباں۔ تمہارے علاقے کے سبھی غنڈے یا تو تائب ہو گئے ہیں یا پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ چندے یہی حال رہا تو ہم دونوں کے گھروں میں چوہے قلابازیاں کھائیں گے۔“ اس نے جواب دیا ”جان من! بیٹھو تو سہی۔ آج ایک کے گلے میں کھنٹی باندھ دی ہے۔ ایسا اسکو پ برسوں میں نصیب ہوتا ہے۔ بغل والے کمرے میں عینی گواہ دسویں دفعہ آموختہ سنا رہا ہے۔ تم بھی جا کے سن لو۔ اور یار! چار دن سے تو نے میرے متبادلے کے خلاف ایک بھی لیٹر ٹو دی ایڈیٹر نہیں پچھوایا۔ ہمیں جب نہ ہوں گے تو تجھے کون ہتھیلی پہ بٹھائے گا؟ اوئے بشیر! دو چاء سلیمانی۔ فناٹ۔ لبالب۔ بلائی (بالائی) ایسی دبا دب ڈلوائیو کہ چاء میں پنسل کھڑی ہو جائے۔ اور بھائی فیروز دین! اس حجرے والے انقلابیہ کو چپکا کرو۔ سرشام ہی سے سالے کے دردس اٹھنے لگیں۔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ چختی، ڈکراتے کلا بیٹھ گیا ہے۔ جناب عالی! مرد کے رونے سے زیادہ ذلیل چیز دنیا میں نہیں۔ سالانہ خود کو حسن ناصر سے کم نہیں سمجھتا۔ میں

نے پانچ بجے اسے آئس کولڈ میئر کے چارمگ پلا دیئے۔ بہت خوش ہوا۔ تیسرے مگ کے بعد مجھے، جی ہاں مجھے، ”ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ“ کا مطلب سمجھانے لگا! چوتھا پی چکا تو میں نے ٹائلٹ جانے کی مناجا کر دی۔ چنانچہ تین دفعہ کھڑے کھڑے پتلون میں ہی چراغ جلا چکا ہے۔ جناب عالی! ہم تو حکم کے تابع ہیں۔ ابھی تو لاہور کے شاہی قلعے میں اس کی آرتی اترے گی۔ وہ سب کچھ قبولو لیا لیتے ہیں۔ اس سالے کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ اس کے پاس قبولنے کو کچھ ہے نہیں۔ لہذا زیادہ پٹے کا۔

شامل واردات

تازہ واردات کی خبر سُن کر رپورٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس خوشی میں اس نے ایک سکرٹ اور دو میٹھے پانوں کا آرڈر دیا۔ جیب سے پیپر منٹ اور نوٹ بک نکالی۔ بڑی مدت بعد ایک چٹ پٹی خبر ہاتھ لگی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کیس کا پلاٹ اپنے افسانہ نویس دوست سلطان خاؤ کو بخش دے گا جو روز ”ریئل لائف ڈرامہ“ کا تقاضا کرتا ہے۔ آہوریزی کے اس کیس کی تفصیلات سننے سے پہلے ہی ذہن میں سرخیاں سنسانے لگیں۔ اب کی دفعہ شہ سرخی میں ہی کاغذ پہ کلیجہ بحال کے رکھ دوں گا، اس نے دل میں تہیہ کیا۔ ”ستر سالہ بوڑھے نے سات سالہ لڑکی سے منہ کالا کیا۔“ یہ سرخی جانے کی خاطر پچھلے سال اسے لڑکی کی عمر سے دس سال بحال کر بوڑھے کی عمر میں جوڑنے پڑے تھے تاکہ اسی تناسب سے جرم کی سنگینی اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہو جائے۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ یہ کیسی بد نصیبی ہے کہ سیدھے سادے اور سپاٹ لفظ rape کے جتنے مترادفات ہمارے ہاں رائج ہیں، ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں خود لذتیت کا عنصر نہ ہو۔ کوئی سُرخ، کوئی سافقرہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، جنسی لذت کشی کا فشرہ نظر آئے گا۔ ”ملزم نے خوب رو دوشیزہ کا دامن عصمت تار تار کر دیا۔“ ”ستر سالہ بوڑھا رات کی تاریکی میں منہ کالا کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔“ ”پینسٹھ سالہ بوڑھا شب بھر کمسن دوشیزہ کی عصمت سے کھیلتا رہا۔“ گویا اصل اعتراض پینسٹھ برس پر ہے، جس میں ملزم کا کوئی قصور نہیں۔ (در اصل اس سرخی میں اخلاقیات، استعجاب، گریہ اور حسد کی بجائے مساوی آمیزش ہے۔ مطلب یہ کہ اخلاقیات صرف ۱/۴)۔ ”چاروں ملزموں نے نوخیز حسینہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔“ ”درندہ صفت ملزم وقفے وقفے سے پستول دکھا دکھا کر عصمت پر ڈاکہ ڈالتا رہا۔ پولیس کے آنے تک دھمکیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔“ یہ سرخیاں اور عبارتیں ہم نے اخبارات سے حرف بحرف نقل کی ہیں۔ بعض بیانیہ اصطلاحیں اور فقرے کے فقرے، جنہیں ہم نقل کرنے سے بوجہ

قاصریں، ایسے ہوتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ بیان کرنے والا voyeur * بنفیس حریص شامل واردات ہونا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پڑھنے والے کی قانونی ہمدردیاں دوشیزہ کے ساتھ، مگر دل ملزم کے ساتھ ہوتا ہے۔

سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

کوٹے کی اس کان سے مزید نمونے برآمد کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہاتھ کالے کرنے کے لیے یہی کافی ہیں۔ مختصر استماع عرض کر دیں کہ ذرا کھرچے تو آپ کو جنسی جرائم سے متعلق کوئی فقرہ لذت اندوزی سے خالی نہیں ملے گا۔ ہر لفظ سسکی اور ہر فقرہ چسکی لیتا دکھائی دے گا۔ انگریزی میں اس اسلوب کی بہترین مثال روسی نژاد مصنف نابوکوف کے ہاں ملتی ہے جو ہر لفظ کے غبارے کو رال میں لٹخڑے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر آخری نقطہ تلخ و تک پھلا پھلا کر دیکھتا اور پھر اپنے قاری پر چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

کتنا کیوں کاٹتا ہے

کافی دیر تک تو بشارت کو یقین نہیں آیا کہ یہ سب کچھ سچ ہو سکتا ہے۔ کراچی ہے، کوئی رجواڑہ تو نہیں۔ اچھی خاصی farce معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب رات کے نونج گئے تو معاملہ سچ مچ کمبیر نظر آنے لگا۔ اسے ایس آئی نے کہا ”آج رات اور کل کا دن اور رات آپ کو حوالات میں گزارنے پڑیں گے۔ کل اتوار پڑ گیا۔ پرسوں سے پہلے آپ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔“ انہوں نے پوچھا ”کس بات کی ضمانت؟“ جواب ملا ”یہ عدالت بتائے گی۔“ انہیں فون بھی نہیں کرنے دیا۔ دادر حوالات کی کوٹھری میں جس کے جنگلے سے پیشاب کی کھرابند بجک بجک آرہی تھی، خلیفہ وقفے وقفے سے ہتھکڑی والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا اور ہی ہی، ہی ہی کر کے اس طرح روتا کہ ہنسی کا گمان ہوتا۔ بشارت کا غصہ اب ایک اپانچ اور گونگے کا غصہ تھا۔ اتنے میں تھانے کے منشی جی چٹائی کی جانماز پر عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے پاس آئے۔ سوکھ کر بالکل ٹڈا ہو گئے تھے، مگر عینک تلے آنکھوں میں ہلاکی چمک تھی۔ لہجے میں شفقت اور مٹھاس کھلی ہوئی۔ ایک بوتل لیوینڈ کی اپنے ہاتھ سے مٹھاس میں انڈیل کر پلائی۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی ڈبیسا سے پان نکال کر کھلایا۔

منشی جی نے بڑے نرم اور پُر خلوص لہجے میں کہا کہ ہمارے سرکار (ایس ایچ او) بڑے

بھلے آدمی ہیں۔ شریفوں کے ساتھ شریف اور بد معاشوں کے حق میں ہلاکو۔ یہ میری کارٹھی ہے کہ آپ کا چوری شدہ مال تین دن میں برآمد کرا دیا جائے گا۔ سرکار انتہیوں میں سے کھینچ کر نکال لاتے ہیں۔ علاقے کے ہسٹری شیٹران کے نام سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ وہ ریڈیو گرام، زیورات اور ساریاں جو اس کمرے میں آپ نے دیکھیں، ان کی بازیابی آج صبح ہی ہوئی ہے۔

معروضہ یہ ہے کہ حضور کی گاڑی میں جو لکڑی پڑی ہے، وہ سرکار کے پلاٹ پر ڈلوادیجیے۔ آپ کی اسی مالیت کی مسروقہ لکڑی، سرکار تین دن میں برآمد کروادیں گے۔ گویا آپ کی گرہ سے تو کچھ نہیں گیا۔ میں نے ابھی ان سے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے سن کر خفا ہو جائیں۔ بس یوں ہی آپ کا عندیہ لے رہا ہوں۔ سرکار کی صاحبزادی کا رشتہ خدا خدا کر کے طے ہوا ہے۔ بیٹا تیس سال کی ہو گئی۔ بہت نیک اور سکھڑ ہے۔ آنکھ میں خفیف سی کجی ہے۔ لڑکے والے جہیز میں کار، فرنیچر، ریڈیو گرام اور ویسٹ اوپن * پلاٹ پر بنگلہ مانگتے ہیں۔ کھڑکی دروازے عمدہ لکڑی کے ہوں۔ برچھوک جائے تو پتھر سے سب کچھ بھونکنا بھگتنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہمارے سرکار اس قسم کے آدمی نہیں۔ آج کل بہت پریشان اور چڑچڑے ہو رہے ہیں۔ یہ تو سب دیکھتے ہیں کہ باؤلا کتا ہر ایک کو کاٹتا پھرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی مرضی سے باؤلا تھوڑا ہی ہوا ہے۔ آپ نے خود دو چار فقروں سے اندازہ کر لیا ہو گا کہ سرکار نے کیسی شگفتہ اور موزوں طبیعت پائی ہے۔ تین برس پہلے تک شعر کہتے تھے۔ شام کو تھانے میں شاعروں کا ایسا اژدہام ہوتا کہ بعض اوقات حوالات میں کرسیاں ڈلوانی پڑتی تھیں۔ ایک شام بلکہ رات کا ذکر ہے۔ کھسمان کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سرکار ترنم سے تازہ غزل پڑھ رہے تھے۔ سارا عملہ داد دینے میں جُٹا ہوا تھا۔ مقطع پر پہنچے تو سنتری زر دار خاں نے تھری ناٹ تھری رائٹفل چلا دی۔ حاضرین سمجھے شاید قبائلی طریقے سے داد دے رہا ہے۔ مگر جب وہ واویلا مچانے لگا تو معلوم ہوا کہ دورانِ غزل جب مشاعرہ اپنے شباب پر پہنچا تو ڈکیتی کیس میں ماخوذ ایک ملزم جو حوالات کا جنگلا بجا بجا کے داد دے رہا تھا، بھاگ گیا۔ شاعروں نے اس کا تعاقب کیا۔ مگر اسے تو کیا پکڑ کے لاتے، خود بھی نہیں لوٹے۔ اللہ جانے پولیس کانسٹیبلان نے پکڑنے میں تساہلی برقی یا ملزم نے 'پکڑائی' نہیں دی۔ مگر سرکار نے ہمت نہیں ہاری۔ راتوں رات اسی نام کے بستہ الف کے ایک چھٹے ہوئے بد معاش کو پکڑ کے حوالات میں بند کر دیا۔ کاغذات میں مفرور ملزم کی ولدیت بدل دی۔ مگر اس کے بعد شعر نہیں

* ویسٹ اوپن: کراچی میں چونکہ شام کو ٹھنڈی ہوا سمندر یعنی مغرب کی سمت سے چلتی ہے، اس لئے مغرب رویہ مکانوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

کہا۔ تین برس سے سرکار کی ترقی اور شر کی آمد بند ہے۔ عدم صاحب سے یاری ہے۔ پکھلے برس اپنے معصوم بچوں کے حلق پہ پُجھری پھیر کر حکام بالا کو ڈیڑھ لاکھ کی نذر گزرائی تو 'لائن حاضری' سے چھٹکارا ملا اور اس تھامنے میں تعیناتی ہوئی۔ اب سرکار کوئی ولی اللہ تو ہیں نہیں کہ سلام پھیر کر جائز کا کوٹا لٹ کر دیکھیں تو ڈیڑھ لاکھ کے نوٹ از غیبی دھرے ملیں۔ دودھ تو آخر تھنوں ہی سے نکالنا پڑتا ہے۔ بھینس دستیاب نہ ہو تو کبھی کبھی چوبیسابھی کو پکڑ کے دوہنا پڑتا ہے۔

بشارت کو نقصان مایہ سے زیادہ اس ذلت آمیز مثال پر غصہ آیا۔ بکری بھی کہہ دیتا تو غنیمت تھا۔ (گو کہ چھوٹی ہے ذات بکری کی) لیکن صورتِ حال کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ انہوں نے کہا، میں اپنی رپٹ واپس لیتا ہوں۔ اے ایس آئی نے جواب دیا کہ دن دہاڑے سر قذاقابلِ راضی نامہ جرم ہے۔ یعنی قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ آپ رپٹ واپس لینے والے کون ہوتے ہیں؟ اگر آپ نے واپس لینے پر اصرار کیا تو جھوٹی رپٹ درج کرانے پر آپ کا یہیں، آن دی اسپاٹ چالان کر دوں گا۔ عزت کے لالے پڑ جائیں گے۔ اگر آپ کا وکیل بہت لائق فائق ہوا تو تین مہینے کی ہوگی۔ ایس ایچ او صاحب پیر کو فیصلہ کر دیں گے کہ آپ کن کن دفعات کے تحت ماخوذ ہیں۔

انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا ہر فعل، ان کی ساری زندگی قابلِ دست اندازی ہی نہیں، قابلِ دست درازی پولیس رہی ہے۔ اور یہ سراسر پولیس کی غفلت کا نتیجہ تھا کہ وہ اب تک عزت آبرو سے بسر کر رہے تھے۔

انہوں نے طیش میں آکر دھمکی دی کہ مجھے جس بے جا میں رکھا گیا ہے۔ یہ غیر قانونی حراست ہے۔ میں ہائی کورٹ میں Habeas Corpus Petition پیش کروں گا۔ اے ایس آئی بولا، آپ پٹیشن کیا پیش کر دیں گے، ہم خود آپ کو ہتھیلی پہ دھر کے عدالت میں پیش کر دیں گے۔ دھڑلے سے دس دن کا جسمانی ریمانڈ لیں گے۔ دیکھتے جائیے۔

آپ میتی لکھنے کی خاطر جیل جانے والے

اے ایس آئی یہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اس کا باس ایس ایچ او بھی اپنا ڈنڈا بغل میں دبا لے اہم عہم عاہم کھانسی لکھتا کرتا اپنے گھر چلا گیا۔ عین اسی وقت مٹھائی والا وکیل نہ جانے کہاں سے دوبارہ آن چکا۔ رات کے گیارہ بجے بھی اس نے کالا کوٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ وکیلوں کا مخصوص کلف دار سفید کالر بھی لٹکائے ہوئے تھا۔ کہنے لگا، برادر! ہر چند کہ

میرا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہیں، محض انسانی ہمدردی کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ آپ متعدد جرائم میں ملوث کیے جاسکتے ہیں۔ خدا نخواستہ ابھی دفعہ ۱۶۴ ضابطہ فوجداری کے تحت آپ کے ڈرائیور کا اقبالِ جرم قلم بند ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ آپ صورت سے بال بچے دار آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ لیڈر تو ہیں نہیں جو سیاسی کیریئر بنانے اور سوانح عمری لکھنے کے لالچ میں جیل جائیں۔ پارٹیشن سے پہلے کی بات اور تھی۔ لیڈر باغیانہ تقریر کر کے جیل جاتا تھا تو جناب والا! سارا ملک انتظار میں رہتا تھا کہ دو تین سال بعد چھوٹیں گے تو کوئی تفسیر، کوئی آپ بیتی، کوئی تصنیف مکمل کر کے نکلیں گے۔ بد قسمتی سے انگریزوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جیل سے قبل از وقت رہا کر دیا تو تفسیر ادھوری رہ گئی۔ بہر حال، وہ زمانے اور تھے۔ آج کل والا حال نہیں تھا کہ تقریر کرنے سے پہلے ہی دھر لیے گئے اور چھوٹے تو جیل کے دروازے پر کوئی بار پھول پہنانے والا تک نہیں۔ نے چراغ، نے ٹکٹے والا مضمون! بخدا! میں یہ سب کچھ نہیں کر رہا کہ آپ مجھے وکیل کر لیں، گو کہ میں آپ کو منع بھی نہیں کر سکتا۔ محض آپ کے بچلے کو کہہ رہا ہوں۔ مجھے پریکٹس کرتے پچیس سال ایک مہینہ ہوا۔ میں نے آج تک کوئی قانونی قصہ ایسی نہیں دیکھی جسے ناناواں (روپیہ) نہ سلجھا سکے۔ سارے سم سم اسی سے کھلتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔ البتہ اسٹافوڈ فار تھٹ (Food for thought) شب گزاری کے لئے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج چاہتے ہیں۔ آپ نے ان آٹھ گھنٹوں میں پولیس کا کیا بگاڑ لیا جو آئندہ آٹھ گھنٹوں میں بگاڑ لیں گے۔ کل اتوار ہے۔ آپ اسی طرح حوالات میں آگڑوں بیٹھے اپنے کانسٹیٹیوشنل رائٹس اور ضابطہ فوجداری کے حوالے دیتے رہیں گے۔ عدالت زیادہ سے زیادہ یہی تو تیر مار لے گی کہ آپ کو پیر کے دن رہا کر دے گی۔ سو ہم تو جناب والا پیر سے پہلے ہی آپ کو اس چوہے دان کے باہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ زیر حراست ہیں۔ اچھا۔ بہت رات ہو گئی۔ شب بخیر! منشی جی کو میرے گھر کا فون نمبر معلوم ہے۔

وکیل کے جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل ایک چٹائی، ایلو مینیم کالونا اور کھجور کا دستی پنکھا لے آیا اور خلیفہ والی حوالات کی طرف اشارہ کر کے بشارت سے کہنے لگا ”دن بھر بیٹھے بیٹھے آپ کی کمر تختہ ہو گئی ہوگی۔ اب آپ یہ پچھا کرواں لیٹ جائیے۔ مجھے جنکے میں تالا لگانا ہے۔ مجھ بے پناہ ہیں۔ یہ کمبل اوڑھ لیجئے گا۔ زیادہ گرمی لگے تو یہ پنکھا ہے۔ رات کو استنجا آئے تو بے شک وہیں۔۔۔ بارہ بجے کے بعد حوالات کا تالا نہیں کھولا جاسکتا۔“ اس نے بتیاں بجنانی شروع کر

مگر قارورہ کچھ اور کہتا ہے!

بتیاں بچنے لگیں تو خلیفہ زور زور سے ”سرکار! سرکار!“ کر کے رونے لگا۔ حوالات کی دیواروں پر کٹھنلوں کی قطاریں رینگنے لگیں۔ اور چہرے کے گرد خون کے پیاسے پچھڑوں کا ہالہ گردش کرنے لگا۔ اس مرحلے پر منشی جی دفعتاً پھر نمودار ہوئے۔ اور لمبا ہی ہوٹل سے منگوایا ہوا قیمہ، جس میں پڑی ہوئی ہری مرچوں اور ہرے دھنیے کی الگ سے خوشبو آ رہی تھی، اور تنور سے اترتی نان بشارت کے سامنے رکھی۔ گرم نان سے اشتہا کو باڈا کر دینے والی وہ لپٹ آ رہی تھی جو ہزار ہا سال قبل انسان کو آگ دریافت کرنے کے بعد گہووں سے آئی ہوگی۔ اسے کھانے سے انکار کرنے کے لیے بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو کہہ نہ سکے کہ بخوک سے برا حال تھا اور سارا منہ رال سے بھر گیا تھا۔ ہاتھ کے ایک بلجے سے اشارے سے انکار کیا اور ناک دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئے۔ اس پر منشی جی بولے، قسم خدا کی! میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ اس کا عذاب آپ کی گردن پر۔ تین بجے ایک ’بن‘ چاء میں ڈبو کے کھایا تھا۔ بس۔ ڈاکٹر آتوں کی ٹی بی بتاتا ہے۔ مگر پیر الہی بخش کالونی والے حکیم شفاء الملک کہنے لگے کہ یہ بیماری زیادہ کھانے سے ہوتی ہے۔ لو اور سنو! میں نے کہا، حکیم صاحب! میرا بخت جسامت تو دیکھیے۔ بولے، مگر قارورہ کچھ اور کہتا ہے!

یکبارگی منشی جی نے بات کا رخ موڑا۔ بشارت کے گھٹنے چھو کر کہنے لگے، میں آپ کے پیروں کی خاک ہوں۔ پر دنیا دہی ہے۔ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ مگر معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے کہ قارورہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں آپ کے خسر کا محلے دار اور اپنی نیاز مند رہ چکا ہوں۔ دیکھیے، عزت کا صدقہ مال ہوتا ہے۔ لکڑی دے دلا کے رفع دفع کیجئے۔ کلہم دو تین ہزار کی تو بات ہے۔ یہ تو دیکھیے آپ ہیں کہاں! پھر یہ غور فرمائیے کہ ساڑھے تین ہزار کی اس لکڑی کے عوض آپ کو ساڑھے تین ہزار کی دوسری لاٹ مل جائے گی۔ پھر جھگڑا کس بات کا؟ سرکار شیر کے منہ سے شکار ہی نہیں چھینتے، اس کے دانت بھی اٹھاڑ لاتے ہیں۔ علاقے میں کہیں کوئی واردات ہو، سرکار کو گویا القا ہو جاتا ہے کہ کس کا کام ہے۔ بعضے بعضے کو تو محض قیافے پر ہی دھر لیتے ہیں جیسا کہ، معاف کیجیے، حضور کے ساتھ ہوا۔ پچھلے سال انہی دنوں کی بات ہے۔ سرکار نے ایک شخص کو کالی گلوچ سے شارع عام پر رکاوٹ پیدا کرنے پر گرفتار کیا۔ بظاہر ذرا سی بات تھی۔ مگر قارورہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ سب کو تعجب ہوا۔ مگر دو گھنٹے بعد سرکار نے اس کے گھر سے وہاٹ ہارس و سکی کی تین سو بوتلیں، دو گھوڑا بوسکی کے تحان، مسروقہ زیورات، درجنوں ریڈیو گرام اور دنیا بھر کا چوری کا مال برآمد کر لیا۔ گھر میں ہر چیز چوری کی تھی۔ ایک چیز بھی ذاتی نہیں بچئی۔ سوائے

والد کے جس نے کہا کہ میں اس ناخلف کو عاق کرتا ہوں۔ مگر ہمارے سرکار دل کے بہت اچھے ہیں۔ پچھلے سال اسی زمانے میں میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ سارے اخراجات سرکار نے خود برداشت کیے۔ انہی میں کا ایک ریڈیو گرام بھی جہیز میں دیا۔ میں اس کی کارٹھی دیتا ہوں کہ مسروقہ لکڑی اور ٹرک کی رجسٹریشن بک آپ کو تین دن کے اندر راند دکان پر ہی ڈلیور ہو جائے گی۔ میری مان جائیے۔ ویسے بھی بیٹی کی شادی کے لیے رشوت لینے اور دینے کا شمار نیگ نیوتے میں کرنا چاہیے۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟

روٹی میری کاٹھ دی، لاون میری بھکھ *

اب پیاز کے سب چھلکے ایک ایک کر کے اتر چکے تھے۔ بس آنکھوں میں ہلکی ہلکی سوزش باقی رہ گئی تھی۔ خواری کا اصل سبب سمجھ میں آجائے تو جھنجھلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کو چُپ لگ جاتی ہے۔ منشی جی اب انہیں اپنے ہی آدمی لگنے لگے۔

”منشی جی! یہاں سبھی؟“

”حضور! سبھی“

”وکیل صاحب بھی؟“

”وکیل صاحب بھی“

”منشی جی! پھر آپ۔۔۔؟“

”حضور! میرے سات بچے ہیں۔ بڑا بیٹا انٹر میں ہے۔ بیوی کو بھی بی بی بتائی ہے۔ دن میں دو تین دفعہ خون ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے مری یا کوئٹہ کے سینے ٹوریم لے جاؤ۔ تنخواہ اس سال کی ترقی ملا کر اٹھائیس روپے پانچ آنے بنتی ہے (+)۔“

بشارت نے ٹرک میں لدی ہوئی لکڑی ایس ایچ اڈو کو نذر کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ آدھی رات ادھر، آدھی رات ادھر، بارہ بجے خلیفہ کی ہتھکڑی کھلی تو وہیں یعنی موری کے منبع و مخرج کے درمیان سجدے میں چلا گیا۔ شکرانے کے سجدے سے ابھی پوری طرح نہیں اٹھا۔

* میری روٹی کاٹھ کی ہے اور بھوک میری لکاون۔ بابا فرید۔

(+) کانسٹیبل کی تنخواہ اس زمانے میں سترہ روپے ہوتی تھی۔ اور ASI کی ستر روپے جو بینک کے چر اسی کی تنخواہ کے برابر تھی۔

تھا کہ ہاتھ پھیلا کر ہیڈ کانسٹیبل سے میری مانگ کر پی۔ ادھر بشارت کو بھی کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت ملی۔ منشی جی نے مبارکباد دی اور اپنی پیتل کی ڈیبا سے نکال کر دوبارہ پان کی کترن یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ گلو ریاں آپ کی بھابی نے صبح بطور خاص بنائی تھیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بشارت کو علیحدہ لے جا کر مبارکباد دیتے ہوئے کہا ”خوشی کا موقع ہے۔ منشی جی کو پچیس روپے دے دیجیے۔ غریب، عیالدار، ایماندار آدمی ہے۔ اور جناب عالی! اب ہم سب کامنہ میٹھا کرائیے۔ ایسے خوشی کے موقعے بار بار تھوڑا ہی آتے ہیں۔ آپ بے شک گھر فون کر لیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ سرکار اب تک کیوں نہیں لوٹے۔ ایسی ڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔ ڈھنڈیا بچ رہی ہوگی۔ اسپتالوں کے کیریولٹی وارڈ میں ہر مردے کی چادر ہٹا ہٹا کے دیکھ رہے ہوں گے اور مایوس لوٹ رہے ہوں گے۔“ بشارت نے سو روپے جیب سے نکال کر مٹھائی کے لیے دیے۔ تھوڑی دیر بعد ایس ایچ او کے کمرے سے وہی وکیل صاحب مٹھائی کے ویسے ہی چار ڈبوں کا مینار گود میں اٹھائے اور ٹھوڑی کی ٹھونک سے اسے میلنس کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی بڑی گرم جوشی سے مبارکباد دی اور ان کی معاملہ فہمی اور سمجھ داری کو سراہا۔ تین ڈبے غلے میں تقسیم کیے اور چوتھا بشارت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے، یہ ہماری طرف سے بھابی صاحبہ اور بچوں کو دے دیجیے گا۔ ڈبا حوالے کرنے کے بعد انہوں نے اپنا کلف دار کارلر اتار دیا اور سیاہ کوٹ اتار کر ہاتھ پر لٹکالیا۔

بھکاری کون؟

وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ لگے ہاتھوں لکڑی ایس ایچ او صاحب کے پلاٹ پر ڈالتے جائیے۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ گاڑی میں ایک راشنل برادر کانسٹیبل خلیفہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے اس دفعہ ”پدر سوختہ“ کہہ کر ایک ہی کالی سے گاڑی اشارت کر دی۔ کوئی بہت پڑھا لکھا یا معزز آدمی پاس بیٹھا ہو تو وہ گاڑی کو فارسی میں کالی دیتا تھا۔ کالی دیتے وقت اس کے چہرے پر ایسا ایکسپریشن آتا کہ کالی کا مفہوم مصور ہو کر سامنے آ جاتا۔ تھانے والوں نے ایک گیس کی لائٹن ساتھ کر دی تاکہ اندھیرے میں پلاٹ پر مال اُتروانے میں آسانی رہے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں لکڑی کے تختوں پر لائٹن ہاتھ میں لیے بشارت بیٹھ گئے۔ جھنگلوں سے مینٹل جھڑ جانے کے ڈر سے انہوں نے لائٹن ہاتھ میں ادھر اُٹھا رکھی تھی۔ خلیفہ ایسا بن رہا تھا جیسے گاڑی ہمیشہ اتنی ہی آہستہ چلا تا ہے۔ کانسٹیبل نے جھنجھلاتے ہوئے اسے دو دفعہ ڈانٹا ”اے ٹرک چلا رہا ہے یا اپنی زوجہ کے جنازے کا جلوس نکال رہا ہے؟“ بشارت کی

آنکھیں نیند سے بند ہو چلی تھیں، مگر کراچی کی سڑکیں جاگ رہی تھیں۔ سنیما کا آخری شوا بھی ختم ہو ہی تھا۔ کاروں کے شیشوں پر اوس کے ریلے بہہ رہے تھے اور ان کی قمیض بھیگ چلی تھی۔ پیلیس سینما کے پاس بجلی کے کنبے کے نیچے ایک جوان نیم برہنہ پاگل عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچے کی آنکھیں دکھنے آئی ہوئی تھیں اور سوجن اور چیپڑوں سے بالکل بند ہو چکی تھیں۔ تنگی چھاتیوں پر بچے نے دودھ ڈال دیا تھا جس پر مکھیوں نے جھاؤنی چھار کھی تھی۔ ہر گزرنے والا ان حصوں کو جو مکھیوں سے بچ رہے تھے نہ صرف غور سے دیکھتا بلکہ مڑمڑ کے ایسی نظروں سے گھورتا چلا جاتا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دراصل بھکاری کون ہے۔ پاس ہی ایلو مینیم کے بے دھلے پیالے میں منہ ڈالے ایک کتا اسے زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کر رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا ابھی تک موتیا کے گجرے بیچ رہا تھا۔ انہوں نے ترس کھا کر ایک گجرا خرید لیا اور کانٹیل کو دے دیا۔ اس نے اسے رائفل کی نال پر لپیٹ لیا۔ بشارت سر جھکائے، خیالات میں گم، بند روڈ، عید گاہ، صدر اور نرسری ہوتے ہوئے پی ای سی ایچ ایس پہنچے تو ایک کاغل ہو گا۔ انہوں نے لائٹین گاڑی کے ہونٹ پر رکھ دی اور اس کی روشنی میں وہ لکڑی جو چوروں سے بچ گئی تھی، اپنے ہاتھوں سے تھانے دار کے پلاٹ پر ڈال آئے۔

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

طوٹے کی پیش گوئی

ڈھائی بجے رات جب وہ گھر پہنچے تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اس آٹومینیک چمکڑے کو اوانے پونے ٹھکانے لگا دیں گے۔ گھر، گھوڑے، گھر والی، سواری اور انگوٹھی کے پتھر کے معاملے میں وہ سعد اور نحس کے قائل تھے۔ انہیں یاد آیا کہ ۱۹۵۳ء میں موٹر سائیکل رکشا کے حادثے میں زخمی ہونے کے بعد جب وہ بندر روڈ پر میونسپل کارپوریشن کے سامنے بیٹھنے والے ایک نجومی کے پاس گئے تو اس نے اپنے سدھائے ہوئے طوٹے سے ایک لفافہ نکلا کر پیش گوئی کی تھی کہ تمہاری قسمت میں ایک بیوی اور تین حج ہیں۔ تعداد کی ترتیب اس کے برعکس ہوتی تو کیا اچھا ہوتا، انہوں نے دل میں کہا۔ ویسے بھی حج زندگی میں ایک ہی دفعہ فرض ہے۔ ثواب لوٹنے کے معاملے میں وہ لالچی بالکل نہیں تھے۔ نجومی نے زانچہ بنا کر اور ہاتھ کی لکیریں محدب شیشے سے دیکھ کر کہا کہ دو، تین اور چار پہیوں والی گاڑیاں تمہارے لیے نحس ثابت ہوں گی۔ یہ بات وہ زانچے اور محدب شیشے کے بغیر، صرف ان کے ہاتھ اور گردن پر بندھی ہوئی پٹیاں دیکھ کر بھی کہہ سکتا تھا۔ بہر حال، اب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ایک پاپانچ پہیوں کی گاڑی ایجاد نہ ہو، انہیں اپنی

ٹانگوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گاڑی کو خریدنے کا اصل مقصد لکڑی کو چوروں اور ایس ایچ او تک بحفاظت تمام پہنچانا تھا جو بحمد اللہ بغیر کسی تاخیر اور رکاوٹ کے تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

۷

بنگال ٹائیگر گیا، یر شیر آ گیا

صبح جب انہوں نے خلیفہ کو مطلع کیا کہ اب وہ اس کی خدمات سے استفادہ کرنے کے لائق نہیں رہے تو وہ بہت رویا کایا۔ پہلے تو کہا، میں گاڑی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ پھر کہنے لگا، کہاں جاؤں؟ بعد ازاں اس نے آقا اور ملازم کے اٹوٹ رشتے اور ٹھک کھانے کے دور رس نتائج پر تنقید کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اور جو بخاری نقصان ان کو پہنچا ہے، اس کی تلافی وہ اس طرح کرنا چاہے گا کہ سال بھر میں ان کی حجامت کی جو اجرت بنتی ہے، اس میں سے وہ لکڑی کی رقم مجرا کر لیں۔ اس پر وہ چہیے کہ خلیفہ! تو سمجھتا ہے کہ میں ساڑھے تین ہزار سالانہ کی حجامت بنواتا ہوں؟ خلیفہ نے دوبارہ اپنی غلطی کا خندہ پیشانی سے اعتراف کیا اور ساتھ ہی گاڑی کو گستی ہیئر کٹنگ سیلون بنانے کی پُر حاکم تجویز پیش کی جو اتنی ہی حقارت سے رد کر دی گئی۔ زچ ہو کر اس نے یہاں تک کہا کہ وہ تمام عمر ————— یعنی گاڑی کی یا اس کی اپنی عمر طبعی تک، جو بھی پہلے دغا دے جائے ————— بالکل مفت ڈرائیوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ گویا جو نقصان پہلے تنخواہ لے کر پہنچاتا تھا وہ اب بلا تنخواہ پہنچائے گا۔ غرض کہ خلیفہ دیر تک اسی قسم کی تجویزوں سے ان کے زخموں پر پھٹکری چمڑکتا رہا۔

وہ کسی طرح نہ مانے تو خلیفہ نے ہتھیار ڈال دیے، مگر اُسٹرا اٹھالیا۔ مطلب یہ کہ آخری خواہش یہ ظاہر کی کہ اس قطع تعلق کے باوجود، اسے کم از کم حجامت کے لیے آنے کی توجہ دے دی جائے، جو بشارت نے صرف اس شرط پر دی کہ اگر میں آئندہ کوئی سواری ————— کسی بھی قسم کی سواری ————— رکھوں تو حرام خور تم نہیں چلاؤ گے۔

کچھ دن بعد خلیفہ یہ خبر دینے آیا کہ صاحب جی! یوں ہی میرے دل میں اُپٹنگ ہوئی کہ ذرا تھانیدار صاحب بہادر کے پلاٹ کی طرف ہوتا چالوں۔ میں تو دیکھ کے بخونچکا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی رشوت میں دی ہوئی لکڑی کے پاس اپنی چوری شدہ لکڑی پڑی ہے! پہلو پہ پہلو! ہمارا

مال ایک شیر دوسرے شیر کے منہ میں سے نکال کر ڈکار گیا۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے کہ وحاری دار شیر (Bengal tiger) چلا گیا اور یر شیر آگیا۔ میرا اعتبار نہیں تو خود جا کے ملاحظہ کر لیجیے۔

خلیفہ ہنسنے لگا۔ اسے اپنی ہی بات پر بے محل، بے اختیار اور مسلسل ہنسنے کی بری عادت تھی۔ سانس ٹوٹ جاتا تو ذرا دم لے کر پھر سے ہنسنے شروع کر دیتا۔ وہ ہنسی الپتا تھا۔ دم لینے کے وقفے میں آنکھ مارتا جاتا۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالکل کلاؤن معلوم ہو رہا تھا۔

ٹرک ہذا بکاؤ ہے

مکڑی ایک مہینے تک بیکار کھڑی رہی۔ کسی نے جھوٹوں بھی دام نہ لکائے۔ تضحیک و توہین کے پہلو سے بچنے کی خاطر ہم نے اسے مکڑی کہا ہے۔ بشارت بے حد حساس ہو گئے تھے۔ کوئی اسے کار کہتا تو انہیں خیال ہوتا کہ طرہ کر رہا ہے اور ٹرک کہتا تو اس میں توہین کا پہلو نظر آتا۔ وہ خود vehicle کہنے لگے تھے۔ وہ مایوس ہو چلے تھے کہ دفعتاً ایک ایک دن کے وقفے سے اکٹھی تین ”آفرز“ آگئیں۔ پڑوس میں سیمنٹ ڈپو کے مالک نے اس ترپال کے جو کبھی مکڑی پر چڑھا رہتا تھا، تیرہ روپے لکائے، جب کہ ایک گدھا مکڑی والے نے بارہ روپے کے عوض چاروں پہیے نکال کر لے جانے کی آفر دی۔ انہوں نے اس جاہل کو بری طرح لتاڑا کہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ تیرا خیال ہے کہ یہ مکڑی پہیوں کے بغیر بھی چل سکتی ہے! اس نے جواب دیا، سائیں! یہ پہیوں کے ہوتے ہوئے کون سی چل رہی ہے! رقم کے لحاظ سے تیسری آفر سب سے اچھی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص نے دی جو حلیے سے اسمگلر لگتا تھا۔ اس نے مکڑی کی نمبر پلیٹ کے دو سو روپے لکائے۔

ان اہانت آمیز آفرز کے بعد بشارت نے مکڑی پر ترپال چڑھا دیا اور توہن کی کہ آئندہ کبھی کار نہیں خریدیں گے۔ آگے چل کر مالی حالت اور طبیعت کی چونچالی بحال ہوئی تو اس توہن میں اتنی سی ترمیم کر لی کہ آئندہ کسی آنچھانی گورے کی مکڑی نہیں خریدیں گے خواہ اس کی بیوہ میم کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ مرزا نے مشورہ دیا کہ اگر تمہاری کسی سے دشمنی ہے تو مکڑی اسے تحفہ دے دو۔ بشارت نے کہا، نذر ہے۔ چند روز بعد انہوں نے ترپال اتار دیا اور ایک گتے پر ”برائے فروخت“ نہایت خوشخط لکھوا کر مکڑی پر ٹانگ دیا۔ دو تین دن میں مکڑی اور گتے پر گرد اور آرمشین سے اڑتے ہوئے بُرادے کی دیز تھیں چڑھ گئیں۔ مولانا کرامت حسین نے جواب

فرم کے منیجر کہلاتے تھے، ونڈاسکرین کی گرد پر اٹھکی سے ”خوش آمدید“ اور ”ٹرک ہذا بکاؤ ہے“ لکھ دیا جو دور سے نظر آتا تھا۔ روزانہ ظہر کے وضو کے بعد حروف پر گیلی اٹھکی پھیر کر انہیں روشن کر دیتے۔ نماز باجماعت کے بعد مسجد سے آکر گاڑی پر دم کرتے۔ فرماتے تھے، ایسا جلالی وظیفہ پڑھ رہا ہوں کہ جس چیز پر بھی پھونک مار دی جائے وہ یا تو چالیس دن کے اندر اندر بک جائے گی، ورنہ وظیفہ پڑھنے والا خود اندھا ہو جائے گا۔ دن میں تین چار دفعہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کی، کبھی دو کبھی تین یا چار اٹھکیاں دائیں بائیں گھماتے۔ یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ مینٹائی جاتی تو نہیں رہی۔ وظیفے کے بعد مسجد سے دکان تک، راستے بھر جلالی پھونک کو اپنے منہ میں بڑی احتیاط سے بھرے رکھتے کہ ”لیک“ ہو کر غلطی سے کسی اور چیز پر نہ پڑ جائے۔

۸

حاجی اور نگ زیب خاں سوداگران و آڑھتیاں چوب ہائے عمارتی

پتلا شور بہ اور سوچی کا حلوہ

ابھی مولانا کرامت حسین کے وظیفے کو چالیس دن نہیں ہوئے تھے کہ بشارت ایک اور قصبے میں الجھ گئے، جو کچھ اس طرح تھا کہ حاجی اور نگ زیب خاں، آڑھتیاں و سوداگران چوب ہائے عمارتی، پشاور ان سے رقم وصول کرنے آدھکے۔ انہوں نے کوئی ایک سال قبل اعلیٰ درجہ کی لکڑی پنجاب کے ایک آڑھتی کی معرفت بشارت کو سپلائی کی تھی۔ یہ داغدار ٹھکی۔ جب یہ سال بھر تک نہیں بکی تو بشارت نے گھائے سے سات ہزار میں فروخت کر دی۔ یہ وہی لکڑی تھی جس کی چوری، بازیابی اور غتبود ہونے کا حال ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں، گھائے سے بیچی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے۔ آدھی پولیس والوں نے ہتھیالی۔ آپ اسے بیچنا کہتے ہیں! اس کے لیے تو پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔

بشارت کے تخمینے کے مطابق لکڑی کی مالیت کسی طرح سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔
 اوجہ حاجی اورنگ زیب خاں اصولی طور پر ایک پائی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کا
 مطلب یہ تھا کہ بشارت بقیہ رقم یعنی ۳-۹-۲۵۷۳ روپے اپنی گرہ سے بھریں۔ (یہ رقم آج کے
 پندرہ ہزار روپے کے برابر تھی) خان صاحب کہتے تھے کہ آپ نے مال بیچنے میں شیطانی عجلت
 سے کام لیا۔ جلدی کام شیطان کا۔ ”صیب! یہ لکڑی تھی، بالغ لڑکی تو نہیں جس کی جلد از جلد
 رخصتی کرنا کارِ ثواب ہو۔“

ایک مدت سے اس رقم کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ایک دن خان صاحب
 کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ قانونی نوٹس کی رجسٹری کرائی اور پشاور جنرل پوسٹ آفس سے
 سیدھے گھر آئے۔ سامان باندھا اور نوٹس سے پہلے خود کراچی پہنچ گئے۔ نوٹس ان کی آمد کے
 تین دن بعد ان کی موجودگی میں اس طرح موصول ہوا کہ رجسٹری خود انہوں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے
 چھین کر رکھ لی۔ نوٹس بحال کر پھاڑ دیا اور لٹافہ بشارت کو تھما دیا۔ قیام بھی انہی کے ہاں کیا۔ اس
 زمانے میں دستور تھا کہ آڑھتی یا تھوک بیوپاری آئے تو اسے گھر پر ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ یوں بھی
 بشارت کی خان صاحب سے خوب بنتی تھی۔ بشارت خان صاحب کے خلوص و مدارات کے گرویدہ
 اور خان صاحب ان کی کچھ داریاں توں کے دلدادہ۔

دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ جھائیں جھائیں کرنے کے بعد، شام کو خان صاحب
 بشارت کے ساتھ ان کے گھر چلے جاتے، جہاں ان کی اس طرح خاطر مدارات ہوتی جیسے دن میں کچھ
 ہوا ہی نہیں۔ گھر والے ان کی خاطر داریاں کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے۔ اس کے باوجود خان
 صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں پتلے شور بے کاسالین کھا کھا کے میری منظر کمزور ہو گئی ہے۔ قدرے
 لنگڑا کر چلنے لگے تھے۔ فرماتے تھے، گھٹنوں میں شور بہا تر آیا ہے! رات کے کھانے کے بعد سوچی
 کا حلوہ ضرور طلب کرتے۔ فرماتے تھے، حلوہ نہ کھاؤں تو بزرگوں کی روحیں خواب میں آ آ کر
 ڈانٹتی ہیں۔ اکثر ان سالم رانوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے جو ان کے دسترخوان کی زینت ہوا کرتی
 تھیں۔ ان کا پیٹ اعلیٰ نسل کے بڑوں (دُنوں) کا قبرستان تھا، جس کے وہ مجاور تھے۔ بشارت
 نے دوپہر کو ان کے لئے فرنیئر ہوٹل سے ران اور چمپلی کباب منگوانے شروع کئے۔ مرزا نے کئی
 مرتبہ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ۳-۹-۲۵۷۳ روپے دے کر اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ یہ پھر بھی سستا پڑے
 گا۔ مگر بشارت کہتے تھے کہ سوال روپے کا نہیں، اصول کا ہے۔ خان صاحب بھی اسے اپنی انا اور
 اصول کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔

اولیاء اللہ جس یکسوئی اور استغراق سے مراقبہ اور خدا کی عبادت کرتے ہیں، خان صاحب اس سے زیادہ یکسوئی اور استغراق غذا پر صرف کرتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ نماز، نیند، کھانے اور کابلی دینے کے دوران کوئی محل ہو جائے تو اسے گولی مار دوں گا۔ کسی اجنبی یا دشمن یا ناقابل اعتبار دوست سے ملنے جاتے تو مکملے میں ۳۸ بور کاربو الور حامل کر لیتے۔ مشہور تھا کہ خانہ کعبہ کے طواف کے دوران بھی ریوالور احرام میں چھپا رکھا تھا۔ واللہ اعلم۔ دس سیر سوجی روے دار بطور سوغات کراچی لائے تھے۔ اسی کا خلہ بنوا کر کھا رہے تھے۔ بشارت روز سوجی کی بوری دیکھتے اور دہل جاتے اس لیے کہ ابھی تو اس کے ختم ہونے میں بہت دیر تھی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ اگلی دفعہ مردان شوگر ملز سے تازہ گڑ کی بوری لاؤں گا۔ سفید چینی کھانے سے خون پتلا پڑ جاتا ہے۔ ایک دن بشارت نے اندیشہ ہائے قریب سے گھبرا کر باتوں باتوں میں ٹوہ لینا چاہی۔ پوچھا ”خان صاحب! گڑ سے کیا کیا بنتا ہے؟“ سوجی کے حلوے کا گولا حلق میں پھسلاتے ہوئے بولے ”بجائی سے پوچھ لینا۔ اس وقت دماغ حاضر نہیں۔ بات یہ ہے کہ گھائے اور جھکڑے سے، اور گڑ سے ——— اور روزے سے بھی ——— ہمارے دماغ کو ایک دم گرمی چڑھ جاتا ہے۔ ہم صرف رمضان میں ہاتھ پائی کرتا ہے۔ اس واسطے کہ روزے میں کابلی دینا منع ہے۔“

ٹانگیں اور پائے

خان صاحب کے اپنے دسترخوان اور خاطر مدارات کا کیا کہنا۔ بشارت کو پشاور میں ان کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر کھانے پر بکری یا ڈبے کی مسلم ران سامنے رکھ دیتے۔ ناشتے اور چائے پر البتہ مرغی کی ٹانگ پر اکتفا کرتے۔ ان کے دسترخوان پر ران اور ٹانگ کے سوا کسی اور حصے کا گوشت نہیں دیکھا۔ نہ کبھی سبزی یا مچھلی دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ بینگن اور مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ بیرس کے Folies Bergere اور Lido کی کورس گرلز کا Legs Show دیکھ کر خان صاحب پشتو میں کیا ارشاد فرماتے، لیکن استاہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ایسی ٹانگوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی جنہیں روسٹ کر کے وہ کھا اور کھاناہ سکین۔

ٹانگ کے گوشت سے رغبت کے باوجود خان صاحب کو کراچی کی بونگ کی نہاری اور سری پایوں سے سخت چڑ تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا، مجھ سے تو مواشی کے گندے، گوبر میں بے ہوئے گھروں کا آب جوش نہیں کھایا جاتا۔ ہمارے فرنیئر میں تو کوئی بدھا کسی کچی عمر کی دوشیزہ

سے شادی کر لے تو حکیم اور پڑوسی اسے ایسا ہی آتش گیر مادہ کھلاتے ہیں۔ اس سے وہ انتڑیوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر وفات پا جاتا ہے۔ سنا ہے ولایت میں تو کھروں سے سالن کے بجائے سریش بناتے ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بکری کے پائے۔ بھیر کے پائے۔ دُنبے کے پائے۔ مکائے کے پائے۔ میل کے پائے۔ بھینسے کے پائے۔ میں تو جانوں چارپائی کے پائے آپ محض اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ صاف ہوتے ہیں۔

پچھلی صدی کا اسٹیچو

خان صاحب وجہہ اور بھاری بھر کم آدمی تھے۔ ان کی لغوبات میں بھی وزن محسوس ہوتا تھا۔ قد تقریباً ساڑھے چھ فٹ، جسے کٹا اور طرے سے ساڑھے سات فٹ بنا رکھا تھا۔ مگر آٹھ فٹ کے لگتے تھے۔ اور یہی سمجھ کر بات کرتے تھے۔ صحت اور کاٹھی اتنی اچھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ تن و توش کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہتھ والی کرسی پر جیسے تیسے ٹھنس کر بیٹھ تو جاتے، لیکن جب اٹھتے تو کرسی بھی ساتھ اٹھتی۔ سنہری مونچھیں اور ہلکی براؤن آنکھیں۔ بایں رخسار پر زخم کا ہلالی نشان جو اگر نہ ہوتا تو چہرہ ادھورا دکھائی دیتا۔ انگشت شہادت دوسری پور سے کٹی ہوئی۔ کسی نابکار کو خبردار کرنا ہو، یا آسمان کو کسی قضیے میں اپنا گواہ بنانا مقصود ہو (جس کی ضرورت دن میں کئی بار پڑتی تھی) تو یہ نیم انگشت انتباہ اٹھا کر خطاب کرتے۔ ان کی کٹی اٹھلی بھی ہماری ثابت اٹھلی سے بڑی تھی۔ پاس اور دور کی منظر خاصی کمزور تھی، لیکن عینک لگانے سے حتی الامکان احتراز کرتے۔ صرف چیک پر دستخط کرنے اور مالی دینے کے بعد معتوب کے چہرے پر اس کے اثرات دیکھنے کے لیے پاس کی عینک لگا لیتے اور اتارنے سے پہلے جلدی جلدی اسی سے دور کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ یہ معلومات ان کی دن بھر کی جغرافیائی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی تحریر۔ کھل کر ہنستے تو چہرہ انار دانہ ہو جاتا۔ چہرے پر ہنسی ختم ہونے کے بعد اس کی اندرونی لہروں سے پیٹ دہر تک ہچکولے کھاتا ہوتا۔ اصلی زری کی کٹا ہر پکڑی کا ہاتھ بھرا نچا کلف دار طرہ زخمی انگوٹھے کی طرح ہمہ وقت کھڑا ہی رہتا تھا۔ گہرا براؤن ٹرکش کوٹ، ”تیلے“ کا پشاور چٹیل جس میں ہمارے دونوں پیر آگے پیچھے آجائیں۔ لامتناہی گھیر کی سفید شلوار۔ خان صاحب نہایت بارعب، جامہ زیب پچھلی صدی کے آدمی دکھلائی

دیتے تھے۔ قصیدے، کیری کچور * اور اسٹیچو (جسمہ) کے لیے یہ از بس لازم ہے کہ کم از کم ڈیوڑھے ہوں۔ لائف سائزنہ ہوں۔ خان صاحب اپنا اسٹیچو آپ تھے۔

واسکٹ کی جیب میں جو طلائی گھڑی رکھتے تھے اس کی زنجیر دو فٹ لمبی ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب کا فاصلہ استہابی تھا۔ جتنی دیر میں خان صاحب کی شلوار میں کمر بند ڈلتا، اتنی دیر میں آدمی حیدر آباد ہو کر آسکتا تھا۔ اعصاب اس حد تک مضبوط تھے کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تھے ہی نہیں۔ معمولی تکلیف اور ناراحتی کا ان کو احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دھوبی نے ان کی میلی شلوار کے نیچے میں سے پنسل کے ٹکڑے برآمد کیے۔ پر خور تھے۔ دورانِ طعام، کلام سے پرہیز کرتے اور پانی نہیں پیتے تھے کہ خواہ مخواہ جگہ گھیرتا ہے۔ دال کو ہندوانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے۔ کڑا ہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑا ہی گوشت کھائیں گے، بلکہ کڑا ہی بھر کے کھائیں گے۔ خیریت گزری کہ اس زمانے میں بالائی گوشت کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ یقیناً بالائی کو کڑا ہی پر ترجیح دیتے۔ تیتیر شیر کی ہڈیوں، انگور، مالٹے اور تربوز کے میج تھوکنے کو زانی نراکتوں میں شمار کرتے تھے۔ اپنے تن و توش اور پیٹ کڈائی (جسے ہیبت غذائی کہنا بہتر ہو گا) سے خود عاجز تھے۔ گھومنے پھرنے اور چہل قدمی کے شوقین، مگر اس شرط پر کہ ہر چالیس قدم کے بعد سستانے اور کچھ پیٹ میں ڈالنے کے لئے توقف فرمائیں گے تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں۔ یعنی اگلے چالیس قدم۔ مانا کہ خان صاحب میں اتنی پُھرتی اور چلت پھرت نہ تھی کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کر سکیں، لیکن ہنگامِ قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی نہ مانگتا۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دم گھٹ کے ڈھیر ہو جاتا۔ کراچی اُکاہی کے لئے تشریف لاتے تو کار تو سوں کی پیٹی نہیں باندھتے تھے۔ فرماتے تھے اس کے بغیر ہی کام چل جاتا ہے۔ سینے اور پیٹ پر پیٹی کے نشان سے ایک ڈایا گنل (اُریب لکیر) بن گئی تھی جو دھڑک دو مساوٰی مثلاًشوں میں آڑا تقسیم کرتی تھی۔ فرماتے تھے، جہاں کو ہستانی ہوائیں اور بندوق کی آواز نہ آئے وہاں مردوں کو نیند نہیں آتی۔

ان کی کٹی ہوئی انگشت شہادت کا قصہ یہ ہے کہ ان کا لڑکپن تھا۔ لڑکوں میں لیونیڈ کی

* caricature: ہم اس کا ترجمہ مسخاکہ کر س کے۔ یعنی مسخ خاکہ۔

گولی والی بوتل کو اٹھکی سے کھولنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ خان صاحب نے اس کی گولی پر انگشتِ شہادت رکھ کر دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت سے مٹکا مارا، جس سے فی الفور بوتل اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوتل کی گردن ان کی اٹھکی میں منگنی کی انگوٹھی کی طرح پھنس کر رہ گئی۔ ہتھوڑے سے توڑنی پڑی۔ اٹھکی سپینک ہو گئی۔ دو ہفتے بعد کٹوانی پڑی۔ کلوروفارم سو نگھنے کو وہ مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہذا بغیر کلوروفارم کے آپریشن کرایا۔ آپریشن سے پہلے کہا کہ میرے منہ پر کس کے ڈھاننا بندھ دو۔

اپنی دانست میں کوئی بہت ہی عالمانہ نکتہ بیان کرنا ہوتا تو بات میں وزن اور وقار پیدا کرنے کی غرض سے پہلے اپنی ٹھوڑی پر اس طرح ہاتھ پھیرتے گویا وہاں ٹیگور جیسی واڑھی ہے جو منتِ پندیر شانہ ہے۔ پھر نیم بریدہ انگشتِ شہادت سوئے فلک اٹھاتے اور پڑھنے کی عینک لگا کر جملہ شروع کرتے۔ لیکن کبھی اور کنبجک جملے کے ادھ بیچ میں کوئی شوخ بات یا چنچل فقرہ اچانک ذہن میں کومد جاتا تو اسے ادا کرنے سے پہلے آنکھ مارتے۔ اور آنکھ مارنے سے پہلے عینک اتار لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو صاف نظر آئے۔

ان کی ہنسی کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے زور سے ایک لمبا قبہ لگانا چاہتے ہیں، مگر بوجہ اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے منہ سے بڑی دیر تک ایسی آوازیں نکلتی رہتیں جیسے میٹری خلاص ہونے کے بعد کار کو بار بار اسٹارٹ کرنے سے ٹکلتی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے بالعموم اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیتے تھے کہتے تھے پردیس میں روز روز کس سے بٹن نکواؤں۔

شادی ایک ہی کی۔ یک گیر و محکم گیر کے قائل تھے۔ بیوی نے عاجز آکر کئی بار ان سے کہا کہ دوسری کر لو، تاکہ اوروں کو بھی تو چانس ملے۔

لنگڑے کا کروچ سے شیخ سعدی تک

آپ چاہیں تو خان صاحب کو آن پڑھ کہہ سکتے ہیں، مگر آن گھڑیا جاہل ہرگز نہیں۔ رچی بسی طبیعت، بلا کی سوجھ بوجھ اور نظر رکھتے تھے جو فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شائستہ حیات تھے کہ انہوں نے انسان اور زندگی کو ہر رنگ میں سہا اور برتا تھا۔ کتاب کے

مستحائنے * اور آرٹ کے آرائشی فریم میں نہیں دیکھا تھا۔ خود زندگی جو کچھ دکھاتی، سکھاتی اور پڑھاتی ہے وہ سیدھا دل پر رقم ہوتا ہے۔

نظیر سیکھے سے علم رسمی بشر کی ہوتی ہیں چار آنکھیں
پڑھے سے جس کے ہوں لاکھ آنکھیں وہ علم دل کی کتاب میں ہے

عرفی نے اپنے آپ کو ”آموزگار خود“ کہا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا تھا۔ خان صاحب مدرسہ حیات کے منتہیوں اور فارغین میں سے تھے۔

خان صاحب برسوں چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے۔ لیکن جس دن ان کا بینک میلنس ایک لاکھ ہو گیا، انہوں نے اردو میں دستخط کرنے سیکھ لئے۔ فرماتے تھے، انگوٹھا لگا لگا کر سود خور بینکوں سے اوور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی ہرج نہیں، پر حلال کی کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر بھائی چاہیے۔ دستخط کیا تھے، لگتا تھا کوئی لنگڑا اکا کروچ دوات میں غسل کر کے کانڈ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسی توڑامروڑی سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح گھٹتی بڑھتی کہ ایک ہی دستخط کے بعد ان کے ہاتھ اور دیکھنے والے کی آنکھ میں باؤٹا آ جاتا! اس زمانے میں خان صاحب کا اکاؤنٹ مسلم کمرشل بینک، چوک یادگار برانچ میں تھا، جہاں اردو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کانڈ پر یہ توہین آمیز indemnity (ضمانت) دینی پڑتی تھی کہ اگر ان کے اکاؤنٹ میں جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہو جائے تو بینک ذمہ دار نہ ہو گا۔ بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچے تو اسے بھی وہی بھریں گے۔ خان صاحب کو جب اس کا مطلب پشتو میں سمجھایا گیا تو مشتعل ہو گئے۔ اردو بولنے والے اکاؤنٹنٹ سے کہنے لگے کہ ایسی بیہودہ شرط مانتے والے کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ ہمارا دل بہت خفا ہے۔ بکتے جھکتے بینک کے انگریز مینجر مسٹر اے میکین (جو راقم الحروف کا پاس رہ چکا تھا) کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ کہنے لگے کہ میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟ آپ کے اسٹاف میں دو درجن آدمی تو ہوں گے۔ سب کے سب شکل سے چور، اُچکے اور نوسرناز لگتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی میرے دستخط بنا کر دکھا

دے تو فوراً ایک ہزار انعام دوں گا۔ پھر گولی سے اڑا دوں گا۔ مسٹر میکین نے کہا کہ میں بینک کے قوانین نہیں بدل سکتا۔ گرینڈ لین بینک میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہم نے سارے فارم اسی سے منقل کیے ہیں۔ منقل کیا، مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ بلکہ اس فارم پر تو پرنٹر کی لاپرواہی سے نام بھی گرینڈ لین بینک ہی کا چھپا ہے۔ خان! تم ورنائیو لڑکے بجائے انگریزی میں دستخط کرنے سیکھ لو تو اس جھمیلے سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اپنے حکم میں التجا کارنگ پیدا کرنے کی غرض سے اس نے خان صاحب کی چائے اور پیسٹری سے تواضع کی۔ بامنتال امر، خان صاحب دو مہینے تک انگریزی دستخطوں کی مشق کرتے رہے۔ جب بالکل رواں اور پختہ ہو گئے تو چق اٹھا کر سیدھے مسٹر میکین کے کمرے میں داخل ہوئے اور روبرو دستخط کر کے دکھائے۔ وہ اس طرح کہ پہلے ہاتھ اونچا کر کے چار پانچ دفعہ ہوا میں دستخط کیے اور پھر یکلخت قلم کاغذ پر رکھ کر فرمائے سے دستخط کر دیے۔ اس نے ٹرنٹ ایک سلپ پر اکاؤنٹنٹ کو حکم دیا کہ ان کی انڈمنٹی منسوخ تصور کی جائے۔ میں ان کے انگریزی دستخط کی جو انہوں نے میری موجودگی میں اس کارڈ پر کیے ہیں تصدیق کرتا ہوں۔

ہو اصرف اتنا تھا کہ خان صاحب نے ان دو مہینوں میں اپنے اردو دستخط کو دائیں سے بائیں کرنے کے بجائے بائیں سے دائیں کرنے کی مشق و مہارت بہم پہنچائی جس کے دوران نقطے اور مرکز غائب ہو گئے۔ مسٹر میکین کے سامنے انہوں نے یہی دستخط بائیں سے دائیں کئے اور تمام عمر اسی انگلیش روش پر قائم رہے۔ چیک اور کاروباری کاغذات پر اسی طرح دستخط کرتے۔ لیکن اگر کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھواتے یا کوئی حلف نامہ داخل کرتے جس میں سچ بولنا ضروری ہو تو آخر میں اردو میں دستخط کرتے۔ مطلب یہ کہ قلم دائیں سے بائیں چلتا۔ خان صاحب کو دستخط کرنے کے فن پر اب اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ اگر جاپانی میں دستخط کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ اسی لیٹے ہوئے کاکروچ کو مونچھیں پکڑ کے سر کے بل کھڑا کر دیتے۔

خان صاحب کو کبھی بے جلت اتمام حجت کرنا مقصود ہوتا، یا مخالف و مخاطب کو محض بوجھوں مارنا ہوتا تو فرماتے کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ۔۔۔ وہ اپنے تمام زہد و غیر زہد اقوال سے شیخ سعدی کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ سعدی اگر ان اقوال کو سن لیتے تو وہ خود بھی دست بردار ہو جاتے۔

بات کتنی ہی غیر متعلق اور چھوٹی سی ہو، خان صاحب اس کی پیچ میں بڑے سے بڑا

نقصان اٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ درگزر اور سمجھوتے کو انہوں نے ہمیشہ شیوہ مردانگی کے خلاف جاننا۔ اکثر فرماتے کہ جو شخص خون خرابہ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتا کر لے، اس کے لیے پشتوں میں بہت بُرا لفظ ہے۔ اس خرخشے کے بعد بشارت کو ایک مرتبہ بنوں میں ان کے آبائی مکان میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ خان صاحب کسی گھمسان کے بحث مباحثے میں جیت جاتے یا کسی خوشگوار واقعہ پر بہت خوش ہوتے تو فوراً باہر جا کر گھوڑے پر چڑھ جاتے اور اپنے کسی دشمن کے گھر کا چکر لگا کر واپس آ جاتے۔ پھر ملازم سے اپنے سر پر ایک آفتابہ ٹھنڈے پانی کا ڈلو اتے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔

۹

خان صاحب نے اپنے حال پر مگر مجھ کے آنسو بہائے

خان صاحب دن میں دو تین مرتبہ بشارت کو یہ دھکی ضرور دیتے کہ ”ایک پائی بھی نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ مجھے ایک سال تمہارے ہاں مہمان رہنا پڑے۔“ و تفتاً و تفتاً یہ بھی کان میں ڈالتے رہتے کہ قبائلی آدابِ میزبانی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر آپ عزیز مہمان سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ تم کب جاؤ گے اور اس پر وہ آپ کا خون نہ کر دے تو اسکی شرافت، پختو * اور ولدیت میں شبہ ہو گا۔

صبح سے شام تک دونوں بارہ سنگھے اپنے سینک پھنسا ئے پھنکا رہے مارتے رہتے۔ خوش معاملگی کا واسطہ، بیوپاریوں کی ریت رسم، رحم کی ابیل اور ایک دوسرے کو ظلم اور دھاندلی سے باز رہنے کی وارنٹک کے علاوہ کوئی اوچھا ہتھیار نہ تھا جو اس جھگڑے میں بے دریغ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً خان صاحب اپنے بے پڑھے لکھے ہونے کا واسطہ دیتے۔ جواب میں بشارت خود کو دیدہٴ عبرت محاذ سے دکھواتے کہ شاعر ہوں۔ بی اسے ہوں۔ فارسی پڑھی ہے۔ اور لکڑی بیچ رہا ہوں! خان صاحب اپنی بزنس میں گھٹاٹے کا ذکر کرتے تو بشارت کہتے، ارے صاحب! یہاں تو سرے سے بزنس ہٹی نہیں۔ گرہ کا کھار ہے ہیں۔ بشارت تو خیر بیوہ میم کے ساتھ اپنی فرضی مسکینی، کثیرالاولادی اور مفلوک الحالی کا ریہرسل کر چکے تھے، لیکن خان صاحب بھی بوقت

ضرورت اپنے حال پر مگر مجھ کے آنسو بہا سکتے تھے۔ ایک دن تو ان کی ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ سیدھی آنکھ سے ایک سچ سچ کا آنسو سری لنکا کے نقشے کی طرح لٹک رہا تھا۔ سائز بھی وہی۔ ایک دفعہ خان صاحب نے اپنی فرضی مظلومیت کا ٹرپ پھینکا کہ میرے حصے کی زمینوں پر بچانے نصف صدی سے قبضہ کر رکھا ہے۔ بشارت نے اس کو اس طرح کاٹا کہ اپنے پیٹ کے السر پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہا کہ وہ اتنی ہی مدت سے ضعفِ معدہ میں مبتلا ہیں۔ غذا انہیں ہچکتی۔ پیٹ میں دوا اور ہوا تک نہیں ٹھہرتی۔ خان صاحب بولے، اوہو ہو! پچاس سال سے پیٹ خراب ہے۔ آپ تو پوتڑوں کے مریض تھے! ویسے ان چونچوں میں بالعموم بشارت ہی کا پلہ بھاری رہتا۔ لیکن ایک دن جب خان صاحب نے نیم آبدیدہ (+) ہو کر کہا کہ میرے توالد بھی فوت ہو چکے ہیں تو بشارت کو اپنے بزرگوار پر بہت غصہ آیا کہ انہیں بھی اسی وقت جینا تھا۔

لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید صرف سچائی ہوتی ہے۔

خان صاحب کسی طرح رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بشارت نے عاجز آ کر یہاں تک کہا کہ کون صحیح ہے، کون غلط، اس کو بھول جائیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا ہمارا بیویو پارائیوہار آئندہ بھی رہے گا۔ پھر کبھی کسر محال لیجیے گا۔ خدا نخواستہ یہ آخری سودا تو ہے نہیں۔ اس پر خان صاحب بولے کہ خان سنگ مرجان خان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دوست سے ملو تو اس طرح ملو جیسے آخری ملاقات ہے۔ اب کے بچھڑے پھر نہیں ملیں گے۔ اور کسی سے سودا کرو تو یہ سمجھ کے کرو کہ آخری سودا ہے۔ دوبارہ یہ ”دَلا“ نہیں آنے کا! شیخ سعدی کہتے ہیں کہ باؤلے سے باؤلہ لکتا بھی یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ جسے اس نے کاٹا ہے وہ خود کو پھر کٹوانے کے لئے دوبارہ سد بارہ آئے گا۔

ایک دفعہ بشارت کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا اور انہوں نے بار بار ”خان صاحب! خان صاحب!“ کہہ کر لعن طعن کی تو کہنے لگے، دیکھو صیب! کمالی گفتار کرنی ہے تو مجھے خان صاحب مت کہو۔ حاجی صاحب کہہ کے کمالی دو، تاکہ مجھے اور تمہیں دونوں کو کچھ غیرت تو آئے۔

بشارت نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیشانی چوم لی۔

(+) نیم آبدیدہ اس لئے کہ ان کی دوسری آنکھ مسکرا رہی تھی۔

کباب پر اسٹھے اور وسیع حلقہ دشمنی

خان صاحب مخلص، مجلسی اور محبتی آدمی تھے۔ بحث میں کتنی ہی گرما گرمی ہو جائے، دل میں ذرا میل نہیں رکھتے تھے۔ مذاق مذاق میں دوستوں کو چھیڑنے اور طیش دلانے میں انہیں بڑا مزہ آتا۔ ناشتے میں تین ترتراتے پر اسٹھے اور شامی کباب کھانے اور لسی کے دو گلاس پینے کے بعد دن بھر غنودگی کے عالم میں نیم باز آنکھوں سے دنیا اور اہل دنیا کو دیکھتے رہتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آنکھوں کو محض چشم پوشی کے لیے استعمال کرتے اور کٹ تختی کا جواب جاہی اور ڈکار سے دیتے۔ ایسے غشی آور ناشتے کے بعد آدمی مراقبہ کر سکتا ہے۔ اسٹریکٹ پیمنٹنگ کر سکتا ہے۔ اسٹریم آف کائناتس نیس والا ناول لکھ سکتا ہے۔ حکومت کا پنچ سالہ منصوبہ بنا سکتا ہے۔ لیکن دماغی کام نہیں کر سکتا۔ نہ ڈھنگ سے بحثا بحثی کر سکتا ہے۔ خان صاحب کو دوسرے دن یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ کل کیا کہا تھا۔ لہذا از سر نو جت کا آغاز کرتے۔ گویا اس سے پہلے اس مسئلہ پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔ تاثیر کے دل آویز مصرع میں ”الفت“ کے بجائے جت جڑ دیں تو ان کے طریقہ واردات پر صادق آتا ہے:

وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے ”جت“ تئے سرے سے

کسی سے زیادہ دیر خفا یا کبیدہ خاطر نہیں رہ سکتے تھے۔ شاعری سے متنفر کے باوجود اکثر یہ بیت پڑھتے، مگر بعض لفظوں کو اتنا کھینچ یا سکیز کر پڑھتے کہ مصرع وزن اور بحر سے خارج ہو کر نثر بن جاتا:

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا

جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

اور اس پر یہ اضافہ فرماتے کہ مسلمان سے کینہ رکھنا اس پر ظلم ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ بھی فخریہ فرماتے کہ ہم تو آزاد قبائلی آدمی ہیں۔ اردو تو ہم نے ڈوبی ہوئی ”رقوما توں“ کی وصولی کے لئے، کراچی کے بیوپاریوں سے لڑائی دنگے کے دوران سیکھ لی ہے۔ چنانچہ ان کی ساری Vocabulary (لفظیات) حالت امن میں بالکل نکلتی اور ناکارہ ہو جاتی تھی۔ راناسا نکا کے جسم کی طرح ان کی لڑاکا اردو پر بھی ۲۷ زخموں کے نشان تھے۔ ان کی اردو کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا تھا کہ کہاں کہاں کے اور کس کس صوبے کے آدمی نے ان کی رقم دہائی ہے اور

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

ان کی زبان سے گجراتی، حیدر آبادی اور دہلی کی کر خنداری زبان کے ٹھیکٹے الفاظ سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے حلقہٴ تکرار و تضادم کے ڈانڈے کہاں کہاں ملتے ہیں۔

لوک لہجہ

خان صاحب کے رابطے اور چھپٹے کی زبان پر تو خیر نادر ہندوؤں کی چھاپ تھی، لیکن بولتے اپنے ہی کھرے، کھنکتے پشتون لہجے میں تھے جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بشارت کو اپنا لہجہ بالکل سپاٹ اور بے ٹک لگا۔ پشتون اردو لہجے میں ایک تنک ایجاز اور تند و تازہ مہکار ہے جو کسی محکم اور ذومعنی بات کی روادار نہیں۔ یہ کوندنا، لکارتا لہجہ مشکوک سرگوشیوں کا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پنجابی اردو لہجے میں ایک کشادگی، گرم جوشی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں میدانی دریاؤں کا پاٹ اور دھیرج اور دل دریا پار لگک ہے۔ اور سچ سچ راستہ بنانے کے لیے اپنی لہری کنگر کاٹ پر پورا اعتماد۔ بلوچ لہجے میں ایک ہوک سی، ایک ہمتی پہاڑی گونج اور دل آویز خشمگیں کیفیت کے علاوہ ایک چوکنا پن بھی ہے جو سنگلاخ کوہ اور دشت بے آب اپنے آزادوں کو بخش دیتے ہیں۔ سندھی اردو لہجہ لہکتا، لہراتا لیریکل (lyrical) لہجہ ہے۔ ایک لٹک، ایک مہران موج جو اپنے آپ کو چوم چوم کر آگے بڑھتی ہے۔ اردو کے علاقائی لہجوں میں وہ لوک ٹٹھاٹ، مٹھاس اور رس جس ہے جس کا ہمارے کھسے پٹے نکسالی اور شہری لہجے میں دور دور شائبہ نہیں ملتا۔ لوک لہجے کی آمیزش سے جو نیا اردو لہجہ ابجرا ہے اس میں بڑی توانا تازگی، لوچ اور سٹائی ہے۔

بحرے ہیں یہاں چار سمتوں سے دریا

شہر آشوب اور نیاز مند ان بنوں

بحث و تکرار کے انٹروال میں خان صاحب پیدل سیر کو مکمل جاتے۔ کوہاٹ اور بنوں کے دس پندرہ نیاز مند جو سارے دن واسکٹوں میں پستول رکھے، باہر انتظار میں بیٹھے ہوتے، ان کی اردلی میں چلتے۔ یہ خان صاحب کے حواری اور مصاحب تو تھے ہی، کمانڈوز بھی تھے جو ان کی کٹی ہوئی اٹھکی کے نصف اشارے پر اپنی کمر سے بارود باندھ کر آتش نرود میں بے خطر کود پڑنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ خان صاحب نے ان کے لیٹنے بیٹھنے اور تواضع کے لئے باہر تین چار پائیاں اور

ایک کابلی سوار رکھوا دیا تھا۔ اس میں دن بھر چائے اونٹنی رہتی، جس کے اخراج کے لیے بشارت کوٹین کی نالی دار چادروں کا ایک عارضی کاکوس (ٹائلٹ) بنوانا پڑا۔ اس میں وہ استعمال شدہ بلاٹنگ پیپر رکھوا دیتے تھے۔ لوگوں نے کراچی کی کچی روشنائی کی شکایت کی تو انہوں نے گزشتہ دن کا ایک اخبار رکھوانا شروع کر دیا جو ہر حکومتِ وقت کا طرہ دار رہا تھا۔ اب یہ ٹائلٹ پیپر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس میں کم از کم اخبار کے ساتھ زیادتی نہیں تھی۔ دن بھر گکیں، چھلیں اور وزن اٹھانے کے مقابلے ہوتے رہتے۔ جوان اپنے روزگار کھیل کون مہنگائی، سینما، کھانے پینے اور نشانہ بازی کی باتیں کرتے، جب کہ ادھیڑ عمر والے زیادہ چینی کی چائے اور فحش لطیفوں سے خود کو ری چارج کرتے رہتے۔ دونوں کی گرمی سے گھڑی بھر کے لئے کلابی بڑھاپے کی ٹھہر دور ہو جاتی تو ٹھکر * سر پہ چڑھ کے ایسی دوانی باتیں کرنے لگتی کہ جوان سن کے شرما جاتے۔ جس کی مونچھ میں جتنے زیادہ سفید بال ہوتے، یا کمر جتنی زیادہ خمیدہ ہوتی، اس کا لطیفہ اتنا ہی دُور مارا اور سہ آتشہ ہوتا۔ اس پر مرزا نے ایک دفعہ پھبتی کھی

کماں چنداں کہ خم گردن خند گش تیز تر گردد (+)

خان صاحب کو کبھی کوئی زیادہ ہی لذیذ حکایت سنائی ہوتی تو کلمے میں گڑیا مصری کی ڈلی دبا کر سی سی کرتے ہوئے چائے پیتے جاتے۔ جھومتے ہوئے فرماتے، یارا جی! سمرقند اور فرغانہ میں اسی طرح پی جاتی ہے!

فرصت کا تمام وقت خان صاحب کراچی اور کراچی والوں کو دیکھنے اور جو کچھ دیکھتے اس پر لاحول پڑھنے اور پڑھوانے میں گزارتے۔ فرماتے تھے ”کراچی میں سانس لینے کے لیے بھی ذاتی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ قبائلی علاقے کی ہوا ہلکی اور شفاف ہوتی ہے۔ خود بخود گولی کی طرح اندر داخل ہو جاتی ہے، خصوصاً جاڑے میں۔ صبح کراچی ریڈیو کہہ رہا تھا کہ ہوا میں رطوبت کا تناسب ۹۰ فی صد ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کراچی کے دودھ والے ہوا میں صرف دس فی صد دودھ ملا کر دودھ بنا لیتے ہیں۔ آپ جن موقعوں پر نعرے، شعر اور وٹیفے کا ورد کرنے لگتے ہیں وہاں ہم ٹھائیں سے گولی مار دیتے ہیں۔ میں اتنے دن سے یہاں ہوں۔ شہر میں ایک آدمی کے ہاتھ میں

* ٹھکر: (پنجابی) معذور ہوس کی ”آنکھوں میں تو دم ہے“ والی منزل۔ ہو کا۔ ہرک اٹھنا۔

(+) کمان جتنی زیادہ خمیدہ ہوگی، اس کا تیرا تہا ہی زیادہ تیز جائے گا۔

بندوق نہیں دیکھی۔ ہمارے یہاں تو نکاح کے وقت بھی پستول ساتھ رکھتے ہیں کہ پتا نہیں مہر پر گولی کی نوبت آجائے۔ بعضی دہن کا والد اور رشتے دار ایک دم خبیث، خسیس اور دیوث نکلتا ہے۔ میں تو احتیاطاً چھوٹی مشین گن لے گیا تھا۔ اس سے میرے ماموں نے ۱۹۳۷ء میں خیوسرہ کے نزدیک کاٹوری خیل علاقے میں ایک پہاڑی کھوہ کی کمیں مکاہ سے تین گورے مار گرائے تھے، جن میں ایک کپتان تھا۔ اس کی صورت بل ڈاک جیسی تھی۔ اس خنزیر کے بچے نے فقیر اپپی کے بے شمار مرید شہید کیے تھے۔ ماموں نے اس کے کان اور ناک کاٹ کر چیل کوڑوں کو کھلا دی۔ دوسرے گورے کی جیب سے جو معمولی سپاہی تھا اس کی خمیدہ کمر ضعیف ماں اور ایک سال کی بڑی پیاری سی بچی کے فوٹو نکلے۔ بچی کے ہاتھ میں گڑیا تھی۔ فوٹو دیکھ کر میرا ماموں بہت رویا۔ لاش کے ہاتھ پر سے جو سونے کی گھڑی اس نے اتار لی تھی، وہ واپس باندھ دی۔ میت کو سائے میں کر کے واپس جا رہا تھا کہ چند قدم بعد کچھ خیال آیا۔ وہ پلٹا اور اپنی چادر اتار کے اس پر ڈال دی۔

”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ماموں کی مشین گن سے مسلح ہو کر گیا تھا۔ سوائے بچوں، قاضی اور نائی کے اور کوئی نہ تھا نہیں تھا۔ عین نکاح کے وقت لڑکی والے پسر گئے۔ کہنے لگے مہر ایک لاکھ کا ہو گا۔ اس پر ماموں جھگڑا کرنے لگا۔ وہ شرعی مہر یعنی پونے تین روپے بھر چاندی پر مصر تھا، جس کے تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے سکد رائج الوقت بنتے تھے۔ قبیلے کے ایک دانا بزرگ نے تجویز پیش کی کہ کچھ لڑکی والے کم کریں، کچھ لڑکے والے مہر بڑھائیں۔ دونوں فریق درمیانی اوسط رقم پہ سمجھوتا کر لیں۔ اس پر ایک دوسرا دانا بولا، سردار! ہوش کرو۔ تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے اور ایک لاکھ کے درمیان کوئی اوسط رقم نہیں ہوتی۔ ایسے میں اوسط تلوار سے نکلتا ہے۔

”راڑرولا بڑھا تو میں نے سہرا ہٹا کر باواز بلند کہا میں تو پانچ لاکھ کا مہر باندھوں گا۔ اس سے کم میں میرے خاندان کی توہین ہوگی۔ یہ سن کر ماموں سنائے میں آگیا۔ میرے کان میں کہنے لگا کیا تو آج پوست پی کے آیا ہے؟ پانچ لاکھ میں تو کلکتے کی گوہر جان اور ایک سو ایک رنڈیوں کا ناچ ہو سکتا ہے، میں نے کہا ماموں! تو بیچ میں مت بول۔ تو نے زندگی میں بائیں آنکھ میچ کر دائیں آنکھ سے رائفل کی شست باندھ کر فقط اپنے دشمن کو دیکھا ہے۔ یا پھر کلدار روپوں پر کوئن وکٹوریہ کا چہرہ دیکھا ہے۔ تو نے دنیا نہیں دیکھی۔ نہ تجھے مردوں کی پختو کا کچھ خیال ہے۔ اگر مجھے ناہنہ نہی ہونا ہے تو بڑی رقم ماروں گا۔ چھوٹی رقم مارنا ذیلوں اور دیوثوں کا

”مجھے آئے اتنے دن ہو گئے، کراچی میں ایک بھی دھکا فساد نہیں ہوا۔ * کیا یہاں رشتے دار نہیں رہتے؟ کیا یہاں سب ایک دوسرے کو یتیم، لا وارث سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں؟ پرسوں کا واقعہ ہے۔ میں ایک دوست سے ملنے لائنڈھی گیا تھا۔ بس کنڈکٹر نے میری ریزکاری نہیں لوٹائی۔ میں نے اترتے وقت کالی دی تو سنی اُن سنی کر گیا۔ میں نے دل میں کہا بُدبختا! میں نے کالی دی ہے۔ نصیحت تو نہیں کی جو یوں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی۔“

اس لطیفے کے بعد بڑی دیر تک ان کے حلق سے کمزور پیڑی والی کار کو بار بار اشارت کرنے کی آوازیں نکلتی رہیں اور جسم جیلی کی طرح تھل تھلاتا رہا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خان صاحب کو کراچی قطعاً پسند نہیں آیا۔ فرماتے تھے، کراچی میں اگر کراچی والے نہ ہوں اور سمندر ڈیڑھ دو سو میل پر سے ہٹ جائے تو ٹرک اور گھوڑے دوڑانے کے لئے شہر بُرا نہیں۔ کراچی کے کچھ حصے انہیں بے حد پسند آئے۔ یہ کچی بستیوں کے وہ علاقے تھے جو تحصیل کوہاٹ سے مشابہت رکھتے تھے جہاں ایک زمانے میں ان کی جوانی نے، بقول ان کے، پوری تحصیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

یار زندہ فضیحت باقی

بشارت اور خان صاحب کے مابین حجت و تکرار صرف دفتری اوقات میں یعنی نو سے پانچ بجے تک ہوتی، جو ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر کل تک کے لیے ملتوی ہو جاتی، تاکہ تازہ دم ہو کر جھگڑ سکیں۔

صلح ہے اک مہلت سلمان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفتنگ

* یہ بات پرانی ہوئی۔ افسوس! کراچی کو اپنی ہی منظر لگ گئی۔

سنا ہے اگلے وقتوں میں پڑوسنیں اسی طرح لڑتی تھیں۔ لڑتے لڑتے کلا میٹھ جاتا اور شام پڑتے ہی وہ مرد گھر لوٹنے لگتے جو دن بھر معرض دشنام میں آیا کیے تو دونوں مکانوں کی سرحد یعنی مشترکہ دیوار پر ایک ہانڈی الٹی کر کے رکھ دی جاتی تھی، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندھیرے کے سبب عارضی دشنام بندی ہو گئی ہے۔ کل پھر ہوگی۔ بات یہ ہے کہ جب تک فریق کا چہرہ منظر نہ آئے، کالی میں third dimension (تیسری جہت) پیدا نہیں ہوتی۔ جس دکان میں ہم وقت جھگڑے اور دھکل کا سماں ہو اور باہر ایک فریق کے دس پندرہ مسٹنڈے حمایتی سماوار کے گرد پھاڑاؤ ڈالے ہوں، اس کے ماکہک بدکیں نہیں تو اور کیا کہیں۔ بقول ہمارے استاد اول، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے، جن کی ”ریڈر“ سے ہم نے دفاع اور آداب فرار کا پہلا سبق سیکھا:

جب کہ دو موزیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

کوئی ماکہک مارے باندھے ٹھیر بھی جاتا تو خان صاحب اس کے سامنے اپنی ڈوبی ہوئی رقم کو اس طرح یاد کرتے کہ وہ حسب توفیق خوف زدہ یا آبدیدہ ہو کر بھاگ جاتا۔

بشائستگی کا اثر خان صاحب کی تندرستی پر نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔ ان کی زبان اور اشتہار روز بروز کھلتی جا رہی تھی۔ وہ کسی طور لکڑی کی قیمت کم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہ انہیں گھر میں اتنے ہی کی پڑی تھی۔ اُدھر اشارت بار بار کہتے کہ ”اول، لکڑی داغی اور گٹھل تھی۔ اس پر تیز سے تیز آری کھٹل ہو ہو گئی۔ دوم، سیزن بھی نہیں ہوئی تھی۔ کئی تختوں میں بل اگیا تھا۔ کوئی بے داغ نہیں نکلا۔ سوم چھیبت * بہت ہوئی۔ چہارم، جگہ جگہ کیڑا لگا ہوا تھا۔“

خان صاحب نے لقمہ دیا، ”پنجم، یہ لکڑی چوری ہو گئی۔ یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ ششم یہ کہ ہم نے آپ کو لکڑی دی تھی۔ لڑکی تو نہیں دی کہ آپ اس کے چیز میں ہزار کیڑے نکالنے بیٹھ جائیں۔ آپ تو پان کھا کھا کے بالکل زنانیوں کی طرح لڑنے لگتے ہیں۔“

بشارت نے ”زمانوں“ سنا اور سمجھا۔ تڑ سے جواب دیا ”آپ بھی تو کاہلی والا سے کم نہیں“

”یہ کیا ہوتا ہے صیب؟“

* چھیبت: کاٹ چھانٹ یا لاوے اور اتارنے سے مال میں کمی واقع ہونا۔

بشارت نے کاہلی والا کا مطلب بتایا تو وہ غضب ناک ہو گئے۔ کہنے لگے ”ہمارے قبیلے میں آج تک کسی نے سود لیا نہ سود دیا۔ خنزیر برابر سمجھتے ہیں۔ جب کہ آپ علانیہ سود دیتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں۔ آپ کے گھر کا تو شور با بھی حرام ہے۔ اس میں آدھا پانی، آدھی مرچیں اور آدھا سود ہوتا ہے! اگر آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا تو ٹھیک نہ ہو گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے عالم غیظ میں میز پر اتنے زور سے مکا مارا کہ اس پر رکھے ہوئے کپ، چمچے، پن اور تلے ہوئے مٹر ہوا میں ایک ایک بالشت اونچے اُچھلے۔ اور میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ پھر انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا، ٹرکش کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد نال کار خ پھیر کر اپنی طرف کر لیا۔

بشارت سہم گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کو جو نہ صرف کمان سے نکل چکا تھا، بلکہ مہمان عزیز کے سینے میں ترازو ہو چکا تھا، اب کیسے واپس لائیں۔ خان صاحب نے اسی وقت اپنے ایک کمانڈو کو حکم دیا کہ فوراً جا کر پشاور کا ٹکٹ لاؤ۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ بشارت منت سماجت کرتے رہے۔ خان صاحب بار بار پتھر کر دفتر سے باہر جاتے مگر اس انداز سے کہ ہر قدم پر

مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

بشارت نے چار بجے ان کے پیر پکڑ لئے تو وہ گھر چلنے کے لیے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ پہلے اپنے ہاتھ سے مجھے پان کھلاؤ!

لیکن اس کے بعد خان صاحب کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی۔

بشارت تو خیر اپنے کہے پر نادم تھے ہی، بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق اپنے ہی عرق میں غرق ہوئے جا رہے تھے، لیکن خان صاحب بھی اپنے شدید ردِ عمل پر کچھ کم خجل نہ تھے۔ طرح طرح سے تلافی اور اشک شوئی کی کوشش کرتے۔ مثلاً بشارت کبھی اداس یا مضحک نظر آتے یا گھمسان کی بحث میں اپنا ایک ایسے بزدلانہ طریقے سے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے کہ خان صاحب ڈان کیونٹ کی طرح اکیلے ہوا میں تلوار چلاتے رہ جاتے، تو ایسے موقع پر وہ ایک عجیب ادائے دلنوازی سے کہتے ”حضور والا! کاہلی والا بعد ادائے آداب کے عرض کرتا ہے کہ پان کی طلب ہو رہی ہے۔ پان کھلائیے۔“ انہوں نے اس سے پہلے پان کبھی چکھا بھی نہیں تھا۔ بشارت ندامت سے زمین میں گر جاتے۔ کبھی قدرے کھسیانے، کبھی mock-serious انداز (استہزائیہ سنجیدگی)

سے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی گھٹنے چھوتے۔ اور کبھی یوں بھی میں ہوتا کہ خان صاحب ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لکھا لیتے۔

۱۰

پلنگ زیب خان

شام کو وہ کھلے صحن میں پلنگ بچھوا کر اس پر مچھر دانی لگواتے۔ کچھ دنوں سے کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ بشارت سے کہتے تھے کہ تم نے مہمان کی شلوار کے لیے کرسیوں کی کیلوں کو تیکا کر رکھا ہے۔ اپنے پلنگ سے موڈ فاصلے پر ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لئے چار چار پائیاں مع مچھر دانی بچھواتے۔ فرماتے تھے کہ اگر فرنیٹر کے پچھوؤں کے پر لگ جائیں تو کراچی کے مچھر بن جائیں گے۔ ساری گفتگو اور بحث مباحثے مچھر دانیوں کے اندر بیٹھے بیٹھے ہوتے۔ البتہ کسی کو دورانِ تقیر جوش آجاتا تو وہ مچھر دانی اس طرح ہٹاتا جیسے دوہا نکاح کے بعد سہرا الٹ دیتا ہے۔ کراچی کی دُور دراز بستیوں سے ان کے پٹھان دوست، گرائیں اور معتقدین جوق در جوق ملنے آتے۔ ان کی خاطر تواضع اس طرح کرتے گویا یہ سب کچھ اپنے ہی حجرے میں ہو رہا ہے۔ رات گئے تک تام چین کی نیلی چیچک زدہ چینکیں اور حقے گردش میں رہتے۔ چائے کے رسیا، اونٹنی چُورا چائے میں مردان کے گڑ کے علاوہ خشخاش کا بُورا بھی ڈلواتے۔ جو بھی آتا خان صاحب کے لیے کچھ نہ کچھ نذر ضرور لاتا۔ اخروٹ، چلغوزے، پشاور کے کالے مکاب جامن، شہد کے چھتے، تلگانگ اور ڈیرہ اسماعیل خان کا سفید تمباکو، قراقلی اور جوان اسیل * مرغ جنہیں خان صاحب بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ دن بھر گھر میں درجنوں اسیل مرغ چُھٹے پھرتے۔ سُرخ سیمنٹ کے فرش پر سبز پیٹ اور بھی کھلتی تھی۔ (کھلتی کوزیر کے ساتھ پڑھیں تب بھی مزہ دے گی) جو مرغ

* اسیل مرغ: سرفی ماٹل کہرے براؤن رنگ کا مرغ۔ بہت لڑاکا اور خونخوار ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بہت مقوی سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالمعلیم شرر لکھتے ہیں کہ ”دنیا میں اسیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں ہے۔ مرغ کی سی بہادری درحقیقت شیر میں بھی نہیں۔ وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے منہ نہیں موڑتا۔“ ان کی تحقیق کے مطابق اس کی نسل عرب سے ہندوستان اسپورٹ کی گئی جب کہ ”شیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔“ معلوم ہوتا ہے شیر بازی سے متعلق مولانا نے کوئی ضعیف روایت نقل کر دی۔ ہم نے تو آج تک اہل پنجاب کو شیروں کو ایک دوسرے سے لڑوا کر بے رحمی سے زخمی یا ہلاک کرواتے نہیں دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے حلال کر کے کھاتے ہیں۔

بے وقت یا زیادہ زور سے اذان دیتا، اسے خان صاحب سب سے پہلے ذبح کرتے۔ صبح جب سب مرغ باجماعت اذان دیتے تو سارے محلے کو کلفی پہ اٹھالیتے۔ ایک دن ایک مہمند نوجوان غلطی سے مرغی دے گیا۔ اس دن مرغ آپس میں بڑی خونخواری سے لڑے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مرغ کسی واضح اور معقول مقصد کی خاطر لڑے، ورنہ روزانہ بے مقصد اور بلاوجہ ایک دوسرے بلکہ تیسرے پر بھی جھپٹتے اور کٹتے مرتے رہتے۔ کوئی انہیں لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ جب وہ آپس میں نہیں لڑتے تھے تو گھر والوں کو کاٹنے لگتے۔ اکلوتی مرغی پر لڑ لڑ کر وہ ایسے لہو لہان ہوئے کہ صبح اذان دینے کے لائق بھی نہ رہے۔ ڈربے میں چپکے پڑے ملائی اذان سنائے۔

خان صاحب اتوار کو سارے دن پلنگ پر نیم دراز ہو کر قبائلی متنازعوں اور بنوں اور کوہاٹ کی زمینوں کے فیصلے کرتے۔ اب وہ اورنگ زیب خاں کے بجائے پلنگ زیب خاں زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ رات کو البتہ فرش پر سوتے۔ فرماتے تھے کہ اس سے تکبر اور کمر کا دُور ہوتا ہے۔ ہمارے فریئر میں جاڑے میں شوقین لوگ پیال (باریک خشک گھاس) پر سوتے ہیں۔ پیال سے رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔

اس دن یعنی اتوار کو لنچ کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے۔ اگر کھانا بد مزہ ہو یا مچیں زیادہ ہوں تو موڈ بگڑ جاتا۔ نماز قضا کر دیتے۔ فرماتے کہ دل کا حال جانتے والے کے سامنے مجھ سے توجھوٹ نہیں بولا جاتا۔ کس دل سے بارہ مرتبہ الحمد للہ کہوں؟ کمرے میں محفل تکرار و غیبت بدستور گرم رہتی اور وہ تنہا ایک کونے میں جا نماز پچھا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ مگر کان اسی طرف لگے رہتے۔ دوران نماز کوئی شخص آپس میں ایسی بات کہہ دیتا جو خان صاحب کے مزاج یا موقف کے خلاف ہوتی تو فوراً ————— عین سجدے کی حالت میں ہوں تب بھی ————— نیت توڑ کر اسے پشتو میں مٹائی دیتے اور پھر سے نیت باندھ کر اور اسی طرف کان لٹا کر نماز پڑھنے لگتے۔

نماز کے بعد کُرتا اتار کر اجلاس فرماتے۔ بیشتر بنیانوں میں بڑے بڑے چھید ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے، کیا کروں، میرے سائز کا بنیان صرف روس سے اسمگل ہو کے آتا ہے۔ کبھی کبھار لنڈی کوتل میں مل جاتا ہے۔ تو عیش آجاتے ہیں۔ کوئی کوئی بنیان تو استخوانی صورت ہوتا ہے کہ کُرتے کے اوپر پہننے کو جی چاہتا ہے۔ خان صاحب گہرا سانس لیتے یا ہنسی کا دورہ پڑتا تو چوٹی برابر سوراخ پھیل کر پنگ پانگ کی گیند کے برابر ہو جاتے۔ ان پھیلتی سُکرتی جھانکیوں میں

سے فرہ بدن کھٹتے بڑھتے پھوڑوں کی طرح اُبلتا تھا۔ کیسی بھی گرمی ہو، کرتا اتارنے کے بعد بھی کلاہ نہیں اتارتے تھے۔ فرماتے تھے، جب تک کلاہ سر پر ہے بندہ خود کو تیکا اور بے جیا محسوس نہیں کرتا۔ انگریز اسی لیے تو عورتوں کو دیکھتے ہی ہیٹ اتار دیتے ہیں!

ایک رات حاضر باشوں کی چارپائی اوور لوڈنگ کے سبب دس بارہ سواریوں سمیت زمیں بوس ہو گئی۔ پانچ چھ منٹ تک خوانین پچھردانی اور بانوں کے جال سے خود کو آزاد نہ کر سکے۔ اس کے اندر ہی مچھلیوں کی طرح ایک دوسرے پر اُچھلتے پھدکتے کُبلاتے رہے۔ چارپائی کا ایک پایہ اور پٹی اور ایک کوبائی خان کی کلائی ٹوٹ گئی۔ جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ کلائی ٹوٹ گئی ہے اس کو بائی خان نے شکر ادا کیا کہ خدا نے بڑی خیر کی، گھڑی بچ گئی۔ دوسرے دن اورنگ زیب خان نے اپنے کمرے میں چاندنی پنچوادی اور اپنے بستر کو گول کر کے کاؤتیکہ بنالیا۔ یہ چاندنی ان مشاعروں کے لیے مخصوص تھی جو بشارت کے ہاں اتوار کے اتوار بڑی پابندی سے ہوتے تھے۔ خان صاحب بھی دو مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شعر میں ذرا بھی ایچ ہیچ ہوتا تو پاس بیٹھنے والے سے دریافت فرماتے کہ یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ وہ سرگوشیوں میں مطلب بیان کر دیتا تو باواز بلند فرماتے، لاجول ولا قوۃ!

پہٹی چاندنی اور اضافت خور

دوسرے مشاعرے کے بعد خان صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا، کیا یہاں ہر دفعہ یہی ہوتا ہے؟ جواب ملا، اور کیا! بولے، خدا کی قسم! اس چاندنی پر اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس پر نماز جائز نہیں! ایسے جھوٹے شاعروں کی میت کو تو حقے کے پانی سے غسل دینا چاہئے تاکہ قبر میں کم از کم تین دن تک تو منکر نکیر نہ آئیں۔ چاندنی پر جہاں جہاں شعرا نے کرام نے سگرٹ بجھائے تھے وہاں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے تھے، جنہیں بعد میں فکرِ شعر اور داؤ سخن کے دوران اٹھکی ڈال ڈال کر بڑا کیا گیا تھا۔ چاندنی کئی جگہ سے پھٹ بھی گئی تھی۔ خان صاحب نے اس پر نماز کا مسئلہ چھیڑا تو مرزا نے ایک اور ہی فتویٰ دیا۔ کہنے لگے، دریدہ دامنِ یوسف پر تو صرف زلیخا ہی نماز پڑھ سکتی ہے! اس پر خان صاحب بولے کہ زلیخا کے خاوند کے لیے پشتوں میں بہت بُرا لفظ ہے۔ خان صاحب کے لئے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع ایک عجب سے کم نہ تھا۔ کہنے لگے، اگر قبائلی علاقے میں کسی شخص کے گھر کے سامنے ایسا مجمع لگے تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس کے چال چلن پہ جرم کہ بیٹھا ہے۔ یا اس کا والد فوت ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی شعر پسند آجائے، گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو ”وئی!“ کہہ کر فرط سرور سے آنکھیں بند کر لیتے اور جھومنے لگتے۔ شاعر وہ شعر مکر پر پڑھنے لگتا تو اسے ہاتھ کے دُرشت اشارے سے روک دیتے کہ اس سے ان کے لطف میں خلل واقع ہوتا تھا۔

ایک دن ایک نوجوان شاعر نے دوسرے سے باز پرس کی کہ تم نے میری زمین میں غزل کیوں کہی؟ اس نے کہا، سودا کی زمین ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں! اس شاعر پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ اضافت بہت کھاتا ہے۔ اس پر دونوں میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ شروع میں تو خان صاحب کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ اگر زرعی زمین کا تنازعہ ہے تو زبانی کیوں لڑ رہے ہیں؟ ہم نے جب ردیف، قافیہ اور اضافت کا مطلب سمجھایا تو خان صاحب دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے ”لا حول ولا۔ میں تو جاہل آدمی ہوں۔ میں سمجھا اضافت خورشید رشوت یا خنزیر کھانے والے کو کہتے ہیں۔ پھر سوچا، نہیں۔ باپ کو کالی دی ہے، اس پر لڑ رہے ہیں۔ فرضی زمینوں پر جو تم پیہ زار ہوتے، ہم نے آج ہی دیکھی! کیا یہ اپنی اولاد کے لیے یہی زمینیں تر کے میں چھوڑ کے مریں گے کہ بر خور دارو! ہم تو چلے۔ اب تم ان آبائی مریعوں کی چوکیداری کرنا۔ ان میں قافیوں کی پیروی لگانا اور اضافتوں کا مُربا بنانا کے کھانا! پشتو میں اس کے لیے بہت بُرا لفظ ہے۔“

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

انہیں خوشی کے عالم میں بار بار کاتے، گنگناتے بھی دیکھا۔ لہراتی، گنگری لیتی آواز میں طنزورے کے تار کا سا کھرج کا ایک اچل (قائم) سُر بھی تھا جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے زمانے میں ٹنگ ٹنگور (+) کے رسیارہ چکے تھے۔ مطلب یہ کہ اس حد تک موسیقی میں درک کہ بخوبی جانتے تھے کہ خود بے سُر اگاتے ہیں۔ اکثر فرماتے کہ ہمارے ہاں شرفا میں اچھا گانے کو عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں بگاڑ کے گاتا ہوں۔ بے مقص کا ئیگی کو صرف گویوں، طوائف، مراثی اور لختی * کے کیس میں قابلِ معافی سمجھتے تھے۔ انہیں بے شمار پٹے یاد تھے۔ مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا جس کا روزِ ابر و شب مابیناب میں خون کرتے تھے۔ اس کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا کہ دیکھ دلدرا! میں نے تیری محبت میں رقیب کو تنگی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر ”یا قربان!“ کے الاپ کے بعد جس والہانہ انداز سے وہ گاتے تھے اس سے تو یہی شک تھا کہ

(+) ٹنگ ٹنگور: (پشتو) راک رنگ۔

* لختی: (پشتو) ناپنے والے خوبصورت لڑکے۔

موصوف کو جو لذت قتل میں ملی، وصل میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملا۔ اس بول کی ادائیگی وہ ایسے پہلوانی جوش اور اندھا دھند وار فٹنگی سے کرتے کہ شلوار میں ہوا بھر بھر جاتی۔ فرماتے تھے کہ دشمنی اور انتقام کے بغیر مرد کی زندگی بے مقصد، لاحاصل اور مہمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ گویا

زیست مہمل ہے اسے اور بھی مہمل نہ بنا

ایک نہ ایک دشمن ضرور ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ دشمن نہ ہو گا تو انتقام کس سے لیں گے؟ پھر برسوں منہ اندھیرے ورزش کرنے، بالٹیوں دودھ پینے اور تکیے کے نیچے پستول رکھ کر سونے سے کیا فائدہ؟ سارے آبائی اور قیمتی ہتھیار بے کار ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ شیر دلیر لوگ باعثِ موت کے بجائے دے اور تے دست میں فوت ہونے لگیں گے! عمر طبعی تک تو صرف کوئے، کچھوے، گدھ، گدھے اور وہ جانور پہنچتے ہیں جن کا کھانا شرعاً حرام ہے! خان صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ جب تک آپ کا کوئی بزرگ بے دردی سے قتل نہ ہو، آپ انتقام کی لذت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ صرف منگتوں، ملاؤں، زنانوں، میراٹیوں، لالہ دوں اور شاعروں کو کوئی قتل نہیں کرتا۔ اگر آپ کا دشمن آپ کو لائقِ قتل نہیں گردانتا تو اس سے زیادہ بے عزتی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس پر تو خون ہو جاتے ہیں۔ ایمان سے! ایسے بے غیرت آدمی کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ پشتو کا ٹڑے پہ اوہو کے نہ ورستی دی۔ (پشتو کا پتھر پانی میں نہیں گھستتا۔)

گھوڑا، غلیل اور انکسار

”یوں میرا دادا بڑا جلالی تھا۔ اس نے چھ خون کیے۔ اور چھ ہی حج کیے۔ پھر قتل سے توبہ کر لی۔ کہتا تھا اب میں بوڑھا ہو گیا۔ اب مجھ سے بار بار حج نہیں ہوتا۔ وہ پچانوے سال کی عمر میں برضا و رغبت فوت ہوا۔ جب تک آخری دشمن فوت نہیں ہو گیا، اس نے خود کو فوت نہیں ہونے دیا۔ کہتا تھا، میں کسی دشمن کو اپنے جنازے کو کندھا نہیں دینے دوں گا۔ نہ میں اپنی زوجہ کا سہاگ لٹے دیکھ سکتا ہوں۔ دادا واقعی بڑے ڈیل ڈول اور رعب داب کا آدمی تھا۔ پیدل بھی چلتا تو یوں لگتا جیسے گھوڑے پر آ رہا ہے۔ وہ بڑا جہاں دیدہ اور دانا تھا۔ اس وقت وہ مجھے گھوڑے کے ذکر پر یاد آیا۔ تو وہ کہتا تھا کہ سب سے اعلیٰ سواری اپنی ٹانگیں ہیں۔ گھوڑے کی ٹانگوں کا استعمال صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اول میدانِ جنگ میں دشمن پر تیز رفتاری سے حملہ کرنے کے لیے دوم، حملہ ناکام ہو تو میدانِ جنگ سے دُکھنی تیز رفتاری سے بھاگنے کے لئے!

مذاق اپنی جگہ، میرا دادا قازقستانی شہ سواروں کی طرح تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کی زین کو چھوڑ کر اس کے پیٹ کے گرد چکر لگاتا ہوا دوسری طرف سے دوبارہ زین پر بیٹھ جاتا تھا! میرے پاس اس کی تلوار اور مرصع پیش قبض ہے۔ ان میں وہی فولاد استعمال ہوا ہے جس سے نادر شاہ کی تلوار ڈھالی گئی تھی۔ ہمارے خاندان میں سو سال کے عرصے میں میں پہلا آدمی ہوں جس نے قتل نہیں کیا۔۔۔۔۔ کم از کم اب تک۔ الحمد للہ! میرے تایا نے بھی قتل نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ جوانی میں ہی قتل کر دیا گیا۔“

خان صاحب گھوڑوں سے بے پناہ شغف رکھتے تھے۔ سیاہ گھوڑا ان کی کمزوری تھی۔ بٹوں میں پانچ چھ گھوڑے اصطبل میں بیکار کھڑے کھاتے تھے۔ سب مُشکی۔ کسی کا تحفہ دیا ہوا ایک اعلیٰ نسل کا سمند سیاہ زانو (بادامی رنگ کا گھوڑا جس کی دم اور زانو سیاہ ہوں) بھی تھا۔ لیکن اسے صرف زانو اور دم کی حد تک پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر فرماتے، ہمارے قبیلے میں جس مرد کا نشانہ خطا ہوتا ہو، یا جس کے شجرہ نسب میں صرف مقتولین ہوں، یا جس کو گھوڑا بار بار زمین پر تھج دیتا ہو، اس سے نکاح جائز نہیں۔ گھوڑا میں نے ہمیشہ رکھا۔ اس زمانے میں بھی جب بے انتہا تنگی تھی اور میں بغیر بریک کی سائیکل پر آتا جاتا تھا، باہر ایک مُشکی کھڑا ہنہناتا رہتا تھا۔ ”کسی نے پوچھا ”اس میں کون سی ٹنگ تھی، خان صاحب؟“ فرمایا ”اول تو اپنے کماؤں میں گھوڑے پر ٹنگے ٹنگے پھر نا غرور و نخوت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ دویم، گھوڑا ضعیف تھا۔ والد صاحب کی آخری نشانی۔ مجھے میرے دادا نے پالا۔ وہ تکتہ اور رعونت کے بہت خلاف تھا۔ کہتا تھا ہمیشہ گردن جھکا کر چلو۔ یہی کھرے پختونوں کا شیوہ ہے۔ میری اٹھتی جوانی، گرم خون تھا۔ ایک دن میں سینہ تانے، اور گردن کو اتنا اکڑائے کہ صرف آسمان نظر آتا تھا، اس کے سامنے سے گزرا تو اس نے مجھے روک لیا۔ میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے غلیل چھین کر اس نے دوشاخے کو میری گڈی میں پیچھے سے پھنسا کر گردن کو اتنا جھکایا کہ مجھے اپنی ایڑی نظر آنے لگی۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی گردن اکڑا کے نہیں چلوں گا۔ پھر غلیل گردن سے علیحدہ کر کے بھائی کو واپس کرنا چاہی تو دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ کہنے لگا، اسے سنبھال کے رکھ لے۔ کام آئے گی۔ بڑھاپے میں اسے دوسری طرف سے استعمال کرنا۔ ٹھوڑی کے نیچے لٹکا کر گردن کھڑی کر لینا۔

اہل خانہ بدوش

خان صاحب اپنے اہلی موالی کی معیت میں جب کچی آبادیوں اور پٹھان بستیوں کا دورہ کرتے اور راستے میں کوئی بھاری پتھر پڑا نظر آ جاتا تو رکھ ل اٹھتے۔ وہیں رک جاتے۔ جوانوں کو اشارہ کرتے کہ اسے اٹھا کر دکھاؤ تو جانیں۔ اگر کسی سے نہ اٹھتا تو آستین چڑھا کر آگے بڑھتے اور یا علی! کہہ کر سر سے اونچا اٹھا کر دکھاتے۔ راہ چلتے لوگ اور محلے کے بچے تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کراچی کی خوش حال اور صاف ستھری بستیوں، مثلاً پی ای سی ایچ ایس، ہاتھ آئی لینڈ اور کے ڈی اے ون، سے سواری باد بھاری گزرتی تو افسوس کرتے کہ خالا یہ کیسی جھاڑو پھری خانہ خراب بستی ہے کہ ایک پتھر پڑا نظر نہیں آتا جسے کوئی مرد پتہ اٹھا سکے۔ میرے بچپن میں کھاؤں میں جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر اور پٹھانیں پڑی ہوتی تھیں جن پر کھڑے ہو کر آپ دشمن کو کالی دے سکتے تھے۔ ٹیک لگا کر سستا سکتے تھے۔ انہی پتھروں پر جاڑے میں بڑے بوڑھے سلیٹی رنگ کا کابل اس طرح اوڑھ کے بیٹھتے تھے کہ صرف دو آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ دھوپ سینکنے کے بہانے وہ ان آنکھوں سے نوجوانوں کے چال چلن پر نظر رکھتے تھے۔ ادھر جب کنواری لڑکیاں جن کے سفید بازو اٹھلے پانی کی پھلیوں کی مانند کسی طرح گرفت میں نہیں آتے، گود (پنکٹ) سے اپنے سروں پر گھڑے اٹھائے گزرتیں تو انہی پتھروں پر بیٹھے گہر و جوان اپنی نظریں اٹھائے بغیر فقط چال سے بتا دیتے تھے کہ کس کا گھڑا بالاب بھرا ہے اور کس کا آدھا خالی۔ اور کون گھونگٹ میں مسکرا رہی ہے۔ کوئی لڑکی موٹی چادر کے نیچے پھنسا پھنسا کر تاپہن کر یا داتوں پر اخروٹ کا تازہ دنداسہ لگا کر آتی، تب بھی چال میں فرق آ جاتا تھا۔ جوان لڑکی کی ایڑی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ چلتی ہے تو اسے پتہ ہوتا ہے کہ پیچھے کون کیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کھاؤں کے چوحدے پر ملک جہانگیر خان کی برجی کے پاس ایک تھوٹا سا پتھر آدھا زمین میں دھنسا، آدھا دیو کے پنچے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ اس پر ابھی تک ان گولیوں کے نشان ہیں جو پچاس سال پہلے عید کے دن میں نے نشانہ بازی کے دوران چلائی تھیں۔ ایک گولی کا ٹکڑا پتھر سے ٹکرا کر اچھٹا ہوا نصیر محل کی ران میں پیوست ہو گیا۔ وہ کچی عمر کا خوش شکل لڑکا تھا۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ اس کا باپ کہنے لگا کہ منحوس کے بچے! میں تیری دونوں جاتوں میں گولی سے ایسا درہ کھولوں گا کہ ایک لحاف کی روئی سے بھی موسلا دھار خون بند نہیں ہو گا۔ کھاؤں میں کبھی سنائے میں فائر ہوتا اور اس کی گونج کو دور و نزدیک کے پہاڑ اپنی گرج میں شامل کر کے، باری باری لوٹاتے تو زمین دیر تک کانپتی رہتی اور دل دہل جاتے۔ عورتیں اپنے اپنے مرد کے لیے دعائیں

کرتیں کہ خداخیر سے لوٹائے۔

محبت اور نفرت دونوں کا اظہار خان صاحب ”ویٹ لفٹنگ“ سے کرتے۔ مطلب یہ کہ بحث میں ہار جائیں تو حریف کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتے۔ اور اگر مدت کے پچھڑے دوست مل جائیں یا ہم جیسے ناقابل رشک قد و قامت والے نیازمند سلام کریں تو معانقے کے دوران ہمیں اس طرح ہلاتے جھنجھوڑتے جیسے پھل دار درخت کی شاخ کو جھڑ بھڑاتے ہیں۔ پھر فرط محبت سے ہمیں زمین سے اُدھراٹھا لیتے۔ ہماری پیدشانی کو اپنی lip level تک لاتے اور چوم کر وہیں ہوا میں نیوٹن کے سیب کی مانند گرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

اسی طرح ان کے ایک دل پسند پٹے سے جو وہ اکثر کھاتے اور لنگناتے تھے یہی ترشح ہوتا تھا کہ محبوب بھی انہیں صرف اس لئے بھاتا ہے کہ اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر گھڑے کی طرح سر پر رکھا جاسکتا ہے:

راشہ زما د غمگ منگے شہ

چہ د سینہ پہ لار دے سر تہ خیر شومہ

مطلب یہ کہ ”جاناں! امیرے پہلو کا گھڑا بن جا کہ تجھے سینے کے راستے سے سر پر چڑھالوں“۔ کھاتے میں کٹی اٹھکی سے اپنے سینے پر گداز گھڑے کے عمودی سفر کا ایسا نقشہ کھینچتے کہ

میں نے یہ جانا کو گویا یہ بھی میرے سر پہ ہے

محبوب کا وزن کے علاوہ ہیئت کدائی میں بھی گھڑے سے مشابہ ہونا اگرچہ لازمی شرط نہیں، لیکن اضافی کوالی فی کیشن ضرور معلوم ہوتی تھی۔ گھڑے کو اپنے گرمائے ہوئے پہلو سے جدا کر کے سر پر رکھ لینے سے غالباً عفتِ نگاہ و مباح کا یہ پہلو دکھانا مقصود تھا کہ خوبصورت گھڑے کو ہم وقت سر پر اٹھائے پھرنے والا اہل خانہ بدوش خود کبھی اس کا پانی نہیں پی سکتا۔ اس دکھیا کی ساری عمر گھڑے کو سر پر بیٹلنس کرنے اور لونڈوں کی غلیل سے پچانے میں ہی گزرے گی۔

آداب عرض!

سچار

سچ بات کہنے میں خان صاحب اتنے ہی بے بس تھے جتنے ہم آپ چھینک کے معاملے میں۔ منہ پر آئی ہوئی بات اور ڈکار کو بالکل نہیں روکتے تھے۔ اگر ان کی کسی بات سے دوسرا آزرده یا مشتعل ہو جائے تو انہیں پوری طرح اطمینان ہو جاتا تھا کہ سچ بولا ہے۔ انہیں سچ اس طرح لگتا تھا جیسے ہاشما کو بچکی یا شاعروں کو تازہ غزل لگتی ہے۔ اتر اتر کر لکھنے والے کو لکھار اور کھل کھیلنے والی کو کھلاڑ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بات بے بات سچ بولنے والے کو سندھی میں ”سچار“ کہتے ہیں۔ خان صاحب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ایک دفعہ ایک صاحب سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ چُھوٹے ہی پوچھنے لگے ”ایسی موچھیں رکھ کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ صاحب برامان گئے تو کہنے لگے ”معاف کرنا! میں جاہل آدمی ہوں۔ یوں ہی اپنا علم بڑھانے کے لیے پوچھ لیا تھا۔“ خلیل احمد خاں رند سے دریافت فرمایا ”معاف کرنا“ آپ کی صحت پیدا نشی خراب ہے یا بقلم خود خراب کی ہے؟ کیا آپ کے والد بھی نام کے آگے خان لکھتے تھے؟“ وہ صاحب کہ روتیل کھنڈ کے اکثر پٹھان تھے، سچ بچ بگڑ گئے۔ کہنے لگے ”کیا مطلب؟“ بولے ”ہم نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔ اس واسطے کہ بارہ سنگھاماں کے پیٹ سے سینگوں کے جھاڑ سمیت پیدا نہیں ہوتا۔“ ایک دفعہ بشارت سے پوچھا ”آپ ریشمی ازار بند استعمال کرتے ہیں۔ کھل کھل جانے کے علاوہ اس کے اور کیا فوائد ہیں؟“ ایک اور موقع پر تین چار دوستوں کی موجودگی میں بشارت کو بڑی سختی سے ٹوکا ”یاراجی! معاف کرنا۔ میں تو جاہل آدمی ہوں۔ مگر یہ آپ دن بھر ’آداب عرض! آداب عرض! تسلیمات عرض ہے! کیا کرتے رہتے ہیں۔ کیا اسلام علیکم کہنے سے لوگ برا مان جائیں گے؟“

غار ہراس پر غارِ حرا کا گمان

اس سے پہلے بشارت نے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر ہمارا بھی خیال نہیں گیا تھا۔ بشارت نے اپنے والد کو ہمیشہ آداب و تسلیمات ہی کہتے سنا تھا۔ اور اس

میں انہیں بڑی ملائمت اور مفاست محسوس ہوتی تھی۔ خان صاحب نے دوسری مرتبہ بحری محفل میں ٹوکا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اب جو پلٹ کر پیچھے دیکھا تو منظروں کے سامنے ایک منظر کے بعد دوسرا منظر آتا چلا گیا۔

۱- کیا دیکھتے ہیں کہ مغل تاجداروں نے کلاہ تیموری اور تاشقندی عمامے اتار پھینکے اور راجپوتی کھڑکی دار پگڑیاں پہن لیں۔ ظلّ سبحانی ماتھے پہ تلک لگائے فتح پور سیکری کے عبادت خانے میں بیٹھے فیضی سے فارسی رامائن کا پاٹ سن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پنڈتوں اور ملاؤں کے مناظرے میں وہ شور و غوغا ہوا کہ یوں لگتا تھا جیسے مست فخر بھڑوں کے چھٹے چہرے ہیں۔ اکبرا عظیم مذہب سے استامایوس اور میزار ہوا کہ ایک نیامذہب ایجاد کر ڈالا۔ وہ اپنی ہندو رعایا کو جلد از جلد خوش رام کرنے کی غرض سے بھی اپنے آبائی دین سے میزاری اور لاتعلقی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بایں جاہ و حشم وہ شریعت سے برگشتہ، ملاؤں سے مایوس اور اپنی رعیت کی اکثریت سے خوف زدہ تھا۔ رفتہ رفتہ دین پناہ کو اپنے غارِ ہراس پر غارِ حرا کا گمان ہونے لگا اور اس نے تبت کا دعویٰ کر دیا، * جس پر اس کی اپنی ملکہ جو دھابائی اور ملا دو پیازہ تک ایمان نہ لائے۔ اس نے سب کو خوش کرنے کے لیے سب مذاہب کا ایک کاک ٹیل بنایا جسے سب نے اسی بنا پر ٹھکرا دیا۔

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

۲- پھر دیکھا کہ سمنہ شب رنگ کی تنگی پیٹھ پر شباشب منزلیں مارنے اور ملکوں ملکوں جھنڈا کاڑنے والے مغل سوار ماب جمناکنارے راجپوتی طرز کے درشن جھروکے میں اور لال عماری اور بیچ رنگ مستیک والے فیل گراں ڈیل پر براجمان منظر آتے ہیں۔ لو کے تھپیڑوں نے فرغانہ کے فرغل اتروا دیے۔ ملل کے ہوا دار انگڑکھوں نے زرہ بکتر کی جگہ لے لی۔ رفتہ رفتہ فاتحین نے اپنی مادری زبانیں عربی، ترکی اور فارسی ترک کر کے ایک نئی زبان اردو وضع کی جو ابتداً خود ان کے لیے بھی اتنی ہی بدیسی اور اجنبی تھی جتنی ہندوؤں کے لیے ترکی یا فارسی۔ مکمل عسکری فتح کے بعد حکمران قوم نے اپنی اصل زبان سے دست بردار ہو کر خوش دلی سے ایک نوع کی شقائق شکست

* اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ دین الہی میں اخلاص چارگانہ شمولیت کی شرط تھی۔ یعنی ترک مال، ترک جان، ترک دین اور ترک ناموس۔ اس دین میں پانچواں رکن اس لیے نہیں تھا کہ چوتھے یعنی ترک ناموس کے بعد کچھ رہ نہیں جاتا۔

مان لی، تاکہ ہارنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ اپنے سکے کے ساتھ اپنی مادری زبان بھی مستقلاً رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مسجدوں اور خانقاہوں کے دروازوں اور محرابوں پر ہندوؤں کے مقدس پھول — کنول — سے منبت کاری ہونے لگی۔ معرکہ آراؤں کی محفلوں میں تاجکستانی رقص کا وفور و خروش اور سمرقند و بخارا کے شعلہ درمکھو نغمے پھر کبھی سنائی نہ دیے کہ وقت نے لے ہی نہیں، نئے و نغمہ بھی بدل کے رکھ دیے۔ ماورائے ہند کے صاحب کمال رامش گر اور اقصائے فارس کے نادر نوازند گمان سبک دست اپنے بربط و چنگ و رباب بغلوں میں دبائے مدتیں گزریں رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے پر نہ آسمان رویا۔ نہ ہمالیہ کی چھاتی شق ہوئی کہ ان کے قدر دانوں نے اب ستار سارنگی اور یردنگ پر ہندوی راگ راگنیوں سے دلوں کو کرمانا سیکھ لیا تھا۔

گنگا جمنی کام

۳۔ لکھنے والی اچھی جو لکھتی چلی جاتی ہے، شگفتگی سمجھوتے کے مرقع کا ایک اور ورق پلٹ کر دکھاتی ہے۔ دریائے گومتی کے رُوپ کنارے رہس کارسیا، اودھ کا آخری تاجدار بیروں میں گھنگھرو باندھے اسٹیج پر اپنی ہی بنائی ہوئی ہندی دھن پر نرت بھاؤ بتا رہا ہے۔ ایک ورق اور پلٹتے تو جمنی کنارے ایک اور ہی منظر نگاہ کے سامنے آتا ہے۔ چند متقی، پرہیز کار اور بارہیش بزرگ مسند کی ٹیک لگائے اسباب زوال امت، اہیائے دین اور ضرورت جہاد پر عربی اور فارسی میں رسالے تحریر کر رہے ہیں، لیکن جب سلام کرنا ہو تو ڈہرے ہو ہو کر ایک دوسرے کو کورنش، آداب و تسلیمات، بندگی اور مجرا بجالاتے ہیں۔ السلام علیکم کہنے سے احتراز کرتے ہیں کہ یہ رواج (جو بارہ سو سال سے مسلمانوں کا شعار اسی طور رہا تھا جیسے ”شلوم“ امت موسوی کی یا ”بے رام جی کی“ اور ”نسکار“ اہل ہنود کی پہچان رہی ہے) اب بالکل متروک ہو چکا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے نے بھی السلام علیکم کہنا ترک کر دیا! مولف امیر الروایات لکھتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے لوگ جب سلام کرتے تو کہتے تھے عبد القادر * تسلیمات عرض کرتا ہے۔ رفیع الدین (+) تسلیمات عرض کرتا ہے۔ جب حضرت سید احمد بریلوی بیعت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ پہلے

* حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(+) حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شخص تھے جس نے انہیں السلام علیکم کہا! (x)

یہ سب شفافیتی سمجھوتے تسخیر و تالیفِ قلوب کی خاطر قرن بہ قرن ہوا کیے، مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ دل کو سمجھانے والی بات تھی۔ آداب عرض اور آہنگ خسروی آنے والی رستاخیز میں کسی کی جان و مال کو ————— حتیٰ کہ خود سمجھوتے کی زبان کو بھی ————— نہ بچا سکے۔ وقت نے ایسے تمام دل خوش کن اور آرائشی سمجھوتوں کو خونِ بَرَد کر دیا۔ مخمل و کم خواب کے غلاف کرتی ہوئی دیواروں کو گرنے سے نہیں روک سکتے۔ چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ بھلایہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زبانِ یار تو قلم کر دی جائے، اخلاص و رواداری کا پرچم سرنگوں ہو جائے، مگر کلچر کام کار و فتح یاب ہو۔

بشارت اکثر کہتے ہیں کہ میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا کہ پشاور کے ایک ان پڑھ پٹھان کے طعنے نے چار پُشتوں کا پالا پوسا آداب عرض چُھڑوا دیا!

۱۲

کراچی والے کسی چُوزے کو مُرغا نہیں بننے دیتے

خان صاحب بحث کے دوران ہر بات اور ہر صورتِ حال کے عموماً دو سبب بتاتے تھے، جن میں سے ایک کی حیثیت محض پچ کی ہوتی تھی۔ مثلاً ایک دن بشارت نے شکایت کی ”کراچی کی صبح کیسی گدلی گدلی اور مضطرب ہوتی ہے۔ خود سورج کو ٹھکنے میں آ لکسی آتی ہے۔ صبح اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بدن ایسا دکھتا ہے جیسے کسی باکسر نے رات بھر اس پر مشق کی ہو۔ میں کاپور میں مرغ کی پہلی ہی اذان پر اس طرح اٹھ بیٹھتا تھا گویا کسی نے اسپرنگ لگا دیا ہو“ خان صاحب اپنی بُریدہ انگشتِ شہادت ان کے گٹھنے کی طرف اٹھاتے ہوئے بولے کہ ”اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کراچی والے کسی چُوزے کو مُرغا نہیں بننے دیتے۔ اذان دینے سے پہلے ہی اس کا قصہ تمام کر دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپ کے اسپرنگ کو گٹھیا ہو گئی ہے۔ چالیس دن تک دانہ میتھی کی بجھیا کھاؤ اور بوڑھے گٹھنے پر گودر (پنگھٹ) کے پودے کا لیپ لگاؤ۔ ہمارا پشتو شاعر کہہ گیا ہے کہ

(x) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے السلام علیکم کہنے سے بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ آئندہ سلام بطریق مسنون کیا جائے۔ (امیر الروایات)

پر دے وطن پہ ہر چا غم دی
ملاہ پر دی وطن کر لی دی گلونہ (+)

وہ دن بھر پشتو لہجے میں مہٹیا اردو بولنے کے بعد شام کو ٹرانزسٹر پر پشتو کانوں سے دل پشوری کرتا ہے اور رات کو پشاور ریلوے اسٹیشن کو آنکھوں میں بھر کے سڑک کے کنارے جھکی میں سو جاتا ہے۔ سڑک پر رات بھر پٹانے چھوڑتی موٹر سائیکل رکشائیں اور دھڑ دھڑاتے ٹرک گزرتے رہتے ہیں۔ پر اسے خواب میں ڈھول سُرنّا اور رباب اور گھڑے پر پٹے سنائی دیتے ہیں۔ اُدھر کوئٹہ اور زیارت سے آیا ہوا بلوچ کراچی کا ٹیلا سمندر دیکھتا ہے اور بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں اور ان فریہ دنبوں کو یاد کر کے ابدیدہ ہو جاتا ہے جن کے وہ بڑے خستہ سخی کباب بنا سکتا تھا۔ اب رہا پرانا سندھی، تو وہ غریب اس زمانے کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے جب یہ چاروں حضرات کراچی تشریف نہیں لائے تھے۔“

اس مرحلے پر بھی آخری کیل خان صاحب ہی نے ٹھونکی۔ کہنے لگے، خا! اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں کہ جس کاؤں کا ہر باشندہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کسی دوسرے کاؤں کی یاد میں تڑپتا رہے، اُس کاؤں کا خانہ خراب ہووے ہی ہووے۔ ہمارے ”ملنگ“ میں اگر کوئی عورت دوسری شادی کے بعد اپنے پہلے خاوند کو اس طرح یاد کرے تو دوسرا خاوند دونوں کی ناک کاٹ کے ایک دوسرے کی ہتھیلی پہ رکھ دے گا۔ ملا کر م علی کہتا تھا کہ جو عورت اپنے پہلے خاوند کو بہت یاد کرے اسے عربی میں خانہ کہتے ہیں۔ ایسی عورت کے دوسرے خاوند کے لئے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔

خان صاحب دقیق مسائل اور زندگی کی گتھیوں کو کبھی کبھی اپنی ناخواندہ سوجھ بوجھ سے اس طرح پانی کر دیتے:

کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی توں ہی دھری رہی

اصولوں کے مرغے اور جنگِ زرگری

معاف کیجیے بیچ میں یہ صفحہ ہائے معترضہ آن پڑے۔ لیکن ان سے فریقین کا مزاج اور

(+) مطلب یہ کہ یوں تو پردیس میں ہر شخص نگین ہوتا ہے، مگر مجھے دیکھو کہ میں نے پرانی زمین میں اپنے وطن کے پھول کھلا دیے ہیں!

قضیے کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہوگی جو اب استا طول کھینچ گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے دلائل کا آموختہ سنا تے ہوئے کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ اب یہ کوئی معمولی کاروباری جھگڑا نہیں رہا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے اصولوں کو منطق کی پالی میں مرغوں کی طرح لڑا رہے تھے۔ اس شرط کے ساتھ کہ جس کا مرغاجیت جائے گا اسے ذبح کر کے دونوں مل کے کھائیں گے! یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ خان صاحب اکثر فرماتے تھے کہ ہارا ہوا مرغ کھانے سے آدمی استابودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات درست معلوم ہونے لگتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ خان صاحب محض تفتقن طبع اور خوش وقتی کے لئے معاملے کو طول دے رہے ہیں، وگرنہ وہ سیر چشم، دوست نواز وسیع القلب اور فراخ دست آدمی تھے۔ بشارت کو اس کا بخوبی احساس تھا۔ اور اس کا بھی کہ خان صاحب انہیں جی جان سے چاہتے اور ان کی بذلہ سخی سے بے حد محفوظ ہوتے ہیں۔ دو سال قبل بھی وہ بشارت سے پشاور میں کہہ چکے تھے کہ میراجی چاہتا ہے آپ کو سامنے بٹھا کر اسی طرح مہینوں آپ کی باتیں سنتا رہوں۔ بشارت خود بھی خان صاحب کے گرویدہ تھے۔ دہکتے سرخ انکارہ فولاد سے چٹکاریاں اڑتی دیکھنے میں انہیں بہت مزہ آتا تھا۔

ایک طرف تو خان صاحب کی حساب فہمی کی یہ انتہا کہ ایک پائی چھوڑنے میں ان کی پختہ پر حرف آتا تھا۔ دوسری طرف محبت و پاسداری کا یہ عالم کہ جہاں بشارت کا پسینہ گرے وہاں ان کے دشمن کا خون بہانے کے لیے تیار۔ بشارت کی دکان سے ایک ایک ساڑا انسپکٹر چار سال قبل دس ہزار روپے کی لکڑی اُدھار لے گیا اور ہنزور رقم دبائے بیٹھا تھا۔ تین سال ہوئے ایک پرونوٹ (منسک) لکھ دیا تھا۔ مگر اب کہتا تھا کہ جائ نہیں دیتے۔ نالش کر کے دیکھ لو۔ پرونوٹ کبھی کا خارج المیہ ہو چکا۔ بشارت نے منجملہ اپنی اور پریشانیوں کے اس نقصان کا بھی ذکر کیا۔ دوسرے دن شام کو بعد مغرب خان صاحب اپنے بیچیس تیس کمانڈوز کی مغری لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ انسپکٹر نے کھولا اور سبب نزول دریافت کیا تو خان صاحب نے کہا کہ ہم وہ کڑکی دروازے کھاڑ کر لے جانے کے لیے آئے ہیں جن میں ہمارے بھائی بشارت کی لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہی جھٹکے سے دروازے کو قبضے، اسکر و اور پینڈل سمیت، اکھاڑ کر اس طرح بغل میں دبایا جیسے مکتب کے بھگوڑے لڑکے تختی بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ دیوار پر سے انسپکٹر کے دادا مرحوم کا فوٹو جس کے بارے میں انہیں شبہ گذر کہ اس کے فریم میں وہی لکڑی استعمال ہوئی ہے، کیل سمیت نوچ کر اپنے ایک لفٹنٹ کو تھما دیا۔ انسپکٹر ایک گھاگ تھا۔ موقع کی نزاکت سمجھ گیا۔ کہنے لگا، خان صاحب! بندہ ابک معروضہ گوش گزار

کرنا چاہتا ہے۔ خان صاحب بولے، زہ پرہ! * اب وہ کسی خرگوش کے گوش گزار کرنا۔ معروضہ شعروضہ کبھی کا خارج المیعاد ہو چکا۔ بھرا ہوا پیٹ فارسیاں بولتا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ رقم نکالو۔

رات کے بارہ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ باقی تھے کہ خان صاحب نے دس ہزار کے نئے نوٹوں کی دس گڈیاں لاکر بشارت کے حوالے کر دیں۔ ان میں سے سات پرولیکا ٹیکسٹائل ملز کی مہر تھی جو اس انسپکٹر کے حلقہ رشوت ستانی میں پڑتا تھا۔ یہی نہیں، انہوں نے اس سے اپنے پہلوان کمانڈوز کی رکشاؤں کا کرایہ اور دودھ کے پیسے بھی بحساب ایک سیر فی کس وصول کر لئے۔

خان صاحب گھر والوں میں ایسے گھل مل گئے کہ اکثر شام کو بچوں کے لیے جو انہیں چچا کہنے لگے تھے، مٹھائی، کپڑے اور کھلونے لے کر جاتے۔ سب سے چھوٹے بچے کو بہلانے کے لیے، پلنگ پر چٹ لیٹ جاتے اور پیٹ کو دھونکنی کی طرح پھلکا اور پچکا کر اس پر بچے کو اچھالتے۔ پڑوس کے بچے انہیں دیکھتے ہی ان کے پیٹ کے لیے مچلنے لگتے اور ماؤں کے سر ہو جاتے۔ خان صاحب نے اب بشارت کے ساتھ ان کے ہشتے داروں کی شادی بیاہ، غمی اور سالگرہ کی تحفہ بیوں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ لیکن بشارت نے کچھ عرصے بعد اس سلسلے کو تکلفت بند کر دیا، اس لیے کہ انہیں خارجی ذرائع سے معلوم ہوا کہ ان کے (بشارت کے) ہشتے داروں کی تمام تر ہمدردیاں خان صاحب کے ساتھ ہیں! اور ایک دن تو یہ سن کر وہ بھونچکے رہ گئے کہ ایک ایسے شری ہشتے دار نے خان صاحب کو بالا بالا مدعو کیا ہے جس سے ایک عرصے سے بشارت کے تعلقات کشیدہ بلکہ منقطع تھے۔

بشارت کو کسی تجربے نے یہ بھی خبر دی کہ خان صاحب دو تین دفعہ چوری چھپے تھانے بھی جا چکے ہیں۔ اور ایس ایچ او کو قراقلی ٹوپی، ایک بوری اخروٹ، اصلی شہد اور درے کے بنے ہوئے بغیر لائنس کے ریوالور کا تحفہ بھی دے آئے ہیں! وہ گھبرائے۔ اب یہ کوئی نیا پھندا ہے۔ اس کے بھی دو سبب ہو سکتے ہیں، انہوں نے سوچا۔

* زہ پرہ: (پشتو) چھوڑو بھی یار! گولی مارو۔

۱۳

روٹی تو کسی طور کما کھائے مجھنדר

خان صاحب نے اب خود شیو کرنا اور شلوار میں کمر بند ڈالنا بھی چھوڑ دیا۔ روازنہ خلیفہ آتا تھا۔ جیسا ہم پہلے کہیں بیان کر چکے ہیں، خلیفہ کو سائسی، کوچوانی، ڈرائیوری، کھانا پکانا، میرا گیری، حجامت، باغبانی، پلمبنگ ————— یہ کہیں کیا نہیں آتا تھا۔ اس فن میں بھی طاق تھا جو ان سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ ————— مصاجی اور خوشامد۔ جب سب ضمنی دھندے ٹھپ ہو جاتے تو خلیفہ اپنے بنیادی پیشے کی طرف رجوع کرتا۔ اپنے بیٹے کو، جو آبائی پیشے سے متنفر و محبوب تھا، اکثر نصیحت کرتا کہ میٹھا حجام کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ حجام کی ضرورت ساری دنیا کو رہے گی۔ ————— تاوقتے کہ ساری دنیا سکھ مذہب اختیار نہ کر لے! اور سکھ یہ کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ خلیفہ دن رات خان صاحب کی خدمت میں بٹھا رہتا۔ شام کو ان کے دوستوں کا غول کوہستانی ڈیرے ڈالتا تو لپک جھپک اندر سے تہوہ اور چلم بھر بھر کے لاتا۔ ایک دفعہ اپنے گھر سے چار اصیل مرغوں کی، جنہوں نے اذان دینی نئی نئی سیکھی تھی، بریانی بنا کر لایا۔ ان کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ جب یہ جوان پٹھے علی الصبح گردن پھلکا کر اذان دیتے تو سارے محلے کے مٹا اور مرغیاں بے قرار ہو کے باہر نکل پڑتے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں مالی کے عہدے پر فائز تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے خواجہ ناظم الدین کو متوفین کے والد کا روسٹ کھاتے دیکھا۔ پرائم منسٹر محمد علی بوگرہ نے عالیہ سے (دوسری) شادی کے بعد متوفی مرغ کی سوگوار بیوہ کان کے انڈوں کا مقوی حلوہ بنوا کر نوش کیا۔ ایک دن کوہاٹ کی اراضی کا ایک تیناڑہ طے ہونے کی خوشی میں وہ فریقین کے لیے مسلم بھیڑ روست کر کے لایا۔ ثبوت میں ایک بکرے کی کٹی ہوئی دُم بھی اٹھا لیا تاکہ خان صاحب کو شبہ نہ گزرے کہ بکرے کے بجائے سستی بھیڑ بھون کے بھیڑ دی۔ (اس رعایت لفظی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا) خان صاحب اسے دیکھتے ہی بولے کہ اتنی چھوٹی ران والے بکرے کی اتنی بڑی دُم ہو ہی نہیں سکتی! دُم کے اس پہلو پر خلیفہ کی نظر نہیں گئی تھی۔ چنانچہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر خان صاحب کے گھٹنے پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر ٹانگ دبائے لگا۔ انہوں نے یہ کہہ کر چھڑائی کہ بد بختا! گھٹنا پکڑتے پکڑتے اب میری ران کس لیے ٹٹول رہا ہے؟

خان صاحب کو خلیفہ کے پکائے ہوئے کھانوں سے زیادہ اس کی لچھے دار باتوں میں مزہ آتا

تھا۔ فرماتے تھے، جس بات کو کہنے والا اور سننے والا دونوں ہی جھوٹ سمجھیں، اس کا گناہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کی شیخی کو بڑھاوا دیتے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے، ان کے تلووں پر روغن بادام کی مالش کرتا۔ کہتا تھا، اس سے دماغ کو تراوٹ پہنچتی ہے۔ ایک دن اچانک خان صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ کہنے لگے، کیا تیرے خیال میں میرا مغز میرے تلووں میں اُتر آیا ہے؟ لیکن خلیفہ ٹھیک ہی کہتا تھا، اس لیے کہ سات آٹھ منٹ بعد ہی خان صاحب ریوالور تکیے کے نیچے رکھے، زور زور سے خزانے لینے لگتے۔ ہر تین چار منٹ بعد چونکتے اور خزانوں میں نیا سُر لگا کر پھر سے سو جاتے۔ ایک دن وہ بڑے اونچے سروں میں خزانے لے رہے تھے کہ پیر دہاتے دہاتے خلیفہ کا ہاتھ نہ جانے کیوں ان کی واسکٹ کی جیب پر پڑ گیا۔ آنکھیں کھولے بغیر کہنے لگے کہ بد بختا! نقدی تو میرے کوٹ کی جیب میں ہے!

دراصل وہ ان کے منہ لگ گیا تھا۔ خدمت گار، درباری، چلم بھرنے والا، حجام، داستان گو، میر مطبخ، اردلی، کائیڈ، مُنجر، مُشیر۔۔۔۔۔ وہ ان کا سبھی کچھ تھا۔ تین چار دن سے آپس میں نہ جانے کیا مسکوٹ ہو رہی تھی۔ روزانہ شام کو بھی کسی نہ کسی بہانے بشارت کے ہاں آجاتا۔ ان کی سیکم نے دو تین دفعہ کہا کہ اس کا آنا مصلحت اور نحوست سے خالی نہیں۔

آدم خورشیر کو پہچانتے کی آسان ترکیب

ایک دن صبح اٹھتے ہی خان صاحب نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم آپ نے دی ہے اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض یہ گاڑی جو عرصہ دراز سے بیکار کھڑی ہے مجھے دے دیجئے۔ بشارت نے کہا، لکڑی کی اصل مالیت کسی طرح سات ہزار سے زائد نہیں، جب کہ اس گاڑی کی قیمت، مع نئی باڈی اور نئے پرزوں کے، کسی طرح نو ہزار سے کم نہیں۔ مزید برآں جس انگریز کی سواری میں یہ رہتی تھی اسے سر کا خطاب ملنے والا تھا۔ خان صاحب نے جواب دیا، آپ کی گاڑی بہت سے بہت پانچ ہزار کی ہوگی، جب کہ میری لکڑی نو ہزار کی تھی۔ آپ نے تو پٹرول اور پنکچر جوڑنے کا تمام خرچہ، خلیفہ کی تنخواہ اور اس کی زوجہ کا دہن مہر بھی کار کی قیمت میں جوڑ دیا۔ بہت کچھ بحثا بحثی اور ”کھڑ سودے بازی“ کے بعد واجب الادا رقم کافرق گھٹ کر وہیں آگیا جہاں سے قضیہ شروع ہوا تھا۔ یعنی ۳-۹-۲۵۱۳۔ اب خان صاحب اس کلیم کے عوض یہ گاڑی چاہتے تھے۔

”خان صاحب! آپ بزنس کر رہے ہیں یا بارٹر (barter)؟“ بشارت نے جھنجھلا کر

پوچھا۔

”یہ کیا ہوتا ہے، صیب؟“

”وہی جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔“

”پشتو میں اس کے لئے بہت بُرا لفظ ہے۔“

وہ جب پشتو کا حوالہ دے دیں تو پھر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اصل یا ترجمہ کرے۔ اکثر فرماتے کہ پشتو منٹ وزاری اور فریاد و فغاں کی زبان نہیں۔ نر آدمی کی للکار ہے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ڈنکے کی چوٹ بات کرنے، کچھار میں غافل سوتے ہوئے شیر کی مونچھیں پکڑ کر جگانے اور پھر اس سے ڈانٹا گ بولنے کی زبان ہے۔ مرزا اس زمانے میں کہتے تھے کہ خان صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو شیر کی مونچھیں اکھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کے منہ میں اپنا سر دے کر یہ علمی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ویجی ٹیرین ہے یا آدم خور!

”وٹہ سٹہ“

بشارت نے خان صاحب کی آسانی کے لئے بار ٹر کو تبادلا جنس کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس کا مفہوم سمجھایا۔ طول طویل تشریح سن کر بولے۔ ”یاراجی! تو پھر سیدہ سیدہ حاوہ سٹہ کیوں نہیں کہتے جس میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ گھائے میں رہا۔“

اور یہی بھونڈی مثال برہان قاطع ثابت ہوئی۔ اسی پر تصفیہ ہو گیا۔ خان صاحب نے بڑی خوشی اور فخر سے اعلان کیا کہ وہ ”جنسی تبادلا“ کے لیے تیار ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور اس طرح گلے ملے جس طرح وہ دُکھیا رے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں اور سائل بھی۔

لیکن بشارت دل ہی دل میں خوش تھے کہ کھٹارا کاڑھی سات ہزار میں بک گئی۔ خان صاحب ان سے بھی زیادہ خوش کہ دَکڑ لکڑی کے عوض نو ہزار کی کار ہتھیالی۔ دونوں فریق اس صورتِ حال کو حق کی فتح سمجھ رہے تھے، حالانکہ ہم سے دل کی بات پوچھیں تو باطل نے باطل کو پچھاڑا تھا۔ اور کوڑے کرکٹ کا تبادلا کوڑے کرکٹ سے ہوا تھا۔ خان صاحب کار کو چمکارتے ہوئے کہنے لگے ”ہم اس کو طور خم، لڈی کوتل کا سیر کرائے گا۔ اخروٹ کے درخت کے سائے میں کھڑا کرے گا۔ اس میں کابل سے قراقلی، قالین اور چلغوزے بھر کے لائے گا۔ کابل کے شمال کے ایک چلغوزے میں، ایمان سے، نکاح کے دس چھوہاروں کے برابر طاقت ہوتا ہے!“

تصفیہ ہوتے ہی خان صاحب نے تازہ تازہ سیکھی ہوئی لکھنوی اردو اور کانپوری لہجے کے شکنجے سے خود کو ایک ہی جھٹکے میں آزاد کر لیا۔ چرب زبان دشمن پر فتح پانے کے بعد ”کیون فلاؤ“ کی ضرورت نہ رہی۔

از بس کہ خان صاحب کے نزدیک مُشکی سے بہتر دنیا بلکہ پُل صراط پر بھی کوئی سواری نہیں ہو سکتی تھی، وہ اس کار کو جواب ان کی ہو چکی تھی، مُشکی کہنے لگے۔

تاریخِ بالوشاہی

بشارت نے چوری چھپے دو رکعت ناز شکرانہ ادا کی۔ مگر خان صاحب سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ وہ ہر چند رائے روڈ پر سے گزرتے ہوئے تانگوں کے گھوڑوں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ لمحہ غلبہ و نصرت کا تھا۔ دشمن کے گھر کے چوگرد گھوڑے پر شبہ مام * کھنکے کی گھڑی تھی۔ ضبط نہ ہو سکا تو سر دست مُشکی کے زانو یعنی کار کے بڈ کارڈ کو تھپتھپا کر دل کے حوصلے مٹا دیے۔ انجن کی تھو تھنی پر ہاتھ رکھ کر شاباشی دی۔ ان کا بس چلتا تو اسے گھاس دانہ کھلا کر اپنے ہاتھ سے کھیرا کرتے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی ایک تانگے والے نے اسپنسر آئی ہسپتال کے سامنے درخت کے سائے میں گھوڑا کھولا، وہ لپک کر اس پر جا پڑے۔ اور بشارت کی دکان کے دو چکر لگائے۔ پھر بشارت ہی سے جگ میں ٹھنڈا پانی منگوایا اور سر پر اس کے تیرہڑوں کے بعد سات سیر بالوشاہی منگوا کر تقسیم کی۔ بشارت کے تین رشتے داروں کے حصے لگا کر خود پہنچوائے۔ بشارت دنگ رہ گئے۔ حد ہو گئی۔ انتہائی بدگمانی کے عالم میں بھی انہیں کبھی ان تینوں پر شبہ نہیں گزرا تھا کہ ایسے متفق اور منافق نکلیں گے۔ درپردہ خان صاحب سے مل جائیں گے۔ بہر کیف، بالوشاہی کے ذریعہ منافقت کا بھانڈا پھوٹنے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی۔ ہمارا مطلب ہے بالوشاہیوں کی تاریخ میں!

نیاز مند ان بنوں نے راضی چلا کر اعلانِ صلح کیا۔ ایک پڑوسی دکاندار دوڑا دوڑا

* شبہ مام: محبتی مختار مسعود صاحب نے کہ صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے علاوہ شہ سواری میں بھی پائے طوئی رکھتے ہیں، ہمیں بتایا کہ یہ وہ باوقار اور ceremonial چال ہے جو گھوڑا اس وقت چلتا ہے جب بادشاہ اس پر سوار ہو۔ ہیٹ کا (بادشاہ کے) پانی نہیں ہلنے پاتا۔ ہمارے جن نوجوان پڑھنے والوں نے کبھی کوئی بادشاہ، شاہی گھوڑا یا خود جناب مختار مسعود کی چال نہیں دیکھی، وہ ”آواز دوست“ میں ان کے اشیہبِ قلم کا طرزِ خرام ملاحظہ فرمائیں۔ اس پر سوار لیلیٰ معنی کے ہیٹ کا پانی نہیں ہلنے دیتے۔ البتہ قاری گھنٹوں ہلتا رہتا ہے۔

بشارت کو مبارکباد دینے آیا۔ وہ یہ سمجھا کہ ان کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔

ایک ٹرک ڈرائیور سے جو دکان پر پڑتل لکڑی کی ڈلیوری لینے آیا تھا، خان صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ذرا ہمیں ہماری کار میں گوردھن داس مارکیٹ تک سیر تو کرادو۔ تمہارے چائے پانی کا بندوبست ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو کار کی کارکردگی سے بے انتہا خوش تھے۔ کہنے لگے، خدا کی قسم! بالکل والد کے مشک کی طرح ہے!

ایک پینٹر کو بلا کر راتوں رات کار پر سیاہ اسپرے پینٹ کروایا تاکہ عادات کے علاوہ شکلا بھی مشک کی سے مشابہت مکمل ہو جائے۔

“Et, tu, Brute!”

دوسرے دن بشارت دکان کے شٹر بند کروا رہے تھے کہ سامنے ایک ٹرک آکر رکا جس میں ڈرائیور کے پہلو میں تھانے کے منشی جی بیٹھے تھے اور پیچھے ان کی چوری شدہ لکڑی کے علاوہ رشوت میں پیش کردہ لکڑی بھی لدی تھی۔ تختوں پر وہی راشنل بردار کانٹینیل بیٹھا تھا۔ خان صاحب نے ایک ڈی ایس پی کے توتل سے جو بنوں کا رہنے والا، ان کا گرائیں تھا، نہ صرف سارا مال شیر کے منہ سے نکلوا لیا تھا، بلکہ اس کے دانت بھی تبر کا نکال لائے تھے۔ ٹرک کے پیچھے پیچھے ایک ٹیکسی میں (جو شارع عام پر اپنے عقب سے مقررہ مقدار سے زیادہ دھواں خارج کرنے کی بنا پر ابھی ابھی پکڑی گئی تھی) وکیل صاحب پہنچے، تاکہ باہمی صلح صفائی ہو جائے اور معاملہ رفع دفع ہو۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر وہی ملزم ناموکل ایک ہاتھ میں ان کا بریف کیس تھامے اور دوسرے میں قانون کی کتابیں اٹھائے پیچھے چل رہا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاتھ میں مٹھائی کے دو ڈبے تھے۔ ایک خان صاحب کو پیش کیا اور دوسرے کے بارے میں بشارت سے فرمایا کہ میری جانب سے بھابی صاحبہ اور بچوں کو دے دیجیے گا۔

تھانے کے منشی جی نے پوچھا، ہمارا خلیفہ کہاں ہے؟ بشارت کو یہ معلوم کر کے بڑا شاک ہوا کہ پولیس لاک اپ میں رات گزارنے کے بعد سے خلیفہ مہینے میں دوبار تھانے جاتا رہا ہے۔ اور ایس ایچ او سے لے کر زیر حراست ملزموں تک کی جحمت ہناتا رہا ہے! تھانے کے اسٹاف میں یا کسی حوالاتی ملزم کے ہاں مستقبل قریب یا بعید میں ولادت ہونے والی ہو، یا تھانے کے نواحی علاقے کی جھگتیوں میں کوئی عورت بھاری قدموں سے چلتی نظر آجائے تو اس سے پتکا وعدہ لیتا کہ اگر لڑکا ہوا تو تختے میں کروں گا۔ اس کے والد مرحوم کی وصیت تھی کہ بیٹا، اگر تم بادشاہ بھی

بن جاؤ تو اپنے آبائی پیشے کو نہ چھوڑنا۔ دوم، جس کسی سے ملو اس کو ہمیشہ کے لیے اپنا کر رکھو یا اس کے ہو رہو۔ سو وہ غریب سب کا ہو رہا۔

خان صاحب رات دو بجے تک قرضوں اور ”پولا“ توڑ کر کھیتوں کو پانی دینے کے سرسری مقدمات، جن میں کالی کلوج کی آمیزش سے پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، منٹاتے رہے۔ اٹھائے سماعت و انفصال مقدمات میں لوگ جوق در جوق ان کو خدا حافظ کہنے آتے رہے۔ عدالت ہر ایک کو میلہ رائے پتھر کہہ کر چائے، چلم، چلغوزے اور بالوشاہی سے تواضع کرتی رہی۔ صبح چار بجے سے خان صاحب نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ فجر کی اذان کے بعد ایک اکیلے مرغ کو قبلہ رو کر کے قربانی کی۔ اس کا سر بلی کو اور باقیات گھر والوں کو ناشتے پر کھلائیں۔ دل خود چبایا۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کسی بڑے موذی پر فتح حاصل ہو تو ہمارے قبیلے کا دستور ہے کہ کائے ذبح کرتے ہیں۔ دشمن گیا گزرا ہو تو ڈبے پر اکٹھا کرتے ہیں۔ ناشتے پر ہی اعلان کیا کہ مشکلی مال کاڑی سے نہیں جائے گی بلکہ میں اسے پنجاب کی سیر کراتا، دریاؤں کا پانی پلاتا ”بائی روڈ“ لے جاؤں گا۔ بچے ان کے جانے سے بہت اداس تھے۔ انہوں نے خود بھی اقرار کیا کہ میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں، لکڑی کا کاروبار وہیں ہے۔ اگر کراچی میں جنگلات ہوتے تو خدا کی قسم تم لوگوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ پھر انہوں نے ڈھارس بندھائی کہ انشاء اللہ دو مہینے بعد پھر آؤں گا۔ ایک بوہری سیٹھ سے وصولی کرنی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ایک وقت میں ایک ہی بے ایمان سے منٹ سکتا ہوں۔

بشارت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیے۔ ارشاد فرمایا، کراچی میں اُدھار پر بزنس سیو پار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کما (گنتے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! جتنا بڑا شہر ہو گا، اتنا ہی بڑا گھپلا اور پھٹا ہو گا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی ہے اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔ پھر سب سے چھوٹے بچے کو بہلانے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئے۔

چلتے وقت انہوں نے بشارت کی بیٹی منیزہ کو جو ان کی چہیتی ہو گئی تھی پانچ سو روپے دیے۔ یہ اس کی پانچویں سالگرہ کا تحفہ تھا جو آٹھ دن بعد منائی جانے والی تھی۔

۳-۹، روپے نوکروں میں تقسیم کئے۔ اس سے قبل، گزشتہ شب وہ ایک پٹھان نوجوان محل داؤد خان کو دو ہزار روپے دے چکے تھے تاکہ وہ اپنے چچا پر جس نے اس کی زمینوں پر قبضہ غاصبانہ کر رکھا تھا، کو ہاٹ جاکر فوجداری مقدمہ دائر کرے اور اس دے کو یتیموں کی جائیداد پر

قبضہ کرنے کی ایسی سزا دلوائے کہ سب چچاؤں کو عبرت ہو۔ ان تینوں رقموں کا حاصل جمع ۳-۹-۲۵ روپے بنتا ہے۔ اور یہی وہ رقم تھی جس کا سارا جھگڑا تھا اور جس کی وصولی کے لیے انہوں نے اپنے کمانڈوز اور ہیر و بنگاہ سمیت لشکر کشی کی تھی۔ بلکہ بقول مرزا، غنیم کے قلعے کے قلب میں مہم جوئی کر بھنگڑا ڈال رکھا تھا۔

اس قفیہ کو تیس سال ہونے کو آئے۔ ہماری ساری عمر حساب کتاب ہی میں گزری ہے۔ مگر ہم آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ درحقیقت کس کی کس پر کتنی رقم نکلتی تھی اور آخر میں جیت کس کی رہی۔ ہماری ہی سمجھ کا قصور تھا۔ جنہیں ہم حریف سمجھے، وہ دراصل حلیف اور دوست نکلے اور ————— حساب دوستاں درد دل *۔

خان صاحب نوکروں کو دے دلا کر بشارت کے والد کو خدا حافظ کہہ رہے تھے کہ بشارت کیا دیکھتے ہیں کہ ٹھیک نوبت کے ایک شخص چلا آ رہا ہے جس کا صرف چہرہ خلیفہ سے ملتا ہے۔ تنگ موری کے پاجامے، ململ کے کرتے اور نخل کی ٹوپی کے بجائے ملیشیا کی شلوار اور کرتا۔ سریر زری کی کلاہ پر مشہدی پکڑی، کلاہ واسکٹ۔ پیر میں ٹائر کے تلے والی پشاور پیچل۔ واسکٹ اور کلاہ بالترتیب تین ساڑ بڑی اور چھوٹی تھی۔ کوٹ کی آستین پر امام خامن۔ ہاتھ میں بلین + گھوڑے کی لکام۔ خان صاحب نے مطلع کیا کہ بلین بھی ایک ٹرک میں بنوں جا رہا ہے۔ ان کے اصطبل میں جہاں پانچ گھوڑے بیکار کھڑے ہنہنار ہے ہیں وہاں ایک اور سہمی۔ ہر جانور اپنے حصے کا رزق ساتھ لاتا ہے۔

خان صاحب نے اعلان کیا کہ مشکلی کو خلیفہ ڈرائیو کر کے پشاور لے جائے گا اور تاقیامت واپس نہیں آئے گا، جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اس کے بزرگ قندھار سے براہ پشاور وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ زاد سفر میں تنگی تلوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ سو یہ بھی کثرت استعمال سے گھس گھسا کر استرا بن گئی! دوسرا یہ کہ انہوں نے اس نمک حلال کو ملازم رکھ لیا ہے۔

بشارت کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔
”خلیفہ! تم۔۔۔۔۔!“

* مرزا عبدالودود بیگ کہ دوستوں کو قرض دے دے کر رقم اور دوست دونوں سے بارہا ہاتھ دھوپکے ہیں، قدرے تصرف کے ساتھ، حساب دوستاں درد دل کہتے ہیں۔

+ بلین: ملاحظہ ہو ”اسکول ماسٹر کا خواب“

”سرکار! —————“ اس نے اس انداز سے ہاتھ جوڑ کر گھگھکاتے ہوئے کہا کہ کسی عذرو وضاحت کی ضرورت نہ رہی۔ اس میں فحالت بھی تھی۔ لجاجت بھی۔ اور بہر طور روٹی کما کھانے کا حوصلہ بھی۔

۱۴

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد ان کا املاکرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ ”بفضل خداوندی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کر کر رہا ہوں۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا۔ دوسرے درجہ میں، جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحبت تمہیں بشاش رکھے۔ بس یہی تمہارا علاج اور خوب ٹروند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔ یاراجی! میں بچہ نہیں ہوں۔ جوان ہوں نے کہا وہ میں سمجھ گیا اور جو نہیں کہا وہ بھی بخوبی سمجھ گیا۔ یہ مشورہ تو مجھے کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے سکتا تھا۔ اس کے لیے ایم آر سی پی اور ایف آر سی ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹوٹی لٹا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

”میں نے لنڈی کوتل سے لائڈی تک ٹکا ڈالی۔ آپ سے زیادہ محبتی، خود خُرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ منظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ طبیعت کا زنگ اتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔ خدا آپ کو اسی طرح شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی اس کی معافی مانگنا لکھنوی تنکافات میں شامل ہو گا، جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔ مگر دوستی میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میرا دادا کہتا تھا کہ فارسی میں ایک مثل ہے کہ یا تو باتھی بانوں سے دوستی مت کرو۔ اور اگر کر لی ہے تو پھر اپنا مکان ایسا بناؤ جو باتھیوں

کی ٹکڑہ سے۔

”ایک ٹرک والے کے ہمراہ مردان کا دس سیر تازہ گڑ جس میں نئی فصل کے اخروٹوں سے مغز کاری کی گئی ہے، سوات کے شہد کے تین چھتے قدرتی حالت میں بمعہ موم اصلی و مگس مردہ اور ایک صراحی دار گردن والی ٹوکری میں بیس فصلی بیڑے روانہ کر رہا ہوں۔ یوسفی صاحب کے لئے ان کا پسندیدہ پشاور کینٹ والی دکان کا دو سیر تازہ پنیر اور پنڈی کا ہنڈر سیف ایک تازک سی ہوا دار ٹوکری میں ہے۔ چلتے وقت انہوں نے گندھارا تہذیب کے دو تین اعلیٰ نمونوں کی فرمائش کی تھی۔ کچھ تو روانگی کی افراتفری، پھر میں جاہل آدمی۔ یہاں اپنے ہی جیسے دو تین دوستوں سے پوچھا۔ انہوں نے مجھے گندھارا کے دفتر بھیج دیا۔ وہ بولے ہم تو نہایت اعلیٰ ٹرک اور genuine پارٹس بیچتے ہیں۔ تمہیں کس کا نمونہ درکار ہے؟ دو شنبہ کو ایک ٹھیکیدار کا منشی چارنگ سیاح کی مورتیاں، نہایت خوبصورت تحت بھائی مردان کی کھدائی سے چادر میں چھپا کر لایا تھا۔ مگر ایک جاتے والے نے جو قد آدم سے بھی بڑی مورتیاں اسمگل کر کے امریکہ بھیجتا رہتا ہے، مجھے بتایا کہ یہ بدھ کی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے چہرے قنات (اس کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے) چیلوں چاشوں کی ہیں۔ بدھ استا تگڑا کبھی تھا ہی نہیں۔ افواہا سنا ہے، نروان کے بعد بدھ کی صحت اور پسلیاں یوسفی صاحب جیسی ہو گئی تھیں۔ بہر حال تلاش جاری ہے۔ بعد سلام ان سے عرض کیجئے کہ اس سے تو بہتر ہو گا کہ دیوار پر کابلی والا کا فوٹو ٹانگ لیں۔ *

”اس بیماری کا خانہ خراب ہو۔ عمر کا پیمانہ لمبیز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اُکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔ آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔ مجھ سے پُچھ کر وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بھتا اور! جب تک بالکل بے ہوش نہ ہو جاؤں، میں بیماری سے ہار مانتے والا آدمی نہیں۔ بشارت بھائی! ایسے آدمی کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ گزشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سوشالروں کے دو زانو بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔

”باقی سب خیریت ہے۔ خلیفہ دست بستہ سلام عرض کرتا ہے۔ میں نے اسے مسلم

* تیس سال بعد وصیت کی تعمیل کر رہا ہوں۔ بھار خانہ دل میں جو تصویر وہ آدمیوں کے لئے اس کا دھندلا سا عکس پیش خدمت ہے۔

کمرشل بینک میں چپراسی لگوادیا ہے۔ روزانہ شام کو اور چھٹی کے دن مُشکی وہی چلاتا ہے۔ بہت چٹکا ہے۔ مُشکی کو پشتو میں روانی سے کالی دینے لگا ہے۔ مگر ابھی پشتو مذکر مونث کی تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ سننے والے ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ کل ہی میں نے اسے گُربتایا ہے کہ جسے تو ہمیشہ مذکر سمجھتا آیا ہے اب اسے مونث بول۔ پھر تجھے پشتو آجائے گی۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام، دعا، پیار اور ڈانٹ ڈپٹ۔

آپ کا چاہنے والا

کابلی والا

”مکرر آنکد، یہاں آکر پرانے حسابات دیکھے تو پتہ چلا کہ ابھی متفرق مذات میں کچھ لینا دینا باقی ہے۔ مجھے سفر منع ہے۔ آپ کسی طرح فرصت نکال کر یہاں شتابی آجائیں تو حساب دوستاں بیساک (لکھنے والے نے اسی طرح لکھا تھا اور کیا خوب لکھا تھا) ہو جائے اور آپ کے کابلی والا کو تھوڑی سی زندگی اور اُدھار مل جائے۔

نیز، اب نئے مکان اور دالان کا انتظار کون کرے۔ میں نے آپ کے لئے سِر دست ایک عدد بے چمید چاندنی اور پانچ شاعروں کا انتظام کر لیا ہے۔ والسلام۔“

بشارت پہلی ٹرہ بن سے پشاور روانہ ہو گئے۔

شہر دو قصہ

۱

کھنڈر میں چراغاں

کم و بیش پینتالیس برس کا ساتھ تھا۔ نصف صدی ہی کہیے۔ بیوی کے انتقال کے بعد بشارت بہت دن کھوئے کھوئے سے، گم ضم رہے۔ جیسے انہوں نے کچھ گم نہ کیا ہو، خود گم ہو گئے ہوں۔ جوان بیٹوں نے میت لحد میں اتاری، اس وقت بھی وہ صبر و ضبط کی تصویر بنے، تازہ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر خاموش کھڑے دیکھا کیے۔ ابھی ان کے بٹوے میں مرحومہ کے ہاتھ کی رکھی ہوئی الائچیاں باقی تھیں۔ اور ڈیپ فریڈز میں اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کمانوں کی تھیں لکی تھیں۔ کروٹے کی جو ٹوپی وہ اس وقت پہنے ہوئے تھے وہ اس جنتی بی بی نے چاند رات کو دو بجے مکمل کی تھی تاکہ وہ صبح اسے پہن کر عید کی نماز پڑھ سکیں۔ سب منہ بھر کے مٹی ڈال چکے اور قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھک گئی تو انہوں نے مرحومہ کے ہاتھ کے لٹائے ہوئے موتیا کی چند کلیاں جن کے کھلنے میں ابھی ایک پہر باقی تھا، کرتے کی جیب سے نکال کر اٹکارہ پھولوں پر بکھیر دیں۔ پھر خالی خالی نظروں سے اپنا مٹی میں سنا ہوا ہاتھ دیکھنے لگے۔ اچانک ایسا سانحہ ہو جائے تو کچھ عرصے تک تو یقین ہی نہیں آتا کہ زندگی بھر کا ساتھی یوں آنا فنا بچھڑ سکتا ہے۔ نہیں۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو پھر یہ بھی خواب ہی ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی یہیں کسی دروازے سے مسکراتی ہوئی آئیگی۔ رات کے سنائے میں کبھی کبھی تو قدموں کی مانوس آہٹ اور چوڑیوں کی کھٹک تک صاف سنائی دیتی۔ اور وہ چونک پڑتے کہ ہمیں آنکھ تو نہیں جھپک گئی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھیں نم نہیں دیکھیں۔ اپنوں میں کانوں سمی نے ان کے صبر و استقامت کی داد دی۔ پھر اچانک ایک واشکاف لمحہ آبا کہ تلخت یقین آ گیا۔ پھر سارے پندار پٹتے اور سارے آنسو بند اور تمام صبر فصیلیں ایک ساتھ ڈھے گئیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

لیکن ہر رنج رفتی ہے اور ہر عیش گزشتی۔ جیسے اور دن گزر جاتے ہیں، یہ دن بھی گزر گئے۔ قدرت نے بقول لاروش فوکو کچھ ایسی حکمت رکھی ہے کہ انسان موت اور سورج کو زیادہ دیر ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ سکتا۔ رفتہ رفتہ صدمے کی جگہ رنج اور رنج کی جگہ اداس تنہائی نے لے لی۔ میں جب میامی سے کراچی پہنچا تو وہ اسی دور سے گزر رہے تھے۔ بے حد اداس۔ بے حد تنہا۔ بظاہر وہ اتنے تنہا نہیں تھے جتنا محسوس کرتے تھے۔ مگر آدمی اتنا ہی تنہا ہوتا ہے جتنا محسوس کرتا ہے۔ تنہائی آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ جدھر نظر اٹھاتا ہے، آئینے کو مقابل پاتا ہے۔ اسی لیے وہ تنہائی یعنی اپنی ہی صحبت سے گریز کرتا اور ڈرتا ہے۔ تنہا آدمی کی سوچ اُس کی اچھلی پکڑ کے کشاں کشاں ہر چھوڑی ہوئی شاہراہ، ایک ایک پگڈنڈی، مکلی کوپے اور چوراہے پر لے جاتی ہے۔ جہاں جہاں راستے بدلے تھے، اب وہاں کھڑے ہو کر انسان پر منکشف ہوتا ہے کہ درحقیقت راستے نہیں بدلتے، انسان خود بدل جاتا ہے۔ سرک کہیں نہیں جاتی۔ وہ تو وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ مسافر خود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ راہ کبھی کم نہیں ہوتی۔ راہ چلنے والے کم ہو جاتے ہیں۔

پیری میں، پرانی ضرب المثل کے مطابق، صدمعیب ہوں یا نہ ہوں، ایک عیب ضرور ہے جو سو عیبوں پر بھاری ہے۔ اور وہ ہے ناسٹبلیم۔ بڑھاپے میں آدمی آگے یعنی اپنی منزل نامقصود و ناگزیر کی جانب بڑھنے کے بجائے اُلٹے پیروں اُس طرف جاتا ہے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ پیری میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کے سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگمگ جگمگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی روشنی تیز ہوتی ہے، کنڈر کی دراڑیں، جالے اور ڈھندار پن اتنے ہی زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔

سوان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

ماضی متنائی اور برزخِ گم گشتہ

کراچی میں اللہ نے انہیں استادیہ کہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اپنے مالوف و متروک دیار کانپور جانے کی انہیں کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ مگر اس سانحے کے بعد یکبارگی ایک ہوک سی اٹھی اور انہیں کانپور کی یاد بے تحاشا ستانے لگی۔ اس سے پہلے ماضی نے ان کے وجود پر یوں چنچے کاڑ کر قبضہ نہیں جمایا تھا۔ حال سے گریزاں، حاضر و موجود سے منحرف، مستقبل سے

مستغنی۔۔۔ اب وہ صرف ماضی میں جی رہے تھے۔ حال میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی، بجز اس کے کہ بوڑھے آدمی کے حال کی سب سے بڑی خرابی اس کا ماضی ہوتا ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔

اک عمر سے ہوں لذتِ نسیاں سے بھی محروم

ہر واقعے، بلکہ ساری زندگی کی فلم اُلٹی چلنے لگی۔ جٹا دھاری برگدہ میں آکر، پھنگ کے بل اپنی بچینگ جٹائیں اور پاتال جٹیں آسمان کی طرف کر کے سیس آسن میں اُلٹا کھڑا ہو گیا۔ پینتیس برس بعد انہوں نے اپنے برزخِ گم گشتہ کانپور جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کلیاں، بازار، محلے، آنگن، چارپائی تلے ادھورے چھڑکاؤ سے رات گئے تک جوان پنڈے کی طرح سلگتی چھتیں، وہ دوانی خواہشیں جو رات کو خواب بن بن کے آتیں اور وہ خواب جو دن میں سچ مچ خواہش بن جاتے۔۔۔ سب ایک ایک کر کے بے طرح یاد آنے لگے۔ حد یہ کہ وہ اسکول بھی جنت کا ٹکڑا معلوم ہونے لگا، جس سے بھاگنے میں استما مزہ آتا تھا۔ سب مزوں، سب یادوں نے یکبارگی یورش کر دی۔ دوستوں سے چَرچاقی چارپائیاں اور ہری بھری نبولیوں سے لدے پھندے نیم کی چھاؤں، آموں کے بور اور مہوے کی مہکار سے بو جھل پُروا، املی پر گرد رائے ہوئے کتارے اور انہیں للچائی نظروں سے دیکھتی لڑکیاں اور انہیں ویسی ہی نظروں سے دیکھتے ہوئے لڑکے، ہرنوں سے بھرے جنگل، چھترے سے زخمی ہو کر دو تین سو فٹ کی بلندی سے گدے گرتی ہوئی مرغابی، خس کی ٹٹیاں، سنگھاڑوں سے پٹے تالاب، گلے سے پھسلتا مَخل فالدود، مولسری کے گجرے، گرمیوں کی دوپہر میں جامن کے گٹنے پتوں میں چھپے ہوئے گرگٹ کی لپلپاتی مہین زبان، اپنے چوکنے کانوں کو ہوا کے رُخ کے ساتھ ٹیون کیے ٹیلے پر تنہا کھڑا ہوا بارہ سنکا، اُڈ کھمڈ جوانی اور پہلے پیار کی گٹھا ٹوپ اُداسی، وہ صندل بانہیں جو سوتے جاگتے تکیہ تصور تھیں، تازہ کلف لگے دوپٹے کی کراری مہک، دھوم مچاتے دوست۔۔۔ ماضی کے کوہِ ندا سے ایسے بٹاوے، ایسی صدائیں آنے لگیں کہ

ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی

وہ اب بچے نہیں رہے تھے۔ ہمارا مطلب ہے ستر سے متجاوز تھے۔ لیکن انہیں ایک لحظے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ تمام رنگین اور رومینٹک چیزیں۔۔۔ جنہیں مرزا عبدالودود بیگ آلاتِ کشاورزی کی مناسبت سے ”عہدِ شباب کے آلاتِ ورزی“ کہتے ہیں۔۔۔ جنہیں یاد کر کر کے وہ سو سو decibel کی آہیں بھرنے لگے تھے، پاکستان میں نہ صرف بافراط بلکہ کہیں بہتر کوالٹی کی دستیاب تھیں۔ ہاں صرف ایک شے پاکستان میں مفقود تھی۔ اور وہ تھی ان کی جوانی۔ سو وہ بعد تلاشِ بسیار و بے سود کانپور میں بھی نہ ملی۔

یہ بچے کتنے بوڑھے ہیں، یہ بوڑھے کتنے بچے ہیں

انہوں نے اپنے نارتھ ناظم آباد والے گھر کے سامنے مولسری کا درخت لگانے کو تو لکالیا، لیکن یادوں کی مولسری کی بھینٹی بھینٹی مہک، پھبن اور چھب چھاؤں کچھ اور ہی تھی۔ اب وہ انواع و اقسام کے پھول کہاں کہ ہر پھول سے اپنی ہی خوشبو آئے۔ ان پر بھی وہ مقام آیا جو بڑھاپے کے پہلے شب خون کے بعد ہر شخص پر آتا ہے، جب وفات اس کا جی پچن کی دنیا کی ایک جھلک۔۔۔ آخری جھلک۔۔۔ دیکھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ پچن اور بڑھاپے کے درمیان کوئی غیبی ہاتھ چپکے سے سوگنی طاقت کا magnifier (محدب شیشہ) رکھ دیتا ہے۔ دانا کبھی اس شیشے کو ہٹا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے ہتھے ہی ہر چیز خود اپنا miniature (تصغیر) معلوم ہونے لگتی ہے۔ کل کے دیو بالکل بالستیہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے پچن کے locale (جائے وُرد و واردات) سے عرصہ دراز تک دور رہا ہے تو اسے ایک نظر آخری بار دیکھنے کے لیے ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ لیکن وہ جاتا ہے۔ وہ منظر اسے ایک طلسمی مقناطیس کی مانند کھینچتا ہے اور وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ طفل طلسمات پر جہاں دیدہ آنکھ پڑ جائے تو سارے طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہرہ و نگر کی ساری پریاں اُڑ جاتی ہیں اور شیش محل پر کالک پُت جاتی ہے۔ اور اس جگہ تو اب مقدس خوشبوؤں کا دھواں ہی دھواں ہے۔ یہاں جو کام دیو کی دہکتی دھنک کمان ہوا کرتی تھی وہ کیا ہوئی؟

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے؟ وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی؟

آدمی کو کسی طرح اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ رُپ سروپ کیا ہوا؟ وہ چہکار مہکار کہاں گئی؟ نہیں۔ یہ تو وہ اوراقِ مضور کو پے اور بازار نہیں جہاں ہر چیز اچنبھا لگتی تھی۔ یہ ہر چیز، ہر چہرے کو کیا ہو گیا؟

Was this the face that launch'd a thousand ships?
And burnt the topless towers of Ilium?

جس گڑھی یہ طلسم ٹوٹتا ہے، ماضی تمنائی کی خواب سراڑ سے جاتی ہے۔ پھر اس شخص کا شمار نہ بچوں میں ہوتا ہے، نہ بوڑھوں میں۔ جب یہ مقام آتا ہے تو آنکھیں بھیک "کلمر بلا اینڈ" ہو جاتی ہیں۔ پھر انسان کو سامنے ناچتے مور کے صرف پیر دکھائی دیتے ہیں اور وہ انہیں دیکھ دیکھ کے روتا ہے! ہر سوبے رنگی اور بے دلی کا راج ہوتا ہے۔

بے حلاوت اُس کی دنیا اور مذہب اُس کا دس

جس شہر میں بھی رہنا، اکتائے ہوئے رہنا

سواس طفلِ بزرگ نے کانپور جا کر بہت گریہ کیا۔ پینتیس برس تک تو اس پر رویا کیے کہ ہائے! ایسی جنت چھوڑ کر اچھی کیوں آگئے۔ اب اس پر روئے کہ لاجول ولا قوۃ! اس سے پہلے ہی چھوڑ کر کیوں نہ آگئے۔ خواہ مخواہ عمر عزیز کی ایک تہائی صدی غلط بات پر رونے میں گنوا دی۔ رونا ہی ضروری تھا تو اس کے لیے ۳۶۵ معقول وجوہات موجود تھیں، اس لیے کہ سال میں اتنی ہی مایوسیوں ہوتی ہیں۔ اپنی ”ڈریم لینڈ“ کا پیٹہ پیٹہ چھان مارا، لیکن

وہ لہر نہ پھر دل میں جالی، وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا

پینتیس برس پرانا نا سٹجلیا یکا یک ٹوٹا تو ہر جگہ اجاڑ اور ہر شے کھنڈر منظر آئی۔ حد یہ کہ جس مگر مجھ بھرے دریا میں کہ جس کا اور نہ چھوڑ، وہ فلک بوس برگد کی پھنگ سے بے خطر چھلانگ لگا دیا کرتے تھے، اب اسے جا کر پاس سے دیکھا تو ایک مینڈک بھرا برساتی نالا نکلا۔ اور وہ جبرنگ برگد تو نرا بونسائی پیڑ لگ رہا تھا۔

ماضی کے دشتِ بازگشت میں وہ اپنے ہمزاد کاخیمہ زنگارگوں نہ پہچان پائے!

۲

کبوتر خانے کا چربہ

یونانی کورس (Greek Chorus) بہت فلسفہ چھانٹ چکا۔ اب اس کہانی کو خود اس کے ہیرو بشارت کی زبانی سنئے کہ اس کامزہ ہی کچھ اور ہے:

یہ افسانہ اگرچہ سرسری ہے
ولے اس وقت کی لذت بھری ہے

صاحب! میں تو اپنا مکان دیکھ کے بھونچکا رہ گیا کہ واللہ! ہم اس میں رہتے تھے! اور اس سے زیادہ حیرانی اس پر کہ بہت خوش رہتے تھے! مڈل کلاس غریبی کی سب سے قابل رحم اور لاعلاج قسم وہ ہے جس میں آدمی کے پاس کچھ نہ ہو لیکن اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ ماشا اللہ سے ہم تلے اوپر کے نو بھائی تھے۔ اور چار بہنیں۔ اور تلے اوپر تو میں نے محاورے کی مجبوری کے سبب کہہ دیا، ورنہ کھیل کود، کھانے اور لیٹنے بیٹھنے کے وقت اوپر تلے کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ سب

کے نام ت پر ختم ہوتے تھے۔ عترت، عشرت، راحت، فرحت، عصمت، عفت وغیرہ۔ مکان خود والد نے مجھ سے بڑے بھائی کی سلیٹ پر ڈیزائن کیا تھا۔ سو سو سو کوتر بھی پال رکھے تھے۔ ہر ایک کی نسل اور ذات جدا۔ کسی کوتر کو دوسری ذات کی کوتری سے مختلط نہیں ہونے دیتے تھے۔ لکڑی کی دکان تھی۔ ہر کوتر کا خانہ اس کی جسامت، عادات، قبیحہ اور دم کی لمبائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، خود بناتے تھے۔ صاحب، اب جو جا کے دیکھا تو مکان کے آرکیٹیکچر میں سراسر ان کے اس شوق فضول کا عکس اور عل دخل نظر آیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا مکان دراصل ان کے کوتر خانے کا بھونڈا سا چرہ تھا۔

والد بہت دور اندیش اور پریکٹیکل تھے۔ اس اندیشے سے کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اولاد جائداد کے تقاسم پر جھگڑا کرے گی، وہ ہر بیٹے کے پیدا ہوتے ہی اس کا علیحدہ کمرہ بنوا دیتے تھے۔ کمرے کی تعمیر میں خرابی کی ایک سے زیادہ صورتیں مضر تھیں۔ یعنی یہ حفظِ مراتب بھی تھا کہ ہر چھوٹے بھائی کا کمرہ اپنے بڑے بھائی کے کمرے سے لمبائی چوڑائی میں ایک ایک گز چھوٹا ہو۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے کمرے کے حد و داربند تقریباً آگڑوں بیٹھ گئے تھے۔ پورے سات سال لگے مکان مکمل ہونے میں۔ اس عرصے میں تین بھائی اور پیدا ہو گئے۔ آٹھویں بھائی کے کمرے کی دیوار اس اٹھائی گئیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قد چوں کی نیور کھی جا رہی ہے یا کمرے کی۔ ہر نومو لو کی آمد پر سلیٹ پر سابقہ نقشے میں ضروری ترمیم اور ایک کمرے کا اضافہ کرتے۔ رفتہ رفتہ سارا آنگن ختم ہو گیا۔ وہاں ہمیں ورثے میں ملنے والی کوٹھریاں بن گئیں۔

بورژوایت پر بورژویت کا گمان!

صاحب، کہاں کراچی کی کوٹھی اور اس کے ایئر کنڈیشنر اور قالین اور روبلیک پینٹ اور کہاں یہ ڈھنڈا رکھنا جس بھی دو تو واللہ پلستر جھڑنے لگے۔ چالیس برس سے رنگ سفیدی نہیں ہوئی۔ پچو پچی زاد بھائی کے مکان میں ایک جگہ ترپال کی چھت گیری بندھی دیکھی۔ کراچی اور لاہور میں تو کوئی چھت گیری اور نم گیرہ کے معنی بھی نہیں بتا پائے گا۔ چھت گیری پر تین جگہ نیل پالش سے ضرب کا نشان × بنا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے نیچے نہ بیٹھو۔ یہاں سے چھت ٹپکتی ہے۔ کانپور اور لکھنؤ میں جس دوست اور رشتے دار کے یہاں گیا اسے پریشان حال ہی پایا۔ آگے جو سفید پوش تھے، وہ اب بھی ہیں۔ مگر سفیدی میں پیوند لگ گئے ہیں۔ اپنی عسرت اور خودداری پر کچھ زیادہ ہی فخر کرنے لگے ہیں۔ ایک نجی محفل میں میں نے اس پر اچھٹا سا فقرہ کس دیا تو ایک جو نیر لیکچرار جو کسی مقامی کالج میں اقتصادیات پڑھاتے ہیں بگڑ گئے۔ کہنے لگے ”آپ کی

امیری امریکہ اور عرب امارات کی دین ہے۔ ہماری غریبی ہماری اپنی غریبی ہے۔ (اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے قرأت سے الحمد للہ کہا) مقروضوں کے لئے تلکے آپ ہی کو مبارک ہوں۔ عرب اگر تھرڈ ورلڈ کو عالم الفقیر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔“ میں مہمان تھا۔ ان سے کیا الجھتا۔ دیر تک فقر و غنا، نانِ جوہس اور خودداری اور مفلسی کے دیگر لوازمات کی مدح میں اشعار سناتے رہے۔ دو شعر حضرت ابوذر غفاری پر بھی سنائے۔ شرما حضوری میں نے بھی داد دی۔ مہمان جو ٹھہرا۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، آج کل ہر اٹلکچھیل کو اپنی بے زری اور بورژوایت پر بوذریت کا گمان ہونے لگا ہے۔

کوئی چیز ایسی نہیں جو ہندوستان میں نہ بنتی ہو۔ ایک کانپورہی کیا۔ ہر شہر کارخانوں سے پٹا پڑا ہے۔ کپڑے کی ملیں۔ فولاد کے کارخانے۔ کار اور ہوائی جہاز کی فیکٹریاں، ٹینک بھی بننے لگے۔ اسٹیم بم تو عرصہ ہوا ایکسپلوڈ کر لیا۔ سیٹلائٹ بھی خلا میں چھوڑ دیا۔ عجب نہیں چاند پر بھی پہنچ جائیں۔ ایک طرف تو یہ ہے۔ دوسری طرف یہ منقشہ بھی دیکھا کہ ایک دن مجھے انعام اللہ بر ملائی * کے ہاں جانا تھا۔ ایک پیڈل رکشا پکڑی۔ رکشا والا مد قوق سا تھا۔ بنیان میں سے بھی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ منہ سے ہناری قوام والے پان کے جھبکے نکل رہے تھے۔ اس نے اٹھکی کا آئٹرا (ہب) سا بنا کر پیشانی پر پھیرا تو پسینے کی تلتلی بندھ گئی۔ پسینے نے منہ اور ہاتھوں پر کلسی چمک پیدا کر دی تھی جو دھوپ میں ایسی لگتی تھی جیسے ویسلین لگا رکھا ہو۔ تنکے پیر، سوکھی کلائی پر کلائی سے زیادہ چوڑی گھڑی۔ مینڈل پر پروم۔ بوبی ایکٹرس کا ایک سیکسی فوٹو۔ پیڈل مارتے میں دہرا ہو جاتا اور پسینے میں تریداشانی بار بار بوبی پر سجدہ رہز ہو جاتی۔ مجھے ایک میل ڈھوکے لے گیا۔ مگر کیس کیجیے کتنا کرایہ مانگا ہو گا؟ جناب! کل پچھتر پیسے! خدا کی قسم، پچھتر پیسے! میں نے ان کے علاوہ چار روپے پچیس پیسے کا ٹپ دیا تو پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ پھر باچھیں کھل گئیں۔ کدو کے میجوں جیسے پان آلود دانت نکلے کے نکلے رہ گئے۔ میرے بٹوے کو حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا ”بابو جی! آپ پاکستان سے آئے ہیں؟“ میں نے کہا ”ہاں۔ مگر پینتیس برس پہلے یہیں ہی امن کے پُروے میں رہتا تھا۔“ اس نے پانچ کانوٹ انٹی سے نکال کر لوٹاتے ہوئے کہا ”بابو جی! میں آپ سے پیسے کیسے لے سکتا ہوں۔ آپ سے تو محلّے داری نکلی۔ میری کھولی بھی وہیں ہے۔“

* انعام اللہ زمانے میں اس پر بہت فخر کرتے تھے کہ وہ ناگفتنی بات بر ملا کہہ دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا لقب بر ملائی پڑ گیا۔

غریب غزانے لگے

اور آبادی؟ الامان! الحفیظ! بارہ ماسی میلے کا سماں ہے۔ زمین سے اُبلے پڑتے ہیں۔ بازار میں آپ دو قدم نہیں چل سکتے، جب تک کہ دائیں بائیں ہاتھ اور کہنیاں نہ چلائیں۔ خشکی میں کڑھی تیرائی کہیے! جہاں کہنی مارنے کی بھی گنجائش نہ ہو وہاں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ محض بھید کے دھکے سے پہنچ جاتے ہیں۔ لکھو کھانا آدمی فٹ پاتھ پہ سوتے ہیں۔ وہیں ہر مرحلے سے گزر جاتے ہیں۔ مگر فٹ پاتھ پہ سونے والا کسی سے دیتا ہے نہ ڈرتا ہے۔ نہ حکومت کو برا کہنے سے پہلے مُذکر دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ ہمارے زمانے کے غریب واقع میں مسکین ہوتے تھے۔ اب غریب غزاتے بہت ہیں۔ سائیکل رکشا کو تو پھر بھی رستہ دے دیں گے، مگر کار کے سامنے سے ذرا جو ہٹ جائیں۔ عزیز الدین وکیل کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں سیاسی بیداری بہت بڑھ گئی ہے۔ واللہ اعلم! میں نے تو یہ دیکھا کہ جتنی غریبی بڑھتی ہے اتنی ہی ہیکٹری بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بلیک کا پیسہ وہاں بھی الغاروں ہے۔ مگر کسی کی مجال نہیں کہ امارت کی نمائش کرے۔ شادیوں میں کھاتے پیتے گھرانوں تک کی خواتین کو سُوتی ساری اور چنل پہنے دیکھا۔ مانگ میں اگر سینڈور نہ ہو تو واللہ بیوہ کا گمان ہو۔ چہرے پر قطعاً کوئی میک اپ نہیں، جب کہ اپنے ہاں یہ حال کہ ہم مرغی کی ٹانگ کے بھی ہاتھ نہیں لگاتے جب تک اس پر رُوڑ نہ لگا ہو۔ صاحب، آپ نے طارق روڈ کے لال بھو کا چکن تنکے دیکھے ہیں؟ کانپور میں میں نے اچھے اچھے گھروں میں دریاں اور بید کے صوفہ سیٹ دیکھے۔ اور بعض تو وہی ہیں جن پر ہم پینتیس سال پہلے اینڈا کرتے تھے۔ صاحب! رہن سہن کے معاملے میں ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے!

جو ہونی تھی سو بات ہوئی، کہا رو!

کہنے کو تو آج بھی اردو بولنے والے اردو ہی بولتے ہیں۔ مگر میں نے ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ عام آدمی کا ذکر نہیں، اردو کے پروفیسروں اور لکھنے والوں تک کا وہ لہجہ نہیں رہا جو ہم آپ چھوڑ کے آئے تھے۔ کرار اپن، کھڑاپن، وہ کڑی کمان والا کھٹکا جاتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے دُھلک کر ہندی کے پنڈتائی لہجے کے قریب آ گیا ہے۔ singsong لہجہ۔ You know what I mean۔ یقین نہ آئے تو آل انڈیا ریڈیو کی اردو خبروں کے لہجے کا کراچی ریڈیو یا میرے لہجے سے موازنہ کر لیجئے۔ میں نے پائنٹ آؤٹ کیا تو انعام اللہ برملائی سچ سچ آئندہ ہو گئے۔ ارے صاحب! وہ تو ذاتیات پر اثر آئے۔ کہنے لگے ”اور تمہاری زبان اور لب و لہجہ پر جو پنجاب دی چھاپ ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتی، ہمیں آتی ہے! تمہیں یاد ہو کا، ۳ اگست

۱۹۴۷ء کو جب میں تمہیں ٹرمین پر سی آف کرنے گیا تو تم سیاہ رامپوری ٹوپی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور جودھپوری جوتی پہنے ہاتھ کا چٹو بنا بنا کر آداب تسلیمات کر رہے تھے۔ کہو ہاں! کٹے میں پان، آنکھوں میں میرے کاسرمہ! ململ کے چٹے ہوئے کرتے میں عطرِ گل! * کہو ہاں! تم یہاں سے چائے کو چاء، گھاس کو گھانس اور چاول کو چانول کہتے ہوئے گئے! کہو ہاں! اور جس وقت کارڈ نے سیٹی بجائی، تم چیمبلی کا گراگے میں ڈالے کوپ میں سے گرم چاء پرچ میں ڈال کے، پھونکیں مار مار کے سڑسڑپی رہے تھے۔ اس وقت بھی تم کراچی کو کراچی کہہ رہے تھے۔ کہہ دو کہ نہیں۔ اور اب تین decades of decadence (عشرہ ہائے انحطاط) بعد سریر سفید بالوں کا ٹوکرار کھے، ٹٹنے تک حاجیوں جیسا جھاڑ جھٹا کرتا پہنے، ٹانگوں پر گھیر دار مشکیزے پھڑکاتے، کراچی کے کنکریٹ جنگل سے یہاں تیرتھ یا تر کو آئے ہو تو ہم تمہیں پنڈت پانڈے دکھلائی دینے لگے! بھول گئے؟ تم یہاں سے اماں! اور اے حضت! کہتے گئے تھے اور اب سائیں! سائیں! کہتے لوٹے ہو۔“ صاحب! میں مہمان تھا۔ بقول آپ کے، اپنی بے عزتی خراب کروا کے، چپکے سے اٹھ کر رکشا میں گھر آگیا۔

جو ہونی تھی سو بات ہو لی، کہا رو!

چلو لے چلو میری ڈولی، کہا رو!

ہم چُپ رہے، ہم ہنس دیے

لکھنؤ اور کانپور اردو کے گڑھ تھے۔ بے شمار اردو اخبار اور رسالے نکلتے تھے۔ خیر، آپ تو مان کے نہیں دیتے۔ مگر صاحب، ہماری زبان سند تھی۔ اب یہ حال ہے کہ مجھے تو سارے شہر میں ایک بھی اردو سائن بورڈ نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں بھی نہیں! میں نے یہ بات جس سے کہی وہ آہ بھر کے یامنہ پھیر کے خاموش ہو گیا۔ شامتِ اعمال، یہی بات ایک محفل میں دُہرا دی تو ایک صاحب ہنسنے لگے۔ غالباً ظہیر نام ہے۔ میونسپلٹی کے ممبر ہیں۔ وکالت کرتے ہیں۔ نہ جانے کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ”اللہ! ہندوستانی مسلمانوں پر رحم کیجیے۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ پاکستان سے جو بھی آتا ہے، ہوائی جہاز سے اترتے ہی اپنا فارن اسپیج اُچھالتا، یہی روناروتا ہوا آتا ہے۔ جسے دیکھو، آنکھوں میں آنسو بھرے شہر آشوب پڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ارے

* عطرِ گل: بارش کے پہلے چھینٹوں سے بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا عطر جو اترتی گرمیوں میں لگاتے تھے۔ اب جسمِ قبر میں پہنچ کر ہی زمین کی خوشبو میں نہاتے ہیں۔

صاحب! ہم نصف صدی سے پہلے کا کانپور کہاں سے لاکے دس۔ بس جو کوئی بھی آتا ہے، پہلے تو ہر موجودہ چیز کا موازنہ پچاس برس پہلے کے ہندوستان سے کرتا ہے۔ جب یہ کر چکتا ہے تو آج کے ہندوستان کا موازنہ آج کے پاکستان سے کرتا ہے۔ دونوں مقابلوں میں چابک دوسرے گھوڑے کے مارتا ہے، جتواتا ہے اپنے ہی گھوڑے کو! وہ بولتے رہے۔ میں مہمان تھا۔ کیا کہتا، وگرنہ وہی (سندھی) مثل ہوتی کہ گنتی تھی سینگوں کے لیے، کان بھی کٹوا آئی۔

لیکن ایک حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ ہندوستانی مسلمان کتنا ہی نادار اور پریشان روزگار کیوں نہ ہو، وہ مخلص، باوقار، غیور اور پُر اعتماد ہے۔

نشور واحدی سے لمبی لمبی ملاقاتیں رہیں۔ سراپا محبت، سراپا خلوص، سراپا مقابہت۔ ان کے ہاں شاعروں اور ادیبوں کا جاؤ رہتا ہے۔ دانشور بھی آتے ہیں۔ مگر دانشور ہیں، دانا نہیں۔ سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اردو بہت سخت جان ہے۔ دانشوروں کو اردو کا مستقبل غیر تاریک دکھائی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ سنا ہے ایک مشاعرے میں تو تیس ہزار سے زیادہ سامعین تھے۔ صاحب، مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کہ جو شعریک وقت پانچ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آجائے وہ شعر نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور شے ہے! بے شمار سالانہ سمپوزیم اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ سنا ہے کئی اردو ادیبوں کو پدم شری اور پدم بھوشن کے خطاب مل چکے ہیں۔ میں نے کئیوں سے پدم اور بھوشن کے معنی پوچھے تو جواب میں انہوں نے وہ رقم بتائی جو خطاب کے ساتھ ملتی ہے! آج بھی فلمی گیتوں، ذومعنی ڈائلاگ، قولی اور آپس کی مادیہیت کی زبان اردو ہے۔ سنسکرت الفاظ پر بہت زور ہے۔ مگر آپ عام آدمی کو سنسکرت میں کمالی نہیں دے سکتے۔ اس کے لیے مخاطب کا پنڈت اور ودوان ہونا ضروری ہے۔ صاحب، بقول شخصے، کمالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ تو اپنی مادری زبان میں ہی مزہ دیتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اردو والے کافی پُر امید ہیں۔ شقیں ہندی الفاظ بولتے وقت اندرا گاندھی کی زبان لڑکھاتی ہے تو اردو والوں کی کچھ آس بندھتی ہے۔

کون ٹھہرے سے کے دھارے پر

نشور واحدی اسی طرح تپاک اور محبت سے ملے۔ تین چار گھنٹے گپ کے بعد جب بھی میں نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا کہ اب چلنا چاہیے تو ہر بار ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا۔ میراجی بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی طرح روکتے رہیں۔ حافظہ خراب ہو گیا ہے۔ ایک ہی نشست میں تین چار دفعہ آپ کے بارے

میں پوچھا ”کیسے ہیں؟ سنا ہے مزاحیہ مضامین لکھنے لگے ہیں۔ بھٹی حد ہو گئی!“ منحنی اور روگی تو، آپ جاتے ہیں، سدا کے تھے۔ وزن پچھتر یونڈ رہ گیا ہے۔ عمر بھی اتنی ہی ہوگی۔ چہرے پر ناک ہی ناک نظر آتی ہے۔ منحنی پہ یاد آیا، کانپور میں چنیا کیلے، اسی سائز کے، اب بھی ملتے ہیں۔ میں نے خاص طور سے فرمائش کر کے منگوائے۔ مایوسی ہوئی۔ اپنے سندھ کے چتئی دار کیلوں کے آس پاس بھی نہیں۔ ایک دن میرے منہ سے نکل گیا کہ سرگودھے کا مالٹا، ناکیپور کے سنترے سے بہتر ہوتا ہے تو نشور تڑپ کے بولے، یہ کیسے ممکن ہے؟ ویسے نشور ماشاء اللہ جاق چوبند ہیں۔ صورت بہت بہتر ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ آگے کو نکلے ہوئے ہنس کی پوتھی جیسے اوڑھکاڑ دانت سب گر چکے ہیں۔ آپ کو تو یاد ہو گا، ٹرینا ایکٹرس کیا قیامت مگاتی تھی۔ مگر لمبے دانت سارا مزہ کر کر کر دیتے تھے۔ سنا ہے ہمارے پاکستان آنے کے بعد سامنے کے ٹکڑا دیے تھے۔ ایک فلمی رسالے میں اس کا حالیہ فوٹو دیکھا تو خود پر بہت غصہ آیا کہ کاہے کو دیکھا۔ پھر اسی ڈر کے مارے اس کے ریکارڈ نہیں سنے۔ اعجاز حسین قادری کے پاس اس زمانے کے سارے ریکارڈ جمع بھونپو والے گراموفون کے ابھی تک محفوظ ہیں۔ صاحب، یقین نہیں آیا کہ یہ ہمارے لیے جدید سائینس، موسیقی اور سامانِ عیش کی انتہا تھی! انہوں نے اس زمانے کے سُرنگیت سمرات سیکل کے دو تین کانے سنائے۔ صاحب، مجھے تو بڑا شاک ہوا کہ آنہانی کے ناک سے کانے ہوئے کانوں سے مجھ پر ایسا رومانی لرزہ کیسے طاری ہو جاتا تھا۔ موتی میٹم کامنہ بھجرا کر بالکل کشمیش ہو گیا ہے۔ نشور کہنے لگے، میاں! تم اوروں پہ کیا ترس کھاتے پھرتے ہو۔ ذرا اپنی صورت تو، ۴۷ کے پاسپورٹ فوٹو سے ملا کے دیکھو۔

کون ٹھہرے سے کے دھارے پر
کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

کوئی کل ہند مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جس میں نشور نہ بلائے جائیں۔ غالباً کسی شاعر کو استعا معاوضہ نہیں ملتا جتنا انہیں ملتا ہے۔ بڑی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ گھر میں فرنیچر بھی ہے۔ مگر اپنی دیرینہ وضع پر قائم ہیں۔ طبیعت معمول پر تھی۔ یعنی بہت خراب۔ میں ملنے جاتا تو بان کی کھری چارپائی پر لیٹے سے اٹھ بیٹھتے اور تمام وقت بنیان پہنے تکیے پر اکڑوں بیٹھے رہتے۔ اکثر دیکھا کہ بیٹھ پر چارپائی کے بانوں کا نالی دار پیٹرن بننا ہوا ہے۔ ایک دن میں نے کہا کہ پلیٹ فارم پر جب اناؤنس منٹ ہوا کہ ٹرین اپنے نر دھارت سے سے ڈھائی گھنٹہ و لمبھ سے پرویش کر رہی ہے تو بخدا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹرین کیا کر رہی ہے۔ آ

رہی ہے یا جا رہی ہے۔ یا ڈھائی گھنٹے سے محض کھلیں کر رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ نشور بگڑ گئے۔ جوشِ سیان میں تکیے پر سے بار بار پھسلے پڑتے تھے۔ ایک مشتعل لمحے میں زیادہ پھسل گئے تو بانوں کی جھری میں پیر کے اناٹوٹھے کو گھائی تک پھنسا کے فٹ بریک لگایا اور ایک دم تن کے بیٹھ گئے۔ کہنے لگے ”ہندوستان میں اردو کو مٹانا آسان نہیں۔ پاکستان میں پانچ برس میں اتنے شاعرے نہیں ہوتے ہوں گے جتنے ہندوستان میں پانچ مہینے میں ہو جاتے ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کا مجمع تو گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اچھا شاعر بآسانی پانچ سات ہزار پیٹ لیتا ہے۔ کرایہ ریل، قیام و طعام اور داد اس کے علاوہ۔ جوش نے بڑی جلد بازی کی۔ ناحق چلے گئے۔ اب پچھتاتے ہیں۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ جوش کو سات آٹھ ہزار روپے ماہوار۔۔۔ اور کار۔۔۔ دو بینکوں اور ایک انشورنس کمپنی کی طرف سے مل رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے مشاہرہ اور مکان علاحدہ کو کہ اس کی نوعیت و وظیفہ عتاب کی سی ہے۔

ترنم میں اب نشور کی سانس اُکھڑ جاتی ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔ مگر آواز میں اب بھی وہی سوز اور ملک ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وہی چمک۔ تیور اور لہجے میں وہ کھرج اور نڈر پن جو صرف اس وقت آتا ہے جب آدمی زرہی نہیں، زندگی اور دنیا کو بھی پیچ سمجھنے لگے۔ دس بارہ تازہ غزلیں سنائیں۔ کیا کہنے! منہ پر آتے آتے رہ گئی کہ ڈیخرز لگا کر سنائیے۔ آپ نے تو انہیں بار بار سنا ہے۔ ایک زمانے میں ”یہ باتیں راز کی ہیں قبلہ عالم بھی پتے ہیں!“ والی غزل سے سارے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ مگر اب ”دولت کبھی ایماں لانا سکی، سرمایہ مسلمان ہونہ سکا“ والے اشعار پر داد کے ڈونکرے نہیں برستے۔ سننے والوں کا مزاج بدلا ہوا ہے۔ سکوتِ سامعین بھی ایک نوع کی بے صدا ہونگ ہے۔ اگر استاد داغ یا نواب سائل دہلوی بھی آج اپنی وہ توپ غزلیں پڑھیں جن سے ستر اسی برس قبل چھتیں اڑ جاتی تھیں تو سامعین کی بدذوقی سے تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر اب نشور کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ شاعرے اب بھی لوٹ لیتے ہیں۔ سدا کے ملنگ ہیں۔ کہہ رہے تھے، اب کوئی تنہا، کوئی حسرت باقی نہیں۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ بیمار، نحیف و نزار، مفلوک الحال اور مطمئن و مسرور ہی دیکھا۔ ان کے وقار و ٹکنت میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ اہل ثروت سے کبھی پچک کے نہیں ملے۔ صاحب، یہ نسل ہی کچھ اور تھی۔ وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے جن میں یہ آشفتمے مزاج کردار ڈھلتے تھے۔ بھلا بتائیے، اصغر گوندوی اور جگر مراد آبادی سے زیادہ مدّخ اور خوددار اور کون ہو گا۔ وسیلہ معاش؟ عینکیں بیچنا! وہ بھی دکان یا اپنے ٹھیلے پر نہیں۔۔۔ جہاں بھی پیٹ کا دھندالے جائے۔ نشور سے میری دوستی تو ابھی حال میں چالیس پچاس برس سے ہوئی ہے۔ ورنہ اس سے قبل دوسرا ہی رشتہ تھا۔ میں نے

قصائیوں کے محلے میں واقع مدرسہ ضیاء الاسلام میں فارسی ان ہی سے پڑھی تھی۔ اور ہاں! اب اس محلے کے قصائی پوتہ کی اچکن اور سرخ پیٹنٹ لیدر کے پمپ شوز نہیں پہنتے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اپنی برادری کا مروتہ لباس ترک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا۔ دوبارہ رشوت دینے کو بجی چاہتا ہے!

جانے پہچانے بازار اب پہچانے نہیں جاتے۔ پر ایسے خلیق دکاندار نہیں دیکھے۔ بچے جاتے تھے۔ دکان میں قدم رکھتے ہی ٹھنڈی بوتل ہاتھ میں تھما دیتے۔ مجھے ایسی ظالم سیلزمین شپ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ بوتل پی کے دکان سے خالی ہاتھ نکلنا بڑی بے غیرتی کی بات معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ سیلزمینوں کی پسند کی چیزیں خریدنا چلا گیا۔ اپنی ضرورت اور فرمائش کی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے ہی نہیں رہے۔ یقین نہیں آیا کہ جہاں اس وقت دھکم پیل، چٹخم دھاڑ مچ رہی ہے اور بدبوؤں کے گولے منڈلا رہے ہیں، یہ وہی کشادہ، صاف ستھری مال بلکہ دی مال ہے۔ صاحب، انگریز نے ہر شہر میں دی مال ضرور بنائی، فیشن اسبل، اونچی دکانوں والی مال۔ زرداروں کی زرگز رہیں۔ ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مال کے کنارے کافی دور تک بیول کی چھال بچھی ہوتی تھی، تاکہ کو توال کے لونڈے کے گھوڑے کو ڈلکی چلنے میں آسانی رہے۔ دائیں بائیں دو سائیس تنگے پیر ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے کہ لونڈا گر نہ جائے۔ وہ ہانپنے لگتے تو وہ ہنسی سے دُہرا ہو جاتا۔ ہماری اس سے شناسائی ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ہم پندرہ بیس دوستوں کو بہرائچ کے پاس اپنے گاؤں شکار پر لے گیا۔ ہر پانچ افراد کے لیے ایک علیحدہ خیمہ۔ خیموں کے عقب میں ایک موڑب فاصلے پر شاگرد پیشہ کی چمولاہاری۔ ہم خیمے ہی میں شب باش ہوتے۔ کیا بتاؤں جنکھل میں کیسے عیش رہے۔ ایک رات مجرا بھی ہوا۔ صورت اتنی اچھی تھی کہ بخدا غلط تلفظ پر بھی پیار آنے لگا۔ پیشہ ور شکاری روزانہ شکار مار کے لے آتے تھے جسے باورچی لکڑیوں اور چمپنیوں کی آگ پر بجھتے۔ ہمارے ذمے تو صرف ہضم کرنا اور یہ بتانا تھا کہ کل کون کس جانور کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ سانجھ کا گوشت پہلے پہل وہیں چکھا۔ آخری شام چار بھنے ہوئے سالم کالے ہرن دسترخوان پر سجا دیے گئے۔ ہر ہرن کے اندر ایک قاز اور قاز میں تیترا اور تیترا کے پیٹ میں مرغی کا انڈا۔ ہماری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کھاتے کیا خاک۔ کانپور کا وہ راشی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش اخلاق، ملنسار اور میٹھا پائیں گے۔ اس واسطے کہ وہ نخوت، سخت گیری اور بد مزاجی انورڈ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لڑکے نے کچھ کر کے نہیں دیا۔ جگر کے

سروس میں مرا۔ اس کا چھوٹا بھائی پاکستان آگیا۔ لوگوں نے کہہ سُن کے ماری پور کے اسکول میں ٹیچر لگوا دیا تھا۔ کوئی تین برس ہوئے میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا میں بی ٹی نہیں ہوں۔ قلیل تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ سعود آباد سے ماری پور جاتا ہوں۔ دو جگہ بس بدلنی پڑتی ہے۔ آدھی تنخواہ تو بس کے کرائے میں نکل جاتی ہے۔ اپنے ہاں منشی رکھ لیجیے۔ اس کی تین جوان بیٹیاں کنواری بیٹھی تھیں۔ ایک کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ وہ جل کر مر گئی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ خود اسے دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے، جنہیں اس نے اسکول والوں سے چھپایا، ورنہ وہ گئی گزری ملازمت بھی جاتی رہتی۔

کو تو وال سارے شہر کا، غنڈوں سمیت، بادشاہ ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ جسے چاہے ذلیل کر دے۔ صاحب، مرزا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سال کے پوست کندہ حالات پڑھنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تین ٹکے ایسے ہیں جو روزِ اول سے بے ایمان ہیں۔ اول پولیس، دوم پنی ڈیلیوڈی، سوم انکم ٹیکس۔ اب ان میں میری طرف سے اینٹی کرپشن کے ٹکے کا اضافہ اور کر لیجئے۔ یہ صرف رشوت لینے والوں سے رشوت لیتا ہے۔ رشوت ہندوستان میں بھی خوب چلتی ہے۔ مجھے بھی تھوڑا بہت ذاتی تجربہ ہوا۔ مگر صاحب! ہندو رشوت لینے میں بھی ایسی مرتا (انکسار)، ایسا اخلاق اور اعتدال برتنا ہے کہ واللہ دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔

اور صاحب، عز و انکسار کا یہ حال کہ کیا ہندو کیا مسلمان، کیا بوڑھا کیا جوان، سب بڑی مرتا سے ہاتھ جوڑ کر سلام پر نام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر تقریر سے پہلے اور تقریر کے بعد اور بڑے سے بڑا سنگیت سمرٹ بھی کئے راک کمانے سے پہلے اور کمانے کے بعد انتہائی عاجزی کے ساتھ سامعین کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے بگوش و بچشم خود ایک مشاعرے میں حضرت علی سردار جعفری کو دس بارہ طویل نظمیں سننے کے بعد ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈائس سے اترتے دیکھا۔ (خیر، ایسی واردات کے بعد تو ہاتھ جوڑنے کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے۔)

بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ ذیل حاجی، ماتھے پر گنفا، مگر ہر قصے میں طوائف کو ضرور کاشوں میں گھسیٹتا ہے۔ کیا کروں۔ ہماری نسل تو ترستی پھوکتی ہی بوڑھی ہو گئی۔ اُس زمانے میں طوائف ادب اور اعصاب پر بُری طرح سوار تھی۔ کوئی جوانی اور کہانی اس کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ رنڈی واحد پرائی عورت تھی جسے آپ منظر بھر کے دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ ہر وہ عورت جس سے نکاح جائز ہو، منہ ڈھانکے رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اب طوائفوں نے گریہستوں کے سے شریفانہ لباس اور وضع قطع اپنالی ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ نیک بختو! اسی چیز سے تو گھبرا کے دکھیا تمہارے پاس آتے تھے۔ گریہستی پاکیزگی اور یک رنگی سے اکتائے ہوئے لوگ اجنبی بدن سرائے میں راتِ براتِ بسرام کے لیے آجاتے تھے۔ سو یہ آسرا بھی نہ رہا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مول کنج میں بازارِ حُسن ہوا کرتا تھا۔ زمانے بھر کی دُرُ دُرُ ہُش کے بعد طوائفوں نے اب روٹی والی گلی میں پناہ لی ہے۔ بازار کاہے کو ہے، بس ایک گٹر ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پچاس برس قبل میں اور میاں تجمل حسین دیوار کی طرف منہ کر کے سنج سے اترتے کباب کھایا کرتے تھے۔ جیسے چٹھارے دار کباب طوائفوں کے محلے میں ملتے تھے، کہیں اور نہیں دیکھے۔ سوائے لکھنؤ کے مولوی محلے کے۔ مگر اب بھی غضب کے ہوتے تھے۔ اور ہاں! آپ کے لیے اسلم روڈ کا ایک بالکل کبابیا ڈسکور کیا ہے۔ آپ کے لندن جانے سے پہلے بانگی پیش کروں گا۔ صاحب، کباب میں نے باہر کا اور پان بیسٹہ گھر کا کھایا۔ آپ نے کبھی طوائف کے ہاتھ کی کھوری کھائی ہے؟ مگر آپ تو کہتے ہیں کہ اپنے ختنوں پر مجرے کے بعد آپ نے رنڈی کا ناچ ہی نہیں دیکھا۔ اور برسوں اسی امپریشن میں رہے کہ مجرای کھنے سے پہلے ہر دفعہ اس مرحلے سے گزرنا ضروری ہے! رنڈی کے ہاتھ کا پان کبھی نہیں رچتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڈھوں، بھڑبھڑیوں اور شاعروں کو پان نہیں رچتا۔ مگر آپ ناچیز کے ہونٹ دیکھ رہے ہیں۔ آداب! میاں تجمل گھر جانے سے پہلے رگڑ رگڑ کے ہونٹ صاف کرتے اور کباب اور پیاز کے بھجکے کو دبانے کے لیے چٹنان کی گولی پُوستے۔ حاجی صاحب (ان کے والد) چینیٹ سے تازہ ولایت تھے اور سنج کے کباب اور پان کو یوپی کی عیاشیوں میں شمار کرتے تھے۔ کہتے تھے، برخوردار! تمہیں جو کچھ کرنا ہے میرے سامنے کرو۔ لیکن بالفرض محال ان کے سامنے یہ شغل کیا جاتا تو کلہاڑی سے سہ بھاڑ دیتے جو ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کہ وہ ایک عرصے سے بطور ورزش روزانہ بعد نماز فجر دس سیر لکڑی پھاڑتے تھے۔ آندھی پانی ہو تو مردانہ میٹھک میں دس دس سیر کے رنگین منگد رکھما لیتے۔ وہ چینیٹ سے تلاشِ معاش کے لیے نکلے تو ان کے والد یعنی

میاں تجمل کے دادا نے انہیں راہِ راست سے بھٹکنے سے باز رکھنے کے لئے ایک ہزار دانہ (تسبیح)، ایک جوڑی منگدر، کلہاڑی اور بیوی زاد سفر میں ساتھ کر دی۔ اور کچھ غلط نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان آلات سے شغل کرنے کے بعد بدی تو ایک طرف رہی، آدمی نیکی کرنے کے لائق بھی نہیں رہتا۔

مگر خدا را! آپ میری باتوں سے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھئے گا۔ بار بار طوائف اور کوٹھے کا ذکر آتا ہے۔ مگر تمام ہو گئیں حل مشکلات کوٹھے پر، والا معاملہ نہیں۔ خدا گواہ ہے، بات کبھی پان اور کباب کھانے اور کوٹھے پر جانے والوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے سے آگے نہ بڑھی۔ کبھی کبھی میاں تجمل بڑی حسرت سے کہتے کہ یار! یہ لوگ کتنے دلکی ہیں! ان کے بزرگ یا تو فوت ہو چکے ہیں یا نایاب ہیں۔

بات یہ ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ نئی پور پر جوانی آتی تو بزرگ نسل دوانی ہو جاتی تھی۔ سارے شہر کے لوگ ایک دوسرے کے چال چلن پر پہرہ دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

بزرگ قدم قدم پر ہماری ناقابلِ استعمال جوانی کی چوکیداری کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری لغزشوں اور غلطیوں کو پکڑنے کے لیے اپنا سارا بڑھاپا چوکنے و کٹ کیپر کی طرح حالتِ رکوع میں گزار دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر یہی کچھ ہوتا تھا تو ہم جوان کاہے کو ہوئے ہیں!

صاحب، اپنی توساری جوانی دوانی ڈسٹر پلینے اور بھینسن کا دودھ پینے میں ہی گزر گئی! اب اسے دوانہ پن نہیں تو اور کیا کہیں؟

کھلی آنکھوں سے گانا سننے والے

میرے والد، اللہ بخشتے، تھیٹر اور گانے کے رسیا تھے۔ ایسے ویسے! جب موج میں ہوتے اور بیٹھک میں بار مونیم بجاتے تو رستہ چلتے لوگ کھڑے ہو جاتے۔ بجاتے میں آنکھیں بند رکھتے۔ اس زمانے میں بازوق سننے والے بھی گانا سنتے وقت آنکھیں بند ہی رکھتے تھے تاکہ توجہ صرف سُر پر مرکوز رہے۔ البتہ طوائف کا گانا کھلی آنکھوں سے سننا جائز تھا۔ استاد بُند و خاں کی طرح والد کے منہ سے کبھی کبھی بے اختیار گانے کا بول نکل جاتا جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ ویسے باقاعدہ گاتے بھی تھے، مگر صرف اس کے سامنے جو خود بھی گاتا ہو۔ یہ اس زمانے کے شرفا کا دستور تھا۔ شاہد احمد دہلوی بھی یہی کرتے تھے۔ آپ نے تو والد کا بالکل آخری زمانہ دیکھا جب وہ صاحبِ فراش ہو

چکے تھے۔ جوانی میں ہیرا بانی کے کانے کے دلدادہ تھے۔ دادر کنٹھیا تھی، یعنی دو سُرور میں قیامت ڈھاتی تھی۔ بیشتر مجرئی، میرا مطلب ہے بیٹھ کر مگاتی تھی۔ سومیل کے دائرے میں کہیں اس کا کانٹا ہو، وہ سارا کام دھندل چھوڑ کر پہنچ جاتے۔ اتفاقاً کسی محفل میں نہ پہنچ پائیں تو وہ خود بھی بے کیف سی رہتی۔ راجستھانی مانڈ اور بحیر وٹھاٹھ صرف ان ہی کے لیے مگاتی تھی۔ دھیوت اور رکھب سُرور کو لگاتے وقت ذرا تھم تھم کے انہیں جھلناتی تو ایک سماں باندھ دیتی۔ جیسی چونچال طبیعت پائی تھی ویسی ہی کائی کی تھی۔ درباری کاتے کاتے کبھی چونچل سُرکھا دیتی تو ساری محفل پھوٹ اٹھتی۔ آپ کو تو بخوبی علم ہے، والد گھر کے رئیس نہیں تھے۔ عمارتی لکڑی کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میری موجودہ دکان کی ایک چوتھائی سمجھیے۔ بس کام چلاؤ۔ لکڑی منڈی میں کسی کی دکان تین دن تک بند رہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ کسی قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ چوتھے دن بند رہنے کا مطلب تھا کہ خود اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن والد صاحب کی دکان سات دن بھی بند رہے تو لوگ فکر مند نہیں ہوتے تھے۔ سمجھ جاتے کہ ہیرا بانی سے اپنے حسن سماعت کی داد لینے گئے ہیں۔ تاہم ان کے بندے ہوئے کھاگ لکڑی انہیں سے خریدتے تھے۔ ہفتے ہفتے بحر واپسی کا انتظار کرتے۔ بلکہ آخر آخر تو یہ ہوا کہ تین چار ماہوں کو بھی چاٹ لگادی۔ وہ بھی ان کی اردلی میں ہیرا بانی کا کانٹا سننے جانے لگے۔ جب انہیں پوری طرح چسکا لگ گیا تو سواری کا انتظام، سہرا گمانے پر میل، اور ہر اچھے شرعیام کی پر روپیہ دینے کے فرائض بھی انہیں کو تفویض کر دیئے۔ ہیرا بانی روپیہ ان سے لیتی، سلام والد کو کرتی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ان ڈکھیاروں کو موسیقی کی بھی کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہوئی یا نہیں، لیکن آخر میں وہ لکڑی خریدنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ ایک نے تو دو والا نکالنے کے بعد ہارمونیم مرمت کرنے کی دکان کھول لی۔ دوسرا اس لائق بھی نہ رہا۔ قرض خواہوں سے آبرو بچا کر بھئی چلا گیا جہاں بغیر ٹکٹ کے روز تھیٹر دیکھتا اور مختار میکم اور ماسٹر مٹار کا گانا سنتا تھا، مطلب یہ کہ تھیٹر میں پردہ کھینچنے کے آئری بری فرائض انجام دینے لگا۔ دن میں ٹرکی ٹوپی کے پھندے بیچتا تھا۔ سنا ہے اس زمانے میں داؤد سیٹھ بھی بھئی میں پھندے بیچا کرتا تھا، حالانکہ اس نے تو ہیرا بانی کا کانٹا بھی نہیں سنا تھا۔

اور یہ جو آپ ٹھمری، دادرے اور خیال میں ناچیز کا درک اور شغف دیکھ رہے ہیں، یہ باوا ہی کا فیضان ہے۔ اقبال بانو، ثریا ملتانیکر اور فریدہ خانم اب میری صورت پہچانتے لگی ہیں۔ مگر میاں جمل کہتے ہیں کہ صورت سے نہیں، تمہارے سفید بالوں سے پہچانتی ہیں! ارے صاحب، گزشتہ سال جو ڈانس ٹروپ آیا تھا، اس کے شو میں خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزار آدمی تو ہوں گے۔

میاں تجمل کا ٹکٹ بھی مجھی کو خریدنا پڑا۔ تیسرا حج کرنے کے بعد انہوں نے اپنے پیسے سے ناچ کاٹا اور سنہیا دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ کہنے لگے ’اس جم غفیر و پُر تقصیر میں ایک آدمی بھی تم جیسا نہیں۔‘ میں نے شکریہ ادا کیا ”آداب!“ بولے ”میرا مطلب ہے تمہاری طرح جھڑوس نہیں۔ ایک آدمی نہیں جس کے تمام بال اور بھوس تک تمہاری طرح سفید ہوں۔ بھائی میرے! یا تو انہیں کالے کر لویا ڈانس مجرے سے توبہ کر لو۔“ میں نے کہا ”بھائی تجمل! روسیابی کے لیے تمہارے ساتھ اس کوچہ ملاست کا طواف میرے لئے کافی ہے۔ میں سیک وقت اپنا منہ اور بال کالے نہیں کرنا چاہتا۔“

کوئی نماز اور مجرا قضا نہیں کیا

ویسے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ والد نیک طینت، پابند صوم و صلوٰۃ اور پاکباز آدمی تھے۔ بحمد اللہ! ہم سب بھائی بہن پنج و تہہ غازی ہیں۔ یہ بھی انہی کا فیضان ہے۔ انہوں نے کبھی کوئی نماز اور مجرا قضا نہیں کیا۔ ۲۳-۱۹۲۲ کا ذکر ہے۔ جب ایک پارسی تھیٹر ٹیکل کمپنی پہلے پہل کانپور آئی تو ایک مہینے تک ایک ہی کھیل روزانہ۔۔۔ بلاناغہ۔۔۔ اس طرح دیکھا گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ چند ہی روز میں تھیٹر والوں سے ایسے کھل مل گئے کہ ڈائلاگ میں تین چار جگہ حسب منشا تبدیلی کرائی۔ ایک موقع پر داغ کے بجائے استاد ذوق کی غزل راگ ایمن کلیان میں گوائی۔ پیو کو سمجھایا کہ تم ڈائلاگ کے دوران سیک وقت آنکھیں بھی مٹکاٹی ہو اور کراؤ کو لٹھے بھی۔ موقع کی مناسبت سے تینوں میں سے صرف ایک مہلک، ہتھیار کا انتخاب کر لیا کرو۔ دوسرے ہیر و کوا سٹیج پر پہننے کے لیے اپنا صاف پاجامہ دیا۔ میزجر کو آکھا کیا کہ تم نے جس شخص کو لیلیٰ کا باپ بنایا ہے، اس کی عمر مجنوں سے بھی کم ہے! مصنوعی داڑھی کی آڑ میں وہ لیلیٰ کو جس نظر سے دیکھتا ہے اسے پدرانہ شفقت ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ ایک دن پیشی ماسٹر درد گردہ سے منڈھا ہوا گیا تو ہمارے باوا ہارمونیم بجانے بیٹھ گئے۔ عطر حنا میں بسا ریشمی رومال سر پر ڈال لیا۔ اور فرض کر لیا کہ کوئی نہیں پہچانے گا! سرخی مائل سپید رنگ۔ سپید چمک دار دانت۔ پتلے ہونٹ۔ کم ہنستے تھے، مگر جب ہنستے تو رخساروں پر سرخی اور آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگتے۔ ہر لباس ان پر پھبتا تھا۔ چنانچہ شیریں بات تو فرادے کرتی، لیکن نظریں ہمارے باوا پر ہی جمائے رکھتی تھی۔

تھیٹر سے ان کا یہ شغف والدہ کو شاق گزرتا تھا۔ ہم بہن بھائی سیانے ہو گئے تو ایک دن والدہ نے ان سے کہا کہ ”اب تو یہ شوق چھوڑ دیجیے۔ اولاد جوان ہو گئی ہے۔“ کہنے لگے ”سیلم!“

تم بھی کمال کرتی ہو۔ جوان وہ ہوئے ہیں اور نیک چلنی کی تلقین مجھے کر رہی ہو!“

انہیں یہ شوق جنون کی حد تک تھا۔ آغا حشر کاشمیری کو شیکسپیر سے بڑا ڈرامہ نگار سمجھتے تھے۔ اس موازنے میں دانستہ ڈنڈی مارنے یا تعصب کو ذرا دخل نہ تھا۔ انہوں نے سرے سے شیکسپیر پڑھا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ اپنے دوست پنڈت سورج نرائن شاستری سے اس بات پر لڑ مرے کہ داغ دہلوی کالی داس سے بڑا شاعر ہے۔ دورانِ موازنہ، دلیل میں زور پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کالی داس کو ایک ناقابلِ بیان کالی بھی دی جس کا پنڈت جی پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور انہوں نے (پنڈت جی نے) نواب سائل دہلوی جانشین داغ تک کو کالی داس سے بڑا تسلیم کرنے کے لیے از خود آمادگی ظاہر کی۔ جس دن آغا حشر کاشمیری کے انتقال کی خبر آئی تو والد کی جیبی گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ دکان پر خریداروں کا جھوم تھا۔ مگر اسی وقت دکان میں تالا ڈال کے گھر آ گئے۔ دن بھر منہ اوندھائے پڑے رہے۔ پنڈت جی پُر سا دینے آئے تو چادر سے منہ نکال کے بار بار پوچھتے، پنڈت جی! مختار مسکیم * کا کیا بنے گا؟ پہاڑ سی جوانی کیسے کٹے گی؟ آخر کے تیش پنڈت جی نے جواب دیا، خاں صاحب، (وہ والد کو نہ جانے کیوں ہمیشہ خاں صاحب ہی کہتے تھے) ہر پہاڑ کو کوئی نہ کوئی تیشہ بردار فہاد مل جاتا ہے۔ کلا کا سہاگ بھی کبھی اُبڑا ہے؟ اس کی مانگ تو سدا سیندور اور ستاروں سے بھری رہے گی۔ والد جیسے ہی صبح گھر میں غم زدہ اور دل گرفتہ داخل ہوئے، برآمدے کی چھین ڈال دیں اور والدہ سے کہا ”مسکیم، ہم لٹ گئے۔ آج گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔“ سر شام ہی قلاتنہ کھا کے سو گئے۔

پنڈت جی موسیقی سے قطعاً ناہلہ تھے، لیکن بلا کے ادا شناس اور اتنے ہی غم گسار۔ دوسرے دن صبح تڑکے والد صاحب سے بھی زیادہ دل گرفتہ اور غم زدہ صورت بنا لئے، آہیں بھرتے آئے۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔ گھر سے حلوہ پوری اور کاشی پھل کی ترکاری بنوا کر لائے تھے۔ والد کو ناشتہ کروایا۔ ہمیں تو اندیشہ ہو چلا تھا کہ والد کے ڈر کے مارے پنڈت جی کہیں بھدرا (+) نہ کروالیں۔

* جو آغا حشر کی منظورِ منظر مغنیہ تھیں۔

(+) ہندو رسم کے مطابق قریبی عزیز کے کریا کرم کے بعد سر کے بال، بھوس، داڑھی اور مونچھ منڈوانا۔

آسمان سے اُترا، کوٹھے پہ اٹکا

معاف کیجیے، یہ قصہ شاید میں پہلے بھی سنا چکا ہوں۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟ ہر بار تفصیلات میں کچھ فرق آجائے تو حافظے کا قصور ہے۔ غلط بیانی مقصود نہیں۔ باوا سے کبھی ہم ٹانگ دیکھنے کی فرمائش کرتے تو وہ منیجر کو رقعہ لکھ دیتے کہ بچوں کو بھیج رہا ہوں۔ اگلی سیٹوں پر جگہ دیجیے۔ بعد کو تو میں خود ہی رقعہ لکھ کے باوا کے دستخط بنا دیتا تھا۔ یہ بات ان کے علم میں تھی۔ اس لیے کہ ایک دن جھنجھلا کر کہنے لگے ”جعلی دستخط بناتے ہو تو بناؤ، کم از کم املا کی غلطیوں سے تو مجھے رُسوانہ کرو۔ صحیح لفظ ’براہ کرم‘ ہے، ’برائے کرم‘ نہیں۔“ ہمیشہ میٹنی شومیں بھیجتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میٹنی شومیں کھیل کا مغرب اخلاق اثر، ٹکٹ کی قیمت کی طرح، آدھا رہ جاتا ہے۔ سب مجھے پتہ سمجھتے تھے، مگر اندر قیامت کی کھد بد مچی تھی۔ مٹی بائی جب اسٹیج پر مکتی تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ وہ داغ والی مٹی بائی حجاب نہیں جس پر انہوں نے پوری مثنوی لکھ ڈالی۔ غضب کی آواز، ہلاکی خوبصورت۔ پلک جھپکنے، سانس بھی لینے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے بھی خلل واقع ہوتا تھا۔ کیا شعر ہے وہ اچھا سا؟ ”وہ مخاطب بھی ہیں، قریب بھی ہیں۔“ آپ کو تو یاد ہو گا۔

(لقمہ) ان کو دیکھوں کہ ان سے بات کروں

شکریہ۔ صاحب، حافظہ بالکل چوہٹ ہو گیا۔ محفل میں اول تو شعریاد نہیں آتا، اور آج بھی جائے تو پڑھنے کے بعد پتر چلتا ہے کہ بالکل بے محل تھا۔ جیسا کہ اس وقت ہوا۔ دُنی خُفت ہوتی ہے۔ اس وقت دراصل ”مظاہرے کو یہ جنبش مرثماں بھی بار ہے“ والا شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ خیر، پھر کبھی۔ اس دن آپ نے بڑے تجربے کی بات کہی کہ پیچن کے بعد صرف ایک مصرع پر قناعت کرنی چاہئے۔ تو صاحب، جس وقت مٹی بائی استاد داغ کی غزل مکتی تو نہ اسے ہوش رہتا، نہ سننے والوں کو۔

ایک جوش تھا کہ محو تماشا لے جوش تھا

مانا کہ داغ بحیثیت عاشق، نرِ ارنید شاہد باز ہے اور اس کا معشوق زنِ بازاری۔ لیکن پیہ لایہ اظہارِ بازاری نہیں۔ زبانِ جمنامیں دھلی قلعة معلیٰ کی ہے۔ محاورہ اور روزمرہ داغ کا اوڑھنا پکھونا ہے۔ مگر غضب یہ کیا کہ بچھانے کی چیز کو اوڑھ کر بسترِ صلائے عام پر دراز ہو گئے۔ حضرت داغ جہاں لیٹ گئے لیٹ گئے۔ بقول آپ کے مرزا عبد اللہ و دیگ کے، کلامِ داغ آسمان فصاحت سے

اترا، کوٹھے پہ اٹھا۔ وہاں سے پھسلا تو کوٹھے پہ آ کے مٹکا۔ لیکن یہ فراق گورکھ پوری کی سراسر زیادتی ہے کہ ”اس شخص نے حرمزدگی کو genius کا مقام عطا کر دیا!“ آپ نے تو خیر وہ زمانہ نہیں دیکھا، مگر آج بھی۔۔۔ کسی بھی محفل موسیقی میں۔۔۔ داغ کی غزل پٹ نہیں سکتی۔ دیکھنے والوں نے داغ کی مقبولیت کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب مولانا عبد السلام نیازی جیسے عالم بے بدل کو شاعری کا شوق چڑایا تو داغ کے شاگرد ہو گئے۔ عقیدت کا یہ عالم کہ کوئی استاد کا شعر پڑھتا تو سبحان اللہ کہہ کر وہیں سجدے میں چلے جاتے! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ”زہر عشق“ میں مٹی بائی نے داغ کی پانچ غزلیں کائیں۔ پانچوں لاجواب اور پانچوں کی پانچوں بے محل۔ صاحب! سن ۴۷ کے بعد رنڈیاں تو ایسی لگئیں جیسے کسی نے لو کا لگا دیا ہو۔ اب ویسی شائستہ طوائفیں کہاں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اب ویسے قدردان بھی نہیں رہے۔ نہ وہ غزنوی میں مذاق۔۔۔ الخ۔ ارے صاحب! آپ سے اس کم بخت الخ کا مطلب پوچھا تھا۔ آج تک بتا کے نہ دیا۔ اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ آپ کو فارسی بالکل نہیں آتی، تو یہ واقع میں سچ ہے یا محض رسمی کسر نفسی؟

چاندی کا گشتہ اور چنیوٹ کی چلم

خوب یاد آیا۔ ہمارے ایک جانتے والے تھے، میاں نذیر احمد۔ چنیوٹ برادری سے تعلق تھا۔ چمڑے کے کاروبار کے سلسلے میں اکثر بھٹی جاتے رہتے تھے۔ وہاں ریس کا چسکا لگ گیا۔ گھوڑوں سے جو کمائی بچ رہتی، اسی میں غریبامٹو گزر بسر کرتے۔ مکنار طوائف کے ساتھ دوپول پڑھوا لیے تھے۔ حج بیت اللہ کے بعد خود تائب ہوئی سو ہوئی، میاں نذیر احمد کو بھی بہت سی علتوں سے توبہ کروادی۔ اور ان کے دن بھی پھر گئے۔ وہ جو ادھیر عمر میں طوائفوں کی صورت پہ پھٹکار برسنے لگتی ہے اور آواز پھٹا بانس ہو جاتی ہے، وہ کیفیت قطعی نہیں تھی۔ میلاد شریف خوب پڑھتی تھی۔ آواز میں غضب کا سوز تھا۔ جب سفید دوپٹے سے سر ڈھانکے لہک لہک کر جامی کی نعت یا انیس کا مرثیہ پڑھتی تو لجن میں ہزار حلاوتیں، ہزار عقیدتیں گول دیتی۔ ہم چمپ چمپ کر سنتے۔ محرم میں کالے کپڑے اس پر کھبتے تھے۔ پاکستان آگئی تھی۔ برنس روڈ پر ادیب سہارنپوری کے فلیٹ سے ذرا دور چھوٹا سا تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ میاں صاحب جاڑے میں بھی ململ کا کرتا پہنتے اور صبح ٹھنڈے بچ پانی سے غسل کر کے لسی پیتے تھے۔ مشہور تھا کہ فوری طاقت کے ہو کے میں ڈھیر سا رُپ رس یعنی چاندی کا ادھ کچا گشتہ کھا بیٹھے تھے۔ مکنار کی چھوٹی بہنیں مٹی اور پٹنی بھی آفت کا پر کالہ تھیں۔ آپ نے بھی تو ایک دفعہ کسی چھوٹی الاچی اور بڑی الاچی کا ذکر کیا تھا۔ بس کچھ ویسا ہی نقشہ تھا۔ افسوس، اب کھانوں میں بڑی الاچی کا استعمال ختم

ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی مہک، اس کا ذائقہ ہی اور ہے۔ آپ تو خیر بڑی الاچی سے چڑتے ہیں۔ مجھے تو کسی طرف سے بھی کاکروچ جیسی نہیں لگتی۔ تو صاحب، مٹی سیکم کا چہرہ اور بھرے بھرے بازو کچھ ایسے تھے کہ کچھ بھی پہن لے، تنگی تنگی سی لگتی تھی۔ یونوواٹ آئی مین اپنی سیکم فارسی غزلیں خوب ماتی تھی۔ لوگ بار بار فرمائش کرتے۔ وہ بھی عموماً بیٹھ کر ماتی تھی۔ کبھی داد کم ملتی یا یوں ہی ترنگ آتی تو یکایک اٹھ کھڑی ہوتی۔ دونوں سارنگئے اور طبلچی * بھی اپنے اپنے زمین پٹکے کس لیتے اور استاد ہو کر سنگت کرتے۔ محفل میں دو تین چکر رقص لگاتی۔ پھر قلب بساط پر کھڑے ہو کر ایک ہی جگہ پھر کی کی مانند تیزی سے گھومنے لگتی۔ زردوزی کی لشکارا مارتی پشواز ہر چکر کے بعد اونچی اٹھتے اٹھتے تابہ کر پہنچ جاتی۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کا ایک ہالہ رقص میں ہے۔ لے اور گردش تیز، اور تیز ہوتی۔ کرن سے کرن میں آگ لگتی چلی جاتی۔ پھر ناپنے والی منظر نہ آتی۔ صرف ناچ منظر آتا تھا۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلہ پُر ہیچ و تاب

اور جب یکایک رکتی تو پشواز سڈول ٹانگوں پر امر میل کی طرح تر چھی لپٹتی چلی جاتی۔ سازندے باپنے لگتے اور کھرن (+) پر طبلچی کی تیتاتی ہوئی انگلیوں سے لگتا خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔

دیکھیے، میں پھر بھٹک کر اسی لعنت مارے بازار میں جا نکلا۔ آپ نے notes لینے بند کر دیئے۔ بور ہو گئے؟ یا میں واقعات کو دہرا رہا ہوں؟ وعدہ ہے، اب کسی طوائف کو، خواہ وہ کتنی ہی آفتِ جاں کیوں نہ ہو، اپنے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہونے دوں گا۔ صاحب، ہماری تو باتیں ہی باتیں ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

پرسوں آپ لندن چلے جائیں گے۔ میری نے بے ثباتی دنیا پر اپنے ایک شعر میں مجمعِ یاراں کو ”مجلسِ رواں“ کہا ہے کہ یہاں ہر یار سفری اور ہر صحبت گزراں ہے۔ تو صاحب، ذکر میاں نذر

* طبلچی: اس زمانے میں سارنگی اور طبلہ بجانے والے کو سارنگیا اور طبلچی کہتے تھے۔ یعنی طبلہ بجانے کو طبلہ بجانا ہی کہا جاتا تھا۔ طبلہ بجانے والا اپنے ہنر سے شرمندہ نہیں تھا۔ طبلہ کو ”تواز نے“ اور طبلہ نواز کہلانے کی ضرورت ابھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

(+) کھرن: وہ سیاہ حلقہ جو طبلہ پر ہوتا ہے۔

احمد کا ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کانپور کے ۱۰۴ ڈگری ٹمپرچر سے گھبرا کر مٹی کا مہینہ بڑی پابندی سے چنیوٹ کی ۱۰۴ ڈگری کی گرمی میں گزارتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چنیوٹ کی لُو کانپور کی لُو سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں شیکسپیئر کے گیت کی دُرکت بناتے تھے:

Blow, blow thou Chiniot "loo",
Thou art not so unkind
As local specimens of mankind,
Who couldn't care who's who!

میاں صاحب اکثر فرماتے کہ قدرت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ چنیوٹ کی گرمی میں سال بھر کے جمع شدہ فاسد خیالات پسینے کی راہ خارج ہو جاتے ہیں۔ روزے کبھی ریس اور بیماری کی حالت میں بھی نہیں چھوڑے۔ مٹی جون میں بھی ایک ڈلی لاہوری نمک کی چاٹ کر حقے کے معدے تک اتر جانے والے کش سے افطار کرتے۔ پہلے تین چار مرتبہ یو نہی امتحاناً گڑ گڑاتے۔ جیسے سنگت کرنے سے پہلے ستار بجانے والے مضراب سے تاروں کی کساوٹ کو اور طبلمچی ہتھوڑی سے طبلم کے رگ پٹھوں کو ٹھونک بجا کے ٹیسٹ کرتا ہے۔ پھر ایک ہی سسکی بھرے کش میں سارے تمباکو کا انس (ست۔ جان) نکال لیتے، بلکہ اپنی جان سے بھی گزر جاتے۔ سُس سُس سُوع سُوع، سُو سُو وُو وُو۔ وُوہ! ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے۔ ٹھنڈے پسینے آنے لگتے۔ پتلیاں اوپر چڑھ جاتیں۔ پہلے بے ست، پھر بے سدھ ہو کر وہیں کے وہیں پڑے رہ جاتے۔ کلنار انہیں شربت انار پلا کر نماز کے لیے کھڑا کرتی۔ حقے کی نئے پر چنبیلی کے ہار اور نیچہ پر خُس لپٹی ہوتی۔ تمباکو تیز اور کڑوا، بے بنا پسند کرتے تھے۔ قوام لکھنؤ سے منگواتے۔ چاندی کی مہنال دلی کے ایک سادہ کار سے گھڑوائی تھی۔ مٹی کی چلم اور توا (مٹی کی گول ٹکلیا جو تمباکو اور اٹھاروں کے درمیان رکھتے ہیں) ہمیشہ چنیوٹ سے آتا تھا۔ فرماتے تھے، بادشاہو! اس مٹی کی خوشبو الگ سے آتی ہے۔

لاہور میں آج بسنت ہے

میاں ندیر احمد شنکرات کے دن کوڑکڑاتے جاڑے میں ململ کا کرتا پہنے، تنگ سرچھت پر پتنگ ضرور اڑاتے۔ یہ بھی ان کا بھولپن ہی تھا کہ ململ کے کرتے کو جوانی کا سرٹیفکٹ اور اشتہار سمجھ کر پہنتے تھے۔ ہم تین چار لڑکے چوری چھپے ان کی خوشبودار مرواریدی معجونیں فقط مٹھاس کے لالچ میں کھاتے، مگر دل ہی دل میں ان کے معجزانہ اثرات کے ہفتوں منتظر رہتے۔

میاں صاحب لحاف صرف اس وقت اوڑھتے جب ہلہلا کے جاڑے سے بھار چڑھتا۔ یوپی کے جاڑے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حقارت سے کہتے ”بادشاہو! یہ بھی کوئی سردی ہے!“ دراصل لاہور کے جاڑے کے بعد وہ صرف ملیریا کے جاڑے کے قائل تھے۔ آپ کے مرزا عبدالودود میگ بھی تو یہی الزام لگاتے ہیں نا، کہ یوپی کے کلچر میں جاڑے کو رُج کے celebrate کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ جب کہ پنجاب میں گرمی کے اس طرح چوٹنے اور غمزے نہیں اٹھائے جاتے جس طرح یوپی میں۔ صاحب، یوپی میں جاڑے اور پنجاب میں گرمی کو محض سالانہ سزا کے طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ کم و بیش اسی نوع کا فرق برسات میں نظر آتا ہے۔ پنجاب میں بارش کو فقط اس لیے انگیز کرتے ہیں کہ اس کے بغیر فصلیں نہیں اگ سکتیں۔ جب کہ یوپی میں ساون کا واحد مقصد و مصرف یہ نظر آتا ہے کہ کڑھائی چڑھے گی۔ درختوں پر آم اور جھولے لٹکیں گے۔ اور جھولوں میں کنواریاں بالیاں۔ پنجاب میں درختوں پر آم یا کچھ اور لٹکنے کی ایسی خوشی صرف طوطوں کو ہوتی ہے۔

اور اٹکلینڈ میں بارش کا فائدہ جو سال کے ۳۴۵ دن ہوتی ہے (بقیہ بیس دن برف باری ہوتی ہے) آپ یہ بتاتے ہیں کہ اس سے شائستگی اور خوش اخلاقی فروغ پاتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو کالیاں انگریز بصورت دیگر ایک دوسرے کو دیتے وہ اب موسم کو دیتے ہیں۔

شکرات کے دن میاں نذیر احمد بیچ بیچ تو کیا خاک لڑاتے، بس چھ سات پتنگیں کٹوا اور ڈور لٹوا کر اپنا۔۔ اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا۔۔ جی خوش کر لیتے تھے۔ ہر پتنگ کٹوانے کے بعد لاہور کے مانجھے کو بے تحاشا یاد کرتے۔ ارے صاحب، پتنگ کٹتی نہیں تو اور کیا۔ بیچ کانپور میں لڑاتے اور قصے لاہور کے بسنت کے رنگ رنگیلے آسمان کے سناتے جاتے۔ نظر بھی خاصی کمزور ہو چلی تھی، لیکن عینک صرف نوٹ گنتے اور پھلی کھاتے وقت طوعاً و کرہاً لکھ لیتے تھے۔ عینک نہ لگانے کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلتا کہ جس پتنگ کو وہ حریف کی پتنگ سمجھ کر بے تحاشا ”گھینچ“ کرتے، وہ دراصل ان کی اپنی ہی پتنگ نکلتی جو چند لمحوں بعد پہلے ہی مخالف رگڑے سے کٹ کر ہوا میں لاپٹی کی نیت کی طرح ڈانواں ڈول ہونے لگتی۔ ڈور بکایک بلجی پڑ جاتی تو انہیں پتہ چلتا کہ کٹی پتنگ تری، ڈور اب سیٹھا کر۔ میاں صاحب اکثر فرماتے کہ پتنگ اور کنکڑے بنانے میں تو بے شک لکھنؤ والوں کا جواب نہیں، لیکن بادشاہو! ہوا لاہور ہی کی بہتر ہے۔ سچ پوچھو تو پتنگ لاہور ہی کی ہوا میں پیٹھا چھوڑے (جھول کھائے) بغیر ڈور پہ ڈور بیٹی اور زور دکھاتی ہے۔ پتنگ کے رنگ اور مانجھے کے جوہر تو لاہور ہی کے آسمان میں کھلتے اور نکھرتے ہیں۔ کانپور میں ’وہ کانٹا‘

اس طرح کہتے ہیں جیسے معذرت، بلکہ تعزیت کر رہے ہوں۔ لاہور کے ”بو کاٹا!“ میں کچھڑے ہوئے پہلوان کی چھاتی پر چڑھے ہوئے پہلوان کا نعرہ سنائی دیتا ہے۔ بلکہ پسینے میں شرابور جسم سے چمٹی ہوئی اکھاڑے کی مٹی تک نظر آتی ہے۔

میاں صاحب کی چرخی لاہور ہی کے ایک زندہ دل پکڑتے جو حلیم کالج کانپور میں لیکچرر تھے۔ عبدالقادر نام تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ دونوں مل کر پتنگ کو مبالغہ کا مانجھا اور یادوں کی الجھی الجھی تل چانولی (دورنگی) ڈور ایسی پلاتے کہ چرخیاں کی چرخیاں خالی ہو جاتیں اور پتنگ آسمان پہ تارا ہو کے لاہور کی چوہرجی پہ جا نکلتی، جس نے ان کے وہ دن دیکھے تھے جب کوئی شے سادہ و بے رنگ نظر نہیں آتی۔

غبار مگلوں ہے، آب رنگیں، زمیں ہے سرخ اور ہوا شہابی *
(یہاں بشارت کا بیان ختم اور خواب نیم روز شروع ہوتا ہے۔)

خواب نیم روز

اب یہ چڑھی پتنگ جو کچھ راوی پار دیکھتی، اس کا حال کچھ ان دونوں زندہ دلان لاہور کی، کچھ بشارت اور رہاسہا اس عاجز داستان و پاستاں طراز کی زبانی سنئے:

لاہور میں آج بسنت ہے۔ آیا بسنت پالا اُڑمت۔ جاتی رُت نے عجب سماں باندھا ہے۔ بسنتی لباس اور رخساروں پر اُترتے جاڑے کی سرخی غضب ڈھا رہی ہے۔ کھیتوں میں چارو سروسوں پُھولی ہے۔ گلاب اور دیر سے کھلنے والے گل داؤدی کی اپنی الگ بہار ہے۔ سروسوں، پتنگ، ستلی، پیرہن، پُھول، رخسار۔۔۔ اک گلستاں نظر آتا ہے گلستاں کے قریب۔

ہاں! لاہور میں آج بسنت ہے۔ رنگ۔ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب پُجاتے ہیں۔ بسنت اور برسات میں لاہور کا آسمان آپ کو کبھی بے رنگ، آکتایا ہوا اور خچلا نظر نہیں آئے گا۔ لاڈلے بچے کی طرح چیخ چیخ کے ہمہ وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور توجہ کا طالب ہوتا ہے کہ ادھر دیکھو! اس وقت مجھے ایک اور شوخی سوجھی ہے۔ کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ کبھی تاروں بھرا۔۔۔ پتوں کی آنکھوں کی مانند جلمک جلمک۔ کبھی نوری فاصلوں پر کہکشاں کی

* ہوا شفق پوش، باغ و صحرا محیط ہے رنگِ لالہ و نخل۔ (سراج اور رنگ آبادی) اس پر مرزا کہتے ہیں کہ نوجوانی میں زیرِ را بھی ملٹی کلر ڈکھلائی دیتا ہے!

افشاں۔ اور کبھی اودی گھشاؤں سے زرتار باراں۔ کبھی تانبے کی طرح تپتے تپتے ایسا کی امت برسانے لگا اور خشک کھیتوں اور اداس آنکھوں کو جل تھل کر گیا۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہے۔ گھڑی بھر کو قرار نہیں۔ کبھی مہریاں، کبھی قہر داماں۔ پل میں اگن گنڈ، پل میں نیل جھیل۔ ذرا دیر پہلے تھل، بیہڑ، صحراؤں کا غبار اٹھائے، لال پتیلی آندھیوں سے بھرا بیٹھا تھا۔ پھر آپنی آپ دھرتی کے گلے میں بانہیں ڈال کے کھل گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سمندر جھاگ بادلوں کے بحرے پھلے نیلم میں پھر تیرنے لگے۔ کل شام ڈھلے جب شفق پُھولی تو یوں لگا جیسے زمین اور آسمان کا وہ ملکجا سا سنگم جو دھکتے سورج کو ٹھک گیا، اب سدایو نہی متمتا رہے گا۔ پھر گرم ہوا ایسا کی تھم گئی۔ ساری فضا ایسے دم سادھے کھڑی تھی کہ پتا نہیں ہلتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بادل گھر آئے۔ اور پچھلے پہر تک بجلی کے ترشول آسمان پر لپکتے، لہراتے رہے۔ پر آج سہ پہر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ اچانک ایسا مورچہ پٹکی نیلا ہوا کہ دیکھے سے رنگ پُچھوٹے۔ پہر رات گئے تک اپنی شفاف نیلا ہٹیں راوی کی چاندی میں گھولتا رہا۔

لاہور کے آسمان سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ خوش رنگ و شوخ ادا تو صرف ایک چیز ہے۔ وہ ہے لاہور کی محل زمین۔ چار سو برس پہلے بھی یہ زمین فلک رنگ ایسی ہی تھی۔ جیسی تو نور جہاں نے کہا تھا:

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم جنتِ دیگر خریدہ ایم

سو نور جہاں نے تو جان کے عوض جنتِ لاہور میں دو گز زمین خرید لی۔ مگر زندہ دلانِ لاہور نے اس جان دادہ ہوائے لاہور کو یاد رکھنے کی طرح یاد نہ رکھا۔ نور جہاں کے قطعہ جنت میں اب بابا بیلوں کا بسیرا ہے!

لیکن صاحبو! دھنک کے اس پار وہ خواہوں کا شہر تو اب شہر دو قصبہ ہو گیا اور اس کی تلاش میں جو شہزادہ چوتھی کونٹ ٹکل گیا تھا وہ کبھی کا دو لخت ہوا۔ اب یہ بستی اور زمین اور ہے! یہ ہر کس و نا کس پر گئے دنوں کے روپ سروپ کے بھید بھاؤ اور لُجھاؤ نہیں کھولتی۔ انہیں دیکھنے کے لئے پیری کی آنکھ اور بچپن کی رنگین دوربین * چاہیے۔ یہ ہوں تو پھر ہر شہر، شہر دو قصبہ

* Kaleidoscope: اسے بچپن کی حیرت بین یا دھنک درشن کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس میں کانچ کے رنگ بر رنگ ٹکڑے ہوتے ہیں جو ہر جنبش کے ساتھ طرح طرح کے رنگ، شکلیں اور ڈیزائن اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔

دکھلائی دیتا ہے۔

خواب نیم روز ختم ہوا۔ اب بقیہ کہانی بشارت کی زبانی انہی کے داستان در داستان انداز میں سنئے۔ طول دینا ہی مزہ ہے قصہ کوتاہ کا۔ جہاں تک قلم اور یادداشت ساتھ دے گی، ہم ان کا مخصوص محاورہ اور لہجہ۔۔۔ اور لہجے کی لک اور لٹک۔۔۔ جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کر دیں گے۔ وہ ایک دفعہ کہانی شروع کر دیں تو ان کا جملہ معترضہ اور غیر متعلق جزئیات بھی الگ اپنی کہانی سنانے لگتے ہیں۔ ہٹکارا بھرنے کی مہلت بھی نہیں دیتے۔ مرزا ایسے شکنجے میں جکڑے جانے کو کہانی کاٹھ کہتے ہیں۔ کو لرج کے Ancient Mariner نے جب اپنی آسیبی کہانی شروع کی تو شادی کے جشن اور دعوت میں جانے والا مہمان ایسا مسحور ہوا کہ شادی وادی سب بھول گیا۔ مہبوت کھڑا سنتا رہا۔ بس کچھ ایسا ہی احوال ہمارا بھی ہوا:

He holds him with his glittering eye
The Wedding-Guest stood still,
And listens like a three year's child:
The Mariner hath his will.

۴

میں ابن بطوطہ، میرا لکھا مخطوطہ

تو صاحب! میاں نندہ راحمد کا مکان بھی دیکھنے گیا۔ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں، اس مکان سے! مگر اب پہچانا نہیں پڑتا۔ خاصی 'فیس لفٹنگ' ہوئی ہے۔ تین ایئر کنڈیشنر چل رہے تھے۔ برآمدے میں ایک سن رسیدہ سردار جی لنگھا ہاتھ میں پکڑے جوڑا باندھ رہے تھے۔ صرف یہی ایسا مکان ہے جو پہلے سے بہتر حالت میں نظر آیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور غایت آمدنیان کی تو خوشی خوشی اندر لے گئے۔ بڑی خاطر میں کہیں۔ دیر تک اپنی جنم بھوم گوجرانوالہ کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں گھر گھر کے سنا سنا رہا۔ اور کیا کرتا؟ ایک سال پہلے منی بس میں گوجرانوالہ سے گزرا تھا۔ اس ایک اسٹیپ شاٹ کو انٹارجر کر کے اردو کایسٹ سیلر سفر نامہ بنادیا۔ خیر، آپ تو ایسے سفر نامے چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں۔ یہ تو مانا کہ بقول آتش

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

لیکن ان سفر نویسوں کی رال سے رقم کی ہوئی داستانوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بس آدمی ایک دفعہ اپنی منکوحہ سے پنڈ پھڑاکے گھر سے نکل پڑے، پھر عیش ہی عیش ہیں۔ قدم قدم پہ شجر سایہ دار۔ ہر شجر میں ہزار ہا شاخیں اور ہر شاخ پر چار چار عقیقاتیں اس انتظار میں لٹکی پڑ رہی ہیں کہ جیسے ہی ڈان جو آن نیچے سے گزرے اس کی جھولی میں ٹپک پڑے۔

ہزار ہا زن امیدوار راہ میں ہے

گویا دیس دیس اور شہر شہر ہی نہیں، بلکہ ”خانہ بجانہ، در بدر، کوچہ بہ کوچہ، کوہ کو“ ان کا سفر جنسی فتوحات کی Odyssey بن جاتا ہے، جس میں مسافر ہر روز ہر عورت کو جو اس کا راستہ کاٹے اس کے کیفر (بد) کردار تک۔۔۔ یعنی اپنی آغوش تک۔۔۔ پہنچ کر دم لیتا ہے۔

روز اک تازہ سراپائی تفصیل کے ساتھ

پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، ہر صفحے پر اسٹریپ ٹیز کرتی ہوئی ان مختصراتِ عصمت آیات کے تذکرے کو ہر زہ سرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر زن سرائی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ آپ نے بہت اچھا کیا، اپنے پندرہ بیس ملکوں اور ایک ہزار صفحوں پر محیط سفر نامے کے نوٹ اپنے سرد خانے بلکہ مسترد خانے میں ڈال دئے۔ ارے صاحب! عجب ہوا چلی ہے۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدتے ہی۔۔۔ خواہ وہ دہائی اور سری لنکا ہی کا کیوں نہ ہو۔۔۔ ہر ادیب اپنے آپ کو ابن بطوطہ، اپنی تحریر کو مخطوطہ اور حسینوں سے اپنے خیالی مکالمے کو ملفوظہ سمجھنے لگتا ہے۔ مجھے آپ کی اس تجویز سے اتفاق ہے کہ جہاں حکومت پاکستان پاسپورٹ جاری کرنے سے پہلے یہ حلف نامہ لیتی ہے کہ درخواست دہندہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کاذب نبی سمجھتا ہے، وہاں ادیبوں سے ایک اور حلف نامہ بلکہ مچلکہ لینا چاہیے کہ واپس آکر سفر نامہ نہیں لکھیں گے اور خود پر بد چلنی کے الزام نہیں لگائیں گے۔

گوجرانوالہ گوجرانوالہ ہے

سردار جی گرید گرید کے بڑے اشتیاق سے پوچھتے رہے اور میں بڑے وثوق سے گوجرانوالہ کا جھوٹا سچا حال سناتا رہا۔ انہوں نے آواز دے دے کے اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو بلایا کہ ”ادھر آؤ۔ بشارت جی کو سلام کرو۔ یہ نومبر میں اپنے گوجرانوالہ ہو کے آئے ہیں۔“ ادھر میری یہ مصیبت کہ میں نے لاہور کے علاوہ پنجاب کا صرف ایک قصبہ یعنی ٹوبہ ٹیک سنگھ قریب سے دیکھا ہے۔ وہاں میرا ایک خورد، اکھن خالہ کا پوتا، ایگری کلچرل بینک میں تین

مہینے کی ملازمت کے بعد گیارہ مہینے سے معطل پڑا تھا۔ بس اسی قصبے کے جغرافیہ پر گوجرانوالہ کو قیاس کر کے ان کی تشنگی رفع کرتا رہا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ سردار جی میری فرضی تفصیلات سے نہ صرف مطمئن ہوئے، بلکہ ایک ایک کی تصدیق کی۔ میں نے اس نہر کی موجودہ حالت کا بھی خیالی نقشہ کھینچ دیا جس میں سردار جی پل پر سے چھلانگ لگا کے کنواری بھینسوں کے ساتھ تیرا کرتے تھے۔ میں نے ان کے ضمنی سوال کے جواب میں یہ بھی اقرار کیا کہ پل کی دائیں طرف کنال کے ڈھلوان پر جس ”ٹاہلی تھلے“ وہ اپنی ہر کیولیز سائیکل اور کپڑے اتار کر رکھتے تھے وہ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ یہاں سے ایک مرتبہ چوران کے کپڑے اٹھا کے لے گیا مگر سائیکل چھوڑ گیا۔ اس واقعہ کے بعد سردار جی نے بہ نظر احتیاط سائیکل لانی چھوڑ دی! میں نے جب یہ ٹکڑا لگایا کہ وہ شیشم اب بالکل سوکھ گیا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ بوڑھے تنے پر نیلامی آرا چل جائے تو سردار جی پر رقت طاری ہو گئی، حالانکہ ان کا اپنا حال اس شیشم سے کچھ بہتر نہ تھا۔ ان کی منجھلی بہونے جو بہت شوخ اور خوش شکل تھی مجھ سے کہا کہ ”بابو جی کو ابھی پچھلے مہینے ہی ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ آپ انہیں مت رُلائیں، اٹکل!“ اس کا اٹکل کہنا مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ اور یہ تو مجھے آپ ہی سے معلوم ہوا کہ نہر میں بھینس نہیں تیر سکتی، خواہ وہ کنواری ہی کیوں نہ ہو۔

سردار جی میری کسی بات یا شوخ فقرے پر خوش ہوتے تو میرے زانو پر زور زور سے ہاتھ مارتے اور اندر سے لٹی کا ایک گلاس اور منگوا کر پلاتے۔ تیسرے گلاس کے بعد میں نے ٹائٹل کا پتہ پوچھا۔ اپنے زانو کو ان کے دست ستائش کی زد سے بچایا اور گفتگو میں حد درجہ احتیاط برتنی شروع کر دی کہ کہیں بے دھیانی میں کوئی شگفتہ فقرہ منہ سے نہ نکل جائے۔ سردار جی کہنے لگے کہ ”ادھر اپنا ٹرانسپورٹ کا بڑا شاندار بزنس ہے۔ سارا ہندوستان گھوما ہوں۔ پر گوجرانوالہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں کی مکئی اور سروسوں کے ساگ میں وہ سواد، وہ سنگند نہیں۔ اور گڑ تو بالکل پھیکا پھوک ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ یہاں کے پانی میں پانی بہت ہے۔ جب کہ گوجرانوالہ کے پانی میں شراب کی تاثیر ہے۔ اس سے ان کی مراد تھی، پانی میں طاقت ہے۔ وہ ہر مفید صحت چیز کو شراب سے تشبیہ دیتے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف فرمائیے۔ بولے ”تو پھر کسی آتے جاتے کے ہاتھ لاہوری تک کے تین چار بڑے سے ڈلے بھیج دینا۔“ ان کی مناتھی کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنے بیٹوں پوتوں کو ساتھ لے کر گوجرانوالہ جائیں اور اپنے مڈل اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو بنوائیں۔ تحفے میں مجھے انڈین raw سلک کا چھوٹا تھان دیا۔ چلنے لگا تو منجھلی بہونے مجھے آداب کیا۔ اس دفعہ

انکل نہیں کہا۔

عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

سردار جی نے مجھے سارا گھر دکھایا۔ بہوؤں نے لپک جھپک بکھری ہوئی چیزیں بڑے قرینے سے غلط جگہ رکھ دی تھیں۔ جو چیزیں عجلت میں رکھی نہ جاسکیں انہیں سمیٹ کر بیڈ پر ڈال دیا اور اوپر صاف چادر ڈال دی۔ چنانچہ گھر میں جہاں جہاں صاف چادر نظر آئی، میں تاڑ گیا کہ نیچے کاٹھ کباڑ دفن ہے۔ صاحب! curiosity بھی بری بلا ہے۔ ایک کمرے میں میں نے منظر چاکر چادر کا کونا سرکایا تو نیچے سے سردار جی کے ماموں کیس کھولے ایک نہایت مختصر کچھنٹا پہنے ہوئے برآمد ہوئے۔ ان کی داڑھی اتنی لمبی اور کھنکھور تھی کہ اس تکلف کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ گھر کا نقشہ کافی بدل گیا ہے۔ ٹکٹنار جس محراب دار دریچے کی چق کے پیچھے سے مقیش کا جھلیل دوپٹہ اوڑھے جھانکا کرتی تھی، اب اسے تیغا کر دیا ہے۔ دیکھیے، آپ پھر مسکرانے لگے۔ صاحب! کیا کروں پرانے لفظ اور محاورے ابھی تک زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کسی محراب یا روزن کو اینٹ مارے سے بند کرنے کو تیغا کرنا کہتے تھے۔ صحن اب پختہ کروا لیا ہے۔ چنبیلی کی میل اور امرود کا پیڑ نظر نہیں آیا۔ یہاں میاں صاحب شام کو دو مشکوں سے چھڑکا ڈکرا کے مونڈھے بچھوا دیا کرتے تھے۔ اپنے لئے خراہ پر بنے ہوئے چنیوٹ کے رنگین پایوں والی چارپائی ڈلواتے۔ وطن کی یاد زیادہ ستاتی تو ہمیں مقامی گنڈہیریاں کھلاتے۔ ان کا کھلا لالپور کی گنڈہیریوں کو یاد کر کے رندہ جاتا۔ چاندنی راتوں میں اکثر ڈل ماسٹر کی آواز میں ”مرزا صاحبان“ اور گجینی چمٹا بجا کے سناتے۔ خود آبدیدہ ہوتے، ہمیں بھی آبدیدہ کرتے۔ گوکہ ہماری ”آبدیدی“ کی وجہ کچھ اور ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد خود ہی اپنے بے سُرے پن کا احساس ہوتا تو چمٹا بڑی حقارت سے صحن میں پھینک کر فرماتے کہ بادشاہو! کانپور کے چمٹے کمانے کی سنگت کے لیے نہیں، چلم بھرنے کے لیے سوٹ اسبل ہیں! میاں صاحب ایک زمانے میں خاصے رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ مدتوں سے کانپور میں آباد تھے۔ مگر کبھی پان کھایا، نہ تسلیمات، آداب عرض کہا۔ اور نہ کبھی کوئی شعر پڑھا۔ کوٹھے پر بھی نہیں، جہاں ان تینوں کے بغیر گزر اور گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔

سردار جی سے جھوٹ سچ بول کر باہر نکلا تو سارا ناسٹل جیسا ہے آپ یادش بخیر یا کہتے ہیں، ہرن ہو چکا تھا۔ پرانا مکان دکھانے مجھے انعام اللہ بر ملائی لے گئے تھے۔ واپسی میں ایک مگلی کے ٹکڑے پر مٹھائی کی دکان کے سامنے رک گئے۔ کہنے لگے، رمیش چند اڈوانی ایڈووکیٹ کے ہاں بھی

جھانکتے چلیں۔ جیکب آباد کا رہنے والا ہے۔ ستر کا ہے۔ مگر لگتا نہیں۔ اسی کا لگتا ہے۔ جب سے سنا ہے کہ کراچی سے کوئی صاحب آئے ہیں، ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ جیکب آباد اور سکھر کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ستار پر تمہیں کافیاں بھی سنائے گا۔ اگر تم نے تعریف کی تو مزید سنائے گا۔ نہ کی، تب بھی مزید سنائے گا کہ ”یہ ان سے بہتر ہیں۔ شاید آپ کو پسند آئیں۔“ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالو زبانی یاد ہے۔ ہندی سیکھ لی ہے، مگر جوش میں آتا ہے تو عجیب جتنا زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ کھسکا ہوا ہے، مگر بے دلچسپ۔

تو صاحب! اڈوانی سے بھی گفتگو رہی۔ گفتگو کیا، monologue کہیے۔ کندھا بھی کہاروں کو بد لئے نہیں دیتے، والا مضمون ہے۔ اس نے یہ تصدیق چاہی کہ جیکب آباد اب بھی ویسا ہی حسین ہے یا نہیں جیسا وہ جوانی میں چھوڑ کر آیا تھا؟ یعنی کیا اب بھی چودہ دس کو پورا چاند ہوتا ہے؟ کیا اب بھی دریائے سندھ کی لہروں میں کش کش کرتی پٹا مچھلیاں دور سے للچاتی ہیں؟ موسم ویسا ہی حسین ہے؟ (یعنی ۱۱۵ ڈگری گرمی پڑتی ہے یا اس پر بھی زوال آگیا؟) اور کیا اب بھی خیر پور سے آنے والی ہوائیں لُٹ سے پکتی ہوئی کھجوروں کی مہکار سے بوجھل ہوتی ہیں؟ سب سے سالانہ دربار اور میلہ مویشیاں لگتا ہے کہ نہیں؟ میں نے جب اسے بتایا کہ میلہ مویشیاں میں اب مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور دور دور سے شاعر بلائے جاتے ہیں تو وہ دیر تک میلے کی بے توقیری پر افسوس کرتا رہا اور پوچھنے لگا، کیا اب سندھ میں اچھے مویشی اتنے کم ہو گئے؟ اسے لگا جمنی میدان ذرا نہیں بھاتا۔ کہنے لگا۔ ”سائیں! ہم سیدھے، کھر درے ریگ مال ریگستانی لوگ ہیں۔ اپنے رشتے، پیارا اور سہمنہ پر کائی نہیں لگنے دیتے۔ آپ صفاسیٹ آگرو (۱) اور دلدلی میدانوں کے رہنے والے، آپ کیا جانیں کہ ریگستان میں گرم ہواریت پر کیسی چلبلی لہریں، کیسے کیسے چڑ (۲) بنانا کے مثالی اور مثا مٹا کے بناتی ہے۔ سائیں! ہمارا سارا landscape شہ زور آندھیاں تراشتی ہیں۔۔۔ جمولو (۳)، جھکڑ اور جیٹھ کے مینار بگولے سارے ریگستان کو متھ کر رکھ دیتے ہیں۔ آج جو ریگ وادی ہے وہاں سے کل لال آندھی کی دھوم سواری گزری تھی۔ جلتی دوپہر میں بھوبل دُحول برساتی ریت پہاڑیاں۔ پچھلے پہر کی سرداتی نخل بالو پہ دھیمی دھیمی پون

(۱) آگرو: (سندھی) دو آب۔

(۲) چڑ: تصویر۔ نقش و نگار۔

(۳) جمولو: (سندھی) گرم ہوا۔ لُٹ۔

پکھاوج۔ جوان بلوان بازوؤں کی پمچلیوں سمان ریت کی اُبھرتی پھرتی لہریں۔ ایک لہر دوسری لہر جیسی نہیں۔ ایک ڈب (۲) ٹیلا دوسرے ٹیلے سے اور ایک رات دوسری رات سے نہیں ملتی۔ برسات کی راتوں میں جب تھوٹے بادل سندھ کے ریگ ساگر کے اوپر سے آنکھ مچولی کھیلنے گزرتے ہیں تو اداس چاندنی ہر آن عجب طلسمات کھیلتی ہے۔ جس کو سارا پاکستان ایک ساں لگتا ہے، اس کی آنکھ نے ابھی دیکھنا ہی نہیں سیکھا۔ سائیں! ہم تمہارے پیروں کی خاک، ہم ریت مہاساگر کی مچھلی ٹھہرے۔ آدھی رات کو بھی ریت کی تھوں میں اٹکیاں گڑو کے ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ آج پوچھانڈو (۵) کہاں تھا۔ (یعنی ٹیلے کا وہ کون سا حصہ ہے جہاں صبح سورے سورج کی پہلی کرن پڑی) دوپہر کو ہوا کا رُخ کیا تھا۔ اور ٹھیک اس سے شہر کی گھڑیوں میں کیا بجا ہو گا۔ دھرتی نے ہمیں پھول، پھل اور ہریالی دیتے سے ہاتھ کھینچ لیا تو ہم نے دھنک کے سارے چنچل رنگوں کی پچکاری اپنی اجرکوں، رلیوں، اوڑھنیوں، شلوکوں، چولیوں اور آرائشی ٹائلوں پر چھوڑ دی۔“

وہ اپنی آنسو دھار پچکاری چھوڑ چکا تو میں نے باہر آکر انعام اللہ بر ملائی سے کہا ”بھائی میرے! بہت ہو چکی۔ یہ کیسا ہندو ہے جو گنکا کنارے کھڑا پاکستان کے سنے دیکھتا ہے!

کہیں دل اور کہیں نگری ہے دل کی
یہ ساری عمر کا بن باس دیکھو

ایسا ہی ہے تو اسے اونٹ پر بٹھا کر یہ کانیر میں کسی ٹیلے یا کانٹوں بھرے لیکر کے ٹھنڈے پر بٹھا آؤ کہ اوپر چھاؤں نہیں اور نیچے ٹھاؤں نہیں۔ اب کے تم نے مجھے کسی ماضی میں مبتلا آدمی سے ملایا تو قسم خدا کی، لوٹا، ڈور، چٹائی، کلیات مظہر اکبر آبادی اور فروٹ سالٹ بغل میں مار بیابان کو مثل جاؤں گا۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اب میں کسی ایسے شخص سے ہاتھ ملانے کا بھی روادار نہیں جو میرا ہم عمر ہو۔“ صاحب! مجھے تو اس کہولت اور بوسست سے، یعنی اپنے آپ سے قے آنے لگی۔ آپ کے مرزا صاحب نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا کہ اپنے ہم عمر بڈھوں سے محض ہاتھ ملانے سے آدمی کی زندگی ہر مصافحے کے بعد ایک سال گھٹ جاتی ہے!

(۲) ڈب: (سندھی) ٹیلا۔

(۵) پوچھانڈو: سندھی لفظ ہے۔ اس کا مترادف عربی میں ہو تو ہو۔

۵

ملا عاصی بکھشو

کانپور میں جی بھر کے گھوما۔ ایک ایک سے ملا۔ ایک زمانہ آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ مگر حاصل سفر ملا عاصی عبدالمنان سے ملاقات رہی۔ ایسے ہی ہدم دیرینہ سے ملاقات کے بارے میں ذوق لے کہا ہے:

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

عبدالمنان کے نانا خطوں میں اپنے دستخط سے پہلے عاصی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے اُچک لیا اور ساتویں کلاس سے اپنا نام عاصی عبدالمنان لکھنا شروع کر دیا۔ آٹھویں کلاس میں ہی داڑھی نکل آئی تھی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ملا عاصی کہلانے لگے۔ اور یہ ایسا چپکا کہ اب صرف اسی نام سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ تختی پر بھی Aasi A. Mannan لکھا ہے۔ طرفہ تاشا ہیں۔ اکہرا گٹھا ہوا بدن۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ درمیانہ قد۔ بوزنہ دست یعنی غیر معمولی لمبو ترے ہاتھ، جیسے بند رکے ہوتے ہیں۔ کوٹ بینکر کے سے ڈھلکے ہوئے کندھے۔ گھنے بال اب سفید ہو گئے ہیں مگر کھنکھرا لاپن باقی ہے۔ باہر نکلی ہوئی مچھلی جیسی گول گول آنکھیں۔ دائیں آنکھ اور دہانے کے دائیں کونے میں بچپن سے tick تھا۔ اب بھی اسی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ داڑھی نکلنے کے دس سال بعد تک ریزر نہیں لگنے دیا۔ سچ پوچھتے تو داڑھی سے بہت بہتر لگتے تھے۔ لمبی گردن۔ چھوٹا اور گول مٹول چہرہ۔ جس روز داڑھی منڈوا کر آئے تو ایسے لگے گویا نیچے پہ چلم رکھی ہے۔ اس سے پہلے ہر مہینے چاند کی پہلی تاریخ کو نر خرے سے ملحق داڑھی کا تلامنڈوا کر آتے تو کہتے ”کنٹھی بنوا کے آیا ہوں“۔ ادھر یہی اصطلاح رائج تھی۔ آپ نے بھی توائنٹریٹیڈ میں باچھ سے باچھ تک مونچھیں رکھی تھیں۔ اگلی کتاب میں وہ والا فوٹو چھپوا دیں تو واللہ مزہ آجائے۔ ملا عاصی خود کہتے ہیں کہ ”عاقل و بالغ ہونے کے بعد میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ البتہ کہیں نماز کے وقت پھنس جاتا اور لوگ اصرار کرتے تو نماز پڑھا دیتا تھا۔ داڑھی کا یہ بڑا بینڈی کیپ تھا۔ آخر سیمک آ کے منڈوا دی“۔ جب سے انہوں نے بدھ ازم کا ڈھونگ رچایا لوگوں نے ملا بکھشو کہنا شروع کر دیا۔ ابھی تک رے (ر) صاف نہیں بول سکتے۔ مگر ان کے منہ سے اچھا لگتا ہے۔ لہجہ مصری کی ڈلی۔ لا اُبابی اور سنکی جیسے جب تھے، اب بھی ہیں۔ بلکہ اپنے مدارج کچھ زیادہ ہی بلند کر لیے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ زندگی ایسے بھی گزاری جاسکتی ہے۔ سارے کام

چھوڑ چھاڑ کر سائے کی طرح ساتھ رہے! لطف آگیا۔ کیا بتاؤں۔ ایسی دریا محبت۔ ایسا برکھا پیار۔

یقین جانتے، سن ۴۷ میں جیسا چھوڑ کے آئے تھے ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ پچھترے کچھ اوپر ہی ہوں گے۔ لگتے نہیں۔ میں نے پوچھا، اس کا کیا راز ہے؟ بولے، کبھی آئینہ نہیں دیکھتا۔ ورزش نہیں کرتا۔ کل کے بارے میں نہیں سوچتا۔ آخری دعوے میں انہوں نے قدرے کسر نفسی سے کام لیا۔ اس لیے کہ کل تو بعد کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ تو آج کے بارے میں بھی نہیں سوچتے۔ جس وضع سے زندگی شروع کی، اسی طرح گزار لے گئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ سینے سے کیا لکایا، تکلفت twenties میں پہنچا دیا۔ ایسا لگا گویا اپنے ہی جوان ہمزاد سے ملاقات ہو گئی۔ ویسے مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے کہ بعض لوگ اس طرح سینے سے لگاتے ہیں کہ اس کے بعد آپ وہ نہیں رہتے جو اس سے پہلے تھے۔ لیکن آپ نے جس چہرے قنات ”بزرگ“ کی مثال دی اس سے مجھے قطعی اتفاق نہیں۔ دل نہیں ٹھکتا۔ آپ آج بھی ملّا عاصی کو ہر ایک کا کام اور ہر طرح کا کام کرنے کے لیے تیار پائیں گے۔ سوائے اپنے کام کے۔ شہر میں ہر افسر سے ان کی یاد اللہ ہے۔ کسی کو آدھی رات کو بھی سفارش کی ضرورت ہو تو وہ ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کوئی بیمار لے آسرا ہو تو دوا دارو، ہاتھ پیر کی خدمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ ہو میو پیٹتھی میں بھی درک رکھتے ہیں۔ ہو میو پیٹتھک دواؤں میں تاثیر ہو یا نہ ہو، ان کے ہاتھ میں شفا ضرور ہے۔ مریض گھیرے رہتے ہیں۔ مشورے اور دوا کا کچھ نہیں لیتے۔

جوانی میں بھی ایسے ہی تھے۔ اللہ دین کے جن کی طرح ہر خدمت کے لیے حاضر۔ بلا کے منتظم۔ سن ۴۱ کا واقعہ ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میاں تجمل حسین کو دور کی سوجھی۔ کس لیے کہ ان کے والد کلکتے گئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، یار ملّا! مجھ کو دیکھتے مدتیں ہوئیں۔ آخری مجرا جمال صاحب کے بیٹے کی شادی پر دیکھا تھا۔ سات مہینے ہونے کو آئے۔ دس بارہ جنے مل کے چندہ کر لیں گے۔ بس تم بلی کی گردن بلکہ پاؤں میں کھنگھرو باندھ کے لوالاؤ تو واللہ عیش آ جائیں۔

بولے، یار! کمال کر دیا! پہلے کیوں نہ کہا؟ بس ایک جا جم کا بندوبست تم کر لو، باقی سب میری ذمہ داری۔ پر ایک بات ہے۔ چندے میں ہمیشہ خورد و برد اور آپس میں لڑائی جھگڑے کا احتمال رہتا ہے۔ خیر، نیک کام میں تو لڑائی جھگڑا بالکل روا ہے، اور رائج بھی۔ پر کاربد میں مکمل اعتماد اور اتفاق رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یارو! یہ تو بتاؤ، چندے کی رنڈی کس کس کو

کورنش بجالائے گی؟

سینچر کو دیکھا کہ عشا کے بعد ملا عاصی سچ مچ اپنی ”ذمہ داری“ کو اگے میں بٹھائے لیے چلے آ رہے ہیں۔ خود اگے کے پر (تختے کا باہر نکلا ہوا کنارہ) پہ نکلے ہوئے تھے۔ پاندان، طبلے، سارنگی، چوراسی (کھنگھرو) اور ضعیف طبلچی کو اپنے ہاتھوں سے اتارا۔ میرے کان میں کہنے لگے کہ داڑھی کی وجہ سے طوائف کو میرے ساتھ آنے میں تامل تھا! روپیہ تو خیر ہم سب نے چندہ کر کے فراہم کیا، مگر باقی ماندہ سارا انتظام انہی کا تھا۔ اس میں شہر سے باہر اس سرکاری ہنگامے کا انتخاب و حصول بھی شامل تھا جہاں یہ محفل برپا ہونی تھی۔ ڈیٹی کلکٹر سے ان کی یاری تھی۔ دسترخوان پر کھانا انہوں نے اپنے ہاتھ سے چُنا۔ کانپور کے خاص سرخ و سفید رس مٹکوں کے کھڑ خود خرید کر لائے۔ زردے میں ملا کر کھانے کے لئے بالائی بطور خاص لکھنؤ سے منگوائی۔ ان کا کہنا تھا کہ گھوڑیاں بھی وہیں کی ایک طرح دار مبولن کے ہاتھ کی ہیں۔ کرارے پان کی گھوڑی اس ترکیب سے بناتی ہے کہ کسی کے کھینچ کر ماریں تو بلبلا اٹھے۔ گھوڑی ٹکڑے ٹکڑے بھلے ہی ہو جائے، لیکن مجال ہے کہ کھل جائے۔ دسترخوان پہنچانے سے ذرا پہلے اپنی نگرانی میں تنوری روٹی پر گڑ اور نمک کا چھینٹا دلویا۔ کانپور میں اسے چھینٹنے کی روٹی کہتے تھے۔ دو تازہ قلعی کی ہوئی سفنجیوں میں نیم کے پتے ڈال کر کونے میں رکھوا دیں۔ غرض کہ بُجرے اور دعوت کا سارا انتظام کیا۔ سب دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے پوچھا، ملا کہاں ہے؟ دُھنڈیا پڑی۔ کہیں پتہ نہ تھا۔ محفل تو ہوئی، مگر بے لطفی رہی۔ دوسرے دن ان سے پوچھا گیا تو تنیک کر بولے، آپ نے مدعو کب کیا تھا؟ میرے سپرد تو بس انتظام کیا گیا تھا، سو میں نے کر دیا۔

کیا چھپکلی دودھ پلاتی ہے؟

مزاج کا بس ہمیشہ سے یہی رنگ رہا۔ جو ٹیڑھ اور سنک جب تھی، وہ اب بھی ہے۔ کچھ بڑھ ہی گئی ہے۔ ایک قصہ ہو تو سناؤں۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ وہ کوئی مافوق الفطرت کو ڈھ مفر نہیں تھے۔ میرا مطلب ہے، اوسط درجے کے بالکل نارمل نالائق تھے۔ امتحان میں تین مہینے رہ گئے تھے۔ دسمبر کا مہینہ۔ کوڑکڑاتے جاڑے۔ انہوں نے کرسمس کے دن سے پڑھائی کی تیاریاں شروع کیں۔ وہ اس طرح کہ آنکھوں اور دماغ کو طراوت پہنچانے کے لئے سرمندوا کے تیل سے سینچائی کی جو ایک میل دور سے پہچانا جاتا تھا کہ اصلی سروسوں کا ہے۔ پہلی ہی رات نزلہ ان کے عضو ضعیف یعنی سر پر گرا تو دوسرے دن چپکتے ہرے رنگ کاروٹی کا ٹوپا سلوایا جسے پہن

کر پان کھاتے تو بالکل طوطا لگتے تھے۔ جمعات کو علی الصبح سفید بکری کی کلہی اور سری خرید کر لائے۔ سری پکوا کر شام کو فقیروں کو کھلائی۔ اُس زمانے میں بے پردگی کے اندیشے سے محلے میں کسی مرد کو چھت پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود چھت پر کھڑے ہو کر دیر تک ”چیل! چیل! چیل!“ پکارا کیے۔ پھر ہوا میں اُچھال اُچھال کے چیلوں کو کلہی کی بوٹیاں اور خود کو پردہ نشین گھروں کے مردوں کی کالیاں کھلوائیں۔ دوپہر کو بان کی چارپائی باہر نکالی اور اونٹنے پانی سے ان کھٹملوں کو جنہیں برسوں سے اپنا خون پلا پلا کے بڑا کیا تھا، آخری غسل دیا۔ پھر چارپائی گھر کے باہر دھوپ میں اٹھی کر کے مرحومین و نیم مرحومین پر ڈھیروں گرم مٹی ڈالی۔ مجھ دانی کے بانس پر جھاڑو باندھ کے بھڑکے چھتے اور جانے اتارے۔ رات کو مختلف اوقات میں چھت پر ٹارچ سے روشنی ڈال ڈال کر چھپکلیوں کی تعداد اور عاداتِ شینہ و شنیہ کا جائزہ لیا۔ ان میں تین چھپکلیاں غالباً چھپکے تھے۔ ”غالباً“ کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ بقول مرزا، پرندوں، چھپکلیوں، مچھلیوں، Punks اور اردو الفاظ میں نرمادہ کی تمیز کرنا انسان کے بس کا کام نہیں۔ پرندے، پنک، مچھلیاں اور چھپکلیاں تو پھر بھی بشری تقاضوں * سے مغلوب ہو کر اپنی اپنی مخالف جنس کو پہچان کر عمل و حل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن اردو الفاظ کے کیس میں تو یہ سہولت بھی میسر نہیں۔ ان کی جنس بندی اور تذکیر و تانیث کی شناخت وادراک صرف قدماء و فصحاء کا حصہ ہے۔ استاد جلیل نے کسی زمانے میں ایک محققانہ رسالہ تذکیر و تانیث پر لکھا تھا جس میں سات ہزار الفاظ کے طبی معائنے کے بعد ہر ایک کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کر دیا تھا کہ مذکر ہے یا مؤنث۔ ساتھ یہ ان الفاظ کی بھی نشاندہی کر دی جن کی مشکوک جنس کے بارے میں اہل لکھنؤ اور دئی والے ایک دوسرے کا سر پھاڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

وہ تین رنگین مزاج چھپکے جن کے ذکر سے یہ بات مٹکی ٹراتے بہت تھے۔ رات بھر ڈبل ڈیکر بنے چھت پر چھٹے پھرتے تھے، جس سے پڑھائی اور ذہنی سکون میں کھنڈت واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان سب بد ذاتوں کو اپنے کیفر کردار کو پہنچانے کے لیے وہ ایک دوست سے ”ڈائما“ ایئرگن مانگ کر لائے، مگر چلائی نہیں۔ کیونکہ بقول ان کے، لہلہی پر اٹھتی رکھتے ہی خیال آگیا کہ ان میں تو لکٹیوں کے دودھ پیتے بچے ہیں!

میں نے ٹوکاکہ یار! چھپکلی اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی۔ بولے، تو پھر جو کچھ پلاتی ہے

* مرزا حیوانوں کی اس نوع کی حرکتوں اور کرتوتوں کے لیے بھی بشری تقاضوں ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

وہ سمجھ لو۔ چھت کی جھاڑ پونچھ کے بعد دیوار کی باری آئی۔ لکھنے کی میز کے اوپر ٹنگی ہوئی مادھوری، کچن اور سلوچنا ایکٹرسوں کی تصویریں ہٹائی تو نہیں، مگر الٹی کر دیں۔ خود کو راہ راست پر رکھنے اور خدا کا خوف دلانے کی غرض سے ان کے بیچوں بیچ اپنے والد گرامی کا، جو بڑے جلالی اور ہتھ پُھٹ بزرگ تھے، فوٹو ٹانگ دیا۔ ڈریکولا کی طرح آئینے بھی کپڑے سے ڈھک دیے تاکہ چہرے پر امتحان کی وحشت دیکھ کر دہشت زدہ نہ ہو جائیں۔ ان کے دوست ہری پرکاش پانڈے نے امتحان کے زمانے میں نیک چلن رہنے اور برہمچریہ کا بڑی سختی سے پالن کرنے کی تاکید کی جو سراسر غیر ضروری تھی۔ اس لیے کہ ان کی اور ہماری نسل کے لیے بد چلنی پر ابلم نہیں، دلی آرزو تھی۔ خود کو ٹھنڈا اور شانت رکھنے کا اس نے یہ گُر بتایا کہ من میں کوئی ایسی ویسی کامنا (خواہش) آجائے تو فوراً اپنے انگوٹھے میں پن چبھو لیا کرو۔ اور جب تک خواہش پوری طرح دل سے نکل نہ جائے، پن بدستور چبھوئے رہو۔ مگر ہوا یہ کہ ان کے منہ سے بارہا چیخ مکل مکل گئی، لیکن خواہش نہیں نکلی۔ پہلے ہی دن یہ نوبت آگئی کہ دونوں pin cushions یعنی دونوں انگوٹھوں میں پن چبھونے کی جگہ نہ رہی۔ پاؤں کے انگوٹھے استعمال کرنے پڑے۔ دوسرے دن جب وہ جوتے پہننے کے قابل نہ رہے تو پن چبھونے کے بجائے صرف مسکرا دیتے اور کپڑا ہٹا کر آئینہ دیکھ لیتے تھے۔

رہر گوید کہ من شاہ جہانم

بری عادتوں سے تائب ہو گئے۔ مطلب یہ کہ رات گئے تک غیر حاضر دوستوں کی غیبت، ناش، شرٹنج، بائیسکوپ اور بُری صحبت یعنی اپنے ہی جیسے دوستوں کی صحبت سے میعاد تو بہ کی۔ یعنی کرسمس کے دن سے یوم امتحان تک۔ اور دل میں both days inclusive کہہ کر مسکرا دیے۔ مثنوی ”زہر عشق“ جو یکے از کتبِ ممنوعہ تھی اور دس بارہ بدنام مثنویوں کے سراپا سے متعلق اقتباسات جن کا شمار اس زمانے میں porn میں ہوتا تھا، مقفل الماری سے نکالے۔ یہ سب ان کے ہاتھ کے قلمی نسخے تھے جو املا کی غلطیوں کے باوجود بلکہ بسببِ دُونا مزہ دیتے تھے کہ ان میں کی بعض غلطیاں فاش اور فاش ہی نہیں، فحش بھی تھیں۔ ان مخطوطات کو مع ناش کے دوپیک کے، جن میں سے ایک بالکل نیا تھا، نذرِ آتش کرنے صحن میں لے گئے۔ لائین سے تیل محال کر ابھی پرانا پیک ہی جلایا تھا کہ بزرگوں کی ایک نصیحت یاد آگئی کہ کوئی بھی کام ہو، جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ لہذا کارِ شیطان پر لعنت بھیجی اور نیا پیک اور ”سراپے“ واپس لے آئے۔ پھر دو پنسلیں اور چھ رہر خریدے کہ ان کے ہاں ہر دوا شیا

کے استعمال کا یہی مناسب تھا۔ آپ بھی تو پنسل سے لکھتے ہیں تاکہ مسودہ فیئر کرنے کی فکھٹیر سے بچ جائیں، مگر دشمنوں کا خیال ہے، لکھتے کم، مٹاتے زیادہ ہیں۔ آپ نے پنسل کی لت پچارے مختار مسعود کو بھی لگا دی۔ اب وہ بھی آپ کی طرح ربر سے لکھتے ہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ نابوکوف بھی پنسل سے لکھتا تھا۔ افسوس کہ لفظ ”میٹنا“ اب متروک ہو گیا۔ پھر ملّا عاصی ”رف ورک“ کے لیے ردی والے کے یہاں سے ریلوے کی بڑی رسیدوں اور بلٹیوں کی پانچ سیر کا پیساں ایک آنے میں خرید لائے۔ اس زمانے میں کفایت شعار لڑکے ان کی پشت پر ”رف ورک“ کرتے تھے۔ آدھ سیر سونف بھی لائے اور اس کے کنکر محلے کی ایک دوشیزہ سے بنوا کر ایک شیشی میں اس طرح محفوظ کر لیے جیسے بعض شیخی خورے مریض آپریشن کے بعد گردے اور پتے کی پتھریاں سجا کر رکھتے ہیں۔ مگر دوشیزہ کا علیحدہ قصہ ہے۔ کبھی اور سہی۔ پھر سونف میں ایک پاؤدھنیے کے میج ملا کر دونوں کو مرتبان میں بھر دیا۔ ہری پر کاش پانڈے نے کہا تھا کہ دھنیے کے عرق کے دو قطرے بھی مست سانڈ کے حلق یا بھڑکتے جوالا مکھی پہ ڈال دو تو وہیں بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔ سونف سے آنکھوں کی جوت بڑھتی اور دماغ کو تراوٹ پہنچتی ہے۔ چنانچہ ایک پھنکی نیند کے جھونکے سے پہلے اور ایک بعد میں مار لیتے تھے۔

جب مطالعہ کے لیے مناسب ماحول بن گیا تو باخبر لڑکوں سے معلومات حاصل کر کے کورس کی کتابوں کی فہرست بنائی۔ کچھ نئی، مگر بیشتر سیکنڈ ہینڈ خریدیں۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو کم قیمت کی بنا پر نہیں، بلکہ فقط اس لیے ترجیح دی کہ بعض نایاب ایڈیشن ایسے مل گئے جن میں فیل ہونے والوں کی دو تین تجربہ کار نسلوں نے یکے بعد دیگرے اہم حصوں پر نشان لگائے تھے۔ بعض نشان تو مثل لائٹ ہاؤس کے تھے جو ان خطرناک چٹانوں کی نشاندہی کرتے تھے جہاں علم کی تلاش میں نکلے ہوئے غافل طلباء کی اداس نسلوں کا یہ رُاعرق ہوا تھا۔ ایک نادر نسخہ ایسا بھی ہاتھ لگا جس میں صرف غیر اہم حصے ”انڈر لائنیں“ کیے گئے تھے تاکہ انہیں چھوڑ کر پڑھا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ کورس کی کتابوں کی فراہمی سے وہ ممتحن کے خلاف جنگ میں آدھی فتح تو حاصل کر ہی چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہری پر کاش پانڈے کے گھر گئے جو گورنمنٹ کالج میں ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ منت سماجت کر کے اس کی تمام کتابیں دو دن کے لیے مستعار لیں اور اگلے میں ڈھو کر گھر لائے۔ پھر چھٹی کلاس کے ایک غریب لڑکے کو ایک آنے یومیہ کی دہائی پر اس کام پر تعینات کیا کہ ہری پر کاش پانڈے کی کتابوں میں جو حصے ”انڈر لائن“ کیے ہوئے ہیں، انہی کے مطابق میری تمام کتابیں سبز پنسل سے انڈر لائن کر دو۔ پھر ایک ایک آنے میں ربر کی دو

مہرہیں Important اور Most Important کی کھڑے کھڑے بنوائیں اور اپنی کتابوں کا سیٹ پانڈے کو دے آئے کہ جن جن حصوں کو تم امتحان کے لحاظ سے ہماری توجہ کے لائق سمجھتے ہو ان پر حسب اہمیت یہ مہرہیں لگاتے چلے جانا۔ پلیز۔

کتابوں کی قسمیں اور نکتے دشمن

سب نشان لگ گئے تو انہوں نے غیر ضروری اور فالتو علم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ایک اور ہنگامی تکنیک ایجاد کی جسے وہ selective study کہتے تھے۔ اردو مترادف تو مجھے معلوم نہیں۔ تفصیل اس کی یہ کہ جو سوال پچھلے سال آچکے تھے، ان کے متعلقہ ابواب پورے کے پورے قیفی سے کاٹ کے پھینک دیے کہ ان کی موجودگی سے توجہ distract ہوتی اور دل پر ضخامت سے خواہ مخواہ دہشت بیٹھتی تھی۔ یہی نہیں، ان کی وہ بین السطور جڑیں بھی جو دوسرے ابواب میں کینسر کی secondaries کی طرح پھیلی ہوئی جہاں تہاں نظر آئیں، کاٹ کر پھینک دیں۔ پھر وہ باب نکال پھینکے جن کے بارے میں ان کے مشیروں اور بھی خواہوں نے کہا کہ ان میں سے کوئی سوال آہی نہیں سکتا۔ تھوڑا بہت اپنے کشف سے بھی کام لیا۔ آخر میں جی کڑا کر کے وہ اذق حصے نکال پھینکے جنہیں وہ دس دفعہ پڑھتے تب بھی کچھ پلے نہ پڑتا۔ اس عمل جزا جی سے کتابیں چھٹ چھٹا کر ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئیں۔ ان میں سے تین کاشیرازہ تو ایسا بکھر کر ان کی باقیات کو کلپ سے دوسری کتابوں کے نیفے میں اڑسنا پڑا۔ ایک کتاب کا صرف سرورق باقی رہ گیا۔ اس میں چند غیر ضروری صفحے محض شگون اور ممتحن کی دلجوئی کے لیے رکھ لیے۔ ان کا پروگرام تھا کہ زندگی اور بینائی نے اگر امتحان تک وفا کی تو ان منتخب اوراق کے چیدہ

چیدہ حصوں پر ایک اچستی سی نظر ڈال لیں گے۔ آخر ہر کتاب ایک ہی انداز سے تو نہیں پڑھی جا سکتی۔ پھر ذہانتِ خدا داد اور علمِ کدنی بھی تو کوئی چیز ہے۔ رہا فیل ہونے کا خدشہ، سو وہ تو ہر صورت میں رہے گا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بہر حال محنت کر کے اپنے زور بازو سے باعزت طریقے سے فیل ہونا نقل کر کے پاس ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ کسی نے ان ہی کتابوں کے بارے میں میمن کا مشہور مقولہ سنایا جو ان کے دل کو بہت بھایا۔ مزے کی بات یہ کہ میمن کا یہ انشائیہ ان کے کورس میں شامل تھا اور اسے انہوں نے فضول سمجھتے ہوئے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ وہ ”کوٹے شن“ آپ کو تو یاد ہو گا۔ کچھ اس طرح ہے کہ بعض کتابیں صرف چمکی جانی چاہئیں۔ کچھ کو نکل جانا چاہیے۔ کچھ اس لائق ہوتی ہیں کہ آہستہ آہستہ، چپا چپا کے

ہضم کی جائیں۔ اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں کسی عوضی سے پرٹھو کر خلاصہ بنوالینا چاہیے۔ ملّا عاصی نے اس قول فیصل میں اتنی اصلاح اپنی طرف سے کی کہ اگر سب نہیں تو بیشتر کتابیں اس لائق ہوتی ہیں کہ سوکھ کر ایسوں کے لیے چھوڑ دی جائیں جو ناک نہیں رکھتے۔ صاحب! ناک پر آپ نے اس دن بیچ لکڑری ہوٹل والے فنکشن میں کمال نظم ”کوٹ“ کی۔ مگر حاضرین میں مجھ جیسے دوچار ہی ہوں گے جو یہ سمجھ پائے کہ آپ کا ہدف و مخاطب کون ہے۔ ایسے حملے سے دشمن کا تو کچھ نہیں بگڑتا، اپنا جی خوش ہو جاتا ہے۔ یاد ہیں کچھ لائینز؟

They haven't got no noses
The fallen sons of Eve. *

تاریخ کا کلیجہ

تاریخ کے مسئلہ کو بھی انہوں نے پانی کر دیا۔ وہ اس طرح کہ ہری پر کاش پانڈے کو ہدایت کی کہ ممتحن کے نقطہ نظر سے جتنے سنہ اہم ہوں، ان سب کی فہرست بنا کر مجھے دے دو، تاکہ ایک ہی جگہ میں ان سے منٹ لوں۔ لیکن بیس سے زیادہ نہ ہوں۔ اب تک وہ صرف پانچ چھ سنہ سے غریباً مٹو کام چلا رہے تھے۔ ماسٹر فاخر حسین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تواریخ، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مجموعہ سنین کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے جواب میں جتنے زیادہ سنہ لکھو گے، اتنے ہی زیادہ نمبر ملیں گے۔ سن کی جمع سنین انہیں پہلی مرتبہ اسی مقولے سے معلوم ہوئی۔ لیکن جب ماسٹر فاخر حسین نے یہ کہا کہ ہمارے ہاں بڑے آدمیوں کا سن وفات ان کے سن پیدائش سے زیادہ اہم ہوتا ہے تو ملّا عاصی کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پیدا ہونے، وفات پانے اور گڈی پر بیٹھنے کے لیے انہوں نے متولد، متوفی، متمکن اور سریر آرائے سلطنت ہونے کی اصطلاحیں ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھیں۔ ماسٹر صاحب نے یہ ٹپ بھی دیا کہ ممتحن اپنا تاثر صرف تمہارے پہلے جواب کے پہلے پیرا گراف سے قائم کر لیتا ہے۔ ان پسند ہائے سودمند کے بعد دوسری جماعت کا جو ششماہی امتحان ہوا اُس میں ملّا عاصی نے پہلے ہی سوال میں کا پانی پہ تاریخ کا کلیجہ نکال کے رکھ دیا۔ مطلب یہ کہ پہلے صفحے کے پہلے پیرا گراف کے کوزے میں وہ سارے سنہ بند کر دیے جو وہ اپنی ہتھیلی اور ”سوانِ انک“ کے ڈبے کے پیندے پر لکھ کر لے گئے تھے۔ ان سنوں یا سنین کا اصل سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ آپس میں بھی کوئی تعلق

نہیں تھا۔ ان سب کو ایک لڑی میں اس طرح پرو دینا کہ ماسٹر فاخر حسین پر اپنی نصیحت کے نتائج ہویدا ہو جائیں، صرف انہی کا کام تھا۔

سوال لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر آیا تھا۔ ان کا جواب مجھے حرف بحرف تو یاد نہیں، لیکن اس کا پہلا پیرا گراف جس میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت سب بادشاہوں کو ایک ہی مہلک لاشی سے ہانک کر موت کے گھاٹ اتارا، کچھ اس طرح تھا:

”اشوک اعظم (متوفی ۲۳۲ ق م) کے بعد سب سے بڑی سلطنت اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۶۸۰ء) کی تھی جو ۱۶۵۸ء میں اپنے والد کا تختہ الٹ کر سربراہ آرائے سلطنت ہوا۔ اس اثنا میں پانی پت میں کھمسان کی جنگ ہوئی، مگر طوائف الملوکی کا دور دورہ ختم نہ ہوا، حالانکہ اورنگ زیب نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کیا، یعنی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتارا۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو بھائی اس کے ساتھ یہی کچھ کرتے۔ دراصل اکبر اعظم (متولد ۱۵۴۲ء، متوفی ۱۶۰۵ء) کی چوکس آنکھ بند ہوتے ہی انتزاع سلطنت کے آثار شروع ہو گئے جو متعدد شاہی اموات کے بعد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ اور ۱۷۹۹ء میں سرہا پٹم کی جنگ پر منتج ہوئے۔ اُدھر یورپ میں نیپولین (متوفی ۱۸۲۱ء) کا طوطی رگ رگ کر بولنے لگا تھا۔ (یہاں انہیں اچانک دوسنہ اور یاد آ گئے۔ چنانچہ انہیں بھی وفیات کی آگ میں جھونک دیا) یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ فیروز تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) اور بلبن (متوفی ۱۲۸۷ء) بھی سلطنت کو استحکام نہ بخش سکے۔ یہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ایک سو سال کی مدت بنتی ہے۔۔۔“

سنہ کو بطور آلہ تسخیر ممتحن استعمال کرنے اور تاریخ کے صحیح تعین سے متعلق ماسٹر فاخر حسین کی نصیحت انہوں نے گرہ میں باندھ لی۔ انہیں اپنی صحیح تاریخ پیدا ئش معلوم نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے خانے میں وہ بڑی دیانت داری سے ”نامعلوم“ لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن جس دن سے ماسٹر فاخر حسین نے لچو کا دیا کہ بر خور دار! ہمارے ہاں نامعلوم و نا تحقیق تو صرف ولدیت ہوا کرتی ہے، وہ اپنی قیاسی تاریخ ولادت ۱۹۰۸ء کے بعد A.D بھی لکھنے لگے تاکہ تسامح نہ ہو۔ کوئی کوڑھ مغز التباساً B.C نہ سمجھ بیٹھے۔ اپنی فاش غلطی میں بھی عالمانہ شان پیدا کرنے کے لئے غلطی کو تسامح اور التباس کہنا ہم دونوں نے ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے ان کی یادداشت خراب ہو چلی تھی۔ کوئی بات یا جواب ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آئے تو ”اس وقت استحضار نہیں ہے“ اس طرح کہتے کہ ہم خود اپنی نالاشقی پر شرمندہ ہوتے کہ کیسے غلط وقت پر سوال کر بیٹھے۔ صاحب! اگلے وقتوں کے استادوں کی شان ہی کچھ اور

امتحانی چالاکیوں سے متعلق ماسٹر فاخر حسین کا بتایا ہوا ایک نکتہ یاد آیا۔ فرماتے تھے کہ جہاں مشکل لفظ استعمال کر سکتے ہو وہاں آسان لفظ نہ لکھو *۔ تم طالب علم ہو۔ سادگی و سلاست صرف عالموں کو زیب دیتی ہے اور انہی کے یہاں مفقود ہے! اسی ضمن میں یہ بھی فرماتے کہ جس عربی یا فارسی لفظ کی جمع تمہیں معلوم ہو اس کو صیغہ واحد میں استعمال نہ کرو۔ چنانچہ میں نے اپنے دشمنوں کو ملاعین و طواغیت کہنا انہی سے سیکھا۔ صیغہ واحد ——— ملعون اور طاغوت ——— میں وہ بات کہاں۔

ملا عبد المنان اور نیپولین

اسی طرح ان کے ایک خیر خواہ نے کسی زمانے میں ٹپ دیا تھا کہ اگر تین Essays اور تین تاریخی جنگیں رٹ لو تو انگریزی اور تاریخ میں فیل ہونا نامکن ہے، بشرطیکہ ممتحن جوہر ناشناس اور نالائق نہ ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ہر ایک کے مشورے پر حرف بحرف عمل کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ ہر دفعہ ایک مختلف طریقے سے فیل ہوتے اور ممتحن کی نالائقی پر رہ رہ کر افسوس کرتے۔ واٹر لو کی فیصلہ کن جنگ جس میں ان کے ہیرو نیپولین کو شکست فاش ہوئی، ان تین جنگوں میں جو انہوں نے نقشہ میدان جنگ سمیت رٹ لی تھیں، ان کی ”فیورٹ“ تھی۔ دوستوں کو اپنے فیل ہونے کی اطلاع بھی اسی یادگار تاریخی حوالے سے دیتے تھے، جس میں طالب علمانہ ندامت کے بجائے جرنیلی تکبر پایا جاتا تھا:

“I have met my Waterloo!”

بعد میں اپنی زندگی کی دیگر ناکامیوں کا اعلان بھی انہی تاریخی الفاظ میں کرنے لگے۔ مگر صاحب، نیپولین کی اور ان کی شکست میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نیپولین تو ایک ہی شکست میں دُحیر ہو

* ۱۹۸۹ میں ایک دلچسپ الٹی لغت، Reverse Dictionary شائع ہوئی ہے، جس میں ہر آسان لفظ کے نہایت مشکل، اذوق اور نامانوس مترادفات دیے گئے ہیں۔ یہ ڈکشنری ان طبقوں میں جن کا کام بات کو کھول کر عام فہم انداز میں بیان کرنا ہے، بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ جاری مراد پروفیسروں، نقادوں، پادریوں، حکومت کے ترجمانوں اور بزنس ایکزیکٹیوؤں سے ہے۔ ماسٹر فاخر حسین کی روج پُر فوج پچاس سال بعد اپنی نصیحت پر عمل درآمد دیکھ کر کس قدر مسرور و مفتخر محسوس کر رہی ہوگی۔

گیا تھا، جب کہ ان کے اعلانِ ہزیمت میں دوبارہ شکست کھانے کا آہنی عزم پایا جاتا تھا۔

تالا انہیں کھلتا

جب ممتحن کو زیرِ دام لانے کے تمام ہتھکنڈے اور ”شارٹ کٹ“ مکمل ہو گئے تو امتحان میں کل چار ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ شارٹ کٹ دراصل اس راستے کو کہتے ہیں جو ذہین مگر کاہل لوگ کم سے کم فاصلے کو زیادہ سے زیادہ وقت میں طے کرنے کے لیے دریافت کر لیتے ہیں۔ صاحب! فاصلے کو گز سے نہیں، وقت سے ناپنا چاہیے۔ خیر۔ اب ملباعہ صبیح پڑھائی میں جُٹ گئے۔ صبح سات بجے آٹھ پوریوں، پاؤ بھر کڑھائی سے اترتی جلیبیوں اور رات بھر تاروں کی چھاؤں میں بھیکے دس باداموں کی ٹھنڈائی کا ناشتہ کرنے کے بعد وہ خود کو کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا ڈلوادیتے تاکہ اگر چاہیں بھی تو باہر نہ نکل سکیں۔ عشا کے وقت تالا کھلتا تھا۔ دو ڈھائی ہفتے یہی معمول رہا۔ مگر امتحان میں نہیں بیٹھے۔ کہنے لگے، دماغ کا تالا انہیں کھلتا۔

اور صاحب! تالا کھلتا بھی کیسے۔ امتحان سے چند روز قبل یہ معمول بنالیا کہ شام پڑتے ہی سائیکل لے کے نکل جاتے اور پو پھٹے لوٹتے۔ پرچے آؤٹ کرنے کی مہم میں لگے ہوئے تھے۔ جن جن پروفیسروں کے بارے میں انہیں ذرا بھی بدگمانی ہوئی کہ انہوں نے پرچہ بنایا ہوگا، ان کے چپراسیوں، خاندانوں، مہتروں، حتیٰ کہ ان کے شیرخوار بچوں کو آیاؤں سمیت cultivate کر رہے تھے *۔ جیسے ہی کہیں سے کوئی ہنٹ ملتا یا کیس پیپر ہاتھ لگتا، اسے راتوں رات گھر تقسیم کرتے۔ وہ مستحقین تک، یعنی شہر کے تمام نالائق طالب علموں تک پہنچ جاتا تو کسی دوسرے پرچے کو آؤٹ کرنے کی مہم پر سائیکل اور منہ اٹھائے نکل جاتے۔ ایک رات دیکھا کہ

* وہ اپنے استاد اور مرشد ماسٹر فاخر حسین کے پسندیدہ نو مند پر عمل کر رہے تھے۔ موصوف اکثر سعدی کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم تیرے پکوں، کبوتر اور چڑیوں کو مستقل مزاجی سے دانہ ڈالتے رہو گے تو ایک دن بنا بھی تمہارے جال میں پھنس جائے گا۔

خورش وہ بہ دراز و کبک و حمام

کہ یک روزت افتد ہمارے دام

مصیبت یہ تھی کہ ماسٹر فاخر حسین نے دانہ ڈالنا تو سکھایا، پکڑنا نہ سکھایا۔ ماسٹر فاخر حسین خود بھی ساری عمر دانہ ہی ڈالتے بلکہ اپنا سارا کھیت چڑیوں کو چکاتے رہے۔ ہمارے چکر میں کسی چڑیا کی دم تک نہ پکڑ پڑے۔

ایک پرنٹنگ پریس کے باہر جو کانفڈ کی کترینیں، پروف کی ردی اور کوڑا کرکٹ پڑا تھا، اسے اپنے معتقدین خاص سے دو بوریوں میں بھرا کر خوردبینی معائنے کے لیے گھر لے آئے۔ انہیں کسی نے انتہائی رازداری سے ہنٹ دیا تھا کہ ایک پرچہ اسی پریس میں چھپا ہے۔ ان کے جاسوس شہر کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے۔ ان کے بقول، اگرے، میرٹھ، بریلی اور راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کے شہروں میں جن کا اگرہ یونیورسٹی سے الحاق تھا، ان کے خفیہ ایجنٹوں نے جاسوسی کابال بچھا رکھا تھا جس سے کسی بھی ممتحن کا باعزت طریقے سے بچ سکتا تھا۔ یہ سب وہ تھے جو کئی سال سے مختلف مضامین میں فیل ہو رہے تھے۔ ہر جاسوس اسی مضمون کے پرچے کی مخبری میں اسپیشلائز کیے ہوئے تھا جس میں وہ گزشتہ سال لڑھکا تھا۔ leakage اور خفیہ اطلاعات کے سوتے خشک ہونے لگے تو انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنے ذاتی کشف و الہام سے اس کمی کو پورا کیا۔ پہلا پرچہ سیٹ کرنے والے ممتحن کے گھر کے باہر تھڑے پر گردن اور بیر لٹکائے دو گھنٹے تک پرچے کی بولیٹے رہے۔ تین سوال اسی عالم میں القا ہوئے۔ گھر آکر ان میں مزید تین کا اضافہ اس طرح کیا کہ دس سوالوں کی کانفڈ کی گولیاں بنائیں اور اسی دوشیزہ کے، جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، پانچ سالہ بھائی سے کہا کہ کوئی سی تین اٹھا لو۔ پیر کی صبح پہلا پرچہ تھا۔ اتوار کی رات کو صبح چار بجے تک دس سوالوں پر مشتمل اپنا آؤٹ کیا ہوا پرچہ ہر اُس طالب علم کے گھر پہنچایا جو گزشتہ برسوں میں متواتر فیل ہوتا رہا تھا، یا جس میں انہیں آئندہ فیل ہونے کی ذرا بھی صلاحیت نظر آئی۔ اس کا رخیر سے صبح ساڑھے تین بجے فارغ ہوئے۔ گھر آکر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ باہر محل کے صبح کے تارے کی طرف ٹٹکی باندھے دیر تک دیکھا کیے۔ ایک ہندو پڑوسی سے جو کنویں کی مینڈ پر لٹیا سے اشنان کر رہا تھا اور ہر لٹیا کے بعد جتنی زیادہ سردی لگتی اتنے ہی زور سے ”ہری اوم! ہری اوم“ پکار رہا تھا، باہر سے تالا لگانے کو کہا۔ پھر اندر آ کے سو گئے۔ کس واسطے کہ دماغ کا تالا نہیں کھلتا تھا!

ملا عاصی کے کشف و کرامات

جتنی محنت اور ریاضت انہوں نے رفاہ عام کی خاطر پرچے آؤٹ کرنے میں کی، اس کی 1/100 بھی اپنی پڑھائی میں کر لیتے تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتے۔ بہر حال، افسوس اس کا نہیں کہ انہوں نے ایسے لغو کام میں وقت کیوں ضائع کیا۔ رونا اس بات کا ہے کہ امتحان کے پہلے پرچے میں آٹھ میں سے پانچ سوال ایسے تھے جو ان کے آؤٹ کیے ہوئے الہامی پرچے میں موجود تھے! ایسا لگتا تھا جیسے ممتحن نے ان کا پرچہ سامنے رکھ کر پرچہ سیٹ کیا ہے۔ یہ بھی سننے

میں آیا کہ ممتحن کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ ملا عاصی نے تو یہاں تک کہا کہ اس پروفیسر نے وہ تحڑا ہی ٹٹو دیا جس پر بیٹھے بیٹھے انہیں کشف ہوا تھا۔ ایک عرصے تک وہ جگہ مرجعِ گمراہانِ خاص رہی۔ واللہ اعلم۔

اب کیا تھا، سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ دوسرے دن ان کے گھر کے سامنے امتحان میں بیٹھنے والے طلباء کے ٹھٹ لگ گئے۔ اس کے بعد امتحان میں چار دن کا ناغہ تھا۔ ان ایام میں نزدیک و دور کے کالجوں کے طلباء نے — کوئی لاری میں، کوئی ٹرین سے، کوئی پیادہ — جوق در جوق آکر ان کے گھر کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ میلا سا لگ گیا۔ یونی کے مالائق لڑکوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع چشمِ فلک نے نہ کبھی اس سے پہلے، نہ اس کے بعد دیکھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ پولیس نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مجمع میں سی آئی ڈی کے آدمی والدوں کا بھیس بنائے پھر رہے ہیں۔ ملا عاصی کا بیان تھا کہ دو برقع پوش لڑکیاں بھی آئی تھیں۔ ان میں سے لمبی والی لڑکی کے بارے میں شکیل احمد نے جو کلاس میں سب سے چھوٹا اور خوب رو لڑکا تھا یہ شہادت دی کہ اس نے میرے کولھے میں چنگی لی اور اس کی نقاب کے پیچھے مجھے تاؤ دی ہوئی مونچھ نظر آئی۔ واللہ اعلم۔ حالانکہ ملا عاصی اب خود امتحان میں نہیں بیٹھ رہے تھے، لیکن اوروں کی خاطر دن رات ایک کر دیے۔ کہتے تھے اگر خود امتحان میں بیٹھ جاؤں تو سارا کشف باطل ہو جائے گا۔ طالب علموں میں یہ افواہ آگ کی طرح پھیل گئی کہ جب سے حجابات اٹھے ہیں، ملا عاصی دنیا سے کنارہ کش ہو کر صوفی ہو گئے ہیں اور پے در پے کرامات ظہور میں آ رہی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس افواہ کی تردید نہیں کر سکتا۔ وہ کمرے میں تالا ڈلو کر دن بھر چھٹی جس کی مدد سے پرچہ بناتے۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے اور پھر ڈھائی بجے اپنے ماموں سجاد احمد مرحوم، وکیل، کا بوسیدہ سیاہ گاؤن پہنے حجرۂ عالیہ سے برآمد ہوتے اور پرچہ آؤٹ کرتے۔ تین دن تک یہی نقشہ رہا۔ تصوف و صوف کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو ان کے چہرے پر تنہا کرنے والے سادھوؤں کی سی کج بھیر شاستی نظر آئی۔ آنکھیں ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں کھولتے تھے۔ گوشت، لہسن اور جھوٹ چھوڑ دیا۔ صبح تڑکے ایسے ٹھنڈے بخ پانی سے اٹھان کرتے کہ بے اختیار چیخ ماریں گے کہ لیے پورا زور لگانا پڑتا۔ عفتِ عہد کا یہ عالم کہ عورت تو کجا، مرغی یا بکری بھی سامنے آجائے تو برہنچاریوں کی طرح شرما کر منظرِ نیچی کر لیتے۔ مخالف جنس سے اس قدر احتیاط اور پرہیز کہ اردو کے بعض ایسے الفاظ کو بھی مذکر بولنے لگے جو اندھے کو بھی نظر آتے ہیں کہ مونث ہیں! غرض کہ پرچے آؤٹ کرنے کے لیے اپنی

تام روحانی طاقتیں اور باطنی تصرفات داؤں پر لگا دیے۔

پہلے پرچے کو چھوڑ کر، باقی ماندہ پرچوں میں ان کا بتایا ہوا ایک سوال بھی نہیں آیا۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ان کے حق میں بس یہی کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے بڑے خلوص نیت سے خلق خدا کو خوار کیا تھا۔ اس سال کانپور اور اس کے ارد گرد پچاس ساٹھ میل کے حلقے میں جتنے بھی لڑکے فیل ہوئے، ان سب کا یہی موقف تھا کہ ملا عاصی کے آؤٹ کئے ہوئے پرچوں کی وجہ سے لڑ چکے ہیں۔ حد یہ کہ عادی فیل ہونے والے لڑکے جو ہر سال قسمت اور ممتحن کو گالیاں دیا کرتے تھے، وہ بھی ملا عاصی کی جان کے لاگو ہو گئے۔ نوبت کالی کلوج پر آنے لگی تو وہ چپکے سے اپنی تنہا امروہہ سٹک گئے۔ ایک لڑکے کے ماموں نے تو ملا عاصی کے ماموں کو سیر بازار زدو کو ب بھی کیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے تک ان کے خاندان کا کوئی بزرگ گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔

تو جناب یہ تھے ہمارے ملا عاصی عبدالمتان۔ چند مخصوص eccentricities (سنگ۔ مضحک عادات و اطوار) سے قطع نظر، جوانی ان کی بھی ویسی ہی گزری جیسی اس زمانے میں عام طالب علموں کی گزرتی تھی۔ آپ نے اس دن مرزا عبدالودود بیگ کا ایک چرانداسا مقولہ سنایا تھا۔ کس کس بلا سے عبارت تھی جوانی اس زمانے میں؟

”سال بحر عیش، امتحان سے پہلے چلے، مہاسے، مشاعروں میں ہونٹنگ، آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے، رینالڈ اور مولوی عبدالعلیم شرر کے اسلامی ناول، سونے سے پہلے آدھ سیراؤنٹنا دودھ، بلاناغہ ڈنٹر بیٹھک اور استمنا بالید، جمعہ کے جمعہ غسل، شب گپ، ریلوے اسٹیشن پر لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے solo goose-step، انگریز کے خلاف نعرے اور اسی کی نوکری کی مٹانا“

ملا عاصی نے ساری زندگی تجرد میں گزار دی۔ سہرا بند خانہ شہنائی بجی۔ نہ چھوہارے بٹے۔ خود ہی چھوہارا ہو گئے۔ میں نے بہت گریدا۔ پُٹھے پر باتھ نہیں رکھنے دیتے۔ گھر سے گھڑائے بقراطی جُلے لڑھکانے لگے جو ان کے اپنے نہیں معلوم ہوتے۔ ”بس تمام عمر ایسی افراتفری رہی کہ تزویج اور متا بلانہ آسودگی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ (جی ہاں، شادی کے لیے ملا عاصی اب یہی لذیذ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ آدھی لذت تو فقط ان کے تلفظ میں ہی مل جاتی ہے) مجھے تو عورتوں کے بغیر زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ

ان کی کوئی حق تلفی ہوئی ہو تو مجھے علم نہیں۔ اللہ معاف کرے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اب بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں جس میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ میرا تو سوچ سوچ کے ہی دم گھٹنے لگا کہ کوئی شخص اپنی ساری زندگی ستر پچتر برس ایک ہی محلے، ایک ہی مکان اور ایک ہی کمرے میں کیسے گزار سکتا ہے۔ کراچی میں تو اتنے سال آدمی قبر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ جہاں گورکنوں نے دیکھا کہ اب کے شبِ برات اور عیدِ بقر عید پر بھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا، وہیں ہڈیاں اور پنجرہ بحال کے پھینک دیئے اور تازہ مردے کے لیے جگہ نکال لی۔ جب صور پھونکا جائے گا تو ایک ایک قبر سے ایک سو ایک مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایک سو ایکواں مردہ متعلقہ گورکن ہو گا۔

۶

کہ یہی ہے امتوں کے مرد کہن کا چارہ

صاحب، ویسے تو دنیا میں ایک سے ایک crackpot (سکی) پڑا ہے، لیکن ملاعاصی کا ”تو چیزے دیگر“ والا معاملہ ہے۔ ان کے ایک واقف کار کا بیان ہے کہ آخری واٹر لو کے بعد کھسک گئے ہیں۔ فرقہ ملائیت سے تعلق ہے۔ نماز اس طرح پڑھتے ہیں جیسے بعض مسلمان شراب پیتے ہیں۔ یعنی چوری چھپے۔ یہ وہی فرقہ ہے جس سے حضرت ماحولال حسین کا تعلق بتایا جاتا ہے۔ ایک صاحب بولے کہ ”مرند ہوئے مدت ہوئی“۔ اس پر دوسرے صاحب بولے کہ ”مسلمان تھے کب جو مرند ہوتے؟“ حیدر مہدی نے بتایا کہ ایک دن میں نے پوچھا ”ملا! کیا یہ سچ ہے کہ تم بد حسٹ ہو گئے ہو؟ ہنسے۔ کہنے لگے، جب میں نے پچاسویں سال میں قدم رکھا تو خیال آیا، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیوں نہ اپنے عقائد کی اصلاح کر لوں۔ سانگ باقی بہت ہیں، شب کم ہے۔“ ایک دن بہت اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے گھیرا۔ پوچھا کہ ”مولانا! بدھ ازم میں تمہیں اس کے علاوہ اور کون سی خوبی نظر آئی کہ مہاتما بدھ اپنی بیوی یشودھرا کو سوتا پچوڑ کر راتوں رات سٹک گئے؟“ مسکرائے۔ کہنے لگے ”میری یشودھرا تو میں خود ہوں۔ وہ بھگا بھری تو اب اگلے جنم میں جا گئے گی۔“

ایک محرم راز نے تو یہاں تک کہا کہ ملاعاصی نے وصیت کر رکھی ہے کہ میری لاش تبت لے جائی جائے۔ حالاں کہ پجارے تبت والوں نے ان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پروفیسر بلگرامی جو ایک مقامی کالج میں انگریزی ادب پڑھاتے ہیں اس اتہام کی سختی سے تردید

کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ملاعاصی نے وصیت لکھی ہے کہ ان کی غیر مغسول لاش کو سپرد آتش کر دیا جائے۔ اور وہ بھی ”لیڈی چیٹلینز لور“ کے مصنف ڈی۔ ایچ لارنس کی طرح۔ اس کی بیوہ کو ڈر تھا کہ لارنس کی خاک کے چھوٹے سے ”ارن“ (صراحی ناظر) کو اس کے عقیدت مند اور فین چرا کر لے جائیں گے۔ لہذا اس نے شوہر کی راکھ کو سیمنٹ میں ملا کر بہت بھاری سیل بنوالی تھی جسے لوگ چوم کر چھوڑ دیتے تھے۔ غرض کہ جتنے منہ اتنے بہتان۔ لیکن استنا تو میں نے بھی دیکھا کہ کونے میں ان کی والدہ کی نماز کی چوکی پر جانازالشی بچھی تھی۔ یعنی محراب کا رخ قبلے کی بجائے پورب کی طرف تھا۔ سنا ہے اس پر آسن مار کے دھیان اور تپسیا کرتے ہیں۔ تو نبی بھی پڑی دیکھی جس کے بارے میں ایک دوست نے کہا کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی سے کوئی ہول ٹائم (کل وقتی) پیشہ اختیار کیا تو اسی تو نبی میں گھر گھر بھیک مانگیں گے۔ میز پر نہ بن بدھ ازم پر پانچ چھ کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے یوں ہی ورق گردانی کی۔ اللہ جانے انہیں کس سے انڈر لائن کرایا ہے۔ کمرے میں صرف ایک ڈیکوریشن پیس ہے۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی ہے، جس کے بارے میں لطیفہ مشہور ہے کہ گو تم بدھ کی ہے۔۔۔ نروان سے پیشتر کی!

سلیقے سے تہ کی ہوئی ایک گیر واد چادر پر گز بھر لمبا چمٹا رکھا تھا۔ مجھے تو بچانے والا، اپنے عالم لوبار والا چمٹا لگا۔ اس پر کسی دل جلے نے پھتتی کسی کہ ملاعاصی جب کوہ طور پر اپنی سنگ * کی چلم کے لئے آگ لینے جائیں گے تو اسی چمٹے سے ٹین کمانڈ مینٹس (احکام عشر) پکڑے پکڑے پیہ پٹختے لوٹیں گے۔ پاس ہی لکڑی کی سادھوؤں والی کھڑاویں پڑی تھیں۔ وہی جن کے پنجے پر شطرنج کا اوٹ بنا ہوتا ہے۔ نماز کی چوکی پر ایک مٹی کا پیالہ، اکتارا، باسی ٹلسی اور بدھ کی مورتی رکھی تھی۔ مختصر یہ کہ کمرے میں بدھ ازم کے (Do It Yourself) آلات گرد میں اٹے جا بجا پڑے تھے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے ان کا مقصد محض نمائش ہے۔ گویا دوسرے کام نہ چڑانے کے لیے اپنی ناک کاٹ لی۔

* سنگ: لغت میں سنگ کے معنی چھوٹا پتھروان یا چھرہ رے بدن کی عورت ہیں! اور پتھروان کے معنی: ایک قسم کا حقہ جس کی نے چمک دار اور بہت لمبی ہوتی ہے۔ دونوں معنوں کو ملا کر پڑھا جائے تو ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگلے وقتوں کے بزرگ، عورت میں بھی حقہ ہی کے اوصاف کے متلاشی رہتے تھے۔ اور بعد متقابل و تلاش بسیار تھے اور تھوہ ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ کہ یہی ہے امتوں کے مرد کہن کا چارہ!

آگ تکفیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ انہوں نے یہ سارا آڈمبر اور ڈھونگ صرف مسلمانوں کو چڑانے کے لیے رچا رکھا ہے۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ، آپ جانتے ہیں، مسلمانوں نے کسی کے ہندو، عیسائی یا بدھ مت کا پیرو ہونے پر کبھی تعرض نہیں کیا۔ البتہ اپنی فقہ اور فرقے سے باہر ہر دوسرے مسلم فرقے کا سر پھاڑنے اور کفر کا فتویٰ لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

آگ ”تکفیر“ کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں۔

کھل جا سم سم!

آپ ذرا گیس کیجئے وہ کیا کرتے ہیں۔ میں آپ کو دو منٹ دیتا ہوں۔ (آدھے منٹ بعد ہی) جناب! وہ ڈیویشن کرتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو میٹرک کی تیاری کرواتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے لوٹتے ہیں۔ پانچ چھ میل پیدل چل کر جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ کہتے ہیں ”سواری سے نفس موٹا ہوتا ہے، سوائے گدھے کی سواری کے۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے بیٹے مبروں نے گدھے کی سواری کی ہے۔“ مگر سنا ہے پڑھانے کا پیسہ ایک نہیں لیتے۔ کہتے ہیں ”مشرق کی ہزاروں سال پرانی ریت ہے کہ پانی، نصیحت اور تعلیم کا پیسہ نہیں لیا جاتا۔ پیسہ لے لو تو یہ انگ * نہیں لگتے اور انجام کار پیسہ بھی نہیں پچھتا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ معاوضہ دے کر حاصل کیے ہوئے علم سے کوئی روحانی تبدیلی آئی ہو۔ سچی تبدیلی صرف کسی کی نظر سے آتی ہے۔ اور نظر کا کوئی مول نہیں۔“ اللہ جانے گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ دستِ غیب تو ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ بد حسٹ خدا اور اس کی رزاقی کے قائل نہیں۔ بھیک کو ترجیح دیتے ہیں۔ فلسفے کا ایک پورا قلعہ کھڑا کر لیا ہے ملا عاصی نے۔ ہم جیسوں کے پلے تو خاک نہیں پڑتا۔ اب اسے جنون کہیے، جھک کہیے، بس ہے تو ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ پڑھائی کے نام سے بھاگنے والا لڑکا، پڑھانے میں اپنا زمانہ تلاش کرے گا۔ یاد نہیں، آپ کا قول ہے یا میرا، کہ اپنے ہاں جو لڑکے پڑھائی میں پچھڑی ہوتے ہیں وہ فوج میں چلے جاتے ہیں، اور جو فوج کے لیے medically unfit ہوتے ہیں وہ کالجوں میں پروفیسر بن جاتے ہیں۔ صاحب! قدرت

* انگ لگنا: غذا کا جذبہ نہ ہونا۔

جس سے جو چاہے کام لے۔ آپ بھی تو ایک زمانے میں لیکچر بننے کی تمار کھتے تھے۔ خدا نے آپ پر بڑا رحم کیا کہ دلی مراد پوری نہ ہونے دی۔ ویسے آپ کو معلوم ہی ہے، میں نے بھی کئی برس ٹیچری کی ہے۔ دل کی بات پوچھیے تو حاصل زندگی بس وہی زمانہ تھا۔ یاد آتا ہے۔

واں سے ٹکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

لیکن ایک بات ہے۔ سبھی کہتے ہیں کہ پڑھاتے بہت اچھا ہیں۔ اچھا معلم ہونے کے لیے عالم ہونے کی شرط نہیں۔ کچھ عرصے گورنمنٹ اسکول میں بھی پڑھایا۔ لیکن جب محکمہ تعلیمات نے یہ بیچ لکائی کہ تین سال کے اندر بی ٹی پاس کرو، ورنہ تنزلی کر دی جائے گی، تو یہ کہہ کے استعفیٰ دے دیا کہ ”میں بے صبرا آدمی ہوں۔ تین سال اس واقعے کے انتظار میں نہیں گزار سکتا۔ میں نے ہمیشہ بی ٹی پاس ٹیچروں سے پڑھا اور ہمیشہ فیل ہوا!“ اس کے بعد کہیں نوکری نہیں کی۔ البتہ نائینٹھوں کے اسکول میں مفت پڑھانے جاتے ہیں۔ لہجے میں مٹھاس، ملائمت اور دھیرج بلا کا ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ جادو الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے۔ الف لیلوی خزانوں کا دروازہ ہر ایرے غیرے کے ”کلل جاسم سم!“ کہنے سے نہیں کھلتا۔ وہ الہ دین کا لہجہ مانگتا ہے۔ دلوں کے قفل کی کلید بھی لفظ میں نہیں، لہجے میں ہوتی ہے۔ اپنی بات دہرائی پڑے، یاد دوسرا الجھنے لگے تو ان کا لہجہ اور بھی ریشم ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے فالودہ گلے سے اتر رہا ہے۔ ہر اچھے استاد کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور سر ہلا ہلا کر بتاتا جاتا ہے کہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ اچھے استاد کا پڑھانا بس اس بچے سے ایک مکالمہ ہے جو عمر بھر چلتا رہتا ہے۔ انہوں نے اس بچے کو بچہ ہی رہنے دیا۔

۷

وہ کمرہ بات کرتا تھا

حجرۂ جہاں نما

مُلّا عاصی سے اُسی کمرے میں کھمسان ملاقاتیں رہیں جہاں پینتیس برس پہلے انہیں خدا

حافظ کہہ کر پاکستان آیا تھا۔ اُس زمانے میں سبھی پاکستان کھینچنے چلے آ رہے تھے۔۔۔۔۔ زمین جائداد، بھرے بتولے گھو، لگے لگائے روز کار اور اپنے یاروں، پیاروں کو چھوڑ کر۔ اسی کمرے میں مجھے گلے لگا کے رخصت کرتے ہوئے کہنے لگے ”جاؤ، سیدھا رو! میری جان! تمہیں کوہِ ندا کے سپرد کیا۔“ آج بھی انہیں استہابی تعجب ہوتا ہے کہ بھلا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس کا پیور کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ کمرے میں وہی پنکھا، اُسی ڈمگ ڈمگ کڑے میں لٹکا، اُسی طرح چرخی چوٹوں کرتا رہتا ہے۔ مجھے تو جب بات کرنی ہوتی تو پنکھا آف کر دیتا تھا۔ پنکھا چلتے ہی آندھی سی آ جاتی ہے۔ اور کتابوں، دیواروں اور درمی پر جمی ہوئی گرد کمرے میں اڑنے لگتی ہے، جس سے مجھروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ پنکھا گرمی سے نہیں، مجھروں سے بچنے کے لیے چلاتے ہیں۔ مگر کم، بہت ہی کم۔ اس لئے نہیں کہ بجلی کی بچت ہوتی ہے، بلکہ چلانے سے پنکھا گھسٹتا ہے۔ اس کی لائف کم ہوتی ہے۔ ماشا اللہ چالیس پینتالیس برس کا تو ہو گا۔ ان حسابوں سو تک گھسیٹ لے جائیں گے۔ بعض سادھوؤں اور جوگیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے مقدر میں بھگوان نے گنتی کے سانس لکھے ہیں۔ چنانچہ بیشتر وقت سانس روک کے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ زندگی، بقدر جس دم، لمبی ہو جائے۔ طوعاً و کرہاً گنڈے دار سانس فقط اس لئے لے لیتے ہیں کہ اسے روک سکیں۔ بس پنکھے کی عمر بھی اسی طرح دراز کی جا رہی ہے۔

ان کے کمرے میں گویا ایک عالم کی سیر ہو گئی۔ جڑ جہاں نما کہئے۔ ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہے۔ بلکہ وہیں کی وہیں دھری ہے۔ بخدا مجھے تو ایسا لگا کہ مکڑی کے جالے بھی وہی ہیں جو چھوڑ کر آیا تھا۔ صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ واڑھی پھر منڈوا دی ہے۔ پوچھا تو گول کر گئے۔ کہنے لگے ”واڑھی اس وقت تک قابلِ برداشت ہے جب تک کالی ہو۔“ اس پر انعام صاحب آنکھ مارتے ہوئے بولے ”مہاتما بدھ بھی تو منڈواتے تھے۔“ کمرے کا نقشہ وہی ہے جو سن ۴۷ میں تھا۔ البتہ دیواروں پر چیکٹ چڑھ گیا ہے۔ صرف وہ حصے صاف نظر آئے جن کا پلاسٹر حال میں جھڑا ہے۔ بائیں دیوار پر پلنگ سے دو فٹ اوپر، جہاں پینتالیس سال پہلے میں نے پنسل سے پکنک کا حساب لکھا تھا، اس کی اوپر کی چار لائیں ابھی تک جوں کی توں ہیں۔ صاحب، روپے میں ۱۹۲ پائی ہوتی تھیں اور ایک پائی آج کل کے روپے کے برابر تھی! حیرت اس پر ہوئی کہ دیوار پر بھی حساب کرنے سے پہلے میں نے ۸۶ لکھا تھا! بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے، اس زمانے میں مسلمان لڑکے حساب میں فیل ہونے کو اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتے تھے۔ حساب کتاب، بیخ بیوپار اور ہر وہ کام جس میں منافع کا ذرا بھی امکان ہو، بنیوں، بقالوں اور

یہودیوں کا کسب تصور کیا جاتا تھا۔ مگر مجھے چکرورتی ارتھمیدنگ ازرتھی۔ پونا، سوایا اور ڈھائی کا پہاڑ مجھے اب تک یاد ہے۔ ان کا فائدہ وائدہ تو سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ دراصل یہ لڑکوں کا پتہ مارنے بلکہ خود انہیں کو پتے سمیت مارنے کا ایک بہانہ تھا۔ مسلمان پر یاد آیا کہ یہ جو پنج وقتہ ٹکڑے مارنے کا لگا آپ دیکھ رہے ہیں، یہ الحمد للہ پچیس چھنیس برس کی عمر میں ہی پڑچکا تھا۔ میاں تھمل کی صحبت اور نیاز فتح پوری کی تحریک سے بھی نماز نہ چھڑوا سکیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا، دو تہائی بال بھی اسی عمر میں سفید ہو گئے تھے۔ خیر تو یہ کہہ رہا تھا کہ شیشم کی میز کے اوپر والی دیوار پر میٹرک کی فیر ویل (الوداعی) پارٹیوں کے گروپ فوٹو لگے ہیں۔ متواتر پانچ سالوں کے۔ خدا خدا کر کے پانچویں سال ان کا بیڑا اس وقت پار لگا جب ان کا ایک کلاس فیلو بی۔ اے کر کے انہیں انگریزی پڑھانے لگا۔ پانچوں میں وہ ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑے کھڑے ہیں۔ مشہور تھا کہ وہ اس وجہ سے پاس نہیں ہونا چاہتے کہ پاس ہو گئے تو مانیٹری ختم ہو جائے گی۔ کالج میں مانیٹر کا کیا کام۔ ایک فوٹو سیمینارنگ کا ہے۔ میں تو اس میں اپنا حلیہ دیکھ کر بخونچنکارہ گیا۔ یا اللہ! ایسے ہوتے تھے ہم نوجوانی میں! کیسے اداس ہوتے تھے لڑکے اُس دن! تادمِ مرگ دوستی نبھانے، دُکھی انسانیت کی خدمت کرنے اور ایک دوسرے کو تمام عمر ہر تیسرے دن خط لکھنے کے کیسے کیسے عہد و پیمان ہوتے تھے! میز پر ابھی تک وہی سبز بنات منڈھی ہوئی ہے۔ روشنائی کے دھبوں سے 9/10 نیلی ہو گئی ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ بقیہ 1/10 پر بھی دوات انڈیل دوں تاکہ یہ برص کسی طرح ختم تو ہو۔ چیرا سیوں کی وردیاں بھی اسی بنات کی بنتی تھیں۔ سردی کڑا کے کی پڑنے لگتی تو کبھی کبھی اسکول کا چہرہ اسی بشیر ڈانٹ کے ہمیں گھر واپس بھیج دیتا کہ میاں! کوٹ لنگوٹ سے کام نہیں چلے گا۔ کمری، مرئی (روئی کی واسکٹ) ڈاٹ کے آؤ۔ مگر خود گھر سے ایک پتلی سی مرئی پہن کر آتا جواتنی پرانی ہو گئی تھی کہ لوزاتی ”پیٹرن“ کے ڈوروں کے ہر خانے میں روئی کا علحدہ گومڑا بن گیا تھا۔ لیکن یونیفارم کی اپکن گھر پہن کر نہیں جاتا تھا۔ میں نے اس پر کبھی کوئی سلوٹ یا داغ نہیں دیکھا۔ چھٹی کا گھنٹہ اس طرح بچاتا کہ گھڑیاں ٹھیک ٹھیک اٹھتا۔

بڑے کان، چھوٹے آدمی

مچھلی بازار کی مسجد شہید ہونے پر مولانا شبلی کی ”ہم کشتگانِ معرکہ کانپور ہیں“ والی معرکتہ آلا را نظم ابھی تک اسی کیل پر معالق ہے جو ٹھونکنے میں دُہری ہو گئی تھی۔ صاحب، جس شخص نے کیل ٹھونکتے وقت ہتھوڑا کیل کے بجائے اپنے انگوٹھے پر کبھی بھی نہیں مارا، مجھے تو

اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ایسے چوکس چالاک آدمی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس مسجد کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا تھا کہ یہ ”وہ مسجد ہے جس کے سامنے ہمارے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں۔“

نظم کے فریم کاشیشہ بیچ میں سے ایسا تڑخا ہے کہ مکڑی کا جالاسابن گیا ہے میں نے کوئی پچاس برس بعد یہ پوری نظم اور ”بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو“ والی نظم پڑھی۔ کیا عرض کروں۔ دل پہ وہ اثر نہ ہوا۔ اس زمانے اور دورِ ماقبل کے بعض کاز مثلاً ریشمی رومال والی تحریک، خلافت، جنگ بلقان (لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل، بلقان چل)، تعلیم نسواں اور سائنسی تعلیم کی شدید مخالفت جس میں اکبر الہ آبادی پیش پیش تھے، شاردا ایکٹ (صغرنی کی شادی پر پابندی کا قانون) کے خلاف مسلمانوں کا، بشمول مولانا محمد علی جوہر ایجنی ٹیشن ————— یہ اور بہت سے ایسے ہی کاز جن کی خاطر کبھی جان کی بازی لگانے کو جی چاہتا تھا، اب کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ خلافت موومنٹ ہی کو لیجیے۔ اس کی حمایت تو کاندھ جی نے بھی کی۔ اس سے زیادہ جوشیلی، ملک گیر، منظم، الٹی اور لاحاصل تحریک کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر وہ لوگ بڑے تھے۔ آج کل کاز تو بہت معقول اور بڑے ہیں، پر آدمی بہت چھوٹے ہو گئے۔ نشور ہی نے سودا کا شعر سنایا جو دو سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل آج کا شعر معلوم ہوتا ہے:

اثر سے میں تہی نالے، تصرف سے ہیں دم خالی
نیستان ہو گئے شیروں سے یارب یک قلم خالی

وہ بھی عجیب جذباتی دور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بدری نرائن نے ایک دفعہ محمود غزنوی کو لُٹیرا ملٹر (مٹا) کہہ دیا تو جواب میں عبدالمقیط خاں نے شیواجی کو Mountain Rat کہا۔ اس پر بات بڑھی اور بدری نرائن نے نام لے لے کے مغل بادشاہوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء مخفی پر تو بہت ہی گندہ بہتان لگایا۔ جواباً عبدالمقیط خاں نے پر تھوی راج چوہان، مہارانا پر تاج اور مرزا راجہ سوائی مان سنگھ کو ٹوم کے رکھ دیا۔ لیکن جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پر ہاتھ ڈالا تو بدری نرائن تلبلا اٹھا حالانکہ وہ سیکھ نہیں تھا۔ گور برہمن تھا۔ دونوں وہیں کھم مٹھتا ہو گئے۔ مقیط خاں کا انگوٹھا اور بدری نرائن کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ دونوں ایک ہی لونڈے پر عاشق تھے۔

چڑیا کی دُسرہاٹ

دیواروں پر وہی طفرے، وہی سبق آموز وصلیاں اور چارپائی بھی وہی جس کے سرھانے والے پائے پر عبدالمقیط خاں نے چاقو سے اس لونڈے کا نام کھودا تھا۔ اور اسی سے اٹھکی میں شکاف لگا کر خون حروف میں بھرا تھا۔ آپ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ اس کی کہانی سے طوائف خدا خدا کر کے رخصت ہوتی ہے تو لونڈا درانا چلا آتا ہے۔ صاحب کیا کروں۔ ان گنہ کار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہی تو بیان کروں گا۔ آپ میری کلیات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری پڑھئے۔ مصحفی کے دیوان دیکھیے۔ آپ کو جا بجا اس کی طرف علانیہ اشارے ملیں گے۔ صاحب، عورت کے بارے میں بات کرنے کا ہیماؤ تو کوئی بی۔ اے میں آ کے پڑتا تھا۔ اب اس لونڈے کا نام کیا بتاؤں۔ کانگرس کے ٹکٹ پر منسٹر ہو گیا تھا۔ کرپشن میں محال گیا۔ ایک ڈپٹی سکریٹری کی بیوی سے شادی کر لی تھی۔ ڈسمس ہونے کے تین مہینے بعد ایک سکھ بزنس مین کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس زمانے کی جنسی مرمومی اور گورکھن کا آپ بالکل اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس لیے کہ آپ اس وقت تک بالغ نہیں ہوئے تھے۔ مجاز نے جھوٹ نہیں کہا تھا:

موت بھی اس لیے گوارا ہے
موت آتا نہیں ہے، آتی ہے

صاحب، یقین جانتے، عالم یہ تھا اس زمانے میں کہ عورت کا ایکس رے بھی دکھا دیا جاتا تو لڑکے اسی پردل و جان سے عاشق ہو جاتے۔

روشن دان میں اب شیشے کی جگہ گتالٹا ہوا ہے۔ اس کے سوراخ میں سے ایک چڑیا بڑے مزے سے آ جا رہی تھی۔ نیچے جھری میں گونسل بنا رکھا ہے۔ اس کے بچے چوں چوں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن ملا عاصی کہنے لگے کہ بچے جب بڑے ہو کر گونسل چھوڑ دیں گے تو ہمارا گھر بہت سنسان ہو جائے گا۔ دُھول سے دری کی لائینیں مٹ گئی ہیں۔ میاں تجمل حسین کے سکرٹ سے چالیس پینتالیس برس پہلے سوراخ ہو گیا تھا، وہ اب بڑھ کے استباڑا ہو گیا ہے کہ اس میں سے تریز نکل جائے۔ سوراخ کے حاشیے پر دری کے پھونسٹوں کی جھالر سی بن گئی ہے۔ اس کے وسط میں وہی ریلوے ویٹنگ روم اور ڈاک بنگلوں والا کتھئی رنگ کا سینٹ کافر ش کلٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میاں تجمل حسین کی عمر اس وقت کچھ نہیں تو تیس برس تو ہوگی۔ تین بچوں

کے باپ بن چکے تھے۔ مگر بڑے حاجی صاحب (ان کے والد) کا ایسا رعب تھا کہ سگرٹ کی طلب ہوتی تو کسی دوست کے ہاں جا کر پی آتے تھے۔ حاجی صاحب سگرٹ پینے کا شمار آوارگی میں کرتے تھے۔ خود حقہ پیتے تھے۔ بائیسکوپ کا شمار بد معاشی میں کرتے۔ چنانچہ میاں تجمل کو تہہ سینما دیکھنے نہیں جانے دیتے تھے۔ خود ساتھ جاتے تھے۔

دیکھیے، میرے ”چنانچہ“ پر آپ پھر مسکرا رہے ہیں۔ صاحب! لکھنؤ اور کانپور والے اگرچہ اور چنانچہ کثرت سے بولتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لہذا بہت کاڑھا لگتا ہے۔ ارے صاحب، میں نے تو اس زمانے میں عام آدمیوں کو فلہذا، ہر چند، از بسکہ اور درنا خلیکہ تک بکثرت بولتے سنا ہے۔

چھپکلی کی کٹی ہوئی دم

چھت نہایت بوسیدہ، شہتیر دیک زدہ۔ پنکھے کا کڑا کھستے کھستے چوڑی برابر رہ گیا ہے۔ میں نجوی تو ہوں نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان تینوں میں سے پہلے کون گرے گا۔ ملاقاتی کو عین پنکھے کے نیچے بٹھاتے ہیں۔ اس غریب کی نگاہ سارے وقت پنکھے پر ہی جمی رہتی ہے۔ ائیر کن سے میں نے چھت پر جہاں چھپکلی ماری تھی، وہاں چھرے کا نشان بون کا توں موجود ہے۔ اور ہاں! چھپکلی پر یاد آیا۔ آپ کے اُس دوست کو جس کا خط ہاسٹل کے لڑکوں نے چرا کر پڑھ لیا تھا، اس کی بیوی نے کیا لکھا تھا؟ ہندی میں تھا شاید۔

”جگت نرائن سری واستونا نام تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ لکھا تھا رام کسم! تمہارے بناراتوں کو ایسے تڑپتی ہوں جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دم!“

واہ! اس تشبیہ کے آگے تو ”ماہئی بے آب“ پانی بھرتی ہے۔ مگر آپ اسے ناسٹجیازدہ لوگوں کے لیے سبیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یہ زیادتی ہے۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ملا عاصی کا ذریعہ معاش کچھ نہیں ہے۔ نہ کبھی تھا۔ مگر کبھی ٹھالی بھی نہیں رہے۔ بے روزگار ہمیشہ رہے، لیکن بیکار کبھی نہیں۔ غالباً سن ۵۱-۵۰ کی بات ہے۔ ان کی والدہ حصول ملازمت اور بدھ ازم سے چھٹکارے کی منت دوسری دفعہ مانگنے اجیر شریف گئیں۔ وہاں کسی نے کہا کہ اتناں، تم حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دو۔ وہاں خود خواجہ اجیری نے چلہ کھینچا تھا۔ سو وہ چھ مہینے بعد منت مانگنے لاہور چلی گئیں۔ مزار پر چڑھانے کے لیے جو کاملار ریشمی چادر وہ ساتھ لے گئی تھیں، اس میں نہ جانے کیسے سر شام آگ لگ گئی۔ لوگوں نے کہا، جلالی وظیفہ الٹا

پڑ گیا۔ دراجابت وانہ ہو تو نذر قبول نہیں ہوتی۔ وہ رات انہوں نے روتے گزاری۔ صبح نماز فجر ادا کرتے ہوئے سجدے کی حالت میں وہ مجیب الدعوات سے جاملیں۔ دے اور قلب کامزمن عارضہ تھا۔ لاہور ہی میں میانی صاحب قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد ان کے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ انہوں نے مکان کا بقیہ حصہ کرائے پر اٹھا دیا۔ کرایہ دار نے پندرہ سال سے وہ بھی مرینا بند کر دیا۔ سنا ہے اب الٹان کو کمرے سے بے دخل کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنے والا ہے۔ عمر کبھی بہتر کبھی پچھتر سال بتاتے ہیں۔ اور سال کے بعد وضاحتاً ”شمسی“ کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ تسامح نہ ہو۔ شمسی پر یاد آیا کہ چھٹی جماعت میں میں نے بھری کلاس میں قری سال کو قری سال اور لٹریچر کو لڑی پر پڑھا تو ماسٹر فاخر حسین نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور اس دن کے بعد سے مجھے بشارت لڑی چر کہنے لگے۔

۸

چیراسی کا سنہری دور ماتحتی

بشیر چیراسی سے ملنے گیا۔ بالکل بوڑھا پھونس ہو گیا ہے۔ مگر مکر بندہ وق کی نال کی طرح سیدھی۔ ذرا جوش میں آجائے تو آواز میں وہی کڑکا۔ کہنے لگا، میاں! بے غیرت ہوں۔ اب تو اس لیے زندہ ہوں کہ اپنے چھوٹوں کو، اپنی گود کے کھلائے ہوؤں کو کندھا دوں۔ ہمارا بھی ایک زمانہ تھا۔ اب تو پسینہ اور خواب آنے بھی بند ہو گئے۔ چھٹے چھما ہے کبھی خواب میں خود کو گھنٹہ بجاتے دیکھ لیتا ہوں تو طبیعت دن بھر چونچال رہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ابھی ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ ماسٹر سمیع الحق مجھ سے عمر میں پورے بارہ برس چھوٹے ہیں۔ تس پر یہ حال کہ حافظہ بالکل خراب۔ ہاضمہ اس سے زیادہ خراب۔ لوٹا ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں اور یہ یاد نہیں آ رہا کہ بیت الکلہا جارہے ہیں یا ہو کر آ رہے ہیں۔ اگر آ رہے ہیں تو ہیٹ میں گڑ گڑاہٹ کیوں ہو رہی ہے؟ اور جارہے ہیں تو لوٹا خالی کیوں ہے؟ مجھے ہر لڑکے کا حلیہ اور حرکتیں یاد ہیں۔ میاں، آپ کا شمار صورت داروں میں ہوتا تھا، حالانکہ سرمنڈاتے تھے۔ ملّا عاصی عورتوں کی طرح میچ کی مانگ نکالتا تھا۔ آپ کا دوست عاصم گلے میں چاندی کا تعویذ پہنتا تھا۔ جس دن

اس کامیٹرک کا پہلا پرچہ تھا ، اسی دن صبح اس کے والد کا انتقال ہوا ۔ جب تک وہ پرچہ کرتا رہا ، میں کوئے میں کھڑا الحمد اور آیتہ الکرسی پڑھتا رہا ۔ دو دفعہ آدھا آدھا گلاس دودھ پلایا اور جس سال کوئے میں بھونچال آیا اسی سال آپ کے دوست غضنفر نے انجن کے سامنے آکر خودکشی کی تھی ۔ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ پر میرے تو سیکڑوں بیٹے ہیں ۔ کون بھڑوا کہتا ہے کہ بشیر لا ولد ہے ۔

شرافت سے مالی دینے والے

پھر کہنے لگا ، یہ بھی مولا کا کرم ہے کہ صحیح وقت پہ رٹائر ہو گیا ، نہیں تو کیسی خواری ہوتی ۔ اللہ کا شکر ہے چاق و چوبند ہوں ۔ بڑھاپے میں بیماری عذاب ہے ۔ پر ضرورت سے زیادہ تندرستی اس سے بھی بڑا عذاب ہے ۔ فالتو تندرستی کو آدمی کائے پہ خرچ کرے ؟ میاں ، ہٹا لٹا بڑھا گھر کا نہ کھاٹ کا ۔ اسے تو گھاٹ کی ہیرا پھیری میں ہی مزہ آوے ہے ۔ چنانچہ پچھلے سال ٹلکتا ہوا اسکول جانگلا ۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ۔ چہر اسی صاحبان بغیر چہر اس ، بغیر اچکن ، بغیر پکڑی ٹوپی کے کد کڑے مارتے پھر رہے تھے ۔ میاں ، میں تو آج تک بیت الخلاء بھی بغیر ٹوپی کے نہیں گیا ، اور نہ کبھی بغیر لنگوٹ کے نہایا ۔ ایک دن حمید الدین چہر اسی نے اپنی اچکن رفوگر کو روک کرنے کے لیے دی اور فقط کرتا پہنے ڈیوٹی سرانجام دینے لگا تو ہیڈ ماس صاب بولے کہ آج تم بچوں کے سامنے کائے کو شمشیر برہنہ پھر ریئے ہو ؟ ہمارے وختوں میں چہر اسی کا بڑا رُعب ہوا کرتا تھا ۔ ہیڈ ماس صاب سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے ۔ میاں ، آپ تو شاہد ہیں ، مجھے آج تک کسی ٹیچر نے بشیر یا تم کہہ کر نہیں پکارا ۔ اور میں نے کسی بر خوردار کو تم نہیں کہا ۔ ایک بد زبان ہیڈ کانس ٹیبل نے مجھے ایک دفعہ بھرے بازار میں ”اے بے پرے ہٹ“ کہہ دیا ۔ میں اس ٹیم اپنی سرکاری یونی فارم میں ملبوس تھا ۔ میں نے اسے دونوں کان پکڑ کے ہوا میں آدھرا اٹھالیا ۔ دھائی من کی راس تھی ! میں نے زندگی میں بڑے سے بڑے تیس مار خاں کا گھڑیاں بجا دی ۔ آج کل کے چہر اسی تو شکل صورت سے چڑیا رنگیں ہیں ۔ ہمارے زمانے کا رکھ رکھاؤ ، ادب آداب کچھ اور تھے ۔ شرفاؤں کی زبان پر تُو اور تیری نہیں آتا تھا ۔ مالی بھی دیتے تو آپ اور آپ کی کہتے تھے ۔ میاں ، آپ کے دادا بڑے جلالی آدمی تھے ۔ پر بڑی شرافت سے مالی دیتے تھے ۔ حسب مراتب — بھونڈو ، بھٹیلا ، بھڑ بھونجا ، بھانڈ — کوئی بہت ہی بے غیرت ہوا تو بھانڈو بھڑوا کہہ دیا ۔ ایک دن اردو ٹیچر کہنے لگا کہ وہ بڑے بھاری عالم ہیں ۔ مالی نہیں جکتے ، بھ کی گردان کرتے ہیں ۔ میاں ، میں جاہل آدمی ٹھہرا ۔ گردان کا مطلب اس دن

سمجھ میں آیا۔ کمال استاد تھے! ان کی بات دل میں ایسے اترتی تھی جیسے باؤلی میں سیرمھیاں۔ کس واسطے کہ وہ مجھ جیسے جاہلوں کی عزت کرنا جانتے تھے۔ میاں آج کل کے بد دماغ عالم اپنے تئیں عقل کل سمجھنے لگے ہیں۔ نیا نیا علم انہیں اس طریقوں چیمے ہے جیسے نیا جوتا۔ پر سارا سمندر دکوس کے اور ساری سپیمیاں ٹھکل کے ایک بھی موتی نہیں اکل سکتے۔

آخری گھنٹہ

یہ کہہ کے بشیر چاچا دیر تک پو پلے منہ سے ہستارہا۔ اب تو موڑوے بھی گھس چلے مگر آنکھ میں ابھی تک وہی twinkle۔ پھر ٹوٹے مونڈھے پر اکڑ کے بیٹھ گیا۔ شبنی نے، تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی، گردن، ہاتھ اور آواز کا ریشہ دور کر دیا۔ کہنے لگا، میاں یقین جانو، گھنٹہ سن کے مجھے تو ہول آنے لگا۔ اب ہر گھسارا، ڈوم دھاری گھنٹہ بجانے لگا ہے۔ اب تو ستیاناسی ایسے گھنٹہ بجا دے ہیں جیسے دارو پی کے ہولی کا ڈھول پیٹ رہے ہوں۔ ایسے میں بچے کیا خاک پڑھیں گے! پانچواں گھنٹہ تو جیسے تیسے میں نے سنا۔ پھر فوراً سے پیشتر بھاگ لیا۔ کس واسطے کہ چھٹا گھنٹہ سننا میری برداش سے باہر تھا۔ بوڑھا خون ایک دفعہ کھول جائے تو پھر بڑی مشکل سے جا کے ٹھنڈا ہووے ہے۔ مجھے پندرہ سال کی ملازمت اور جوتیاں سیدھی کرنے کے بعد گھنٹہ بجانے کے اختیارات ملے تھے۔ اس زمانے میں گھنٹہ بجانے والا چہر اسی عزت دار اور صاحب اختیار ہوتا تھا۔ ایک دن ہیڈ ماس صلب کے گھر سے خبر آئی کہ گھر والی کے ہاں بال بچہ تقریباً ہوا چاہتا ہے۔ بدحواسی میں وہ سالانہ امتحان کے پرچے میز پر کھلے چھوڑ گئے۔ اس رات میں گھر نہیں گیا۔ رات بھر پرچوں پہ سرکاری یونیفارم پہنے سانپ بنا بیٹھا رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جغرافیہ کے ماسٹر کو مجھ سے اور مجھ کو اس سے بلا وجہ کہ ہو گئی۔ میاں، تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بے سبب دشمنی اور بد صورت عورت سے عشق حقیقت میں دشمنی اور عشق کی سب سے نکال اور سب سے زیادہ خطرناک قسم ہے۔ کس واسطے کہ یہ شروع ہی وہاں سے ہووے ہیں جہاں عقل ختم ہو جاوے ہے۔ مطلب یہ کہ میری مت تو بغض للہی میں ماری گئی۔ پر اس کی عقل کا چراغ ایک بد صورت عورت نے ٹھل کیا جو میری ہم خندہ تھی۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کے لیے خوب صورت ہونا ضروری نہیں۔ بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہووے ہے! یہ کہہ کے بشیر چاچا پیٹ پکڑ کے پو پلے منہ سے ہنسا۔ آنکھوں سے بھی ہنسا۔ پھر کہنے لگا کہ میاں، ہماری جوانی میں کالی کلوٹی عورت کو کالی نہیں کہتے تھے۔ سانولی کہتے تھے۔ کالی سے تو افیم اور شکتی کی دیوی مراد ہوتی تھی۔ تو میں کہنے یہ چلاتا تھا کہ جب جغرافیہ

ٹیچر نوڈس دوسوں کی کلاس لیتا تو میں گھنٹہ دس منٹ دیر سے بچانے لگا۔ وہ تیسرے ہی دن چین بول گیا۔ دوسرے ٹیچر بھی ترہا ترہا کرنے لگے۔ مجھے اسٹاف روم میں کرسی پہ بٹھال کے بولے کہ ”بشیر میاں، اب غصہ تھوک بھی دو۔ گھن کے ساتھ ہمیں کائے کو پیستے ہو؟“

میں نے ہمیشہ اپنی مرضی اور اٹکل سے گھنٹہ بچایا۔ بندہ کبھی گھڑی کا غلام نہیں رہا۔ میرے اندر کی ٹک ٹک نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ اپنی مرضی کا مختار تھا۔ مجال ہے کوئی میرے کام میں ٹانگ اڑائے۔ اپنے کانپور کے مولانا حسرت موہانی کی سناؤنی آئی تو، قسم خدا کی، کسی سے پوچھے پاپچھے بغیر میں نے چھٹی کا گھنٹا بچا کے سارا اسکول بند کر دیا۔ غلام رسول دھری ایک بزدل تھا۔ بولا کہ بشیر! تیری خیر نہیں۔ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن تجھ سے جواب طلب کرے گا۔ میں بولا کہ فدوی کا جواب یہ ہو گا کہ حضور پر نور دام اقبال، خاطر جمع رکھیں۔ جب آپ فوت ہوں گے تب بھی بلا اجازت چھٹی کا گھنٹہ بچا کے اسکول بند کر دوں گا۔ پر جب وٹھ بھائی پٹیل کے مرنے کی خبر آئی تو ہیڈ ماس صاب نے کہا بشیر! چھٹی کا گھنٹہ بچا دو۔ میں نے دو دفعہ سُنی اُن سُنی کر دی۔ تیسری دفعہ انہوں نے تاکید کی تو اُدھر کو منہ پھیر کے لُنجے لُنجے ہاتھ سے بچا دیا۔ کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا۔ سن سینتالیس، گویا آزادی کے بعد تو فقط حاطے کی دیوار کا سایہ دیکھ کے گھنٹہ بچانے لگا تھا۔ پاس پڑوس والے گھنٹے سے اپنی گھڑیاں ملاتے تھے۔ ریٹائر ہوئے اب تو پندرہ برس ہونے کو آئے پر اب بھی پہلے اور آخری گھنٹے کے دخت سیدھے ہاتھ میں چُل سی اٹھتی ہے۔ بے طرح پھرنے لگتا ہے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ملازمت کا آخری دن انسان پہ کتنا بھاری ہووے ہے۔ میرا آخری دن تھا۔ اور میں آخری گھنٹہ بچانے جا رہا تھا کہ رستے میں ایک جی بھر آیا۔ وہیں بیٹھ گیا۔ مجید چیرا سی کو موگری تھماتے ہوئے بولا ”بیٹا، مجھ میں اس کی تاب نہیں۔ اپنا چارج یہیں سنبھال لے۔ کوچ بھارا تو ہی بجا۔“ پھر ہیڈ ماس صاب سے ملنے گیا تو وہ بولے کہ بشیر میاں، ٹیچر حضرات تمہیں تحفے میں ایک اچھی سی گھڑی دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، جناب عالی، میں گھڑی لے کے کیا کروں گا؟ مجھے کون سی ٹائم کیپری کرنی ہے۔ جب گھنٹہ ہی گھڑی دیکھے بغیر بجاتا رہا تو اب آخری دخت میں کون سا کام ہے جو گھڑی دیکھ کے کروں گا! البت کچھ دینا ہی ہے تو یہ چیرا اس دے دیکھے۔ چالیس سال پہنی ہے۔ کہنا پڑے گا کہ ہیڈ ماس صاب کا دل بڑا تھا۔ تیوری پہ بل ڈالے بغیر بولے ”لے جاؤ“ وہ سامنے کھنٹی پر ٹنگی ہے۔ تین چار مہینے میں ایک دفعہ اس کے پیتل کو نیو سے جھما جھما چمکا لیتا ہوں۔ اب ہاتھوں میں پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ چیرا اس کے بغیر کندھا بالکل خالی خالی اُلا سا لگے ہے۔ کبھی کبھی پالش کے بعد گلے میں ڈال

لیتا ہوں تو آپ کی آپ میرا کب (پیٹھ کی کچی) ٹھک جاتا ہے۔ گھڑی بھر کے لیے پہلے کی طریقوں چلت پھرت آجاتی ہے۔ میاں، ۱۹۵۵ کا واقعہ ہے۔ زبردستی اسکول بند کروانے کی غرض سے سیکڑوں ہڑتالی غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ ہاتھ پائی، مارا ماری پہ اُتار دیتے۔ معصوم بچے ہراساں، ٹیچر حریان۔ ہیڈ ماس صاب پریشان۔ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے لکھا کہ کسی مائی کے لال کی طاقت نہیں کہ میرے گھنٹہ بجائے بغیر اسکول بند کرادے۔ منحوس! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نہیں تو ابھی تم سب کا گھڑیاں بجادوں گا۔ ہیڈ ماس صاب نے پولیس کو فون کیا۔ تھانے دار نے کہا آپ کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی۔ میں نے غصے میں آن کر ریسپور ایک گز ڈوری سمیت جڑ سے اکھاڑ لیا۔ پھر میں ایک ہاتھ میں کاغذ کاٹے کا شمشیر برہنہ چاقو اور دوسرے میں ریسپور لٹھ کی طریقوں ہوا میں دائیں بائیں، شائیں شائیں کھاتا، فل سرکاری یونی فارم ڈاٹے، بنکارتا ڈکارتا آگے بڑھا تو جناب والا، کائی سی چھٹ گئی۔ سروں پہ قضا کھیل رہی تھی۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ جو نہیں گرا اس کو میں نے جالیا۔

اس وقت بشیر چاچا کی آنکھ میں وہی twinkle تھی جو ساری عمر شیر پچوں کی سنگت میں رہنے سے پیدا ہو گئی ہے۔ پچوں ہی کی طرح جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

پائنتی بیٹھنے والا آدمی

اس نے گھنٹہ بجانے کے فن کی بعض ایسی نزاکتوں پر توجہ دلائی جن کی طرف کبھی ذہن نہیں گیا تھا۔ مثلاً یہی کہ پہلے گھنٹے میں وہ موگری کو کھینچ کر گھڑیاں کے عین قلب میں مارتا تھا۔ ایک قطعیت اور حکمانہ اختصار کے ساتھ۔ کھیل کے گھنٹے کا اعلان تیز سرگم میں کنارے کی جھن جھن سے کرتا۔ پیر کے گھنٹوں کا کبھی ٹھنکا کا سینچر کی ٹھٹھے مارتی ٹھن ٹھن سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ کہنے لگا ”میاں! نئی پیڑھی (نسل) کے پی انوں (peons) کو صبح اور سہ پہر کے مزاج کا فرق معلوم نہیں۔“ اس نے کھل کر دعویٰ تو نہیں کیا، مگر اس کی باتیں سن کر مجھے سچ محسوس ہونے لگا کہ وہ صبح دعا کا گھنٹہ اپنے حسابوں بھیر وِس میں ہی بجاتا ہو گا۔

جتنی دیر میں وہاں بیٹھا وہ ہر پھر کے اپنے فرائض منصبی کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ چہرہ اسی نہ ہوتا، کچھ اور ہوتا تب بھی اپنا کام صرف جانفشانی ہی سے نہیں، اتنے ہی خضوع و خضوع سے کرتا۔ جب آدمی اپنے کام پہ فخر کرنا چھوڑ دے تو وہ بہت جلد بے حس اور نکمنا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کام کو بھی سچ سچ ذلیل اور گھٹیا بنا دیتا ہے۔ بشیر چاچا کہنے لگا کہ میری فارغ خطی

(وہ رٹائرمنٹ کو اسی خانہ خراب نام سے یاد کرتا ہے) سے ایک ماہ پیشتر ہیڈ ماس صاحب نے سفارش کی کہ محکمہ خوار قدیم ہے۔ اس کی تنخواہ بطور خاص بڑھادی جائے۔ اس پر محکمہ سے الٹا حکم آیا کہ اس کی پنشن کر دی جائے۔ یہ تو وہی کہات ہوئی کہ میاں ناک کاٹنے کو پھر بس، بیوی کہے تھے کھڑا دو! فارغ خطی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ایک چیئر فٹائ انسپیکٹر نے میرے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ چہرہ اسی بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمر جھک گئی ہے۔ اور لنگڑا نے بھی لکھا ہے۔ میاں، خدا کی شان دیکھو کہ چھ مہینے بعد اسی کبڑے اور لو لے لنگڑے بڑھے نے اسے کندھا دے کر آخری منزل تک پہنچایا۔ رہے نام اللہ کا!

پھر کہنے لگا ”ہمارے زمانے میں پلنگ چرپائی پہ ہی چوپال جمتی تھی۔ بزرگوں کی نصیحت تھی کہ چرپائی پہ کبھی سریانے کی طرف مت بیٹھو۔ ہمیشہ پائینتی بیٹھا کرو تاکہ کوئی تم سے بڑا آجائے تو جگہ نہ چھوڑنی پڑے۔ سوساری زندگی پائینتی بیٹھے گزار دی۔ میاں، اب تو تین کٹارے آن لگی۔ غریب پیدا ہوا۔ غریب ہی مروں گا۔ پر مولا کا کرم ہے، کسی کا دیل نہیں۔ میں نے اپنی چہر اس کو ہمیشہ زیور سمجھا اور یونی فارم کو خلعت جان کے پہنا۔“ اس نے یہ بھی کہا کہ ہر سال لڑکوں کی ایک نئی کھپ آئی۔ پر ایک لڑکا ایسا نہیں جسے اس نے تنبیہ و نصیحت نہ کی ہو۔ نیز اس نے اپنے سنہری دور ماتحتی میں نو ہیڈ ماسٹروں اور تیرہ انسپیکٹروں کو بھگتا دیا۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑن چھو ہو گئے۔ فقیر نے بڑے بڑوں کا گھڑیاں بجا دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی ہلتی ہوئی گردن اکڑ گئی اور اس نے سینہ تان لیا۔ اپنی کھانسی روکتے ہوئے بولا ”ہیڈ ماس صاحب نے کئی دفعہ کہا کہ میں تم کو پروموٹ کر کے سب چہر اسیوں، بخشی، مہتروں اور اسکول کے خوائے والوں۔۔۔ سب کے اوپر افسر بنانا چاہتا ہوں۔ پر میں نے عرض داش کی کہ اکبری سروری اسی کی ذات کو زیا ہے۔ میں نے زندگی میں بڑے بڑے افسر ٹانگ کے نیچے سے نکال دیے۔ افسری تکبر کا تاج ہے۔ آپ کا غلام اسے جوتی کی نوک پہ رکھتا ہے۔“ کہانیاں گھڑتے گھڑتے اب بشیر چاچا انہیں سچ بھی سمجھنے لگا ہے۔ بڑھاپے میں مشیخت پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اب بھی ہمارے آگے، یارو! جوان کیا ہے

میں نے اس کا دل خوش کرنے کے لیے کہا ”چاچا تم تو بالکل ویسے کے ویسے ہی ٹانھے رکھے ہو۔ کیا کھاتے ہو؟“ یہ سنتے ہی لاٹھی پھینک، سچ سچ سینہ تان کے، بلکہ پسلیاں تان کے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا:

”صبح نہار منہ چار مگلاس پانی پیتا ہوں۔ ایک فقیر کا ٹوٹکا ہے۔ کچھ دن ہوئے محلے والے میرے کئے (پاس) وفد بنا کے آئے۔ آپس میں کھس پھس کرنے لگے۔ میرے سامنے بات کرنے کا ہیاؤ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے کہا، بر خور داری کچھ منہ سے پھوٹو۔ عرض اور غرض میں کائے کی شرم۔ کہنے لگے، چاچا، تم لاولد ہو۔ دوسری شادی کر لو۔ ابھی تمہارا کچھ بھی تو نہیں بگڑا۔ جس دو شیکا کی طرف بھی چشم آبرو سے اشارہ کر دو، کپتے دھاگے میں بندھی چلی آوے گی۔ ہم بقلم خود پیام لے کے جائیں گے۔ میں بولا، پنچایت کا فیصلہ سر آنکھوں پہ۔ پر یہ جوان جو کھوں کا کام ہے۔ سوچ کے جواب دوں گا۔ کس واسطے کہ میری ایک مستورات مر چکی ہے۔ یہ بھی مر گئی تو تاب نہیں لاسکوں گا۔ ذرا دل لگی دیکھو۔ ان میں کا ایک چرب زبان لونڈا بولا کہ چاچا، ایسا ہی ہے تو کسی پکی عمر کی سخت جان نکائی (عورت) کے ساتھ دو بول پڑھو الو۔ بلقیس دو دفعہ رائد ہو چکی ہے۔ میں نے کہا، ہُشت!

کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدہ!“

صاحب، ملیدے کے استعارے کو اب کون سمجھے گا۔ یوں کہیے کہ شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں۔ میں نے چھیڑا ”چاچا اب بڑھاپے میں نئی روشنی کی بے کہی بیوی سے نباہ کرنا، اسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔“

بولا ”میاں، آپ نے وہ پرانی مثل نہیں سنی کہ ہزار لاٹھی ٹوٹی ہو، پھر بھی گھر بھر کے برتن باسن توڑنے کو بہت ہے۔“

یہ کہہ کر لاٹھی پہ سر ٹیک کے اتنے زور سے ہنسا کہ دے کا دورہ پڑ گیا۔ دس منٹ تک کھوں کھوں، کھس کھس کرتا رہا۔ مجھے تو ہول آنے لگا کہ سانس آئے گا بھی کہ نہیں۔

۹

گو تم بدھ بطور ہپیرویت!

ایک دن ملا عاصی سے طے پایا کہ اتوار کو لکھنؤ چلیں گے۔ اور وہ شہر بھاراں دیکھیں گے جس پر شامِ اودھ ختم ہوئی۔ لکھنؤ کے شیدا ئی اور ترجمان شیوا بیان مولانا عبد الحکیم شرر نے اودھ کے تمدن کا یہ باب ایک ڈوبتے سورج کی سرخی شفق سے رقم کیا ہے۔ میرا اصرار تھا کہ تم ساتھ چلو۔

چالیس برس بعد تنہا دیکھنے کا کس میں حوصلہ تھا۔ لوگوں نے ڈرا دیا تھا کہ زندگی اور زندہ دلی کا وہ مرقع جس پر ساری رونقیں، رعنائیاں اور رنگینیاں ختم تھیں۔۔۔۔۔ حضرت کنج۔۔۔۔۔ اب حسرت کنج دکھلائی دیتا ہے۔ صاحب، لکھنؤ haunted (آسیب زدہ) شہر ہویا نہ ہو، اپنا تو ہائٹڈ ذہن بٹی ہے۔ مجھے تو ایک صاحب نے یہ کہہ کر بھی دہلادیا کہ تمہیں چار باغ ریلوے اسٹیشن کا نام اب صرف ہندی میں لکھا نظر آئے گا۔ سارا لکھنؤ چھان مارو، کہیں اردو میں سائن بورڈ نظر نہیں آئے گا۔ البتہ قبروں کے کتبے اب بھی نہایت خوشخط اردو میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسا پاکیزہ خط اور ایسے موتی پرونے والے خطاط تمہیں ڈھونڈے سے پاکستان میں نہیں ملیں گے۔ میں مہمان تھا۔ چپکا ہو رہا۔ دو دن قبل میں نے ایک دلی والے سے سیدھے سبھاؤ کہیں یہ کہہ دیا کہ دلی کی نہاری اور گولے کے کباب دلی کی بہ نسبت کراچی میں بہتر ہوتے ہیں۔ ارے صاحب! وہ تو سر ہو گئے۔ میں نے کان پکڑے۔

عاصی وقت مقررہ پر نہیں آئے۔ پہلے تو غصہ آیا۔ پھر تشویش ہونے لگی۔ رکشا پکڑی اور ان کے حجرہ دکشا گیا۔ درمی پر بوسیدہ کاغذات، فائلیں اور تیس برس کے سیکڑوں پل اور رسیدیں پھیلائے، ان کے بچپوں بیچ اکڑوں بیٹھے تھے۔ مینڈک کی طرح پھدک پھدک کر مطلوبہ کاغذ تک پہنچتے تھے۔ جس کاغذ کا بعد میں بغور معائنہ کرنا ہو اس پر بدھ کی مورتی رکھ دیتے۔ تین بدھ تھے ان کے پاس: آنکھیں موندے ہوئے ہوئے مسکراتا ہوا بدھ۔ بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے جاتا ہوا جوان بدھ۔ مہینوں کے مسلسل فاقے سے ہڈیوں کا پنجرہ بدھ۔ ان تینوں بدھوں کو وہ اس وقت پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں تیز تیز بیدل چل کے آیا تھا۔ پسینے میں شرابور۔ ململ کا کرتا پیاز کی جھلی کی طرح چپک گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے پنکھا ”آن“ کیا تو سوچ کے شاک سے پچھاڑ کھا کے فرش پر گرا۔ خیر۔ صاحب، اسے آن کرنا تھا کہ کمرے میں آندھی آگئی اور سیکڑوں پتنگیں اڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کو نظر آنے بند ہو گئے۔ ان کا تیس سالہ فائلنگ سسٹم محو پرواز تھا۔ انہوں نے لپک کر لکڑی کی کھڑاوس پہنیں اور پنکھا بند کیا۔ چالیس پچاس سال پرانا پیتل کا سوچ شاک مارتا ہے۔ آن اور آف کرنے سے پہلے کھڑاؤں نہ پہنو تو موت واقع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ پھر انہوں نے دوڑ دوڑ کر اپنا دفتر لخت لخت اس طرح جمع کیا جس طرح لوہڈے پتنگ لوٹتے ہیں۔ کہنے لگے، بھائی، معاف کرنا۔ آج لکھنؤ ساتھ نہ جاسکوں گا۔ ایک ناگہانی الجھیڑے میں پھنس گیا ہوں۔

مرغان بننے کی فضیلت

صاحب! وہ الجھیرٹایہ تھا کہ نگر پالیکا (بلدیہ) نے پانی کا جو بل انہیں کل بھیجا تھا، اس میں ان کے والد کا نام اعجاز حسین کے بجائے اعجاز علی لکھا تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ ”سہو کتابت“ نوٹس نہیں کیا تھا۔ اب وہ گزشتہ تیس سال کے تمام بل چیک کر رہے تھے کہ اس غلطی کی شروعات کب ہوئی۔ کسی اور محکمے کے بل یا سرکاری مراسلے میں یہ سہو ولایت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیوں ہے؟ اور نہیں ہے تو کیوں نہیں؟ ایک تحقیق طلب مسئلہ یہ بھی کھڑا ہوا کہ پانی کے محکمے کو ولایت سے کیا سروکار۔ اسی کی ایک شق یہ نکلی کہ آیا اوروں کے بلوں میں بھی متعلقہ والد کی نشاندہی کی جاتی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا، مولانا ابل ”پے“ کیجیے اور خاک ڈالیے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بولے فرق کی بھی ایک ہی کہی۔ اگر باپ کے نام سے بھی فرق نہیں پڑتا تو پھر دنیا کی کسی بھی چیز سے نہیں پڑے گا۔ پانچویں کلاس میں میں نے ایک دفعہ شاہجہاں کے باپ کا نام ہمایوں بتادیا تو ماسٹر فاخر حسین نے مرغانا دیا تھا۔ وہ سمجھے میں مذاق کر رہا ہوں۔ یہ غلطی نہ بھی کرتا تو کسی اور بات پر مرغانا دیتے۔ اپنا تو طالب علمی کا زمانہ اسی پوز میں گزرا۔ بچ پر آنا تو اس وقت نصیب ہوتا تھا جب ماسٹر کہتا کہ اب بچ پھڑے ہو جاؤ۔ اب بھی کبھی طالب علمی کے زمانے کے خواب آتے ہیں تو یا تو خود کو مرغانا دیکھتا ہوں یا وہ اخبار پڑھتا ہوا دیکھتا ہوں جس میں میرا رول نمبر نہیں ہوتا تھا۔ مسٹر دوار کا داس چتر ویدی، ڈائریکٹر آف ایجوکیشن حال میں یورپ اور امریکہ کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ دنیا کے کسی اور ملک نے مرغانا بنانے کا پوز ”ڈسکور“ ہی نہیں کیا۔ میں نے تو عاجز آکر ترکی ٹوپی اوڑھنی چھوڑ دی تھی۔ مرغانا بتا تو اس کا پھندنا آنکھوں سے ایک انچ کے فاصلے پر تمام وقت پنڈولم کی طرح جھولتا رہتا تھا۔ دائیں بائیں۔ پیرید کے آخر میں ٹانگیں برسی طرح کانپنے لگتیں تو پھندنا آگے پیچھے جھولنے لگتا۔ اس میں ٹرکوں کی توہین کا پہلو بھی مچلتا تھا جسے میری غیرت قومی نے گوارا نہ کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے کسی بھی قسم کی ٹوپی نہیں اوڑھی۔

میں نے فقرہ کسا، مہاتما بدھ بھی تو تنکے سر رہتے تھے۔ انہوں نے فقرہ منظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے کبھی غور کیا، جب سے لڑکوں کو مرغانا بنانا بند ہوا ہے، تعلیمی اور اخلاقی معیار گر گیا ہے۔ ویسے تو میں اپنے شاگردوں کی ہر نالائقی برداشت کر لیتا ہوں، لیکن غلط تلفظ پر آج بھی کھٹ سے مرغانا دیتا ہوں۔ جسم سے چمکی ہوئی جینز پہننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اس سے فارسی الفاظ کے تلفظ، آبدست اور مرغان بننے میں دقت ہوتی ہے۔ مگر آج کل کے

لونڈوں کی ٹانگیں پانچ منٹ میں ہی ناپاقتی سے لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ میں اپنے زمانے کے ایسے لڑکوں کو جانتا ہوں جو بیس بیس بید کھانے پر ”سی“ تک نہیں کرتے تھے۔ ایک تو ایس پی ہو کے ریٹائر ہوا۔ دوسرا دیہات سُدھار کے محکمے میں ڈائریکٹر ہو گیا تھا۔ اب ویسے شرارتی اور جی دار لڑکے کہاں! دراصل اس زمانے میں کیریئر بہت مضبوط ہوا کرتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے کیمیا بنانے میں ایک آج کی کسر رہ جاتی تھی، اسی طرح آج کل کی تعلیم میں ایک بید کی کسر رہ جاتی ہے۔

ایک کٹورا چاندی کا

اس دن سخت گرمی تھی۔ کوئی نصف صدی بعد ناریل کے ڈونگے سے پانی نکال کر اسی نقشین کٹورے سے پیا۔ اندر سورہ یاسین کندہ ہے۔ خالص چاندی کا ہے۔ آپ نے کٹورا اسی آنکھ کا محاورہ سنا ہے؟ حضور میں نے دیکھی ہے! تو شام کو جب ہم فٹ بال کھیل کر لوٹتے تو اس کے پتلے کنارے کو ہونٹوں کے بیچ میں لیتے ہی لگتا تھا کہ ٹھنڈک رگ رگ میں اتر رہی ہے۔ اسی کٹورے میں شہد گھول کے ملا عاصی کو پیدا ہوتے ہی ماں کے دودھ سے پہلے چٹایا گیا۔ اسی کٹورے سے نزع کے وقت ان کے دادا اور والد کے منہ میں آبِ زمِ چوایا گیا تھا۔ اب بھی آئے دن لوگ مانگ کے لے جاتے ہیں اور بیمار کو آبِ شفا پلاتے ہیں۔ میں نے پینے کو تو کٹورے سے پانی پی لیا۔ مگر عجیب سا لگا۔ کُھدے ہوئے حروف میں کالا سیاہ میل جا ہوا تھا۔

صاحب، سچی بات یہ کہ پانی تو آج بھی اتنا ہی ٹھنڈا ہے۔ کٹورا بھی وہی۔ پینے والا بھی وہی۔ پروہ پہلی سے پیاس کہاں سے لائیں!

یوں تو گھر میں ایک مراد آبادی کام کا گلاس بھی ہے۔ انہی کا ہم عمر ہو گا۔ پہلی مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ایک شاگرد کو دوڑایا۔ وہ کہیں سے ایک پڑیا میں شکر مانگ کر لایا۔ انہوں نے اسی گلاس میں الٹی پنسل سے گھول کر شربت پلایا۔ میں تو شکر کے شربت کا مزہ بھی بھول چکا تھا۔ ہمارے بچپن میں اکثر اسی سے مہمان کی تواضع ہوتی تھی۔ سوڈے اور جنجر کی بوتل تو صرف بد ہضمی اور ہندو مسلم فساد میں استعمال کی جاتی تھی۔

شیر (شاہ) لوہے کے جال میں ہے

دیکھئے، میں کہاں آنکلا۔ بات یلوں سے شروع ہوئی تھی۔ جب انہوں نے اپنا دغیر

پریشان سمیٹ لیا تو میں نے پھر پنکھا آن کرنا چاہا، مگر انہوں نے روک دیا۔ کہنے لگے، معاف کرنا۔ شیر شاہ علیل ہے۔ پنکھے سے بخار اور تیز ہو جائے گا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس نام کا کا، بلکہ کسی بھی نام کا، کوئی بیمار نظر نہ آیا۔ اور نظر آتا بھی کیسے۔ شیر شاہ دراصل اس بیمار کبوتر کا نام تھا جو کوئے میں ایک جالی دار نعمت خانے میں بند تھا۔ ایسے نعمت خانے، جنہیں بعض لوگ گنجینے بھی کہتے تھے، اس زمانے میں ریفریجریٹر کی جگہ استعمال کیے جاتے تھے۔ حدود اربعہ بھی کم و بیش وہی۔ لکڑی کے دو تین منزلہ فریم پر چاروں طرف لوہے کی مہین جالی منڈھی رہتی تھی، جس کا ضمنی مصرف ہوا پہنچانا، لیکن اصل مقصد مکھیتوں، بلیوں، چوہوں اور بچوں کو کھانے سے محروم رکھنا تھا۔ اس کے پایوں تلے بالعموم پانی سے لبریز چار پیالیاں رکھی ہوتی تھیں جن میں ان چٹوری چٹوٹیوں کی لاشیں تیرتی رہتی تھیں جو جان پر کھیل کے، یہ خندق پار کر کے ممنوعہ لڈائز تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ یہ نعمت خانے ڈیپ فریز اور ریفریجریٹر سے اس لحاظ سے بہتر تھے کہ ان میں رکھا ہوا بد مزہ کھانا دوس گھنٹے بعد ہی سڑ جاتا تھا۔ اسے روز بحال بحال کے ہفتوں نہیں کھلایا جاتا تھا۔ ایسے نعمت خانے اس زمانے میں ہر متمول گھرانے میں ہوتے تھے۔ نچلے متوسط طبقے میں چھینکا استعمال ہوتا تھا، جب کہ غریب غربا کے ہاں روٹی کی اسٹوریج کے لیے آج بھی محفوظ ترین جگہ پیٹ ہی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا نعمت خانہ ۱۹۵۳ سے ملّا عاصی کے بیمار کبوتروں کا Intensive Care Unit ہے۔ اُس دن لکھنؤ نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بیمار کبوتر کو اکیلا چھوڑ کر سیر سپاٹے کے لیے جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک کبوتری نور جہاں اچانک مر گئی تو دس بارہ دن تک گھر سے نہیں نکلے، کیوں کہ اس کے بچے بہت چھوٹے اور بالکل ہی مکاؤ دی تھے۔ انہیں سیتے رہے۔ دروپدی نام کی ایک انار (سرخ آنکھوں والی) کبوتری کی چونچ ٹوٹ گئی۔ اسے مہینوں اپنے ہاتھ سے چوکا کھلایا۔ انہوں نے ہر کبوتر کا ایک نام رکھ چھوڑا ہے۔ اس وقت ایک لٹھ کبوتر رنجیت سنگھ نامی دروازے کے سامنے سینہ اور دم پھلائے دوسرے فرقے کی کبوتریوں کے گرد اس طرح چکر لگا رہا تھا کہ اگر وہ انسان ہوتا تو فرقہ وارانہ فساد میں کبھی کا مارا جا چکا ہوتا۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں ”شمار“ ہوتا۔

کبوتروں کی چھتری

کبوتر بازی ان کا بہت پرانا شوق ہے۔ ان کے والد کو بھی تھا۔ میرے والد بھی پالتے

تھے۔ کبوتر کی فضیلت کے تو آپ کے مرزا عبدالودود بیگ بھی قائل ہیں۔ سچے شوق اور بابائی کی پہچان یہ ہے کہ بالکل فضول اور بے مصرف ہو۔ جانور کو انسان کسی نہ کسی فائدے اور خود غرضی کے تحت پالتا ہے۔ مثلاً کتا وہ دکھیارے پالتے ہیں جو مصاحب اور درباری افورڈ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ کتا اس مغالطے میں پال لیتے ہیں کہ اس میں برادرِ خورد کی خوبیاں ہوں گی۔ بکری اس غرض سے پالتے ہیں کہ اس کی مینگنی میں دودھ ملا کر جو ابار دو نقدادوں کو پلائیں گے۔ ہاتھی زیادہ تر وہ معتوب امر پالتے تھے جنہیں بادشاہ سزا کے طور پر ہاتھی مع بودہ منقری بخش دیتا تھا کہ جاؤ اب تمام عمارے کھلاتے ٹھساتے رہو۔ طوطے کو بڑے ارمانوں سے پالتے ہیں کہ بڑا ہو کے اپنی بولی بھول جائے گا اور ساری عمر ہمارا سکھایا ہوا بول دہراتا رہے گا۔ مولوی صاحبان مرغی کے اذان فقط مرغی کے لالچ میں برداشت کر لیتے ہیں۔ اور ۱۹۶۳ میں آپ نے بندر محض اس لیے پالا تھا کہ اس کا نام ”ڈارون“ رکھ سکیں! لیکن صاحب، کبوتر کو صرف اس لیے پالا جاتا ہے کہ وہ کبوتر ہے اور بس۔ لیکن ملا عاصی کے ایک پڑوسی سعد اللہ خاں آخستہ نے قسم کھا کر کہا کہ ایک دن کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں صبح چھ بجے گرم کشمیری چائے کی ایک چینک لے کر ان کے ہاں گیا۔ دیکھا کہ کمرہ بچ ہو رہا ہے اور وہ گرمائی کے لیے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کبوتر دبائے بودھی ستو کی مورتی کے سامنے دھیان میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ غلو وغیبت برگردنِ راوی۔

ایک صحبت میں کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو کہنے لگے، میں نے سنا ہے، گو کہ یقین نہیں آتا، کہ کراچی میں کبوتروں کی ایک بھی چھتری نہیں! یارو، تم نے کیسا شہر بنایا ہے؟ جس آسمان پر کبوتر، شفق، پتنگ اور ستارے نہ ہوں ایسے آسمان کی طرف منظر اٹھا کے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بجائی ابرار حسین دسمبر ۱۹۷۳ء میں کراچی میں تھے۔ دو مہینے رہے ہوں گے۔ مطلع مستقل ابر آلود رہا۔ صرف ایک دن دوپہن کی مدد سے ایک ستارہ منظر آیا۔ وہ دُمدار ستارہ تھا! کہہ رہے تھے کراچی میں لوگ ہم لکھنؤ والوں کی طرح پتنگ، تیتہ، مرغ اور مینڈھے نہیں لڑاتے۔ خود لڑ لیتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس محلے میں بھی اب نہ کوئی پتنگ اڑاتا ہے، نہ کبوتر۔ لے دے کے یہی ایک چھتری رہ گئی ہے۔ لکھنؤ کا حال اس سے بھی ابتر ہے۔ اور ایک وہ زمانہ تھا کہ تمہارے جانے کے بعد دسمبر ۷۴ء میں علیم الدین نے ————— بھٹی وہی اپنا شیخ چلی لڈن ————— پاکستان جانے کے لیے یوریا بستر باندھ لیا تھا۔ مگر عین وقت پر ارادہ فسخ کر دیا۔ کس واسطے کہ ماسٹر عبدالشکور بی۔ اے، بی۔ ٹی نے اسے ڈرا دیا کہ تم ٹرین میں کبوتروں کی چھتری ہمراہ نہیں لے جا سکتے۔ اور چوری چھپے لے بھی گئے تو واہگہ سرحد پر پاکستان کشم والے نہ

جائے کیا سمجھ کے تمہیں کو دھریں۔ بھائی بشارت! تم تو ہجرت کر کے مہاجر بنے۔ ہم اپنے شہر میں بیٹھے بیٹھے ہی غریب الوطن ہو گئے۔ یہ وہ شہر تھوڑا ہی ہے۔ وہ شہر تو قصہ کہانی ہو گیا۔ آکار بدل چکا ہے۔ اب اس محلے میں ۹۵ فی صد گھروں میں ویجی ٹیرین (سبزی خور) رہتے ہیں۔ ان کی بلیاں گوشت کو ترس گئی ہیں۔ چنانچہ سارے دن میری چھتری کے چوگرد منڈلائی رہتی ہیں۔ بھٹی تمہیں تو یاد ہو گا، کوپرایلن اینڈ کمپنی کا بڑا صاحب۔ کیا نام تھا اس کا؟ سر آر تھرانس کپ؟ اس کی میم جب ولایت سے سیامی بلی لائی تو سر آر تھرنے کانپور شہر کے سارے بلوں کو neuter (آختہ) کر دیا تھا تاکہ بلی پاک دامن رہے۔ دو بنگلے چھوڑ کر اجل میر سٹر رہتے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ ایک رات ان کے کتے کو بھی پکڑ کر احتیاطاً آختہ کر دیا۔ سن اکتالیس کا قصہ ہے۔ Quit India تحریک سے ذرا پہلے۔

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ وہ اب بھی ہنستے ہیں تو بچوں کی طرح ہنسے چلے جاتے ہیں۔ پھر آنکھیں پونچھ کر تکلیف سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ اب مجھ میں استقامت نہیں رہا کہ چھت پر آواز لگا کے سب کو کابکوں میں بند کروں۔ سدھے سدھائے کبوتر تو چراغ جلے خود آ آ کے کابک میں دبک جاتے ہیں۔ بقیہ کو شاگرد گھیر گھار کے بند کر دیتے ہیں۔ وہی دانہ چو کا ڈالتے ہیں۔ اشرا فوں کے جتنے شوق تھے سب پہ زوال آ گیا۔ شہر میں جوار تک نہیں ملتی۔ پچاس میل دور ایک گاؤں سے منگواتا ہوں۔ پٹواری میرا شاگرد رہ چکا ہے۔ آج کل کے کسی گریجویٹ کو پکڑ کے پوچھ دیکھو۔ جواں باجرے اور کنگنی کا فرق بتا دے تو اسی کے پیشاب سے اپنی بھوس منڈوا دوں۔ تناوے فی صد نے زندگی میں جو بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اماں، کیا کراچی کا بھی یہی حال ہے؟ مگر تیورس کے سال ایک کرم فرما اس شغل میں میرے توغل کے پیش نظر (دیکھیے یہاں بھی ملنا کے منہ سے ماسٹر فاخر حسین بول رہے ہیں) کراچی سے سوغات میں ایک ناول لائے، ”دلی کی ایک شام“۔ کوئی جید عالم ہیں پروفیسر احمد علی۔ بھٹی خوب لگتے ہیں۔ دلی کے روڑے لگتے ہیں۔ ان کے انگریزی ناول کا با محاورہ ترجمہ ہے۔ واللہ جی خوش ہو گیا۔ ہر صفحے پر دلی کے تمام بیگماتی محاورے اور کبوتر ایک ساتھ چھوڑ دیے ہیں۔ ان کی کوئی اور کتاب کبوتروں سے متعلق ہو تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھیجنا۔

کالا کبوتر اور دوشیزہ کی بلی

ان کے سڑی پن کا ایک واقعہ ہو تو بیان کروں۔ ایک سالانہ روٹین کا حال سناتا ہوں۔

میٹرک کے زمانے سے ہی (جب وہ اپنی بائیسویں سالگرہ منا چکے تھے) انہوں نے یہ وتیرہ اختیار کر لیا تھا کہ امتحان کا نتیجہ اخبار میں نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ اخبار لینا اور پڑھنا اور اخبار بینوں سے ملنا ترک کر دیتے تھے۔ ممکن ہے اس کا سبب بے نیازی ہو۔ خوف بھی ہو سکتا ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ اپنی سالانہ نالاغی کو کوئلہ پرنٹ میں face نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال، نتیجے سے تقریباً ایک ہفتے قبل، اپنے ایک جگہری دوست امداد حسین زیدی کو اپنا ایک کالا گرہ باز اور ایک سفید لوٹن کبوتر دے آتے۔ اور کمرہ مقفل کر کے خود مراقبے میں چلے جاتے۔ امداد حسین کو یہ ہدایت تھی کہ جیسے ہی اخبار میں میرے پاس ہونے کی خبر پڑھو، فوراً سفید لوٹن کبوتر چھوڑ دینا۔ اور فیل ہو جاؤں تو کالا۔ پھر دن بھر کھڑکی سے آدھا دھڑکال نکال کر کبھی سوئے آسمان اور کبھی چھتری کو دیکھتے کہ کبوتر خبر لیا کہ نہیں۔ ہر سال منحوس کالے کبوتر کو زنج کر کے مرجینا (دوشیزہ کی بلی کا نام) کو کھلا دیتے۔ یہ شاہانہ وضع داری انہوں نے بی۔ اے تک قائم رکھی کہ قدیم زمانے میں بادشاہ بھی بری خبر لانے والے قاصد کا سر قلم کروا دیتے تھے۔ زلٹ والے ہفتے میں گھر میں روز کئی دفعہ رونا پیٹنا چھتا تھا، اس لئے کہ ان کی والدہ اور ہم شیر مکان جیسے ہی کوئی کالا کبوتر دیکھتیں، رونا پیٹنا شروع کر دیتیں۔ یوں تو چھتری پر دن میں کئی سفید کبوتر بھی آتے تھے، مگر وہ ان کا کوئی نوٹس نہیں لیتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ غلطی سے آن بیٹھے ہیں۔ بالآخر تین چار سال بعد زلزلہ لاکھ وہ دن آتا جب

ترپنتا، لومنتا، اٹھتا جو بے تابانہ آتا ہے

یعنی سفید لوٹن کبوتر آتا تو اس خوشی میں اپنے تمام کبوتروں کو جن کی تعداد ستراسی کے لگ بھگ ہوگی، جوار کے بجائے گپھوں کھلاتے اور سب کو ایک ساتھ اڑاتے۔ دوسرے دن اس کبوتر کے پاؤں میں چاندی کی منی سی پینجی * ڈال دیتے، اور اس کے کلبک کے پاس کبوتر خانے میں دس تانہ (+) پٹھور کبوتریوں کا اضافہ کر دیتے۔ کبوتر خانہ تو ہم روانی میں لکھ گئے، ورنہ نقشہ یہ تھا کہ جب انہوں نے بی۔ اے پاس کیا تو میٹرک، انٹر میڈیٹ اور بی۔ اے تینوں کی ملا کر تیس عدد خولہ کبوتریوں کے اضافے کے بعد ان کا سارا گھر اس طائر خوش خبر یعنی لوٹن کبوتر کے حرم خاص میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گھر والوں کی حیثیت ان کبوتریوں کے خدمت کاروں اور

* پینجی: کبوتر کی جھانجھ

(+) تانہ: سفید ٹکلیے رنگ کا کبوتر یا کبوتری۔

پیٹ اٹھانے والوں سے زیادہ ہمیں رہی تھی۔

وہ اک سپہ جو بظاہر سپاہ سے کم ہے

جس دن وہ شیر شاہ نامی کبوتر کی علالت کے سبب میرے ساتھ لکھنؤ نہ جاسکے، میں نے کسی قدر جھنجھلاتے ہوئے ان سے کہا ”بندہ خدا! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اب تو اس کبوتر بازی پہ خاک ڈالو۔“

فرمایا ”تمہارے والد بھی تو بڑے پائے کے کبوتر باز تھے۔ میں تو ان کے سامنے بالکل اناڑی ہوں۔ اب لوگ اسے گھٹیا شوق سمجھنے لگے ہیں، ورنہ یہ صرف شرفا کا شوق ہوا کرتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی سواری بھکتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اڑتی ہوئی جاتی۔ اور جہاں پناہ پر سایہ کیے رہتی۔ جب واجد علی شاہ مٹیابرج میں محبوس ہوئے تو اس گئی گزری حالت میں بھی ان کے پاس چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے، جن کی دیکھ دیکھ پر سینکڑوں کبوتر باز مامور تھے۔“

عرض کیا ”اس کے باوجود لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سلطنت پر زوال کیوں آیا! تیغوں کے سائے میں پلنے والوں کے سروں پر جب کبوتر منڈلائے لگیں تو پھر سواری باؤ بہاری مٹیابرج اور رنگون جا کر ہی دم لیتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے کبوتر خانے اور واجد علی شاہ نے پری خانے اور کبوتر خانے پر جتنی رقم اور توجہ صرف کی، اس کا دسواں حصہ بھی اپنے توپ خانے پر صرف کرتے تو فوج ظفر موج بلکہ کبوتر موج کی یہ دُرگت نہ بنتی کہ ڈٹ کر لڑنا تو درکنار اس کے پاس تو ہتھیار ڈالنے کے لئے بھی ہتھیار نہ نکلے۔ ہائے!

وہ اک سپہ جو بظاہر سپاہ سے کم ہے

بگڑ گئے ”تو گویا سلطنت مغلیہ کا زوال کبوتروں کے سبب ہوا! یہ بات تو جادو ناتھ سرکار تک نے نہیں کہی! مسٹر چتر ویدی کہہ رہے تھے کہ انگلستان میں چمکتے لاکھ پالتو کتے ہیں! فرانس میں سواتین کروڑ pets (پالتو جانور) ہیں! سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، انگلستان میں ہر تیسرا بچہ ولد الزنا ہوتا ہے! اس کے علاوہ وہاں گزشتہ دس سال میں پچیس لاکھ اسقاط کرائے گئے! جیسے اپنے ہاں آدمی کثیر الاولاد ہوتا ہے، ویسے ہی ان کے ہاں بچہ کثیر الولدیت ہوتا ہے۔ آخر

ان پر زوال کیوں نہیں آتا؟

۱۰

چریا

ملّا عاصی کے کھٹ مٹھے مزاج کا اندازہ ایک واقعہ سے لکائیے جو ایک صاحب نے مجھے سنایا۔ ان کے پڑوسی نے کئی مرتبہ شکایت کی ”آپ کے کرایہ دار نے ایک نئی کھڑکی نکال لی ہے جو میرے والان میں کھلتی ہے۔ مستورات کی بے پردگی ہوتی ہے۔“ انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا تو ایک دن دھکی دی ”آپ نے کھڑکی نہ چنوائی تو ٹھیک نہ ہو گا۔ نالش کر دوں گا۔ اگر گھر کے سامنے قرقی کا ڈھول نہ بجوا دوں تو میرا نام نہیں۔ سارا بدھ ازم دھرا کا دھراہ جائے گا۔“ یہ پجارے خود کرائے دار کے ستائے ہوئے تھے۔ کیا کر سکتے تھے۔ البتہ پردے کے نقصانات ضرور بیان کر دیے جس سے وہ اور مشتعل ہو گیا۔ دو تین دن بعد اس نے یکم نومبر کو ان کو قانونی نوٹس دے دیا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر آپ نے کھڑکی بند نہ کروائی تو آپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ انہوں نے نوٹس پڑھ کر بھاڑ دیا۔ اس کی میعاد تیس نومبر کو ختم ہوتی تھی۔ یکم دسمبر کو صبح پانچ بجے انہوں نے اس پڑوسی کے دروازے پر دستک دی۔ وہ پڑڑا کر آنکھیں ملتا ہوا تنکے پیر باہر آیا تو کہنے لگے ”حضور! گستاخی معاف۔ میں نے کچی نیند اٹھا دیا۔ میں صرف یہ یاد دہانی کرانے آیا ہوں کہ آج آپ کو میرے خلاف مقدمہ دائر کرنا ہے۔ آداب۔“

ہم کراچی والوں کی اصطلاح میں ”چریا“ تو وہ سدا کے تھے، مگر اب اصلاح اور برداشت کی حد سے گزر گئے ہیں۔ آٹھویں جماعت سے لے کر بی۔ اے تک کورس کی تمام کتابیں جو انہوں نے پڑھی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہیں پڑھی تھیں، ایک الماری میں سجا رکھی ہیں۔ امتحان کے پرچوں کی ایک علیحدہ فائل ہے۔ ان کی رسم بسم اللہ پر جس چاندی کی پیالی میں زعفران گھولا گیا اور مسلمانوں کی تقریب میں زردوزی کے کام کی جو ٹوپی انہیں پہنائی گئی، اور اسی قسم کے اور بہت سے تبرکات دوسری الماری میں محفوظ ہیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ پیدائش کے وقت اپنا کام آپ کرنے سے بوجہ معذور تھے، ورنہ اپنا نال بھی منجملہ دیگر یادگار اشیاء کے سنگوا کر رکھ لیتے۔ ان کی تفصیل کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے۔ مختصر آیوں سمجھئے کہ عام طور پر مورخ یا ریسرچ کرنے والے کو بڑے آدمیوں کی زندگی کے بارے میں باریک تفصیلات کھود کھود کر

جھانکنے میں جو مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ انہوں نے اپنا تمام خام مواد اس کی ہتھیلی پر رکھ کے آسان کر دی ہے۔ واٹھ! میں نے ایسا آدمی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی کوئی چیز ڈسکارڈ (ترک) نہیں کر سکتے، بجز اپنے عقائد کے۔ اپنے کُڑے کو بھی ”این ٹیک“ بنا دیتے ہیں۔ کمرہ کا ہے کو بے یادوں کا ملبہ ہے جسے سیلچوں سے کھودیں تو آخری تہ کے نیچے سے خود موصوف برآمد ہوں گے۔

زوجہ کو چوک کے نام

اسی طرح گزشتہ تیس چالیس برسوں میں انہیں جتنے خطوط اجاب و اعزہ نے لکھے، وہ سب کے سب کھڑے سوؤں میں تاریخ وار پروئے ہوئے محفوظ ہیں۔ بیشتر پوسٹ کارڈ ہیں۔ اس زمانے میں پچانوے فی صد خطوط پوسٹ کارڈ پر ہی لکھے جاتے تھے۔ اس کا ایک کونا ذرا سا کاٹ دیا جاتا تو یہ الارم ہوتا تھا کہ کسی کے مرنے کی خبر آئی ہے۔ صرف کٹا ہوا کونا دیکھ کر ہی آن پڑھ گھرانوں کی عورتیں نامعلوم مُردے کے فرضی اوصاف بیان کر کر کے رونا پیٹنا شروع کر دیتی تھیں۔ اس اشنا میں کوئی پڑوسی خط پڑھ دیتا تو بین میں مرحوم کے نام کا اضافہ اور اوصاف میں کمی کر دی جاتی۔ پوسٹ کارڈ پر ایک طرف تیس تیس سطریں تو میں نے لکھی دیکھی ہیں جنہیں غالباً گھڑی سازوں والی یک چشمی خوردبین لگا کر ہی لکھا اور اسی طرح پڑھا جاسکتا تھا۔ میں ایک چمڑے کے بیوپاری شیخ عطا محمد کو جانتا تھا جو مال بک کرانے لگتے جاتا تو اپنی نوخیز و خور و زوجہ کو چوک کو (جسے محلے والے پیار میں صرف کو چوک کہتے تھے) بہ نظر کفایت پوسٹ کارڈ پر خط لکھتا، لیکن نجی جذبات کے اظہار میں کفایت شعاری سے بالکل کام نہیں لیتا تھا۔ دوسروں کے خط پڑھنے کا لپکا اس زمانے میں بہت عام تھا۔ پوسٹ میں ہمیں یعنی مجھے، میاں تجمل حسین اور ملّا عاصی کو وہ پوسٹ کارڈ پڑھوا دیتا تھا۔ ہم اسے ہرن کے کوفتے کھلاتے تھے۔ صاحب، زبان کا چٹخار بُری بلا ہے۔ میں جب اثاودہ کے اسکول میں تعینات ہو کر گیا تو اس نے میرا خط جو میں نے شادی کے کچھ دن بعد آپ کی بھابی کو لکھا تھا، ملّا عاصی اور میاں تجمل کو پڑھوا دیا۔ خط کا مضمون سارے شہر میں ہتھپنے کی طرح پھیل گیا۔ میں نے کئی بیقرار فقرے اور جملے کے جملے چمڑے کے بیوپاری کے پوسٹ کارڈوں سے اُڑائے تھے۔ ہر چند کہ وہ کچا چمڑا بیچتا تھا اور انشاء پر دازی اس کے پیشہ ورانہ فرائض اور شوہرانہ وظائف میں داخل نہ تھی، لیکن چودہری محمد علی ردو لوی نے بیوی کے نام مثالی خط کی جو تعریف کی ہے اس پر شیخ عطا محمد کے خطوط پورے اترتے تھے، یعنی ایسا ہو کہ مکتوب الیہ کسی کو دکھانہ سکے! کسی متفقہ نے شیخ عطا محمد کو بھی میرے خط کا مضمون سنا

دیا۔ کہنے لگا کہ اگر کوئی میرے انتہائی نجی جذبات اپنی ذاتی زوجہ تک پہنچانا چاہتا ہے تو میری عین خوش نصیبی ہے۔ شدہ شدہ آپ کی بھائی تک جب اس سرتے کی خبر پہنچی تو انہیں مدتوں میرے انتہائی اور بجنل مکتیب سے بھی چمڑے کی بو آتی رہی! عجیب گھپلا تھا۔ وہ اور کوچک ایک دوسرے کو اپنی سوکن سمجھنے لگیں جو ہم دونوں مردوں کے لیے باعثِ شرم تھا۔ دسمبر کی تعطیلات میں جب میں کانپور گیا تو اس حرمزدگی پر پوسٹ مین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور دھکی دی کہ ابھی پوسٹ ماسٹر کو رپورٹ کر کے تجھے ڈسمس کرادوں گا۔ غصے سے میں پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا ”بے ایمان! اب تجھے وہ دونوں ہرن کے کوفتے کھلا رہے ہیں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ”قسم قرآن کی! جب سے آپ گئے ہیں، ہرن کے کوفتے کھائے ہوں تو سوز کھایا ہو۔“ میں جوتا لے کے پیچھے دوڑا تو بد معاش قبولاکہ نیل کائے کے کھائے تھے!

بلیک باکس *

ہاں، تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ سوؤں میں پروئے ہوئے خطوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر سوئے پر پانچ پانچ سال کی مراسلت کو سولی دی ہے۔ لکڑی کے گول پیندے میں ٹھکے ہوئے یہ سوئے اُس زمانے میں فائلوں اور فائلنگ کیبنیٹ کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ سیاہ پیندے کا ایک سوامر حومین کے لئے وقف ہے۔ کہنے لگے کہ جب کسی کے انتقال کی خبر آتی ہے تو اس کے تمام خطوط مختلف سوؤں سے نکال کر اس میں لگا دیتا ہوں۔ اور یہ بلیک باکس بہت ہی اہم اور نجی کاغذات کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے وصیت کر دی ہے کہ مرنے کے فوراً بعد نذرِ آتش کر دیا جائے۔ میرا مطلب ہے، کاغذات کو۔

پلاننگ کے نیچے رکھے ہوئے جس سیاہ صندوق کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا، وہ دراصل ایک کیش بکس تھا۔ ان کے والد کے دوالے اور اس کے نتیجے میں انتقال کے بعد بس یہی اثاثہ ان کو تر کے میں ملا۔ اب بھی اکثر فرماتے ہیں کہ اس میں ایک لاکھ نقدی کی گنجائش ہے! لوگوں کا خیال ہے کہ اس بکس میں ان کی وصیت رکھی ہے جس میں واضح ہدایات ہیں کہ ان کی میت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے یا پارسیوں کی طرح لاش چیل

* Black Box: وہ مضبوط فائبر وائر اور شک پروف باکس جس کے اندر ہندو آلات سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ہوائی جہاز کے گر کر تباہ ہونے اور مسافروں کے ہلاک ہونے کی وجہ کیا تھی۔ یعنی بقول ہندوئی ماجد علی صاحب کے، مسافر گر کر مرے یا مر کر گئے تھے۔

کوؤں کو کھلا دی جائے۔ یا بدھ رسوم کے مطابق ٹھکانے لگائی جائے۔ جہاں عقائد میں استاکھلا ہو وہاں یہ وضاحت از بس ضروری ہے۔ غالب کو اس کی ”کلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھر وہ کہیں۔۔۔“ والی خواہش کے برعکس اس کے سنی عقیدت مند سنی طریقے سے کاڑ آئے، جب کہ اس غریب کا مسلک امامیہ تھا۔ صاحب، اس پر یاد آیا۔ غالب نے کیسی ظالم بات کہی ہے۔ حیف کافر مردوں و آدھ مسلمان زیستن۔ یعنی پروردگار! مجھے کافروں کی طرح مرنے اور مسلمانوں کی طرح جینے سے بچا! سب کچھ سات لفظوں کے ایک مصرع میں سمودیا۔

حرفِ حق کہ بعد از مرگ یاد آید۔۔۔

ان کے ایک قریبی دوست سید حمید الدین کا بیان ہے کہ وصیت میں یہ رقم فرمایا ہے کہ میں مسلمان تھا، مسلمان ہی مرا۔ باقی سب ڈھونگ تھا جو مسلمانوں کو چڑانے کے لیے رچانا پڑا۔ گویا ان کا کفر در حقیقت مکاری تھی! یہ بھی سننے میں آیا کہ انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میری وصیت ٹھیک اسی دن کھولی جائے جس دن مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب کے غیر مطبوعہ حصے بینک کے سیف ڈپازٹ لاکر سے نکالے جائیں۔ اس پر ایک دل جلے نے یہ نیم چڑھایا کہ وصیت میں ملا عاصی نے مولانا آزاد کے بارے میں اپنی بے نقط رائے لکھ دی ہے جس کا اظہار وہ اپنی زندگی میں خوفِ فسادِ خلق سے نہیں کر سکتے تھے۔ مگر سوچیے تو سہی۔ ملا عاصی نے آخر کون سی توپ چلائی ہوگی۔ بدترین سے بدترین گمان یہی ہو سکتا ہے کہ سچ بولا ہو گا! لیکن صاحب! وہ کلمہ حق کس کام کا جس کے اعلانیٰ جیتے جی جرات نہ ہوئی۔ ہر لمحے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس سچائی کا اعلان و ابلاغ بھی صرف اسی اور صرف اسی لمحے واجب ہوتا ہے۔ سو جو چُپ رہا اُس نے اس لمحے سے اور اپنے آپ سے کیسی دغا کی! بقول آپ کے مرزا عبد اللہ وودو بیگ کے، تمام عمر دروغِ مصلحت آمیز کے ساتھ ہنسی خوشی گزارہ کرنے کے بعد قبر میں پہنچ کر اور کفن پھاڑ کر سچ بولنے اور منہ پڑانے کی کوشش کرنا مردوں ہی کو نہیں، مردوں کو بھی زیب نہیں دیتا۔

پریم پتر اور گوتم بدھ کے دانت

شہر میں یہ بھی مشہور ہے کہ بکس میں اس پنجابی شرناں تھی لڑکی کے خطوط اور فوٹو ہیں جسے وہ ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ واللہ اعلم۔ یہ قبل از بدھ ازم کی بات ہے۔ میں تو اس زمانے میں کراچی آچکا تھا۔ سب اس کی ٹوہ میں ہیں۔ مگر بکس میں پیتل کا سیر بھر کا تالا پڑا ہے جس کی

چابی وہ اپنے کمر بند میں باندھ پھرتے ہیں۔ خلق خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ کسی نے کہا، لڑکی نے بلیڈ سے کلائی کی رگ کاٹ کے آتم ہیتا (خودکشی) کی۔ کسی نے اس کی ایک ناگفتہ بہ وجہ بتائی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ لڑکی کو ایک دوسرا ٹیوٹر بھی پڑھاتا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شمشان تک ارحی سے جیتا جیتا خون ٹپکتا گیا۔ اسی رات اس کا باپ نیند کی تیس چالیس گولیاں کھا کر ایسا سو گیا کہ پھر صبح ارحی ہی اٹھی۔ لیکن دیکھا جائے تو نہ لڑکی مری، نہ اس کا باپ۔ موت تو اس بیوہ اور چھ بچوں کی واقع ہوئی جو اس نے چھوڑے۔ تین چار دن بعد مگلی کے موڈ پر کسی نے ملا عاصی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ آنتیں کٹ کر باہر نکل پڑیں۔ چار مہینے گمنامی کی موت اور بدنامی کی زندگی کی کشمکش میں اسپتال میں پڑے رہے۔ سنا ہے جس دن ڈسچارج ہوئے، اسی دن سے جوگ لے لیا۔ مگر صاحب! جوگی تو وہ جنم جنم کے تھے۔ ایک مثل ہے کہ جوگی کا لڑکا کیلے کا تو سانپ سے۔ سو یہ ناگن نہ بھی ہوتی تو کسی اور گزند سے خود کو ڈسوالیتے۔ ارے صاحب، جب کشتی غرقابی ٹھہری تو، اور تو اور، خود خواجہ خضر پیندے میں سوراخ کر دیتے ہیں۔

اللہ جانے مذاق میں کہا یا سچ ہی ہو، انعام اللہ بر ملائی کہنے لگے کہ بلیک باکس میں ملا عاصی کے چار ٹوٹے دانت محفوظ ہیں جو وہ اپنے عقیدت مندوں اور آئندہ نسلوں کے لیے بطور relic چھوڑ کر مرنا چاہتے ہیں۔ آخر مہاتما بدھ کے بھی تو کم از کم سو دانت مختلف مقدس مقامات پر زیارت کے لیے بھاری حفاظتی پہرے میں رکھے ہیں۔

کمرے میں صرف ایک چیز واقعی نئی دیکھی۔ رسالہ ”عرفان“ کا تازہ شمارہ! اللہ جانے کسی نے ڈاک سے بھیجا یا کوئی شرارتا چھوڑ گیا۔ جہاں تہاں سے پڑھا۔ صاحب! وضع داری اس رسالے پر ختم ہے۔ نصف صدی پہلے اور آج کے ”عرفان“ میں ذرا جو فرق ہو۔ وہی ترتیب، وہی چھپائی اور گیٹ آپ جو پچاس برس پہلے تھا، محمد اللہ آج بھی ہے۔ مجھے تو چھاپہ خانہ اور کاتب بھی وہی معلوم ہوتا ہے۔ موضوعات اور مسائل بھی بعینہ وہی ہیں جو سرسید اور شبلی کے زمانے میں تھے۔ کاش یہ شمارہ ستر اسی سال قبل چھپا ہوتا تو بالکل ”آپ ٹو ڈیٹ“ معلوم ہوتا۔ مولانا شبلی نعمانی اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی اسے دیکھ دیکھ کر کیسے خوش ہوتے!

Life-Like دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے ابھی دیوار سے چھلانگ لگا کر جنگل کی راہ لے گا۔ اس کے نیچے ان کے دادا کی سی پیارنگ کی بیضوی تصویر ہے۔ صاحب، اس زمانے میں سبھی کے داداؤں کا خلیہ ایک جیسا ہوتا تھا۔ بھرواں داڑھی، پکڑ باندھے، پھولدار اچکن پہنے، ایک ہاتھ میں پھول دوسرے میں تلوار پکڑے کھڑے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد، بلکہ اس سے بہت پہلے، شرفا تلوار کو واکنگ اسٹک کے طور پر اور شعرا بطور استعارہ یعنی ناکردہ وصل کی حسرت کے الزام میں خود کو معشوق کے ہاتھوں قتل کروانے کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔ برصغیر میں یہ انحطاط و طوائف الملوکی کا وہ دور تھا جب رجز خوانوں کے دف ڈفلی بن چکے تھے اور طبل جنگ کی جگہ طبلے نے لے لی تھی۔ قومی عظمت کے ثبوت میں لوگ صرف عالیشان کھنڈر پیش کرتے تھے۔

یہ سانہر ستراسی سال کا تو ہو گا۔ دادا نے نیپال کی ترائی میں گرایا تھا۔ رفہ عام بلکہ شفا ئے عام کے لیے ایک سینک آدھا کاٹ کر رکھ لیا ہے۔ گھس کر لگانے سے درد گردہ میں آرام آجاتا ہے۔ دور دور سے لوگ مانگ کر لے جاتے ہیں۔ ایک بے ایمان مریض نے ایک انچ کاٹ کر لوٹایا۔ اس کے دونوں گردوں میں درد رہتا تھا۔ ملا عاصی اب سینک کو اپنی ذاتی نگرانی میں کُرٹ کی سیلی پر گھسواتے ہیں۔ ہندوستان میں ابھی تک یہ جاہلوں کے ٹوٹکے خوب چلتے ہیں۔ وہ اس کے لیپ کی تعریفیں کرنے لگے تو میں نے چنگلی لی ”مگر ملّا! گردہ تو بہت اندر ہوتا ہے“ بولے ہاں! تمہارے والد نے بھی پاکستان جانے سے پہلے تین چار دفعہ لیپ لکایا تھا۔ ایک سینک کاٹ کر اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا، قبلہ، بارہ سنگھوں کے رمنے میں اس گھسے گھسائے سینک سے کام نہیں چلنے کا۔

نٹ راج اور مُردار تیتیر

ملا عاصی نے ایک اور یادگار فوٹو دکھایا جس میں میاں تجمل حسین نٹ راج کا سافا تھانہ پوز بنائے، یعنی نیل کائے کے سر پر اپنا پیر اور ۱۲ بور کا کندہ رکھے، کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ اور میں مکے میں جست کی عمدہ چڑھی چھا مکمل اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک میلرڈ (نیل سر) مرغابی اور اپنا منہ لٹکائے کھڑا ہوں۔ میاں تجمل کا دعویٰ تھا کہ تھو تھنی سے دُم کی نوک تک نیل کائے کی لمبائی وہی ہے جو بڑے سے بڑے آدم خور بنکال ٹائیگر کی ہوتی ہے۔ نیل کائے کا شکار ایک مدت تک انڈیا میں ممنوع رہا۔ اب کھل گیا ہے۔ جب سے وہ فصلیں کی فصلیں صاف کرنے لگیں، نیل کایوں کو گھوڑا کہہ کر مارنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جیسے اٹکینڈ میں اب کالوں اور سانولوں

کو بلیک نہیں کہتے ethnic کہہ کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔

یہ فوٹو چودھری گلزار محمد فوٹو گرافر نے منٹ کیمرے سے میاں تجمل حسین کے گھر کے احاطے میں کھینچا تھا۔ فوٹو کھینچوانے کے لیے اتنی دیر سانس روکنا پڑتا تھا کہ صورت کچھ سے کچھ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ صرف مردہ نیل مکائے کا فوٹو اصل کے مطابق تھا۔ گلزار محمد اکثر شکار میں ساتھ لگ لیتا تھا۔ شکار سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میرا مطلب شکار کرنے سے ہے، کھانے سے نہیں۔ بس میاں تجمل حسین ہم وقت اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ خدا خواستہ وہ دوزخ میں بھیجے گئے تو مجھے یقین ہے تنہا ہرگز نہیں جائیں گے۔ پیشوائی اور PR کے لئے پہلے مجھے روانہ کر دیں گے۔ شہر سے سات اٹھ میل پر شکار ہی شکار تھا۔ عموماً تانگے میں جاتے تھے۔ کھوڑا اپنی ہی ہم وزن، ہم شکل اور ہم رنگ نیل مکائے ڈھو کر لاتا تھا۔ شکار کے تمام فرائض و انتظامات اس ناچیز کے ذمے تھے، سوائے بندوق چلانے کے۔ مثلاً نہ صرف ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ڈھن کیرئیر اٹھائے اٹھائے پھرنا، بلکہ اپنے گھر سے صبح چار بجے تازہ تر تر اتے پر اٹھے اور کباب بنوا کر اس میں ٹھسا ٹھس بھر کر لانا اور سب کو ٹھسانا۔ دسمبر کے کڑکڑاتے جاڑے میں تالاب میں اتر کر چھڑا کھائی ہوئی مرغابی کا تعاقب کرنا۔ ہرن پر نشانہ خطا ہو جائے، جو کہ اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا، تو میاں تجمل حسین کو قسمیں کھا کھا کے یقین دلانا کہ گولی برابر لگی ہے۔ ہرن بُری طرح لنگڑاتا ہوا گیا ہے۔ زخم ذرا ٹھنڈا ہو گا تو بے حیا وہیں پیچھا ڈکھا کے ڈھیر ہو جائے گا۔ تیتّر فوج ہونے سے پہلے دم توڑ دے تو اس کے گلے پر کسی حلال شدہ تیتّر کا خون لگانا بھی میرے گناہ منصفی میں داخل تھا، اس لئے کہ شکار اگر چھری پھیرنے سے پہلے مُردار ہو جائے تو وہ مجھے ہفتوں بُرا بھلا کہتے تھے۔ لہذا پچھڑایا گولی لگنے کے بعد میں زخمی جانور کی درازی عمر کی دُعا مانگتا تھا تاکہ اسے زندہ حالت میں حلال کر سکوں۔ مردار تیتّر اور مرغابیاں وہ سر آر تھرانس کپ کے بیشکل پر بھجوا دیتے تھے۔ بھجوا کیا دیتے تھے۔ یوں کہیے مجھی کو سائیکل پر لاد کے لے جانا پڑتا تھا۔ پیچھے کیر پر پر وہ خود شکار کو اپنی گود میں لے کر بیٹھتے تاکہ سائیکل پر بوجھ نہ پڑے! ان کا اپنا وزن (نہار منڈ) ۲۳۰ پونڈ تھا۔ اس کے باوجود میں بہت تیز سائیکل چلاتا تھا۔ ورنہ شکار کی بو پر لپکتے کتے فوراً آ لیتے۔ میاں تجمل کہتے تھے کہ بندوق میری۔ کار تو س میرے۔ نشانہ میرا۔ شکار میرا۔ چھری میری۔ سائیکل میری۔ حد یہ کہ سائیکل میں ہوا بھی میں نے ہی بھری۔ اب اگر اسے چلاؤں بھی میں ہی تو آپ کیا کریں گے؟

وفا بھی حُسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ بس کیا عرض کروں، اس یاری میں کیسی کیسی خواری ہوئی ہے۔ یہ تو کیسے

کہوں کہ میاں تجمل نے ساری عمر میرے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی ہے۔ ارے صاحب، کندھا خالی ہی کہاں تھا کہ بندوق رکھتے۔ کندھے پر تو وہ خود بعد بندوق سوار رہتے تھے۔ بخدا، ساری عمر ان کے غمزے ہی نہیں، literally (لفظاً) خود انہیں بھی اٹھایا ہے۔

اونٹ کی مستی کی سزا بھی مجھی کو ملی

یہ تو غالباً میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بڑے حاجی صاحب، یعنی تجمل کے والد، نانگہ اور موٹر کار رکھنے کو تکتے اور کابلی کی علامت سمجھتے تھے۔ سائیکل اور اونٹ کی سواری پر البتہ تعرض نہ کرتے۔ اس لیے کہ ان کا شمار وہ آلاتِ نفس کشی میں کرتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ ”میں پچیس سال کا ہو گیا، اس وقت تک میں نے ہجڑوں کے ناچ کے سوا کوئی ناچ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی تجمل (یعنی اپنے بیٹے) کی بیدائش پر۔ چھبیسویں سال میں لائلپور میں چوری چھپے ایک شادی میں بُجرا دیکھ لیا تو والد صاحب نے ہنکا کر دیا۔ عاق کرنے کی دھمکی دی۔ حالانکہ ورثے میں مجھے سوائے ان کے قرضوں کے اور کچھ ملنے والا نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ ’لوٹا بد چلن ہو گیا۔ چنیوٹ برادری میں میں پہلا باپ ہوں جس کی ناک فرزند کے ہاتھوں کٹی۔‘ چنانچہ بطور سزا اور سرزنش مجھے اُدھار کپاس خریدنے چنیوٹ سے جھنگ ایک مستی پر آئے ہوئے اونٹ پر بھیجا جس کے ماتھے سے بُودار مَدِرس رہا تھا۔ چلتا کم، بلبلا تا زیادہ تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں سرگودھے کے درختوں کے جھنڈ اور جھ * نظر آنے لگی تو وہ یکایک بدک گیا۔ اسے ایک اونٹنی نظر آگئی۔ اس کے تعاقب میں سرگودھا پار کر کے مجھے اپنے کوہان پر ہاتھ ہاتھ بھرا اچھالتا پانچ میل آگے نکل گیا۔ مجھے تو ایک میل بعد ہی اونٹنی نظر آئی بند ہو گئی، اس لیے کہ میں اونٹ نہیں تھا۔ لیکن وہ مادہ کی بُو پہ لپکا جا رہا تھا۔ میں ایک مست بھونچال پہ سوار تھا۔ بالآخر اونٹ انتہائی جوش کے عالم میں ایک دلدل میں مجھ سمیت گھس گیا۔ اور تیزی سے دھنسنے لگا۔ میں نہ اوپر بیٹھا رہ سکتا تھا، نہ نیچے کود سکتا تھا۔ گاؤں والے رستے، نسیمنی (سیردھی) اور قبر کھودنے والے کو ساتھ لے کر آئے تو جان بچی۔ کجاوہ گز بھر چوڑا تھا۔ ایک ہفتے تک میری ٹانگیں ایک دکھتی غلیل کی طرح چری کی چری رہ گئیں۔ اس طرح چلنے لگا جیسے خطرناک خونی قیدی ڈنڈا بیڑی پہن کر چلتے ہیں۔ یا لڑکے ختنوں کے بعد۔ مہتر سے کہہ کر قد چے ایک ایک گز کے فاصلے پر رکھوائے۔ اونٹ کی مستی کی سزا بھی مجھی کو ملی۔“

قبلہ کاہی کا خیال تھا کہ بیٹے کی چال دیکھ کر اونٹ نے بھی عبرت پکڑ لی ہوگی۔

علی گڑھ کٹ پاجامہ اور ارہر کی دال

حاجی صاحب قبلہ نے کانپور میں ایک ہندو سیٹھ کے ہاں ۱۹۰۷ء میں چار روپے ماہوار کی نوکری سے ابتدائی دینت دار، دینگ، قد آور اور ڈیل ڈول کے مضبوط تھے۔ سیٹھ نے سوچا ہو گا ابھی میں آسانی رہے گی۔ دوسری جنگ کے بعد حاجی صاحب کروڑ پتی ہو گئے۔ مگر وضع داری میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ مطلب یہ کہ ان کی خود آزاری کی حد تک پہنچی ہوئی جُرسی، وضع قطع، انکسار اور انداز گفتگو سے یہی لگتا تھا کہ اب بھی چار روپے ہی ملتے ہیں۔ کاڑھی ملل کا کرتا اور ٹخنے سے اونچی چوخانے کی لنگی باندھتے۔ شلوار صرف کسی فوجداری مقدمے کی پیروی کے لیے عدالت میں جانے اور جنازے میں شرکت کے موقع پر پہنتے تھے۔ ماکلز لکانے اور پتلون اور چوڑی دار پاجامہ پہننے والے کو کبھی ادھار مال نہیں دیتے تھے۔ کچھ نہیں تو چالیس پینتالیس برس تو یوپی میں ضرور رہے ہوں گے، مگر لگی ہوئی فیرنی، نہاری اور ارہر کی دال دوبارہ نہیں کھائی۔ نہ کبھی دوپٹی ٹوپی اور پاجامہ پہنا۔ البتہ ۱۹۳۸ء میں آپریشن ہوا تو نرسوں نے حالت بے ہوشی میں پاجامہ پہنا دیا تھا جو انہوں نے ہوش میں آتے ہی اتار پھینکا۔ بقول شاعر

بے ہوش ہی اچھا تھا، ناحق مجھے ہوش آیا

اکثر فرماتے کہ اگر چھٹے کو کسی شرعی تقاضے کے تحت یا پھکنی کے پٹھلاوے سے کچھ پہننا پڑے تو اس کے لیے علی گڑھ کٹ پاجامے سے زیادہ موزوں کوئی پہناؤ نہیں۔ پنجابی میں یہ فقرہ بڑا مزہ دیتا تھا۔ ہم سب فرمائش کر کے سنتے۔

نیل گائے اور پری چہرہ نسیم

میں نے ملا عاصی کو چھیڑا ”اب بھی شکار پر جاتے ہو؟“ کہنے لگے ”اب نہ فرصت، نہ شوق، نہ گوارا۔ ہرن اب صرف چڑیا گھر میں نظر آتے ہیں۔ میں تو اب مرغابی کے پروں کا تکیہ تک استعمال نہیں کرتا۔“ پھر انہوں نے الگنی پر سے ایک لیر لیر بنیان اتارا۔ اسے سونگھا اور اس سے لکڑی کے ایک فریم کو کچھ دیر گڑا تو خانی الذکر کے نیچے سے ایک شیشہ اور شیشے کے نیچے سے فوٹو برآمد ہوا۔ یہ فوٹو چوہدری گلزار محمد نے جنگل میں شکار کے دوران کھینچا تھا۔ اس میں یہ عاجز اور ایک چار کالے ہرن کو ڈنڈا ڈولی کر کے تانگے تک لے جا رہے ہیں۔ غنیمت ہے اس میں

وہ چیل کوئے نظر نہیں آ رہے جو ہم تینوں کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ کیا بتاؤں صاحب، ہمارے یار نے ہم سے کیا کیا یہ نگاری ہے۔ مگر سب گوارا تھا۔ فرشتوں کو کنوئیں جھٹکوا دیے اس حلق ظالم نے۔ بڑا خوبصورت اور کڑیل ہرن تھا وہ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بہت اداس تھیں۔ مجھے یاد ہے، اسے ذبح کرتے وقت میں نے منہ پھیر لیا تھا۔ اچھے شکاری عام طور پر کالا نہیں مارتے۔ ساری ڈار بے آسرا، بے سری ہو جاتی ہے۔ آپ نے وہ کہاوت سنی ہوگی۔ کالا ہرن مت مارو ستر ہو جائیں گی رائٹ۔ چوہدری گلزار محمد پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا، پندرہ بیس سال سے کانپور میں آباد و ناشاد تھا۔ اپنے اسٹوڈیو میں تاج محل اور قطب مینار کے فوٹو بھی (جو اس نے خود کھینچے تھے) بیچتا تھا۔ اپنے مکان کی دیواروں کو پنڈی بھٹیاں کے مناظر سے سجاکھا تھا۔ اس میں اس کا پٹھوس کے چھتر والا گھر بھی شامل تھا جس پر ٹرٹی کی سیل چڑھی تھی۔ دروازے کے سامنے ایک جھلنگے پر نورانی صورت ایک بزرگ حقہ پی رہے تھے۔ قریب ہی ایک کھوٹے سے غبارہ تھنوں والی بکری بندھی تھی۔ ہر منظر مثل لیلیٰ کے تھا جسے صرف مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ وہ دیکھی کو دیکھی اور تمغہ کو تمغہ * کہتا تو ہم سب اس پر ہنستے تھے۔ حلیم شمیم آدمی تھا۔ بڑی سے بڑی ہڈی توڑنے کے لیے بھی بڈا صرف ایک دفعہ مارتا تھا۔ چار من وزنی نیل کالے کی کھال آدھ گھنٹے میں اتار، منکا بوٹی کر کے رکھ دیتا۔ کباب لاجواب بناتا تھا۔ ہر وقت بیٹی کے خواب دیکھتا رہتا۔ کھال اتارتے وقت اکثر کہتا کہ کانپور میں نیل کالے کے سوا اور کیا دھرا ہے؟ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن منرو و مووی ٹون میں کیرہ مین بنوں گا۔ اور مادھوری اور مہتاب کے کلوز اپ لے کے تمہیں بھیجوں گا۔ پھر خود ہی نرت کر کے سیکسی یوز بناتا اور خود ہی کالے کپڑے کے بجائے اپنے سر پر خون آلود جھاڑن ڈال کر فرضی کیرے سے خود کو کلوز اپ لیتا ہوا imagine کرتا۔ ایک دفعہ اس طرح پری چہرہ نسیم کا کلوز اپ لیتے لیتے اس کی چٹھری بہک کر نیل کالے کی کھال میں گھس گئی۔ میاں تجمل چیخے کہ ”پری چہرہ گئی بھاڑ میں۔ یہ تیسرا چر کا ہے۔ تیرا دھیان کدھر ہے؟ کھال داغدار ہوئی جا رہی ہے۔“ کانپور میں ایک لاجواب taxidermist تھا۔ شیر کاسر البتہ بنگلور بھیجنا پڑتا تھا۔ رئیسوں کے فرش پر شیر کی، اور مڈل کلاس گھرانوں میں ہرن کی کھال بچھی ہوتی تھی۔ غریبوں کے گھروں میں عورتیں گوبر کی لپائی کے کچے فرش پر پکے رنگوں سے قالین کے سے ڈیزائن بنا لیتی تھیں۔

* تمغہ: صوبہ سرحد اور پنجاب میں جب لوگ تمغہ کو تمغہ کہتے ہیں تو عام طور پر اسے تلفظ کی غلطی پر محمول کیا جاتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صحیح لفظ تمغہ ہی ہے جو ترکی الاصل ہے۔ اور صحیح املا تمغا ہے۔

قصہ ایک مرگ چھالے کا

ملا عاصی کے کمرے میں دری پر ابھی تک نثار احمد خاں کی ماری ہوئی ہرنی کی کھال بچھی ہے۔ خاں صاحب کے چہرے، مزاج اور ہلچے میں خشونت تھی۔ عقائد میں ہمیشہ سے متشدد۔ وہابی مشہور تھے۔ واللہ اعلم۔ شکار کے دہشتی۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میاں تجمل کہتے تھے کہ وجہ پسندیدگی تمہارا منڈا ہوا سرا اور ٹخنے سے اونچا پاجامہ ہے۔ گراب جہاں لٹکا تھا، اس کا سوراخ کھال پر جوں کا توں موجود ہے۔ اس کے پیٹ سے پورے دنوں کا پچہ نکلا۔ کسی نے گوشت نہیں کھایا۔ خود نثار احمد دو راتیں نہیں سوئے۔ استنا اثر تو ان کے قلب پر اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب تیتیر کے شکار میں ان کے فیر کے چھڑوں سے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک کسان کی دونوں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ دو سو روپے میں معاملہ رفع دفع ہوا۔ ہرنی والے واقعے کے تین مہینے کے اندر اندر ان کا اکلوتا جوان بیٹا جو بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا، زخمی مرغابی کو پکڑنے کی کوشش میں تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کہنے والوں نے کہا، گیا بحن، گربہ وقتی کا سراپ لگ گیا۔ جنازہ والاں میں لا کے رکھا تو زنانے میں کہرام مچ گیا۔ پھر ایک بھنجی بھنجی سی چیخ کہ سننے والے کی چھاتی پھٹ جائے۔ نثار احمد خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”بیوی! صبر۔ صبر۔ صبر۔ اونچی آواز سے رونے سے اللہ کے رسول نے منع کیا ہے۔“ وہ بی بی خاموش ہو گئی، پر کھڑکی کے جھٹکے سے سر ٹکرا ٹکرا کے لہو لہان کر لیا۔ مانگ خون سے بھر گئی۔ میت لحد میں اتارنے کے بعد جب لوگ قبر پر مٹی ڈال رہے تھے تو باپ دونوں ہاتھوں سے اپنے سفید سر پر مٹھی بھر بھر کے خاک ڈالنے لگا۔ لوگوں نے بڑھ کر ہاتھ پکڑے۔ مشکل سے چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ بیوی کو صبر کی تلقین کرنے والا بھی کفن اوڑھ کے خاک میں جاسویا۔ وصیت کے مطابق قبر بیٹے کے پہلو میں بنائی گئی۔ ان کی پائنتی بیوی کی قبر ہے۔ فاتحہ پڑھنے قبرستان گیا۔ بڑی مشکل سے قبر ملی۔ شہر تو پھر بھی پہچانا جاتا ہے۔ قبرستان تو بالکل ہی بدل گیا۔ پہلے ہر قبر کو سارا شہر پہچانتا تھا کہ ہر ایک کامرنے والے سے جنم جنم کا نانا تھا۔ صاحب، قبرستان بھی جائے عبرت ہے۔ کبھی جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جس دن اس میں میت اتری ہوگی، کیسا کہرام مچا ہو گا۔ رونے والے کیسے ہلک ہلک کے، ٹرپ ٹرپ کے روئے ہوں گے۔ پھر خود یہی رونے والے دوسروں کو رولا کے یہیں باری باری پیوند خاک ہوتے چلے گئے۔ صاحب، جب یہی کچھ ہونا ہے تو پھر کیسا سوگ، کس کا ماتم، کاہے کا رونا۔

ماسٹر فاخر حسین کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھی۔ کچھ نہ پوچھئے، دل کو کیسی کیسی باتیں یاد آ کے رہ

مگنیں۔ لوح مزار گر گئی ہے۔ اس پر وہی شعر کندہ ہے جو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ حروف کی سیاہی کو تیس پینتیس برس کی بارشیں بہا کے لے گئیں۔

بعد از وفات شربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست *

تحت اللفظ، شرمائے شرمائے ترنم اور کھرج کی آمیزش بلکہ آویزش سے شعر پڑھنے کی ایک مخصوص طرز فاخری ایجاد کی تھی جو انہیں پر ختم ہو گئی۔ پڑھنے سے پہلے شیروانی کا تیسرا ہٹن کھول دیتے۔ پڑھ چکے تو بغیر پھندے والی ترکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دیتے۔ ہر شعر ایک ہی لے اور ایک ہی بحر میں پڑھنے کے سبب درمیان میں جو جھٹکے اور سکتے پڑتے، انہیں واہ! ارے ہاں! حضور! یا فقط با وزن کھانسی سے دور کر دیتے۔ مندرجہ بالا شعر میں سینہ ہائے عارف ادا کرتے تو انگشت شہادت سے تین چار دفعہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے۔ البتہ مزار ماست پڑھتے وقت ہم نالائق شاگردوں کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنی قبر کی نشان دہی کرتے۔

دیکھیے، یادوں کی بھول بھلیوں میں کہاں آ نکلا۔ جیھی تو پچارے ساحرے کہا تھا، یا ممکن ہے کسی اور نے کہا ہو:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

بات دراصل مرگ چھالے سے نکلی۔ ایک دفعہ میں نے لاپرواہی سے ہولڈر جھٹک دیا تھا۔ روشنائی کے چھینٹے ابھی تک کھال پر موجود ہیں۔ میں نے دیکھا کہ عاصی کھال پر پاؤں نہیں رکھتے۔ سارے کمرے میں یہی سب سے قیمتی چیز ہے۔ قیاس کن زمکستان من۔۔ دیکھئے زبان پر پھر وہی کم بخت ”لح“ آتے آتے رہ گیا۔ آپ نے بھی تو کسی بزنس ایگزیکٹیو کا ذکر کیا تھا جن کے اٹالین ماربل فلور پر ہر سائز کے نایاب ایرانی قالین بچھے ہیں۔ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا ہو تو وہ ان پر قدم نہیں رکھتے۔ ان سے بچ بچ کے تنگی راہداروں پر اس طرح قدم رکھتے زک زیک جاتے ہیں جیسے وہ خود اسٹیکس اینڈ لیڈرس کی گوٹ ہوں۔ ارے صاحب، میں بھی ایک بزنس مین کو جانتا ہوں۔ ان کے گھر میں قالینوں کے لیے فرش پر جگہ نہ رہی تو دیواروں پر لٹکا دیے۔ قالین ہٹا ہٹا کر مجھے دکھاتے رہے کہ ان کے نیچے نہایت قیمتی

* میرے مرنے کے بعد میری قبر روئے زمین پر تلاش نہ کرو۔ میرا مزار تو عارفوں کے سینے میں ہے۔

رنگین ماربل ہے۔

شہر دو قصہ

وہ منحوس بندوق نثار احمد خاں نے ملّا عاصی کو بخش دی کہ وہ ان کے بیٹے کے جگری دوست تھے۔ ہنگاموں میں پولیس نے سارے محلّے کے ہتھیار تھانے میں جمع کروائے تو یہ بندوق بھی مال خانے میں پہنچ گئی۔ پھر اس کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ فقط مہر شدہ رسید ہاتھ میں رہ گئی۔ پیروی تو بہت کی۔ ایک وکیل بھی کیا۔ مگر تھانے دار نے کہلا بھیجا کہ ”ڈی آئی جی کو پسند آگئی ہے“۔ زیادہ غوغا کرو گے تو بندوق تو مل جائے گی، مگر پولیس تمہارے گھر سے شراب کشید کرنے کی بھٹی برآمد کروالے گی۔ تمہارے ساتھ رہنے والے سارے رشتے دار پاکستان جا چکے ہیں۔ تمہارا مکان بھی Evacuee property (متروکہ املاک) قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوچ لو۔“ چنانچہ انہوں نے سوچا اور پُپ ہو رہے۔ اللہ! اللہ! ایک زمانہ تھا کہ شہر کو تو ال ان کے باوا سے ملنے تیسرے چوتھے آتا تھا۔ پر ڈی کی بڑی نایاب بندوق تھی۔ آج کل چھ لاکھ قیمت بتائی جاتی ہے! مگر صاحب، مجھ سے پوچھیے تو چھ لاکھ کی بندوق سے آدم خور شیر یا مردم آزار بادشاہ — یا خود — سے کچھ کم مارنا اتنی قیمتی بندوق کی تو بین ہے۔ ملّا عاصی ابھی تک ہر ایک کو ضبط شدہ بندوق کی مہر شدہ رسید اور لائسنس دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدھ میل دور سے اس کا گراب اُچھٹتا ہوا بھی لگ جائے تو کالا (ہرن) پانی نہ مانگے۔

۱۲

خلافِ وضعِ فطری موت

پرانے دوست جب مدتوں بعد ملتے ہیں تو کبھی کبھی باتوں میں اچانک ایک تکلیف دہ وقفہ سکوت آجاتا ہے۔ کہنے کو استا کچھ ہوتا ہے کہ کچھ بھی تو نہیں کہا جاتا۔ ہزار یادیں، ہزار باتیں، جھوم کر آتی ہیں۔ اور کہنی مار مار کے، کندھے پکڑ پکڑ کے، ایک دوسرے کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ پہلے میں۔ پہلے میں۔ تو صاحب، میں ایک ایسے ہی وقفے میں ان کی مفلوک الحالی اور عُسرت پر دل ہی دل میں ترس کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ پاکستان آگئے ہوتے تو سارے دلّزدہ دور ہو جاتے۔ انہوں نے یکبارگی سکوت توڑا۔ کہنے لگے، تم واپس کیوں نہیں آ جاتے؟ تمہارے ہارٹ اٹیک کی جس دن خبر آئی تو یہاں صفِ ماتم سی بچھ گئی۔ تمہیں یہ راج

روک، یہ رئیسوں کی بیماری کیسے لگی؟ سنا ہے میڈیکل سائنس کو ابھی تک اس کی اصل وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسی خوردبین ضرور ایجاد ہوگی جو اس مرض کے جراثیم کرنسی نوٹوں میں ٹریس کر لے گی۔ بندہ خدا! تم پاکستان کا ہے کو چلے گئے؟ یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ دیکھو، وہاں تمہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ میاں نجل حسین کو ہوا۔ منیر احمد کا ”بائی پاس“ ہوا۔ ظہیر صدیقی کے ”پیس میکر“ لگا۔ منظور عالم کے دل میں سوراخ نکلا۔ مگر مجھے یقین ہے یہ پاکستان ہی میں ہوا ہوگا۔ یہاں سے تو صحیح سالم گئے تھے۔ خالد علی لندن میں انجیو گرافی کے دوران میز پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میت کی ممی سا گوان کے شاندار بکس میں کراچی فلائی کی گئی۔ اور تو اور دُبلے سوکھے سینک چھوہارا بھینا احتشام بھی لاہور میں ہارٹ اٹیک میں گئے۔ سبطین اور انسپکٹر ملک غلام رسول لنگڑیال کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ مولانا مہر القادری کو ہوا۔ یوں کہو، کس کو نہیں ہوا۔ بھائی میرے! یہاں ذہنی سکون ہے۔ قناعت ہے۔ تو کُل ہے۔ یہاں کسی کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔ اہل ہنود میں البتہ cases ہوتے رہتے ہیں۔

گویا سارا زور کس پر ہوا؟ اس پر کہ کانپور میں ہر شخص اپنی طبعی موت مرتا ہے۔ ہارٹ اٹیک سے بے موت نہیں مرتا۔ ارے صاحب، میرے ہارٹ اٹیک کو تو انہوں نے گویا کھوٹی بنا لیا جس پر جان پہچان کے کڑے مردے اکھاڑ اکھاڑ کر ٹانگتے چلے گئے۔ مجھے تو سب نام یاد بھی نہیں رہے۔ دوسرے ہارٹ اٹیک کے بعد میں نے دوسروں کی رائے سے اختلاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب اپنی رائے کو ہمیشہ غلط سمجھتا ہوں۔ سب خوش رہتے ہیں۔ لہذا چپکا میڈیٹھنا سنتا رہا۔ اور وہ ان خوش نصیب مرحومین کے نام گنواتے رہے جو ہارٹ اٹیک میں نہیں مرے، کسی اور مرض میں مرے۔ ”اپنے مولوی تحتشم ٹی بی میں مرے۔ حمید اللہ سینئر کلرک بنیرہ خان بہادر عظمت اللہ خاں کا گلے کے کینسر میں انتقال ہوا۔ شہناز کے میاں عابد حسین وکیل ہندو مسلم فساد میں شہید ہوئے۔ قائم گنج والے عبدالوہاب خاں پورے پچیس دن غائبہ میں مبتلا رہے۔ حکیم کی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بقای ہوش و حواس و حافظہ جاں بحق تسلیم ہوئے۔ مرنے سے دو منٹ پہلے حکیم کا پورا نام لے کر کمالی دی۔ منشی فیض محمد سفیہ میں ایک دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ حافظ فخر الدین فالج میں گئے۔ مگر الحمد للہ! ہارٹ اٹیک کسی کو نہیں ہوا۔ کوئی بھی خلافِ وضع فطری موت نہیں مرا۔ پاکستان میں میری جان پہچان کا کوئی متمول شخص ایسا نہیں جس کے دل کا بائی پاس نہ ہوا ہو۔ چند سے یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب خوش حال گھرانوں میں تختے اور بائی پاس ایک ساتھ ہوا کہیں گے۔

پھر وہ آواگون اور نروان کے فلسفے پر لیکچر دینے لگے۔ بیچ لیکچر کے انہیں اچانک ایک اور مثال یاد آگئی۔ اپنا ہی قطع کلام کرتے ہوئے اور بھگوان بدھ کو بودھی بیڑے کے نیچے اکیلا اونگھتا چھوڑ کر کہنے لگے ”حد یہ کہ خواجہ فہیم الدین کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ بیوی کے مرنے کے بعد دونوں بیٹیاں ہی سب کچھ تھیں۔ انہیں میں مگن تھے۔ ایک دن اچانک پیشاب بند ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا پروسٹیٹ بڑھ گیا ہے۔ فوراً ایئر جنسی میں آپریشن کروانا پڑا جو بگڑ گیا۔ مگر تین چار مہینے میں لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو گئے۔ لیکن بڑی بیٹی نے ناگہاں ایک ہندو وکیل اور چھوٹی نے سکھ ٹھیکے دار سے شادی کر لی تو جانو کر ٹوٹ گئی۔ پرانی چال، پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ گئے۔ اور اس وقت تک پڑے رہے جب تک اس کر سپین نرس سے شادی نہ کر لی جس نے پروسٹیٹ کے آپریشن کے دوران ان کا گوموت کیا تھا۔ وہ حرافہ تو گویا اشارے کی منتظر بیٹھی تھی۔ بس انہیں کی طرف سے چرچر تھی۔

اے مرد ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟

باپ کے سہرے کے پھول کھلنے کی خبر سنی تو دونوں عاق شدہ بیٹیوں نے کہلا بھجیا کہ ہم ایسے باپ کا منہ دیکھیں تو بد جانور کا منہ دیکھیں۔ وہ چنتے ہی رہ گئے کہ بد بختوں میں نے کم از کم یہ کام تو شرع شریف کے عین مطابق کیا ہے۔ میاں، یہ سب کچھ ہوا۔ مگر ہارٹ ایکس خواجہ فہیم الدین کو بھی نہیں ہوا۔ تمہارے ہارٹ ایکس کی خبر سنی تو دیر تک افسوس کرتے رہے۔ کہنے لگے، یہاں کیوں نہیں آ جاتے؟

صاحب، مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا پروسٹیٹ بڑھ گیا تو میں بھی آ جاؤں گا۔

پنڈو لے کا پیالہ

طالب علمی کے زمانے میں کھانے کے معاملے میں بڑے نفاست پسند تھے۔ دو پیازہ گوشت، لہسن کی چٹنی، سری پائے، کلچہ، گردے، کھیری اور مغزے انہیں بڑی کراہت آتی تھی۔ دسترخوان پر ایسی کوئی ڈش ہو تو بھوکے اٹھ جاتے۔ اس ”وِزٹ“ میں ایک جگہ میرے اعزاز میں دعوت ہوئی تو بھٹنا ہوا مغز بھی تھا۔ صاحب! لہسن کا چھینٹا دے دے کے بھوتا جائے اور پھنگیوں کو گھوٹ دیا جائے تو ساری بساند نکل جاتی ہے۔ بشرطیکہ گرم مصالحہ ذرا بوتلا ہوا اور مرچیں بھی پہچکا مارتی ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی کھایا اور منغض نہ ہوئے۔

میں نے پوچھا، حضرت، یہ کیسی بد پرہیزی؟ بولے، جو سامنے آگیا، جو کچھ ہم پر اُترا، کھا لیا۔ ہم انکار کرنے، منہ بنانے والے کون۔

پھر کہنے لگے ”بھائی تم نے وہ بھکشو والا قصہ نہیں سنا؟ بھکشو سے سات برس بھیک منگوائی جاتی تھی تاکہ انا کا پٹن لڑیوں تلے بالکل کچل جائے۔ اس کے بغیر آدمی کچھ پا نہیں سکتا۔ کاسہ گدائی کو مہاتما بدھ نے تاجِ سلطانی کہا ہے۔ بھکشو کو اگر کوئی ایک وقت سے زیادہ کاکھانا دینا بھی چاہے تب بھی وہ قبول نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ اس کے پیالے میں ڈال دیا جائے، اسی کو بے چون و چرا کھانا اس پر فرض ہے۔ پالی کی قدیم رولہ تین میں آیا ہے کہ پنڈولے نامی ایک بھکشو کے پیالے میں ایک کوڑھی نے روٹی کا ٹکڑا ڈالا۔ ڈالتے وقت اس کا کوڑھ سے کلا ہوا انگوٹھا بھی جھڑک پیالے میں گر پڑا۔ پنڈولے کو دونوں کا سوا دایک ساں لگا۔ یعنی کچھ نہیں۔“ صاحب، وہ تو یہ قصہ سنا کر سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ مگر میرا یہ حال کہ مغز تو ایک طرف رہا، میز پر رکھا ہوا سارا کھانا زہر ہو گیا۔ صاحب، اب ان کا ذہن بھی پنڈولے کا پیالہ ہو گیا ہے۔

ملا بھکشو

لڑکی کی خود کشی والا واقعہ ۱۹۵۳ء کا بتایا جاتا ہے۔ سنا ہے اس دن کے بعد سے وہ مستغنی الاحوال ہو گئے اور پڑھانے کا معاوضہ لینا ترک کر دیا۔ تیس سال ہو گئے۔ کسی نے کچھ کھلا دیا تو کھالیا، ورنہ تکیہ پیٹ پ رکھا اور گھٹنے ٹیکر، دونوں ہاتھ جوڑ کے انہیں دائیں کال کے نیچے رکھ کے سوجاتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اس کو؟ جی! foetal posture اردو میں اسے جنم آسن، کوکھ آسن کہہ لیجیے۔ مگر مجھے آپ کی اس فرائیڈ والی تاویل سے قطعی اتفاق نہیں۔ آپ خود بھی تو اس طرح کنڈلی مار کے سوتے ہیں۔ مگر سبب اس کا تپتیا نہیں، السر ہے۔ ملا عاصی بھکشو کہتے ہیں کہ بھگوان بدھ بھی داہنے پاؤں پر بایاں پاؤں اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر داہنی کروٹ سوتے تھے۔ اسے سنگھ شینا کہتے ہیں۔ بھوک بلاسی یعنی اہل ہوس اور عیاش بائیں کروٹ سوتے ہیں۔ اسے کام بھوگی شینا کہتے ہیں۔ یہ مجھے انہی سے معلوم ہوا کہ بد چلن آدمی فقط سونے کے آسن سے بھی پکڑا جاسکتا ہے۔ بہر کیف، اب عالم یہ ہے کہ جو کسی نے پہنا دیا، پہن لیا۔ جو مل گیا، کھا لیا۔ جس سے ملا۔ جیسا ملا۔ جب ملا۔ جہاں تھک گئے وہیں رات ہو گئی۔ جہاں پڑ رہے وہیں رہن بسیرا۔ تن تکیہ من بسرام۔ چار چار دن گھر نہیں آتے۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسے کتھاکھر

رہے ویسے رہے بدیس * - خدا بھلا کرے اُن کے چیلوں کا۔ وہی دیکھ دیکھ کرتے ہیں۔ ایسے محبتی، خدمتی شاگرد نہیں دیکھے۔ ملا ایک دن ہاتھ کا پیالہ سنا بنا کر پینے لگے، بس مٹھی بھر دانوں کے لیے بنجارا کیسا گھبرایا، کیسا بولایا پھرتا ہے۔ ہر کس و ناکس پہ اگریہ کھل جائے کہ زندگی کرنا کتنا سہل ہے تو یہ سارا کارخانہ ٹھپ ہو جائے۔ یہ سارا پاکھنڈ، (+) یہ سارا آڈمبر (x) پل بھر میں کھنڈت ہو جائے۔ ہر آدمی کا شیطان اس کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اور خواہش اس شیطان کا دوسرا نام ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کو جتنی بڑھاتا اور ہشکارتا جائے گا، اس کا سن استباہی کٹھنور اور اس کی زندگی اتنی ہی کٹھن ہوتی چلی جائے گی۔ ڈائنوسور (Dinosaur) کا ڈیل جب استباہی ہو گیا اور کھانے کی خواہش اتنی شدید ہو گئی کہ زندہ رہنے کے لیے اسے چوہیں گھٹنے مسلسل چرنا پڑتا تھا تو اس کی نسل ہی extinct (معدوم) ہو گئی۔ کھانا صرف اتنی مقدار میں جائز ہے کہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رہے۔ جسم فرہ ہو گا تو نفس کا موٹا ہونا لازمی ہے۔ میں نے آج تک کوئی لاغر مولوی نہیں دیکھا۔ بھرے پیٹ عبادت اور شب زندہ داری اور خالی پیٹ عیاشی نہیں ہو سکتی۔

یہ کہتے ہوئے وہ میز پر سے اپنے تالیف کردہ بودھ منتروں کا قلمی نسخہ اٹھالائے اور اس کے دیباچے سے اشلوک پڑھنے والے ہلچے میں لہک لہک کر اقتباس سنانے لگے:

”بودھی ستوانے بھگوان سچک سے کہا کہ اے اگی ویسن! جب میں دانتوں پر دانت جاکر اور تالو کو زبان سے لٹکا کر دل و دماغ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا تھا تو میری بغلوں سے پسینہ چھوٹنے لگتا تھا۔ جس طرح کوئی بلوان کسی کمزور آدمی کا سریا کندھا پکڑ کر دباتا ہے، ٹھیک اسی طرح میں اپنے دل و دماغ کو دباتا تھا۔ اے اگی ویسن! اس کے بعد میں نے سانس روک کر تپسیا کرنا شروع کی۔ اس سے میرے کانوں سے سانس نکلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوہار کی دھونکنی جیسی یہ آوازیں بہت تیز تھیں۔ پھر اے اگی ویسن! میں سانس روک کر اور کانوں کو ہاتھوں سے دبا کر تپسیا کرنے لگا۔ ایسا کرنے سے مجھے یوں لگا جیسے کوئی تلوار کی تیز نوک سے میرے ماتھے کو چھلنی کر رہا ہے۔ پھر بھی اے اگی ویسن! میں نے اپنی تپسیا جاری رکھی۔

* نیکنا خاوند گھر رہے یا پر دس، برابر رہے۔

(+) پاکھنڈ: بکھیرا۔ دکھاوے کی عبادت

(x) آڈمبر: نمائش۔ تصنع۔ دکھاوے کے متکلفات

”اے اکی ویسن! تپتیا اور فاقے سے میرا شریر (جسم) دن بدن کمزور پڑتا گیا۔ آستک وئی کی کانٹھوں کی طرح میرے شریر کا جوڑ جوڑ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میرا کولھا سوکھ کر اونٹ کے پاؤں کی مانند ہو گیا۔ میری رےڑھ کی ہڈی سوت کی تھکیوں کی مال کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جس طرح مگرے ہوئے مکان کی بلتیاں اوپر نیچے ہو جاتی ہیں، میری پسلیوں کی بھی وہی دشا (کیفیت) ہو گئی۔ میری آنکھیں کسی گہرے کنوس میں ستاروں کے عکس کی طرح اندر کو دھنس گئیں۔ جیسے کچا کروا کڈو کاٹ کر دھوپ میں ڈال دینے سے سوکھ جاتا ہے، ویسے ہی میرے سر کی چڑی سوکھ گئی۔ جب پیٹ پر ہاتھ پھیرتا تھا تو میرے ہاتھ میں رےڑھ کی ہڈی آ جاتی تھی۔ اور جب پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا تو ہاتھ پیٹ کی چڑی تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح میری پیٹھ اور پیٹ برابر ہو گئے تھے۔ شریر پر ہاتھ پھیرتا تو بال جھڑنے لگتے تھے۔“

* فلیس منی! فلیس منی!

یہ پڑھنے کے بعد قدرے توقف کیا۔ آنکھیں موند لیں۔ میں سمجھا دھیان گیان کے غوط میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد آنکھیں بس اتنی کھولیں کہ پلک سے پلک جدا ہو جائے۔ اب وہ دھیان کی ساتویں سیڑھی پہنچو م رہے تھے۔ ہاتھ کا چٹو بنا کر کہنے لگے ”ایک پیاس تو وہ ہوتی ہے جو گھونٹ دو گھونٹ پانی سے بجھ جاتی ہے۔ اور ایک تونس ہوتی ہے کہ جتنا پانی پیو پیاس اتنی ہی بھڑکتی جاتی ہے۔ ہر گھونٹ کے بعد زبان پر کانٹے پڑتے چلے جاتے ہیں۔ آدمی آدمی پر منحصر ہے۔ کسی کو کایا موہ، کسی کو زرن زمین کی پیاس لگتی ہے۔ کسی کو علم اور شہرت کی۔ کسی کو خدا کے بندوں پر خدائی کی۔ اور کسی کو عورت کی پیاس ہے کہ بے تحاشا لگے چلی جاتی ہے۔ پر سب سے بیکل کرنے والی وہ جھوٹی پیاس ہے جو انسان خود اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ یہ پیاس دریاؤں، بادلوں اور کلیشٹیروں کو بھل جاتی ہے اور سیراب نہیں ہوتی۔ انسان کو دریا دیرا، سراب سراب لیے پھرتی ہے، بجھائے نہیں بجھتی۔ العطش! العطش! پھر ہوتے ہوتے یہ آن بجھ پیاس خود انسان ہی کو پکھلا کے پی جاتی ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ ”جب جالوت لشکر لے کر چلا، تو اس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے۔ ہاں ایک آدھ چٹو کوئی پی لے تو پی لے۔ مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔ پھر جب طالوت

اور اس کے اہل ایمان ساتھی دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔“ (+) سواس دریا کنارے ہر ایک کی آزمائش ہوتی ہے۔ جس نے اس کا پانی پی لیا اس میں بدی کے مقابلے کی طاقت نہ رہی۔ فلیس مٹی، فلیس مٹی۔ پس جیت اس کی اور نجات اس کی جو بیچ دریا سے پیسا لوث آئے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے! بس اسی کارن ملاً بھکشو کہلاتے ہیں۔ زبان و بیان بالوں سے بھی زیادہ کچھڑی اور عقائد ان سے زیادہ رنگ برنگے۔ صوفیوں کی سی باتیں کرتے کرتے یکایک سادھو کا بن لے لیتے ہیں۔ الفاظ کے سر سے دفعۂ عامہ اتر جاتا ہے اور ہر شبد، ہر انچھر کے جٹائیں مکل آتی ہیں۔ آپ زَم زَم سے وضو کر کے بھبھوت رما لیتے ہیں۔ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ۔ کبھی آپ کو ایسا محسوس ہو گا کہ بھٹک کے کہاں سے کہاں جا نکلے:

تشنہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اور کبھی ایسا محسوس کرادیں گے گویا گوتم بدھ نے برکش تلے اپنی سادھی چھوڑ کر احرام باندھ لیا ہے۔ مگر کبھی ایک نقطے اور نکتے پر جتے نہیں۔ ٹڈے کی طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر پھند کتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک دن چھیرا کہ مولانا! بعض فقیہوں کے نزدیک مرتد کی سزا قتل ہے۔ اشارہ سمجھ گئے۔ مسکرا دیے۔ کہنے لگے، سوچنے کی بات ہے۔ جس نے پہلے ہی خود کشی کر لی ہو اسے سولی پہ لٹکانے سے فائدہ؟

تمام چہرے ہیں میرے چہرے، تمام آنکھیں ہیں میری آنکھیں

اپنے تمام خلوص اور تپاک کے باوصف وہ مجھے خاصے بے تعلق نظر آئے۔ ایک طرح کا درویشانہ استغنا آگیا ہے۔ رشتوں میں بھی۔ ایک دن کہنے لگے کہ کوئی شے ہو یا شخص، اس سے ناتا جوڑنا ہی دکھ کا اصل سبب ہے۔ پھر انسان کی سانس چھوٹی اور اُڑان اوچھی ہو جاتی ہے۔ انسان جی کڑا کر کے ہر چیز سے ناتا توڑ لے تو پھر دکھ اور شکھ کے بے انت پکڑے باہر مکل جاتا ہے۔ پھر وہ شاد رہتا ہے نہ ناشاد۔ مسرور نہ مغموم۔

عیش و غم در دل نمی استد ، خوشا آزادی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما*

مکریہ بے نیازی ”بیدلی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق“ والی منزل سے ماورا نظر آتی ہے۔ میری واپسی میں دو دن رہ گئے تو میں نے پھیرا۔ ”مولانا، یہاں بہت رہ گئے۔ جو رو نہ جاتا، کانپور سے ناتا۔ اب میرے ساتھ پاکستان چلو۔ سب یار دوست، سارے سنگی ساتھی وہیں ہیں۔“

”پُرکھوں کے ہاڑ ہڑواڑ (+) تو یہاں ہیں۔“

”تم کون سے ان پر فاتحہ پڑھتے ہو یا جمعرات کی جمعرات پھولوں کی چادر چڑھاتے ہو جو چھوٹے کاملال ہو۔“

اتنے میں ایک چٹکبری بلی اپنا پتہ منہ میں دبائے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نعمت خانے میں بند کبوتر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ بلی کے پیچھے ایک پڑوسی کی بچی مینا کا پنجرہ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی گرٹیا دوسری بغل میں دبائے آئی اور کہنے لگی کہ صبح سے ان دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔ بولتے بھی نہیں۔ دوا دے دیجیے۔ انہوں نے بیمار گرٹیا کی نبض دیکھی۔ اور مینا سے اسی کے لہجے میں بولنے لگے تو ذرا دیر بعد مینا ان کے لہجے میں بولنے لگی۔ انہوں نے ایک ڈبے میں سے لیمن ڈراپ نکال کر بچی کو دی۔ اس نے اسے چوسا تو گرٹیا کو آرام آگیا۔ وہ مسکرا دیے۔ پھر بحث کا سراوہیں سے اٹھایا جہاں سے بلی، بچی اور مینا کی اچانک آمد سے ٹوٹ گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے ”یہاں میں سب کے دکھ درد میں سا جھی ہوں۔ وہاں میری ضرورت کس کو ہوگی؟ وہاں مجھ سا غریب اور کون ہو گا۔ یہاں مجھ سے بھی غریب ہیں۔“

* غالب کہتا ہے، عیش اور غم دونوں ہمارے دل میں نہیں ٹھہرہاتے۔ ہماری آزاد منشی کے کیا کہنے! ہماری پھلتی کے لیے شراب اور خون دونوں برابر ہیں۔ یعنی دونوں پھن کر نکل جاتے ہیں۔

(+) ہاڑ ہڑواڑ: ہڈیاں اور خاندانی قبرستان۔

صد رفیق و صد ہمد پر شکستہ و دل تنگ
دورا! نمی زبید بال و پر بن تنہا*

”بندہ خدا! ایک دفعہ چل کے تو دیکھو۔ پاکستان کا تمہارے ذہن میں کچھ عجیب سا نقشہ ہے۔ وہاں بھی دُکھی بستے ہیں۔ ہماری خاطر ہی چلو۔ ایک ہفتے کے لیے ہی سہی۔“
”کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں؟“

”تو پھریوں سمجھو کہ جہاں سبھی تاج پہنے بیٹھے ہوں، وہاں تنگے سر، خاک بسر آدمی سب سے نمایاں ہوتا ہے۔“

خدا جانے سچ مچ قائل ہوئے یا محض زچ ہو گئے۔ کہنے لگے ”برادر، میں تو تمہیں دانہ ڈال رہا تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ ہماری پختری یہ آن بیٹھو! خیر، چلا تو چلوں۔ مگر خدا جانے ان کبوتروں کا کیا ہو گا۔“

”اس کا انحصار خدا پر نہیں، بلی کی نیت پر ہے۔ مگر سنو، تم خدا کے کب سے قائل ہو گئے؟“

”میں نے تو محاورہ کہا تھا۔ سامنے جو جامن کا بیڑ دیکھ رہے ہو، یہ میرے دادا نے لکایا تھا۔ جس سے پو پھٹتی ہے اور اس کھڑکی سے صبح کا ستارہ منظر آنا بند ہو جاتا ہے یا جب دونوں وقت ملتے ہیں اور شام کا بھٹ پٹا سا ہونے لگتا ہے تو اس پر بے شمار چڑیاں جی جان سے ایسے چچکھاتی ہیں کہ دل کو کچھ ہونے سا لگتا ہے۔ اس جامن کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

”اول تو اس بوڑھے جامن کو تمہاری اور بدھ ازم کی ضرورت نہیں۔ گوہر کے کھاد کی ضرورت ہے۔ دوم، تمہیں التباس ہوا ہے۔ مہاتما بدھ کو نروان جامن کے نیچے نہیں، پیپل تلے حاصل ہوا تھا۔ بفرض محال تم پٹو پکھشی اور پیڑ کی سیوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو کراچی کے لاغر گردنوں اور لاہوری آپر مال کے جامنوں کی رکھوالی کر کے شوق پورا کر لینا۔ جامنوں کے پکنے سے پہلے ہی نینیاں (سیڑھیاں) لگ جاتی ہیں۔ زندہ دلان لاہور پرائے درختوں کے پھل کا پور والوں کی طرح دور سے پتھر مار مار کے نہیں توڑتے۔ رسان سے درخت پہ چڑھ کے یا

* یعنی میرے سب رفیق اور سب ہمد پر شکستہ اور دل تنگ ہیں۔ اے خدائے عادل! مجھے یہ زب نہیں دیتا کہ تنہا میرے ہی بال و پر ہوں۔

سیرٹھی لٹاکے توڑ توڑ کے خود کھاتے ہیں اور رکھوالوں کو کھلاتے ہیں۔

”میں آؤں گا۔ لاہور ایک دن ضرور آؤں گا۔ مگر کبھی اور۔“

”ابھی میرے ساتھ چلنے میں کیا قباحت ہے؟“

”ان بچوں کا کیا ہو گا؟“

”ہوتا کیا۔ بڑے ہو جائیں گے۔ تمہیں کوئی miss نہیں کرے گا۔ آخر کو تم مر گئے ،

تب کیا ہو گا؟“

”تو کیا ہوا۔ یہ بچے — اور ان بچوں کے بچے تو زندہ رہیں گے۔ سینوں میں اجالا بھر رہا

ہوں۔ مر گیا تو ان کے منہ سے بولوں گا۔ ان کی اوتار آنکھوں سے دیکھوں گا۔“

(بشارت کی زبانی یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے)

پس نوشت

لو وہ بھی ہارٹ اٹیک میں گئے !

۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو طلوع آفتاب سے ذرا پہلے جب ، ان ہی کے الفاظ میں ، جامن پر چڑیاں اس طرح چہچہا رہی تھیں ، جانوجی جان سے گزر جائیں گی ، ملا عبد المنان عاصی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ محلے کی مسجد کے پیش امام نے کہلا بھیجا کہ ملحد کی صلوٰۃ الجنائزہ جائز نہیں۔ جس کے وجود ہی کے آنجہانی قائل نہ تھے ، اس سے رحمت و بخشائش کی دعا کیا معنی؟ بڑی دیر تک جنازہ جامن کے نیچے پڑا رہا۔ بالآخر ان کے ایک عزیز شاگرد نے امامت کے فرائض انجام دیے۔ سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ تجہیز و تکفین سے پہلے ان کے بلیک باکس کا تالا معزز بن محلہ کی موجودگی میں کھولا گیا۔ اس میں اسکول کی کاپی کے ایک صفحے پر پنسل سے لکھی ہوئی تحریر ملی جس پر نہ تاریخ تھی نہ دستخط۔ لکھا تھا کہ پرس مردن میری جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ (جس کی مکمل فہرست اور احوال ہم پچھلے صفحات میں دے چکے ہیں) نیلام کر کے کبوتروں کے لیے ٹرسٹ بنادیا جائے۔ یہ احتیاط رکھا جائے کہ کوئی گوشت خور ٹرسٹی (متولی) مقرر نہ ہو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے کانپور میں دفن نہ کیا جائے۔ لاہور میں ماں کے قدموں میں لٹادیا جائے !

دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ

۱

فیل ہونے کے فوائد

بشارت کہتے ہیں کہ بی ۔ اے کا امتحان دینے کے بعد یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر فیل ہو گئے تو کیا ہو گا۔ وظیفہ پڑھا تو جمد اللہ یہ فکر تو بالکل رفع ہو گئی، لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور تشویش لاحق ہو گئی ۔ یعنی اگر خدا نخواستہ پاس ہو گئے تو؟ نوکری ملنی محال ۔ یار دوست سب سترِ تر ہو جائیں گے ۔ والد ہاتھ کھینچ لیں گے۔ بے کاری، بے روزگاری، بے زری، بے شغلی ——— زندگی عذاب ہو جائے گی۔ انگریزی اخبار فقط wanted کے اشتہارات کی خاطر خریدنا پڑے گا۔ پھر ہر کڈ حب آسامی کے سانچے میں اپنی کوالی فی کیشنز کو اس طرح ڈھال کر درخواست دینی ہوگی گویا ہم اس عالم رنگ و بو میں صرف اسی ملازمت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اک پھول کے مضمون کو سورنگ سے باندھنا ہو گا۔ روزانہ دفتر بد فخر ذلت اٹھانی پڑے گی تا وقتے کہ ایک ہی دفتر میں اس کا مستقل بند و بست نہ ہو جائے ۔ ہر چند کہ فیل ہونے کا قوی امکان تھا، لیکن پاس ہونے کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا ۔

دیکھیں کیا گزرے ہے خدشے پہ خطر ہونے تک

بعض لڑکے اس ذلت کو مزید دو سال کے لیے ملتوی کرنے کی غرض سے ایم اے اور ایل ایل بی میں داخلہ لے لیتے تھے ۔ بشارت کی جان پہچان کے جن مسلمان لڑکوں نے تین سال پہلے یعنی ۱۹۳۳ میں بی ۔ اے کیا تھا، وہ سب جو تیاں چٹختے یہ کار پھر رہے تھے۔ سوائے ایک خوش نصیب کے، جو مسلمانوں میں اول آیا تھا اور اب مسلم ہڈل اسکول میں ڈرل ماسٹر ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی بھیمانک عالم گیر کساد بازاری اور بے روزگاری کی تباہ کاریاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ مانا کہ ایک روپے کے گپھوں پندرہ سیر اور اصلی مٹی ایک سیر ملتا تھا، لیکن ایک روپیہ تھا کس کے پاس ؟

کبھی کبھی وہ ڈر ڈر کے مگر سچ مچ متنا کرے کہ فیل ہی ہو جائیں تو بہتر ہے ۔ کم از کم ایک

سال اور بے فکری سے کٹ جائے گا۔ فیل ہونے پر تو، بقول مرزا، صرف ایک دن آدمی کی بے عتیٰ خراب ہوتی ہے۔ اس کے بعد چین ہی چین۔ بس یہی ہو گا نا کہ جیسے عید پر لوگ ملنے آتے ہیں، اسی طرح اس دن خاندان کا ہر بزرگ باری باری برسوں کا جمع شدہ غبار نکالنے آئے گا اور فیل ہونے اور خاندان کی ناک کٹوانے کی ایک مختلف وجہ بتائے گا۔ اس زمانے میں نوجوانوں کا کوئی کام، کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا تھا جس کی جھپیٹ میں اگر خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ آج کل والی صورت نہیں تھی کہ اول تو خاندانوں کے منہ پر ناک منظر نہیں آتی اور ہوتی بھی ہے تو tube-less tyre کی مانند جس میں آئے دن ہر سائز کے پنکچر ہوتے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر آپنی آپ جڑتے رہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بعض اوقات خاندان کے دور و نزدیک کے بزرگ چھٹی ساتویں جماعت تک فیل ہونے والے برخورداروں کی، حسب قربت و طاقت، دستِ خاص سے پٹائی بھی کرتے تھے۔ لیکن لڑکا جب ہاتھ پیر نکالنے لگے اور استیاسیانہ ہو جائے کہ دو آوازوں سے رونے لگے، یعنی تیرہ چودہ سال کا ہو جائے تو پھر اسے تھپڑ نہیں مارتے تھے، اس لیے کہ اپنے ہی ہاتھ میں چوٹ آنے اور پھنچا اترنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ فقط لعن طعن اور ڈانٹ پھٹکار سے کام نکالتے تھے۔ ہر بزرگ اس کی certified (مستند، مصدقہ) نالائقی کا اپنے فرضی تعلیمی ریکارڈ سے موازنہ کرتا اور نئی پود میں تاجہ (موٹی) منظر، انحطاط اور گراوٹ کے آثار دیکھ کر اس خوشگوار نتیجے پر پہنچتا کہ ابھی دنیا کو اس جیسے بزرگ کی ضرورت ہے۔ بھلا وہ ایسی نالائق نسل کو دنیا کا چارج دے کر اتنی جلدی کیسے رحلت کر سکتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہر بزرگ بڑے پتہ غیرانہ انداز میں بشارت دیتا تھا کہ تم بڑے ہو کر بڑے آدمی نہیں بنو گے! صاحب، یہ تو اندھے کو بھی ——— حد تو یہ کہ خود ہمیں بھی ——— منظر آ رہا تھا۔ یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے سفید داڑھی یا ستارہ شناس ہونے کی شرط نہیں تھی۔ بہر طور، یہ ساری farce ایک ہی دن میں ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن پاس ہونے کے بعد تو ایک عمر کا رونا تھا۔ خواری ہی خواری۔ ذلت ہی ذلت۔

بشارت اور شاہجہان کی تمنا

بالآخر دوسرا خدشہ پورا ہوا۔ وہ پاس ہو گئے، جس پر انہیں مسرت، پروفیسروں کو حیرت اور بزرگوں کو شک ہوا۔ اس دن کئی مرتبہ اپنا نام اور اس کے آگے گئی۔ اے لکھ لکھ کر دیر تک مختلف زاویوں سے دیکھا کیے۔ جیسے آرٹسٹ اپنی پینٹنگ کو پتھجھے ہٹ ہٹ کر دیکھتا

ہے۔ ایک مرتبہ تو B.A کے بعد بریکٹ میں (First Attempt) بھی لکھا۔ مگر اس میں شینی اور تکتیر کا پہلو نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد گنتے پر انگریزی میں نیلی روشنائی سے نام اور سرخ سے B.A لکھ کر دروازے پر لٹا آئے۔ پندرہ بیس دن بعد اردو کے ایک مقامی اخبار میں اشتہار دیکھا کہ دھیرج گنج کے مسلم اسکول میں جہاں اسی سال نويس کلاس شروع ہونے والی تھی، اردو ٹیچر کی آسامی خالی ہے۔ اشتہار میں یہ لالچ بھی دیا تھا کہ ملازمت مستقل، ماحول پاکیزہ و پرسکون اور مشاہرہ معقول ہے۔ مشاہرے کی معقولیت کی وضاحت بریکٹ میں کر دی تھی کہ الاؤنس سمیت پچیس روپے ماہوار ہوگا۔ سواروپہ سالانہ ترقی اس پر مستزاد۔ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کو بہادر شاہ ظفر نے اپنا استاد بنایا تو بے نظیر پرورش چار روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ”تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔۔۔ لیکن قسمت نے آواز دی کہ لعل (چار روپے) نہ سمجھنا۔ یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔“ اور ان کا قصر آرزو تو پورے پچیس ستونوں پر کھڑا ہونے والا تھا!

لیکن وہ ”پرسکون ماحول“ پر مرے۔ دھیرج گنج کانپور اور لکھنؤ کے درمیان ایک بستی تھی جو گاؤں سے بڑی اور قصبے سے چھوٹی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ ہر شخص ایک دوسرے کے آباو اجداد کے کرتوتوں تک سے واقف تھا۔ اور نہ صرف یہ جانتا تھا کہ ہر گھر میں جو ہانڈی چولہے پر چڑھی ہے اس میں کیا پک رہا ہے، بلکہ کس کس کے ہاں تیل میں پک رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی زندگی میں اس بری طرح دخیل تھے کہ آپ کوئی کام چھپ کر نہیں کر سکتے تھے۔ عیب کرنے کے لیے بھی ساری بستی کا ہنر اور تعاون درکار تھا۔ عرصے سے ان کی متنا تھی کہ قسمت نے ساتھ دیا تو ٹیچر بنیں گے۔ لوگوں کی نظر میں استاد کی بڑی عزت تھی۔ کانپور میں ان کے والد کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ مگر آبائی کاروبار کے مقابلے میں انہیں دنیا کا ہر پیشہ زیادہ دلچسپ اور کم ذلیل لگتا تھا۔ بی۔ اے۔ کا نتیجہ نکلتے ہی والد نے ان کی تالیف قلب کے لیے اپنی دکان کا نام بدل کر ”ایجوکیشنل ٹبرڈپو“ رکھ دیا۔ پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔ مارے باندھے کچھ دن دکان پر بیٹھے، مگر بڑی بے دلی کے ساتھ۔ کہتے تھے کہ ”بھاؤ تاؤ کرنے میں صبح سے شام تک جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ جس دن سچ بولتا ہوں اس دن کوئی بوہنی بکری نہیں ہوتی۔ دکان میں گرداہت اڑتا ہے اور ماکھک چچ چچ کر گھٹکو کرتے ہیں۔“ ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انجن

ڈرائیور اور ہوش سنبھالنے کے بعد اسکول ٹیچر بننا چاہتے تھے۔ کلاس روم بھی کسی سلطنت سے کم نہیں۔ استاد ہونا بھی ایک طرح کی فرمانروائی ہے۔ جبھی تو اورنگ زیب نے شاہجہان کو ایام اسیری میں بچوں کو پڑھانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بشارت خود کو شاہ جہاں سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے تھے۔ خصوصاً اس لیے کہ انہیں تو معاوضے میں پورے پچیس روپے بھی ملنے والے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں معلّٰی کا پیشہ بہت باوقار اور باعزت سمجھا جاتا تھا۔ زندگی اور کیریئر میں دو چیزوں کی بڑی اہمیت تھی۔ اول عزت۔ دوم، ذہنی سکون اور بے فکری۔ دنیا کے کسی اور ملک میں ”عزت“ پر کبھی اتنا زور نہیں رہا جتنا کہ برصغیر میں۔ انگریزی میں تو اس مفہوم کا حامل کوئی ڈھنگ کا مترادف بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انگریزی کے بعض صحافیوں اور نامور کہانی لکھنے والوں نے اس لفظ کو انگریزی میں جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ آج بھی جہاں دیدہ بزرگ جب کسی کو دعا دیتے ہیں تو خواہ صحت، عافیت، کثرتِ اولاد، آسودہ حالی اور افزونیِ ایمان کا ذکر کرس یا نہ کرس، یہ دعا ضرور کرتے ہیں کہ اللہ تمہیں اور ہمیں عزت آبرو کے ساتھ (بالترتیب) رکھے / اٹھائے۔ ملازمت کے ضمن میں بھی ہم حسنِ کارکردگی، ترقی درجات اور بلندِی مناصب کی دعا نہیں مانگتے۔ اپنے لیے جاری واحد دعا یہ ہوتی ہے کہ عزت کے ساتھ سبک دوش ہوں! یہ دعا آپ کو دنیا کی کسی اور زبان یا ملک میں نہیں ملے گی۔ سبب یہ کہ بے عزتی کے جیسے اور جتنے وافر اور متنوع مواقع ہمارے ہاں ہیں وہ دنیا میں کہیں اور نہیں۔ ملازمت پیشہ آدمی بے توقیری کو Professional hazard سمجھ کر قبول اور انگیز کرتا ہے۔ فیوڈل عہد کی روایت، خُوبُو اور خواری جاتے جاتے جائے گی۔ ان دنوں ملازم خود کو نمک خوار کہتے اور سمجھتے تھے۔ (روم میں تو عہدِ قدیم میں سپاہیوں کو تنخواہ کے بجائے نمک دیا جاتا تھا اور غلاموں کی قیمت نمک کی شکل میں ادا کی جاتی تھی۔) تنخواہ حقِ محنت کی طرح نہیں، بلکہ بطور خیرات اور بخشش دی اور لی جاتی تھی۔ تنخواہ تقسیم کرنے والے کھلمے کو بخشش خانہ کہتے تھے۔

نیک چلتی کا سائن بورڈ

اشتہار میں مولوی سید محمد مظفر نے، کہ یہی اسکول کے بانی، منتظم، مہتمم، سرپرست اور خازن و خائن کا نام تھا، مطلع کیا تھا کہ امیدواروں کو تحریری درخواست دینے کی ضرورت

نہیں۔ اپنی ڈگری اور نیک چلنی کے دستاویزی ثبوت کے ساتھ صبح آٹھ بجے اصالتاً پیش ہوں۔
بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہ نیک چلنی کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ بد چلنی کا البتہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً
چالان، چمکے، وارنٹ گرفتاری، مصدقہ نقل حکم سزایابی یا ”بستہ الف“ جس میں نامی بد معاشوں
کا اندراج ہوتا ہے۔ پانچ منٹ میں آدمی بد چلنی تو کر سکتا ہے، نیک چلنی کا ثبوت فراہم نہیں کر
سکتا۔ مگر ان کا تردد بے جا تھا۔ اس لیے کہ جو خلیہ انہوں نے بنا رکھا تھا، یعنی منڈا ہوا سر،
آنکھوں میں سرے کی تحریر، اٹھ کا پاجامہ، سر پر نخل کی سیاہ رامپوری ٹوپی، گھر، مسجد اور محلے میں
پیر میں کڑاؤں۔۔۔۔۔ اس خلیے کے ساتھ وہ چاہتے بھی تو نیک چلنی کے سوا اور کچھ ممکن نہ تھا۔
نیک چلنی ان کی مجبوری تھی، اختیاری وصف نہیں۔ اور ان کا خلیہ اس کا ثبوت نہیں، سائن
بورڈ تھا۔

اور یہ وہی خلیہ تھا جو اس علاقے میں نچلے مڈل کلاس خاندانی شریف گھرانوں کے
نوجوانوں کا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی شریف سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں شریف بننے، رہنے اور
کہلانے کے لیے ذاتی کوشش قطعی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ مہر شرافت، جائداد اور مذکورہ بالا خلیہ
نسلاً بعد نسل اس طرح ورثہ میں ملتے تھے جس طرح ہاشما کو Genes اور موروثی امراض ملتے ہیں۔
عقیدے، مبلغ علم اور خلیے کے لحاظ سے پڑھنا اگر ہو پڑا پڑا معلوم ہو تو یہ خاندانی نجابت،
شرافت اور اصالت کی دلیل تصور کی جاتی تھی۔ انٹرویو کے لیے بشارت نے اسی خلیے پر صیقل
کر کے نوک پلک سنواری۔ اپکن دھلوائی۔ بدرنگ ہو گئی تھی، لہذا دھوبی سے کہا، ذرا کلف
زیادہ لگانا۔ سر پر ابھی جمعہ کو ”نمبر نمبر“ کی مہین مشین پھروائی تھی۔ اب استرا اور اس کے بعد
آم کی ٹٹھلی پھروا کر آمد کے تیل سے مالش کروائی۔ دیر تک مہرچیں لگتی رہیں۔ ٹوپی پہن کر
آئینہ دیکھ رہے تھے کہ اندر منڈے ہوئے سر سے پسینہ اس طرح رسنے لگا جیسے پیشانی پر ”وکس“
یا ”بام“ لگانے کے بعد جھرتا ہے۔ ٹوپی اتارنے کے بعد پنکھا جھلا تو ایسا لگا جیسے کسی نے ہوا میں
پیسپر منٹ ملا دیا ہو۔ یہاں یہ اعتراف غالباً بے محل نہ ہو گا کہ ہم نے جب اپنا اندیشائی خول اتار کر
یورپ کے رنگ ڈھنگ پہلے پہل ”تنگی آنکھ“ سے دیکھے تو ہمارے سارے وجود کو بالکل ایسا ہی
محسوس ہوا۔ پھر بشارت نے جو توں پر فوجیوں کی طرح ٹھوک سے پاش کر کے اپنی پرسنلٹی کو
فٹنگ ٹیج دیا۔ سلیکشن کمیٹی کا چیئرمین تحصیلدار تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ تقریروں کے معاملے
میں اسی کی چلتی ہے۔ پھکڑ، فقرے باز، ادب دوست ادیب نواز، ملنسار، نڈر اور رشوت خور
ہے۔ گھوڑے پر کچہری آتا ہے۔ نادیم تخلص کرتا ہے۔ آدمی بلا کا فہین اور طبیعت دار ہے۔

اسے اپنا طرفدار بنانے کے لیے بادامی کاغذ کا ایک دستہ اور چھ سات نیزے (نرسل) کے قلم خریدے اور راتوں رات اپنے کلام کا انتخاب یعنی ستائیس غزلوں کا گلدستہ خود مرتب کیا۔ مخمور تخلص کرتے تھے جو ان کے استاد جوہر الہ آبادی کا عطا کردہ تھا۔ اسی کی رعایت سے کلیات ناتمام و بادۂ خام کا نام ”خمخانہ مخمور کانپوری ثم لکھنوی“ رکھا۔ (لکھنؤ سے ان کو صرف اتنی نسبت تھی کہ پانچ سال قبل اپنا پتہ نکالوانے کے سلسلے میں دو ہفتے وہاں کے اسپتال میں تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں قیام فرمایا تھا) پھر اس میں ایک ضخیم ضمیمہ بھی شامل کر دیا۔

اس ضمیمہ کا قصہ یہ ہے کہ اپنی غزلوں اور اشعار کا انتخاب انہوں نے دل پر پتھر بلکہ پہاڑ رکھ کر کیا تھا۔ شعر کتنا ہی لغو اور کمزور کیوں نہ ہو، اسے بقلم خود کاٹنا اور حذف کرنا استہابی مشکل ہے جتنا اپنی اولاد کو بد صورت کہنا یا زہور سے اپنا ہلنا ہوا دانت خود اٹھاؤ۔ غالب تک سے یہ مجاہدہ نہ ہو سکا۔ کاٹ چھانٹ مولانا فضل حق خیر آبادی کے سپرد کر کے خود ایسے بن کے بیٹھ گئے جیسے بعض لوگ انجکشن لگواتے وقت دوسری طرف منہ پھیر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ بشارت نے اشعار قلم زد کرنے کو تو کر دیے، مگر دل نہیں مانا۔ چنانچہ آخر میں ایک ضمیمہ اپنے تمام منسوخ کلام کا شامل کر دیا۔ یہ کلام تمام تر اس دور سے تعلق رکھتا تھا جب وہ بے استاد تھے اور فریفتہ تخلص کرتے تھے۔ اس تخلص کی صفت یہ تھی کہ جس مصرع میں بھی ڈالتے، وہ بحر سے خارج ہو جاتا۔ چنانچہ بیشتر غزلیں بغیر مقطع کے تھیں۔ چند مقطعوں میں ضرورتِ شعری کے تحت فریفتہ کا مترادف شیدا اور دلدادہ استعمال کیا اور صراحتاً اوپر ڈوٹی بھی بنادی، مگر اس سے شعر میں کوئی اور سقم پیدا ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ غیب سے جو مضامین خیال میں آتے تھے ان کے الہامی و فوری اور طوفانی خروش کو وزن و عروض کے کوزے میں بند کرنا انسان کے بس کا کام نہ تھا۔

خدا بنے تھے یگانہ، خدا بنانہ گیا

کلیات کے سرورق کی محراب پر ”إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةٍ وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا“ لکھا۔ اور اس کے نیچے ”خمخانہ مخمور کانپوری ثم لکھنوی - ترتیب جدید“ - نیچے کی دوسطروں میں ”باہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نوکشور لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا“ لکھا۔ پھر ”ہوا“ کا الف مشاکر اس کی جگہ بہت باریک خط میں ”ہما“ اس طرح لکھا کہ پہلی نظر میں ”ا“ ہی دکھائی دیتا تھا۔ آخری سطر میں ”پہلا ایڈیشن - دسمبر ۱۹۳۷ء قیمت للہ“ - کتاب کے نام کے نیچے اس سے دُگنے جلی حروف میں اپنا نام لکھا:

”بشارت علی فاروقی کانپوری ثم لکھنوی - بی - اے - (آگرہ یونیورسٹی)

جانشین افسر الشعراء، افصح الفصحی حضرت جوہر چغتائی الہ آبادی اعلیٰ اللہ مقامہ - ہمارے جن پڑھنے والوں کو اس میں غلو یا زیبِ داستان کا شائبہ نظر آئے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کرشن چندر بھی اپنے نام کے ساتھ ایم اے کا ڈم چھٹا لکاتے تھے۔ اور اس کے بغیر ان کا نام بالکل تنگ و درنگ بلکہ کسی اور کا معلوم ہوتا تھا۔ اور ایک انہیں پر موقوف نہیں، ان سے بہت پہلے اکبر الہ آبادی کا نام ان کے مجموعوں اور رسالوں میں اس طرح چھپتا تھا:

”از لسان العصر خان بہادر اکبر حسین صاحب - پنشنر شش جج، الہ آباد“

اور بشارت کے پسندیدہ شاعر یگانہ چنگیزی نے جو خود کو ”امام الغزل، ابوالمعانی، یگانہ علیہ السلام“ کہتے اور لکھتے تھے، اپنے دوسرے مجموعہ کلام کو اپنے ہیر و اور مرشد روحانی، چنگیز خان کے نام اتہائی عقیدت سے ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا:

”تحفہ ادب بجناب بیت مآب، پیغمبر قہر و عذاب، شہنشاہ بنی آدم سرتاج سکندر و جم، حضرت چنگیز خان اعظم، قہر اللہ، منجانب میرزا یگانہ چنگیزی، لکھنوی -“

ایک سنگین غلطی البتہ نادانستہ در آئی۔ بشارت نے ساری عبارت اور القاب مع قیمت للحد، نول کشور پریس کے ایک ٹائٹل سے من وعن نقل کیے تھے۔ رواروی میں اپنے استاد جوہر چغتائی الہ آبادی کے نام کے آگے ”اعلیٰ اللہ مقامہ، نقل کرتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ ابھی تو وہ حیات ہی نہیں، جوان بھی ہیں اور آخرت میں ان کے مقامات بلند ہونے میں ابھی خاصی دیر ہے۔

یگانہ نے اپنے مطبوعہ دیوان میں اپنی پسندیدگی کی مناسبت سے اشعار پر ص کے نشان بالالتزام چھپوائے تھے۔ جو اشعار زیادہ پسند آئے ان پر دوسر ص اور جن پر خود کوٹ ہو جاتے تھے ان پر تین ص ص لگوائے، تاکہ کل کلاں کو لاپرواہ پڑھنے والا یہ نہ کہے کہ مجھے خوب، خوب تر اور خوب ترین کے فرق سے کب کسی نے آگاہی بخشی؟ بشارت نے استاد کا تتبع تو کیا، مگر اتنی سی ترمیم کے ساتھ کہ صاد کے دقیانوسی نشان کے بجائے سرخ تک مارک دائیں اور بائیں دونوں حاشیوں پر لکھادیے۔

دھیرج گنج کی ملازمت پر انہیں صرف ایک اعتراض تھا۔ مخمور کے آگے دھیرج گنجی

لکھنا تخلص اور تغزل کا دہرا خون کرنے سے کم نہ تھا۔ لیکن جب ان مظلوم شاعروں پر نظر کی جو اس سے بھی زیادہ گنوار اور کُڈھب نام کے قصبوں، مثلاً پھچھوند، بہرائچ، گونڈہ، بارہ بنکی، چریاکوٹ، جالندھر، لوہارو، لدھیانہ، مچھلی شہر کے ساتھ نباہ کیے جا رہے تھے تو بقول ان کے ”صبر تو نہیں آیا، سمجھ آگئی“ پھر ایک دن لیٹے لیٹے دفعتاً خیال آیا کہ عظیم شاعر نظامی بھی تو اپنے تخلص کے بعد گنجوی لکھتا تھا۔ چلیے، ”گنج“ کی خلش تو دور ہوئی۔ اللہ نے چاہا تو اسی طرح دھیرج کا کاٹنا بھی دفعتاً مکمل جائے گا۔

مولوی مجن سے تانا شاہ تک

حفظِ ماتقرر کے طور پر تحصیلدار تک سفارش پہنچانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ البتہ مولوی مظفر (جو حقارت، اختصار اور پیار میں مولیٰ مجن کہلاتے تھے) کے بارے میں جس سے پوچھا اس نے ایک نیا عیب نکالا۔ ایک صاحب نے کہا۔ قوم کا درد رکھتا ہے۔ حکام رس ہے۔ پر کم ظرف۔ بچ کے رہنا۔ دوسرے صاحب بولے، مولیٰ مجن ایک یتیم خانہ شمع الاسلام بھی چلاتا ہے۔ یتیموں سے اپنے پیر دیواتا اور اسکول کی جھاڑو دلاتا ہے۔ اور ماسٹروں کو یتیموں کی ٹولی کے ساتھ چندہ اکٹھا کرنے کا پور اور لکھنؤ بھیجتا ہے۔ وہ بھی بلا ٹکٹ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دُھن کا پکا ہے۔ مسلمانانِ دھیرج گنج کی بڑی خدمت کی ہے۔ دھیرج گنج کے جتنے بھی مسلمان آج پڑھے لکھے اور سرسبز روزگار نظر آتے ہیں وہ سب اسی اسکول کے زینے سے اوپر چڑھے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ لوگوں کو مولوی مظفر سے بغض لگ ہی ہو گیا ہے۔ بشارت کو ان سے ایک طرح کی ہمدردی ہو گئی۔ یوں بھی ماسٹر فاخر حسین نے ایک مرتبہ بڑے کام کی نصیحت کی تھی کہ کبھی اپنے کسی بزرگ یا باس یا اپنے سے کم بد معاش آدمی کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں غلط راہ پر دیکھو تو تین دانا بندروں کی طرح اندھے، بہرے اور گونگے بن جاؤ۔ ٹھٹھ کرو گے۔

ایک جلے تن بزرگ جو رسالہ ”زمانہ“ میں کاتب تھے، فرمانے لگے ”وہ چھا کٹا ہی نہیں چرکٹا بھی ہے۔ پچیس روپے کی رسید لکھو اگر پندرہ روپے ہاتھ میں ٹکا دے گا۔ پہلے تمہیں جانچے گا۔ پھر آنکے گا۔ اس کے بعد تمام عمر ہانکے گا۔ اس نے دستخط کرنے اس وقت سیکھے جب چندے کی جعلی رسیدیں کاٹنے کی ضرورت پڑی۔ ارے صاحب! سرسید تو اب جا کے بنا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے اپنے نکاح نامے پر اٹکواٹھا لگاتے دیکھا ہے۔ ٹھوٹھ جاہل ہے۔

مگر بلا کا کرٹھا ہوا۔ گھسا ہوا بھی ہے اور گھٹا ہوا بھی۔ ایسا ویسا چڑقنات نہیں ہے۔ لُفہ بھی ہے۔ لُٹہ بھی اور ٹُٹہ بھی! ”بزرگوار موصوف نے ایک ہی سانس میں پاجی پن کے ایسے باریک شید زنگنوا دیے کہ جب تک آدمی ہر کمالی کے بعد لُغت نہ دیکھے، یا ہماری طرح عرصہ دراز تک زبان دانوں کی صحبت کے صدمے نہ اٹھائے ہوئے ہو، وہ زبان اور نالائقی کی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

سید اعجاز حسین وفا کہنے لگے ”مولیٰ بچن پانچوں وقت ٹکریں مارتا ہے۔ گھٹنوں، ماتھے اور ضمیر پر یہ بڑے گٹے پڑ گئے ہیں۔ تھانیدار اور تحصیلدار کو اپنے حسن اخلاق، اسلامی جذبہ اخوت و مدارات اور ————— رشوت سے قابو میں کر رکھا ہے۔ دسے کامریض ہے۔ پانچ منٹ میں دس دفعہ آستین سے ناک پونچھتا ہے۔“ دراصل انہیں آستین سے ناک پونچھنے پر استیاء اعتراض نہ تھا جتنا اس پر کہ آستین کو آستین کہتا ہے۔ بختی کو اخنی اور حوصلہ کو حوصلہ۔ انہوں نے اپنے کانوں سے اسے مجاز شریف اور شہرات کہتے سنا تھا۔ جُہلا، دہقانوں اور بکریوں کی طرح ہر وقت ’میں، میں‘ کرتا رہتا ہے۔ لکھنؤ کے شرفا انانیت سے بچنے کی غرض سے خود کو ہمیشہ ”ہم“ کہتے ہیں۔ اس پر ایک نحیف و لاغر بزرگ نے اضافہ فرمایا کہ ذات کا قصائی کنبڑا یاد دلی والا معلوم ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ تین دفعہ گلے ملتا ہے۔ اودھ میں اشراف صرف ایک مرتبہ گلے ملتے ہیں۔

یہ اودھ کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔ اس لئے کہ صرف ایک دفعہ گلے ملنے میں شرافت و نجابت کا غالباً آئینا دخل نہ تھا جتنا نازک مزاجی کا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ اس زمانے کے روایتی چونچلے ہیں جب نازک مزاج بیگمات خشکے اور شبنم کو آلہ خودکشی کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اور یہ دھمکی دیتی تھیں کہ خشک کھا کر اس میں سو جاؤں گی۔ وہ تو خیر بیگمات تھیں، تانا شاہ ان سے بھی بازی لے گیا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ گرفتار ہو کر دربار میں پانچولاس پیش کیا گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اسے کس طرح مروایا جائے۔ درباریوں نے ایک سے ایک تجویز پیش کی ہوگی۔ مثلاً ایک درباری نے کہا کہ ایسے عیاش کو تو مست ہاتھی کے پیر سے باندھ کر شہر کا گشت لگوانا چاہیے۔ دوسرا کورنش بجا کے بولا بجا ”مگر مست ہاتھی کو شہر کا گشت کون مائی کالا لگوائے گا۔ ہاتھی گشت لگانے کے لیے تھوڑا ہی مست ہوتا ہے۔ البتہ آپ تانا شاہ کی عیاشی کی سزا ہاتھی کو دینا چاہتے ہیں تو اور بات ہے۔ اس پر تیسرا درباری بولا کہ تانا شاہ جیسے عیاش کی اس سے زیادہ اذیت ناک سزا نہیں ہو سکتی کہ اسے محنت کر کے اسی کے حرم میں کھلا چھوڑ دیا

جائے۔ ایک اور درباری نے تجویز پیش کی کہ آنکھوں میں نیل کی سلانی پھروا کر اندھا کر دو۔ پھر قلعہ گوالیار میں دو سال تک روزانہ نہار منہ پوست کا پیالہ پلاؤ تاکہ اپنے جسم کو دھیرے دھیرے مرتے ہوئے خود بھی دیکھے۔ اس پر کسی تاریخ داں نے اعتراض کیا کہ سلطان ذی شان کا تانا شاہ سے کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ یہ سلوک تو صرف سکے بھائیوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ ایک شقی القلب نے کہا کہ قلعے کی فصیل پر سے نیچے پھینک دو۔ مگر یہ طریقہ اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ اس کا دم تو مارے ڈر کے رستے میں ہی نکل جائے گا۔ اگر مقصد اذیت دینا ہے تو وہ پورا نہیں ہو گا۔ بالآخر وزیر نے، جس کا باتدبیر ہونا ثابت ہو گیا، یہ مشکل حل کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر ذہنی اذیت دے کر اور تڑپا تڑپا کر مارنا ہی مقصود ہے تو اس کے پاس سے ایک گوالن گزار دو۔ جن پڑھنے والوں نے بگڑے ہوئے رئیس اور گوالن نہیں دیکھی ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مکھن اور کچے دودھ کی بُو، ریوڑ پاس میں بے ہوئے لہنگے اور پسینے کے کھار سے سفید پڑے ہوئے سیاہ شلو کے کے ایک ہی جھبکے سے امرا و رؤسا کا دماغ پھٹ جاتا تھا۔ پھر انہیں ہرن کے نافہ سے نکلے ہوئے مادے کے گلگلے سنگھا کر ہوش میں لایا جاتا تھا۔

۲

حلوائی کی دکان اور کتے کا ناشتہ

انٹرویو کی غرض سے دھیرج گنج جانے کے لیے بشارت صبح تین بجے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ سات بجے مولوی مظفر کے گھر پہنچے تو وہ تخت پر بیٹھے جلیبیوں کا ناشتہ کر رہے تھے۔ بشارت نے اپنا نام پتہ بتایا تو کہنے لگے ”آئیے آئیے! آپ تو کان ہی پور کے (کانپور ہی کے) رہنے والے ہیں۔ کانپور کو گویا لکھنؤ کا آئینہ کہیے۔ لکھنؤ کے لوگ تو بڑے مدبغ اور ناک والے ہوتے ہیں۔ لہذا میں ناشتے کے لیے جھوٹوں بھی نہیں ٹوکوں گا۔ اے ذوق متکلف میں ہے تکلیف برابر (جی ہاں) انہوں نے سراسر کو برابر کر دیا تھا) ظاہر ہے ناشتہ تو آپ کر کے آئے ہوں گے۔ سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ انجمن کے دفتر میں ایک گھنٹے بعد ہوگی۔ وہیں ملاقات ہوگی۔ اور ہاں جس ناہنجار سے آپ نے سفارش کروائی وہ نہایت بخیل اور نامعقول آدمی ہے۔“

اس تمام گفتگو میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے۔ مولوی مظفر نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ کھڑے کھڑے ہی بھگتا دیا۔ گھر سے منہ اندھیرے چلے تھے، مولوی مظفر کو گرم

جلیبی کھاتے دیکھ کر ان کی بھوک بھڑک اٹھی۔ محمد حسین آزاد کے الفاظ میں بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کر دیا۔ گھوم پھر کے حلوائی کی دکان دریافت کی اور ڈیڑھ پاؤ جلیبیاں گھان سے اترتی ہوئی ٹلوا لیں۔ دو نے سے پہلی جلیبی اٹھائی ہی تھی کہ حلوائی کا کتا ان کے پورے عرض کے غرارے نما لکھنوی پاجامے کے پائینچے میں منہ ڈال کے بڑی تندہی سے لپڑ لپڑان کی پنڈلی چاٹنے لگا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ، بے حس و حرکت کھڑے چٹواتے رہے۔ اس لیے کہ انہوں نے کسی سے سنا تھا کہ کتا اگر پیچھا کرے یا آپ کے ہاتھ پیر چاٹنے لگے تو بھگانا یا شور نہیں مچانا چاہیے، ورنہ وہ مشتعل ہو کر سچ مچ کاٹ کھائے گا۔ جیسے ہی انہوں نے اسے ایک جلیبی ڈالی، اس نے پنڈلی چھوڑ دی۔ اس اثناء میں انہوں نے خود بھی ایک جلیبی کھائی۔ کتا اپنی جلیبی ختم ہوتے ہی پائینچے میں منہ ڈال کے پھر شروع ہو گیا۔ زبان بھی ٹھیک سے صاف نہیں کی۔ اب ناشتے کا یہ ”پیٹرن“ بنا کہ پہلے ایک جلیبی کتے کو ڈالتے تب خود بھی ایک کھا پاتے۔ جلیبی دینے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ لپک کر دوبارہ بڑی رغبت و انہماک سے پنڈلی چھوڑنے لگتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے اندر ایک ہڈی تھی۔ لیکن اب دل سے کتے کا خوف اس حد تک مٹ چکا تھا کہ اس کی ٹھنڈی ناک سے گدگدی ہو رہی تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے دو نہایت اہم فیصلے کیے۔ اول یہ کہ آئندہ کبھی بھلائے کانپور کی طرح سڑک پر کھڑے ہو کر جلیبی نہیں کھائیں گے۔ دوم، شرفائے لکھنؤ کی دیکھا دیکھی اتنے چوڑے پائینچے کا پاجامہ ہرگز نہیں پہنیں گے۔۔۔ کم از کم زندہ حالت میں۔ کتے کو ناشتہ کروا چکے تو خالی دونا اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ شیرہ چاٹنے میں منہمک ہو گیا تو حلوائی کے پاس دوبارہ گئے۔ ایک پاؤ دودھ کھڑ میں اپنے لیے اور ڈیڑھ پاؤ کتے کے لیے خریدا، تاکہ اسے پیتا چھوڑ کر سبک جائیں۔ اپنے حصے کا دودھ غنا غٹ پی کر قصبے کی سیر کو روانہ ہونے لگے تو کتا اپنا دودھ چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ انہیں جانا دیکھ کر پہلے کتے کے کان کھڑے ہوئے تھے، اب ان کے کھڑے ہونے کے بعد ذات اب کیا چاہتا ہے۔ تین چار جگہ جہاں انہوں نے ذرا دم لینے کے لیے رفتار کم کرنے کی کوشش کی، یا اپنی مرضی سے مڑنا یا لوٹنا چاہا تو کتا کسی طرح راضی نہ ہوا۔ ہر موڑ پر گلی کے کتے چاروں طرف سے انہیں اور اسے گھیر لیتے اور کھمبہ ڈتے ہوئے دوسری گلی تک لے جاتے جس کی بین اُکلبی سرحد پر دوسرے تازہ دم کتے چارج لے لیتے۔ کتا بڑی بے جگری سے تنہا لڑ رہا تھا۔ جب تک جنگ فیصلہ کن طریقے سے ختم نہ ہو جاتی یا کم از کم عارضی سک بندی نہ ہو جاتی یا بصورت دیگر، دوسری گلی کے شیروں سے ازسرنو مقابلہ شروع نہ ہوتا، وہ UNO کی طرح نیچ میں خاموش کھڑے دیکتے رہتے۔ وہ لوٹنوں کو کتوں

کو پتھر مارنے سے بڑی سختی سے منع کر رہے تھے۔ اس لیے کہ سارے پتھر انہی کو لگ رہے تھے۔ وہ کتنا دوسرے کتوں کو ان کی طرف بڑھنے نہیں دیتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی اخلاقی ہمدردیاں اب اپنے ہی کتے کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ دو فرانک پہلے جب وہ چلے تھے تو وہ محض ایک کتا تھا۔ مگر اب رشتہ بدل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کوئی اچھا سا نام سوچنے لگے۔

انہیں آج پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ گاؤں میں اجنبی کی آمد کا اعلان کتے، مور اور بچے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا مہمان بن جاتا ہے۔

ٹیپو نام کے کتے

انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ حلوائی اور بچے اس کتے کو ٹیپو! ٹیپو! کہہ کر بلانا اور دھتکار رہے تھے۔ سر ٹکا پٹم کی خون آشام جنگ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے کثرت سے کتوں کا نام ٹیپور کھنا شروع کر دیا تھا۔ اور ایک زمانے میں یہ نام شمالی ہندوستان میں استعام ہوا کہ خود ہندوستانی بھی آوارہ اور بے نام کتوں کو ٹیپو کہہ کر ہی بلاتے اور ہتکار تھے۔۔۔۔۔ یہ جانے بغیر کہ کتوں کا یہ نام کیسے پڑا۔ باستانوں نے نیپولین اور ٹیپو سلطان، انگریزوں نے ایسا سلوک اپنے کسی اور دشمن کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ اس لیے کہ کسی اور دشمن کی ان کے دل میں ایسی ہیبت اور دہشت کبھی نہیں بیٹھی تھی۔ برصغیر کے کتے سو سال تک سلطان شہید کے نام سے پکارے جاتے رہے۔ کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، عقوبت، مظہرہ اور شہادتِ غلطی ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ رب جلیل انہیں شہادتِ جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔

تلو ادیکھ کر قسمت کا حال بتانے والا

حالانکہ ان کا پناہ گریختہ اور اسکول نیم پختہ تھا، لیکن مولوی مظفر نے اپنی دیانت اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سادگی کا نمونہ پیش کرنے کی غرض سے اپنا دفتر ایک کچے ٹن پوش مکان میں بنا رکھا تھا۔ سلیکشن کمیٹی کا اجلاس اسی جگہ ہونے والا تھا۔ بشارت سمیت کل تین امیدوار تھے۔ باہر دروازے کے بائیں طرف ایک بلیک بورڈ پر چاک سے یہ ہدایات مرقوم تھیں: (۱) امیدوار اپنی باری کا انتظار صبر و تحمل سے کرے۔ (۲) امیدواروں کو سفر خرچ اور بختہ ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ ظہر کی نماز کے بعد ان کے طعام کا انتظام یتیم خانہ شمع الاسلام میں کیا گیا ہے۔ (۳) انٹرویو کے

وقت امیدوار کو مبلغ ایک روپے چندے کی یتیم خانے کی رسید پیش کرنا ہوگی۔ (۴) امیدوار حضرات براہ کرم اپنی سیڑی بجھا کر اندر داخل ہوں۔“

بشارت جب انتظار گاہ یعنی نیم کی چھاؤں تلے پہنچے تو کتنا ان کی جلو میں تھا۔ انہوں نے اشاروں کنایوں سے کئی بار اس سے رخصت چاہی مگر وہ کسی طور ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ نیم کے نیچے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئے تو وہ بھی ان کے قدموں میں آن بیٹھا۔ نہایت مناسب وقفوں سے دم ہلایا کر انہیں ممنون نکاہوں سے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز انہیں بہت اچھا لگا اور اس کی موجودگی سے انہیں کچھ تقویت سی محسوس ہونے لگی۔ نیم کے سائے میں ایک امیدوار جو خود کو الہ آباد کا T.T. بتاتا تھا، اکڑوں بیٹھا تھکے سے ریت پر ایک تسکیر یعنی ۲۰ کا مبارک نقش بنا رہا تھا، جس کے خانوں کے عدد کسی طرف سے بھی گنے جاییں، حاصل جمع ۲۰ بنتا تھا۔ تسخیر زن اور افسر کو رام کرنے کے لیے یہ نقش تیر ہدف سمجھا جاتا تھا۔ کان کے بیچ و خم میں جو سوالیہ نشان کے اندر ایک اور سوالیہ نشان بنا ہوتا ہے، ان دونوں کی درمیانی گھائی میں اس نے عطرِ خس کا پھویا اُڑس رکھا تھا۔ ”زلفِ بنگال ہیئر آئل“ سے کی ہوئی سیخائی کے ریلے جو سر کی فوری ضروریات سے زائد تھے، پیشانی پر بہہ رہے تھے۔ دوسرا امیدوار جو کالپی سے آیا تھا، خود کو علیگڑھ کا بی۔ اے، بی ٹی بتلاتا تھا۔ دھوپ کی عینک تو سمجھ میں آتی تھی، لیکن اس نے گلے میں سیلک کا سرخ اسکارف بھی باندھ رکھا تھا، جس کا اس چلچلاتی دھوپ میں بظاہر یہی مصرف نظر آتا تھا کہ چہرے سے ٹپکا ہوا پسینہ محفوظ کر لے۔ اگر اس کا وزن سو پونڈ کم ہوتا تو وہ سوٹ جو وہ پہن کر آیا تھا، بالکل فٹ آتا۔ قمیص کے دو نیچے کے بٹن اور پتلون کے دو اوپر والے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ صرف سولر ہیٹ صحیح سائز کا تھا۔ فیروزے کی انگوٹھی بھی غالباً تنگ ہو گئی تھی، اس لئے کہ انٹرویو کے لیے آواز پڑی تو اس نے جیب سے نکال کر چھٹکلیا میں پہن لی۔ جوتے کے تسمے جنہیں وہ کھڑے ہونے کے بعد دیکھ نہیں سکتا تھا، کھلے ہوئے تھے۔ کہتا تھا گول کپیرہ چکا ہوں۔ اس تن و توش کے باوجود خود کو نیم کے دوشانے میں اس طرح فٹ کیا تھا کہ دور سے ایک V منظر آتا تھا جس کی ایک ٹوک پر جوتے اور دوسری پر ہیٹ رکھا تھا۔ یہ صاحب اوپر ٹنگے ٹنگے ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ اور وہیں سے پیک کی پچکاریاں اور پاسنگ شو سگرٹ کی راکھ چٹکی بجاتا کر جھاڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بشارت کے پاس ایک جنگلم * فقیر آن بیٹھا۔ اپنا سونٹا ان

* جنگلم: فقیر جس کے سر پر جٹا میں، ہاتھ میں سونٹا اور پاؤں میں زنجیر ہوتی تھی۔ ہاتھ میں ایک گھنٹی ہوتی تھی، جسے بجاتا پھرتا تھا۔

کے ماتھے پہ رکھ کے کہنے لگا۔ ”قسمت کا حال بتاتا ہوں پاؤں کے تلوے دیکھ کر۔ ابے جوتے اتار۔ نہیں تو سالے کو یہیں بھسم کر دوں گا۔“ انہوں نے اسے پاگل سمجھ کر منہ پھیر لیا۔ لیکن جب اس نے نرم لہجے میں کہا ”بچہ! تیرے پیڑوپہ تل اور سیدھی بغل میں مسابے۔“ تو انہوں نے خوفزدہ ہو کر جوتے اتار دیے، اس لیے کہ اس نے بالکل صحیح نشانہ ہی کی تھی۔ ذرا دور پہر ایک بڑے درخت کے نیچے تیسری جماعت کے لڑکے ڈرل کر رہے تھے۔ اس وقت ان سے ڈنڈ لگوائے جا رہے تھے۔ پہلے ہی ڈنڈ میں ”ہوں!“ کہتے ہوئے سر نیچے لے جانے کے بعد صرف دو لڑکے ہتھیلیوں کے بل اٹھ پائے۔ باقی ماندہ وہیں دھول میں چھپکلی کی طرح پٹ پٹے رہ گئے۔ اور گردن موڑ موڑ کر بڑی بے چارگی سے ڈرل ماسٹر کو دیکھ رہے تھے، جو انہیں طعنہ دے رہا تھا کہ تمہاری ماؤں نے تمہیں کیسا دودھ پلایا ہے؟

دروازے پر سرکنڈوں کی چق پڑی تھی جس کا نچلا حصہ جھڑچکا تھا۔ سُتلی کی لڑیاں لٹکی رہ گئی تھیں۔ سب سے پہلے علیگ امیدوار کو اس طرح آواز پڑی جیسے عدالت میں فریقین مقدمہ کے نام مع ولدیت پکارے جاتے ہیں۔ پکارنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا گویا سودو سو امیدوار ہیں جو ڈیڑھ دو میل دور کہیں بیٹھے ہیں۔ امیدوار مذکور نیم کی غلیل پر سے دھم سے کود کر سولر ہیٹ سمیت دروازے میں داخل ہونے والا تھا کہ چہرہ اسی نے راستہ روک لیا۔ اس نے یتیم خانے کے چندے کی رسید طلب کی اور پائینگ شو کی ڈیبا جس میں ابھی دو سگرٹ باقی تھے بصیغہ خراج دھروا لی۔ پھر جوتے اتروا کر بحالت رکوع اندر لے گیا۔ پچاس منٹ بعد دونوں باہر نکلے۔ چہرہ اسی نے دروازے کے پاس رکھی ہوئی چوٹی گھوڑی میں معلق گھنٹے کو ایک دفعہ بجایا جس کا مقصد اہالیانِ قصبہ اور امیدواروں کو مطلع کرنا تھا کہ پہلا انٹرویو ختم ہوا۔ باہر کھڑے ہوئے لڑکوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد الہ آبادی امیدوار کا نام پکارا گیا اور وہ بیس کا نقش مشاکر لپک چھپک اندر چلا گیا۔ پچاس منٹ بعد پھر چہرہ اسی نے باہر آکر گھنٹے پر دوبار اتنے زور سے ضرب لگائی کہ قصبہ کے تمام مورچکھاڑنے لگے۔ ہر انٹرویو کا دورانیہ وہی تھا جو اسکول کے گھنٹوں کا۔ چہرہ اسی نے آنکھ مار کر بشارت کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

بلیک ہول آف وحیرت گنج

بشارت انٹرویو کے لیے اندر داخل ہوئے تو کچھ دیر تک تو کچھ منظر نہ آیا، اس لئے کہ بجز

ایک گول موکھے کے ، روشنی آنے کے لئے کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اسی اندھیرے میں ہر چیز کی آؤٹ لائن اُبھرتی ، اُجلتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ دیواروں پر کہنکل یعنی پسیلی مٹی اور گوبر کی تازہ لپائی میں مضبوطی اور گرفت کے لیے جو کڑبی کی چھیلن اور ٹوڑی کے تیکے ڈالے گئے تھے ان کا قدرتی سنہری وارنش اندھیرے میں چمکنے لگا ۔ دائیں طرف نیم تاریک کونے میں دو بٹن روشن نظر آئے ۔ وہ چل کر ان کی طرف آنے لگے تو انہیں خوف محسوس ہوا ۔ یہ اس بلی کی آنکھیں تھیں جو کسی آن دیکھے چوہے کی تلاش میں تھی ۔ بائیں طرف ایک چار فٹ اونچی چان ناکھاٹ پڑی تھی جس کے پائے غالباً درختوں کے سالم تنے سے بنائے گئے تھے ۔ بسولے سے چمال اتارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی تھی ۔ اس پر سلیکشن کمیٹی کے تین ممبر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے ۔ اس کے پاس ہی ایک اور ممبر بغیر پشت کے مونڈھے پر بیٹھے تھے ۔ دروازے کی طرف پشت کئے مولوی مظفر ایک ٹیکسی دار مونڈھے پر براجمان تھے ، جس کے ہاتھوں کی پیڈنگ ٹھننے کے بعد سر کٹھے تنگے سر کٹھے رہ گئے تھے ۔ ایک بغیر بازو والی لوہے کی کرسی پر ایک نہایت خوش مزاج شخص الٹا بیٹھا تھا ۔ یعنی اس کی پشت سے اپنا سینہ ملائے اور کنارے پر اپنی ٹھوڑی رکھے ہوئے ۔ اس کا رنگ اتنا سانا تھا کہ اندھیرے میں صرف دانت نظر آرہے تھے ۔ یہ تحصیلدار تھا جو اس کمیٹی کا چیئرمین تھا ۔ ایک ممبر نے اپنی ترکی ٹوپی کھاٹ کے پائے کو پہنار کھی تھی ۔ کچھ دیر بعد جب بلی اس کے پُھندنے سے طمانچہ مار مار کے فھیلنے لگی تو اس نے پائے سے اتار کر اپنے سر پر رکھ لی ۔ سب کے ہاتھ میں کھجور کے پنکھے تھے ۔ مولیٰ مجن پنکھے کی ڈنڈی گردن کے راستے شیر وانی میں اتار کر بار بار اپنی پیٹھ کھانے کے بعد ڈنڈی کی نوک کو سوکتے تھے ۔ تحصیلدار کے ہاتھ میں جو پنکھا تھا اس میں سُرخ موٹ اور وسط میں چھوٹا سا آئینہ لگا ہوا تھا ۔ امیدوار کے بیٹھنے کے لیے ایک اسٹول ، جس کے وسط میں گردے کی شکل کا ایک سوراخ تھا جو اس زمانے میں سب اسٹولوں میں ہوتا تھا ۔ اس کا مصرف ایک عرصے تک ہماری سمجھ میں نہ آیا ۔ بعض لوگ گرمیوں میں اس پر صراحی یا ٹھلیا رکھ دیتے تھے تاکہ سوراخ سے پانی رستار ہے اور پینڈے کو ٹھنڈی ہوا لگتی رہے ۔ بشارت آخر وقت تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ خود نروس ہیں یا اسٹول لڑکھڑا رہا ہے ۔ تحصیلدار بیڑے کی لتی پی رہا تھا اور بقیہ ممبران حقہ ۔ سب نے جوتے اتار رکھے تھے ۔ بشارت کو اگر یہ علم ہوتا تو یقیناً صاف موزے پہن کر آتے ۔ مونڈھے پر بیٹھا ہوا ممبر اپنے بائیں پیر کو دائیں گتھنے پر رکھے ، ہاتھ کی انگلیوں سے پاؤں کی انگلیوں کے ساتھ پنجہ لڑا رہا تھا ۔ ایک بدقلبی اکالدا ان گردش میں تھا ۔ ہوا میں

حقے، پان کے بناسی تمباکو، کوری ٹھلیا، کونے میں پڑے ہوئے خربوزے کے چھلکوں، عطر خس اور گوبر کی تازہ لپائی کی بو بسی ہوئی تھی۔ اور ان سب پر غالب وہ بھبکا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ دیسی جو توں کی بو ہے جو پیروں سے آہری ہے یا پیروں کی سڑاند ہے جو جو توں سے آہری ہے۔

جس موکھے کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ روشنی کے لیے بنایا گیا ہے یا اندر کی تاریکی کو contrast (تضاد، تقابل) سے اور زیادہ تاریک دکھانے کے لیے رکھا گیا ہے۔ آیا اندر کے دھوئیں کو باہر پھینکنے کے لیے ہے یا باہر کی گرد کو اندر آنے کا راستہ دکھانا مقصود ہے۔ باہر کا منظر دیکھنے کے لیے روزن ہے یا باہر والوں کو اندر تاک جھانک کرنے کے لئے جھانکی مہیا کی گئی ہے۔ روشندان، ہوا دان، دید بان، دودکش، دیبچہ، پورٹ ہول ————— بقول بشارت، یہ ایشیا کا سب سے کثیر المقاصد سوارخ تھا جو بے حد overworked اور چکرایا ہوا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کوئی سا فریضہ بھی ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا تھا۔ فی الوقت اس میں ہر پانچ منٹ بعد ایک نیا چہرہ فٹ ہو جاتا تھا۔ ہویہ رہا تھا کہ باہر دیوار تلے ایک لڑکا کھوڑا بنتا اور دوسرا اس پر کھڑے ہو کر اس وقت تک تماشہ دیکھتا رہتا جب تک کہ گھوڑے کے پیر نہ لڑکھڑانے لگتے اور وہ کمر کو کمافی کی طرح لچکا لچکا کے یہ مطالبہ نہ کرنے لگتا کہ یار! اتر مجھے بھی تو دیکھنے دے۔ کابے کابے یہ موکھا آکسیجن اور مالیوں کی رگمزر کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولیٰ مجن دے کے مریض تھے۔ جب کھانسی کا دورہ پڑتا اور ایسا لگتا کہ شاید دوسرا سانس نہیں آئے گا تو وہ دوڑ کر آکسیجن کے لیے موکھے میں اپنا منہ فٹ کر دیتے اور جب سانس کی آمد و شد بحال ہو جاتی تو قراءت سے الحمد للہ کہنے کے بعد لوٹوں کو سٹری سٹری مالیاں دیتے۔ تھوڑی دیر بعد دھوپ کا رخ بدلا تو سورج کا ایک چمکا چوند لپکتا نیزہ اس روزن سے داخل ہو کر کمرے کی تاریکی کو چیرتا چلا گیا۔ اس میں دھوئیں کے بل کھاتے مرغولوں اور دڑوں کا ناچ دیدنی تھا۔ بائیں دیوار کے طاق میں دینیات کے طلبہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے استنجے کے نہایت سڈول ڈھیلے قرینے سے تلے اوپر سجے تھے، جن پر اگر مکھیاں میٹھی ہوتیں تو بالکل بدایوں کے پیرے معلوم ہوتے۔

دائیں دیوار پر شہنشاہ جارج پنجم کے فوٹو پر گیندے کا سوکھا کھرنک ہار لٹک رہا تھا۔ اس کے نیچے مصطفیٰ کمال پاشا کا فوٹو اور مولانا محمد علی جوہر کی تصویر جس میں وہ چغہ پہنے اور سموری ٹوپی پر چاند تارا لٹکائے کھڑے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان مولیٰ مجن کا بڑا سا فوٹو اور

اس کے نیچے فریم کیا ہوا سپاس نامہ جو اساتذہ اور چہر اسیوں نے ان کی خدمت میں پہنچنے سے جانبر ہونے کی خوشی میں درازی عمر کی دعاؤں کے ساتھ پیش کیا تھا۔ ان کی تنخواہ پانچ مہینے سے لگی ہوئی تھی۔

ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ جب بشارت انٹرویو کے لیے اٹھ کر جانے لگے تو کتنا بھی ساتھ لگ لیا۔ انہوں نے بہتیارو کا مگر وہ نہ مانا۔ چہر اسی لے کہا، آپ اس پلید کو اندر نہیں لے جا سکتے۔ بشارت نے جواب دیا، یہ میرا کتنا نہیں ہے۔ چہر اسی بولا، تو پھر آپ اسے دو کھٹنے سے آغوش میں لئے کیوں بیٹھے تھے؟ اس نے ایک ڈھیلا اٹھا کر رسید کرنا چاہا تو کتنے نے جھٹ پینڈلی پکڑ لی۔ اور وہ جھنجھنے لگا۔ بشارت کے منع کرنے پر اس نے فوراً پینڈلی چھوڑ دی۔ شکریہ ادا کرنے کے بجائے چہر اسی کہنے لگا، اور اس پر آپ کہتے ہیں کہ یہ کتنا میرا نہیں ہے! جب وہ اندر داخل ہوئے تو کتنا بھی ان کے ساتھ گھس گیا۔ روکنا تو بڑی بات ہے، اب چہر اسی میں اتنا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ ٹوک بھی سکے۔ اس کے اندر کھستے ہی ایک بھونچال آگیا۔ ممبران کمیٹی نے چیخ چیخ کر چھتر سر پر اٹھا لیا۔ لیکن جب کتنا ان سے بھی زیادہ زور سے بھونچا تو سب سہم کر اپنی اپنی پینڈلی گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ بشارت نے کہا کہ اگر آپ حضرات بالکل خاموش اور ساکت ہو جائیں تو یہ بھی چُپکا ہو جائے گا۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ آپ انٹرویو میں اپنے ساتھ کتنا لے کر کیوں آئے ہیں؟ بشارت نے قسم کھا کر کتے سے اپنی لا تعلقی کا اظہار کیا تو وہی صاحب بولے کہ اگر آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ کتنا آپ کا نہیں ہے تو آپ اس کی عادتِ قبیحہ سے اس درجہ کیوں کر واقف ہیں؟

بشارت انٹرویو کے لیے اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو کتنا ان کے پیروں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ یونہی بیٹھا رہے۔ اس کی وجہ سے اب وہ نروس محسوس نہیں کر رہے تھے۔ انٹرویو کے دوران دومرتبہ مولیٰ مجن نے بشارت کی کسی بات پر بڑی حقارت سے زور دار قہقہہ لگایا تو کتنا ان سے بھی زیادہ زور سے بھونکنے لگا اور وہ سہم کر اپنا قہقہہ زیچ میں ہی سوچ آف کر کے چپکے بیٹھ گئے۔ بشارت کو کتے پر بے تحاشا پیار آیا۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلاؤں کیا

انٹرویو سے پہلے تحصیلدار نے کلا صاف کر کے سب کو خاموش کیا تو ایسا سناٹا طاری ہوا کہ دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی ٹک ٹک اور مولوی مظفر کے ہانپنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ پھر

انٹرویو شروع ہوا اور سوالوں کی بوچھاڑ - اتنے میں کلاک لے گیا رہ بجائے اور سب دوبارہ بالکل خاموش ہو گئے - دھیرج گنج میں کچھ عرصے رہنے کے بعد بشارت کو معلوم ہوا کہ جب کلاک کچھ بجاتا ہے تو دیہات کے آداب کے مطابق سب خاموش اور باادب ہو کر سنتے اور گنتے ہیں کہ غلط تو نہیں بجا رہا۔

انٹرویو دوبارہ شروع ہوا تو جس شخص کو وہ چہرہ اسی سمجھے تھے وہ کھاٹ کی ادو امین پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ دینیات کا ماسٹر نکلا جو ان دنوں اردو ٹیچر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ انٹرویو میں سب سے زیادہ دھڑکنے والی اسی نے کی، گوکہ مولوی مظفر اور ایک ممبر نے بھی جو عدالت منصفی کے ریٹائرڈ سرشتہ دار تھے، اینڈے اینڈے سوال کیے - تحصیلدار نے البتہ دیر پردہ مدد اور طرفداری کی اور سفارش کی لاج رکھ لی - چند سوالات ہم نقل کرتے ہیں جن سے سوال کرنے اور جواب دینے والے دونوں کی قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

مولوی مظفر: (”کلیاتِ مخمور“ پر چمکانے کے انداز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) شعر کہنے کے فوائد بیان کیجیے -

بشارت: (چہرے پر ایسا ایکسپریشن گویا آؤٹ آف کورس سوال پوچھ لیا) شاعری --- میرا مطلب ہے - شعر --- یعنی اس کا گویا مقصد --- تلا میذا الرحمن --- بات دراصل یہ ہے کہ شوقیہ ---

مولوی مظفر: اچھا! ”خالقِ باری“ کا کوئی شعر سنائیے۔

بشارت: خالقِ باری سر جن ہار

واحد ایک بیدا کرتا

سرشتہ دار: آپ کے والد، دادا اور نانا کس محکمے میں ملازم تھے؟

بشارت: انہوں نے ملازمت نہیں کی۔

سرشتہ دار: پھر آپ کیسے ملازمت کر سکیں گے؟ چار پشتیں یکے بعد دیگرے اپنا پتا ماس،

تب کہیں ملازمت کے لائق جوہر قابل پیدا ہوتا ہے -

بشارت: (سادہ لوحی سے) جناب عالی! میرا پتا آپریشن کے ذریعہ نکالا جا چکا ہے -

دینیات ٹیچر: شگاف دکھائیے -

تحصیلدار: آپ نے کبھی پیدا استعمال کیا ہے؟

بشارت: جی نہیں -

- تحصیلدار: آپ پر کبھی بید استعمال ہوا ہے؟
 بشارت: بارہا۔
 تحصیلدار: آپ یقیناً ڈسپلن قائم رکھ سکیں گے۔
 سرشتہ دار: اچھا، یہ بتائیے، دنیا گول کیوں بنائی گئی ہے؟
 بشارت: (سرشتہ دار کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے چاروں خانے چت ہونے کے بعد پہلو ان اپنے حریف کو دیکھتا ہے)
 تحصیلدار: سرشتہ دار صاحب، انہوں نے اردو ٹیچری کی درخواست دی ہے۔ جغرافیہ والوں کے انٹرویو جمعرات کو ہیں۔
 دینیات ٹیچر: بلیک بورڈ پر اپنی خوش خطی کا نمونہ لکھ کر دکھائیے۔
 سرشتہ دار: واڑھی پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟
 بشارت: کچھ نہیں۔
 سرشتہ دار: پھر رکھتے کیوں نہیں؟
 دینیات ٹیچر: آپ کو پچاسے زیادہ محبت ہے یا ماموں سے؟
 بشارت: کبھی غور نہیں کیا۔
 دینیات ٹیچر: اب کر لیجیے۔
 بشارت: میرے کوئی چچا نہیں ہیں۔
 دینیات ٹیچر: آپ کو نماز آتی ہے؟ اپنے والد کی نماز جنازہ پڑھ کر دکھائیے۔
 بشارت: وہ حیات ہیں!
 دینیات ٹیچر: لاجول ولا قوتہ۔ میں نے تو بشرے پر قیاس کیا تھا۔ تو پھر اپنے دادا کی پڑھ کر دکھائیے۔ یا آپ ابھی ان کے سائے سے بھی محروم نہیں ہوئے؟
 بشارت: (مری آواز میں) جی، ہو گیا۔
 مولوی مظفر: مسدس حالی کا کوئی بند سنائیے۔
 بشارت: مسدس کا تو کوئی بند اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ حالی ہی کی ”مناجاتِ بیوہ“ کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ *
- تحصیلدار: اچھا، اب کوئی اپنا پسندیدہ شعر سنائیے جس کا موضوع بیوہ نہ ہو۔

* یہ جواب سن کر ککھٹ پر بیٹھے ہوئے ممبران معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں۔ تحصیلدار بشارت کو آنکھ مارتا ہے۔
 (بقیہ نوٹ اسکے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

بشارت: توڑ ڈالے جوڑ سارے باندھ کر بند کفن

گورکی بغلی سے چت میں پہلوں، کچھ بھی نہیں

تحصیلدار: کس کا شعر ہے؟

بشارت: زبان کا شعر ہے۔

تحصیلدار: اے سبحان اللہ! قریان جائے۔ کیسی کیسی لفظی رعایتیں اور قیامت کے

تلازمے باندھے ہیں! توڑ کی ٹکڑ پہ جوڑ۔ ایک طرف باندھنا ہے تو دوسری طرف

بند۔ واہ وا! اس کے بعد بغلی قبر اور بغلی داؤ کی طرف لطیف اشارہ۔ پھر بغلی داؤ

سے پہلوں کا چت ہونا۔ اخیر میں چت پہلوں اور چت مُردہ اور کچھ بھی نہیں،

کہہ کے دنیا کی بے شباتی کو متین لفظوں میں بھگتا دیا۔ ڈھیر سارے صنائع بدائع

کو ایک شعر کے کوزے میں بند کر دینا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا ٹھکا ہوا،

استیا پختہ اور استیا خراب شعر کوئی استاد ہی کہہ سکتا ہے۔

مولوی مظفر: آپ سادگی پسند کرتے ہیں یا عیش و عشرت؟

بشارت: سادگی۔

مولوی مظفر: شادی شدہ ہیں یا چھڑے دم؟

بشارت: جی۔ غیر شادی شادہ ہوں۔

مولوی مظفر: پھر آپ اتنی ساری تنخواہ کا کیا کام کریں گے؟ یتیم خانے کو ماہوار کتنا چندہ دیں

گے؟

تحصیلدار: آپ نے شاعری کب شروع کی؟ اپنا پہلا شعر سنائیے۔

بشارت: ہے انتظار دید میں لاشہ اچھل رہا

حالانکہ کوئے یار ابھی اتنی دور ہے

تحصیلدار: واہ وا! ”حالانکہ“ کا جواب نہیں۔ واللہ! اوسر افتادہ زمین میں ”لاشہ“ نے جان

ڈال دی۔ اور ”اتنی دور“ میں کچھ نہ کہہ کر کتنا کچھ کہہ دیا۔

مولوی مجن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ سبب؟ کچھ عرصے پہلے مولوی مجن نے حساب کے پتھر کی سیوہ بہن

سے دوسری شادی رچائی تھی اور سالے کی تنخواہ میں چار روپے کا اضافہ کیا تھا، جس سے ان سینئر میجروں کی بڑی حق

تلافی ہوئی تھی جن کی کوئی سیوہ بہن نہیں تھی۔ قصبے میں ان کے بچہ صغیرہ و کبیرہ اور سالے کی ترقی کے بڑے چہرے

تھے۔ لیکن سالہا چار روپے سے مطمئن نہیں تھا۔ ہر وقت شاکی ہی رہتا اور بار بار طعنے دیتا تھا۔

ہم سے کب پیار ہے، ہمیشہ تمہیں پیاری ہے

بشارت: آداب بجالاتا ہوں۔
تحصیلدار: چھوٹی بحر میں کیا قیامت شعر نکالا ہے۔ شعر میں کفایت الفاظ کے علاوہ خست خیال بھی پائی جاتی ہے۔

بشارت: آداب!
تحصیلدار: (کتا بھونکنے لگتا ہے) معاف کیجیے، میں آپ کے کتے کے بھونکنے میں مغل ہو رہا ہوں۔ یہ بتائیے کہ زندگی میں آپ کی کیا ambition ہے؟

بشارت: یہ ملازمت مل جائے۔
تحصیلدار: تو سمجھیے مل گئی۔ کل صبح اپنا اسباب، برتن بھانڈے لے آئیے گا۔ ساڑھے گیارہ بجے مجھے آپ کی Joining Report مل جانی چاہیے۔ تنخواہ آپ کی چالیس روپے ماہوار ہوگی۔

مولوی مظفر چنیتے اور بیہوش ہوتے ہی رہ گئے کہ سنیے تو! گریڈ پیچیس روپے کا ہے۔ تحصیلدار نے انہیں جھڑک کر خاموش کر دیا۔ اور فائل پر انگریزی میں یہ نوٹ لکھا کہ اس امیدوار میں وہ تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی بھی لائق اور ambitious نوجوان کو ایک کامیاب پٹواری یا کلاس ٹیچر بنا سکتے ہیں، بشرطیکہ مناسب نگرانی اور رہنمائی میسر آجائے۔ عدیم الفرستی کے باوجود میں اسے اپنا کچھ وقت اور توجہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ابتدا میں نے اسے ۱۰۰ میں سے ۸۰ نمبر دیے تھے، مگر بعد میں پانچ نمبر خوش خطی کے بڑھائے۔ لیکن پانچ نمبر شاعری کے کاٹے پڑے۔

خواص مولیٰ اور اچھا سانام

بشارت نے دوپہر کا کھانا یتیم خانے کے بجائے مولوی بادل (عباد اللہ) کے ہاں کھایا جو اسی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ مکھن سے چڑھی ہوئی گرم روٹی کے ساتھ آلو کا بھرتا اور لہسن کی چٹنی مزہ دے گئی۔ مولوی بادل نے اپنی شفقت اور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ برخوردار! میں تمہیں کھوتے کور فو کرنا، آغا گوندھنا اور ہر طرح کا سالن پکانا سکھا دوں گا۔ بندہ! بیوی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔ سردست انہوں نے مولیٰ کی بھیجیا بنانے کی جو ترکیب بتائی وہ خاصی پیچیدہ اور پُر خطر تھی۔ اس لیے کہ اس کی ابتدا مولیٰ کے کھیت میں پو پھٹنے سے پہلے جانے سے ہوتی تھی۔ انہوں نے ہدایت کی کہ دیہات کے آداب کے خلاف، لہلہاتے کھیت میں

علی الصبح منہ اٹھائے نہ گھس جاؤ بلکہ مینڈ پر پہلے اس طرح کھانسو کھنکھارو جیسے بے کواڑیا ٹاٹ کے پردے والے بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے کھنکھارتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہدایت کہ ٹخنے سے ایک بالشت اونچا لہٹکا اور ہنسل سے دوبالشت نیچی چولی پہننے والی کھیت کی مالکن دھاپاں سے تازہ گدرائی ہوئی مولیٰ کا محل وقوع اور اسے توڑنے کی اجازت کس طرح لی جائے کہ منظر دیدنی پر نہ پڑے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ چمکاڈر سبزیاں مقوی اور کاسر ریلح ہوتی ہیں۔ اس سے ان کی مراد وہ پودے تھے جو اپنے پیر آسمان کی طرف کئے رہتے ہیں، مثلاً کاجر، گوبھی، شلغم۔ پھر انہوں نے پتے دیکھ کر یہ پہچانتا بتایا کہ کون سی مولیٰ کھاری، پھپھس ٹھکے گی اور کون سی جڑیلی اور چھیل۔ ایسی تیزابی کہ کھانے والا کھاتے وقت منہ پیٹ لے اور کھانے کے بعد پیٹ پیٹتا پھرے۔ اور کوئی ایسی سڈول، چکنی اور میٹھی کہ بے تحاشا جی چاہے کہ کاش گز بھر کی ہوتی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کبھی غلطی سے تیزابی مولیٰ اکھاڑ لو تو پھینکومت۔ اس کا عرق کھال کے اونٹ کی کھال کی کپٹی میں محفوظ کر لو۔ چالیس دن بعد جہاں وادیا ایکڑ یا دوہاں پھر ہری سے لگاؤ۔ اللہ نے چاہا تو جلد ایسی نکل آئے گی جیسے نوزائیدہ بچے کی! کچھ عرصے بعد جیسے ہی بشارت نے اپنے ماموں کے ایکڑ یا کی پُھنسیوں پر اس عرق کی پھر ہری پھیری تو بزرگوار بالکل نوزائیدہ بچے کی طرح چچین مارنے لگے۔

بشارت انٹرویو سے فارغ ہو کر برادر و شاد کام محلے تو کتنا ان کے ساتھ تھی تھا۔ انہوں نے حلوائی سے تین پوریاں اور ربڑی خرید کر اسے کھلائی۔ وہ ان کے ساتھ لگا لگا مولوی بادل کے ہاں بھی گیا۔ انٹرویو میں آج جو معجزہ ان کے ساتھ ہوا، اسے انہوں نے اسی کے دم قدم کا ظہور سمجھا۔ کانپور واپس جانے کے لیے وہ لاری میں سوار ہونے آئے تو وہ ان سے پہلے پھلانگ لگا کر اس میں گھس گیا جس سے مسافروں میں کھلبلی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ کلینر اسے انجن اسٹارٹ کرنے والے پینڈل سے مارنے کو دوڑا تو انہوں نے لپک کر اس کی کلائی مروڈی۔ کتا لاری کی چھت پر کھڑا ان کے ہمراہ کانپور آیا۔ ایسے باوفا کہتے کو کتنا کہتے ہوئے اب انہیں جاب محسوس ہونے لگا۔ انہوں نے اسی وقت اس کا نام بدل کر لارڈولز لی رکھا جو اس جنرل کا نام تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے ٹیپو نے جام شہادت نوش کیا تھا۔

کانپور پہنچ کر انہوں نے پہلی مرتبہ اس پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ کتے کا جسم استا گرم ہوتا ہے۔ اس پر جا بجا لڑکوں کے پتھروں سے پڑے ہوئے زخموں کے نشان تھے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک خوبصورت کالر اور زنجیر خریدی۔

۴

بحضور فیض گنجپور تحصیلدار صاحب بہادر

دوسرے دن بشارت اپنی ساری کائنات ٹین کے ٹرنک میں سمیٹ کر دحیرج گنج آ گئے۔ ٹرنک پر انہوں نے ایک پینٹر کو چار آنے دے کر اپنا نام، ڈگری اور تخلص سفیدے سے پینٹ کروائے تھے جو بمشکل دو سطروں میں سما پائے۔ یہ ٹرنک ان کی پیدائش سے پہلے کا تھا، مگر اس میں چار لیور والا نیا ہیٹلی تالا ڈال کر لائے تھے۔ اس میں کپڑے اتنے کم تھے کہ راستے بھر اندر رکھا ہوا مراد آبادی لوٹا ڈھولک بجاتا آیا۔ اتنا شور مچانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے اثاث البیت میں یہ تازہ قلعی شدہ لوٹا ہی سب سے قیمتی شے تھی۔ ابھی انہوں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا کہ تحصیلدار کا چپراسی ایک لٹھ اور یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ تحصیلدار صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔ انہوں نے پوچھا، ابھی؟ بولا، اور کیا؟ فوراً سے پیشتر! بالموافقہ، اصلتاً۔ چپراسی کے منہ سے یہ منشیانہ زبان سُن کر انہیں حیرت ہوئی اور خوشی بھی، جو اس وقت ختم ہوئی جب اس نے یہ پیغام لانے کا انعام، دوپہر کا محضر اور زاوراہ اسی زبان میں طلب کیا۔ کہنے لگا، تحصیل ہذا میں یہی دستور ہے۔ بندہ تو اجورہ دار* ہے۔ جتنی دیر وہ ان مطالبات پر غور کریں، وہ اپنے لٹھ کی چاندی کی شام کو منہ کی بھاپ اور انگوچھے سے رگڑ رگڑ کر چمکاتا رہا۔

جُھلستی جُھلساتی دوپہر میں بشارت ڈیڑھ دو میل پیدل چل کر ہانپتے کانپتے تحصیلدار کے ہاں پہنچے تو وہ قبولہ کر رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد اندر بلائے گئے تو خس کی ٹٹی کی مہکیلی ٹھنڈک جسم میں اترتی چلی گئی۔ لُوسے جُھلسی ہوئی آنکھوں میں ایک دم ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سی آگئی۔ اوپر چھت میں لٹکا ہوا جمالہ دار پنکھا ہاتھی کے کان کی طرح ہل رہا تھا۔ فرش پر بچھی چاندنی کی اُجلی ٹھنڈک ان کی جلتی ہوئی، تھیلی کو بہت اچھی لگی۔ اور جب اس کی حدت سے چاندنی گرم ہو ہو جاتی تو وہ تھیلی کھسکا کر دوسری جگہ رکھ دیتے۔ تحصیلدار بڑے تپاک اور شفقت سے پیش آیا۔ برف میں لگے ہوئے تر بوز کی ایک قاش اور چھلے ہوئے سنگھاڑے پیش کرتے ہوئے بولا، تو اب اپنے کچھ ایسے اشعار سنائیے جو مہمل نہ ہوں، چھوٹی بحر میں نہ ہوں۔

* اجورہ دار: وہ ہر کارہ جس کی اجرت، آمد و رفت اور قیام و طعام کا خرچ اس ماتحت کو برواشت کرنا پڑتا تھا جس کے نام وہ سرکاری احکام لے کر آتا تھا۔ یہ ایک نوع کی سزا ہوتی تھی۔ کچھ علاقوں میں یاد دہانیوں (reminders) کی ترسیل اجورہ دار ہی کے ذریعہ ہوتی تھی تاکہ آئندہ کو سبق ہو۔

وزن اور تہذیب سے گرنے ہوئے نہ ہوں۔ بشارت اشعار سنا کر داو پاپکے تو اس نے اپنی ایک تازہ نظم ”ماہ و پرفیس ہیں یہ ذرات زمین آج کی رات“ سنائی جو ڈیڑھ کلکڑ کے حالیہ دورہ دھیرج گنج کے موقع پر لکھی تھی۔ نظم بشارت کو پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ ۲۷ تاریخ کو ڈیڑھ کلکڑ صاحب کے سالے کی شادی ہے۔ اسی نمونے کے مطابق ایک پھرکتا ہوا سہرا لکھ کر مجھے دکھائیے۔ (آنکھ مارتے ہوئے) بحر وہی اپنی ”مناجات بیوہ“ والی ٹھیک رہے گی۔

حق بحق تحصیلدار رسید

وہ اپنی ران کھجائے چلا جا رہا تھا۔ ٹانگوں پر منڈھے ہوئے چوڑی دار پاجامے میں نہ جانے کیسے ایک بھنگا کس گیا تھا۔ اور وہ اوپر ہی اوپر چٹکی سے مسلنے کی بار بار کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک خوش شکل نو عمر خادمہ ناز و تازہ توڑے ہوئے فالسوں کا شربت لائی۔ تحصیلدار کنکھیوں سے برابر بشارت کو دیکھتا رہا کہ وہ ناز کو دیکھ رہے ہیں یا نہیں۔ موٹی ململ کے سفید کرتے میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ مکلاس دینے کے لیے جھکی تو اس کے بدن سے جوان پسینہ کی مہکار آئی۔ اور ان کا ہاتھ اس کے چاندی کے بٹنوں کے گھنکر وٹوں کو چھو گیا۔ اس کا آڑا پاجامہ رانوں پر سے کسا ہوا تھا اور پیوند کے ٹانگے دو ایک جگہ اتنے بکسے ہوئے تھے کہ نیچے چنبیلی بدن کھلکھلا رہا تھا۔ شربت پی چکے تو تحصیلدار کہنے لگا کہ آج تو خیر آپ تھکے ہوئے ہوں گے، کل سے میرے بچوں کو اردو پڑھانے آئیے۔ ذرا کھنڈرے ہیں۔ تیسرے نے تو ابھی قاعدہ شروع ہی کیا ہے۔ بشارت نے کچھ پس و پیش کیا تو یکجہت اس کے تیور بدل گئے۔ لہجہ کڑا اور کڑوا ہوتا چلا گیا۔ کہنے لگا۔ جیسا کہ آپ کو بخوبی معلوم تھا، ہے اور ہو جائے گا، آپکی اصل تنخواہ پچیس روپے ہی ہے۔ میں نے جو پندرہ روپے از خود بڑھا کے چالیس کر دیے تو وہ درحقیقت پانچ روپے فی پچہ بیوشن تھی۔ ورنہ میرا دماغ تھوڑا ہی خراب ہوا تھا کہ کالج سے نکلے ہوئے الل بچھیرے کو مسلمانوں کی کاڑھی کمائی کے چندے سے پندرہ روپے کی نذر گزارتا۔ آخر کو ٹرسٹی کی کچھ ذمے داری ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ چالیس روپے ہے! اور وہ تو بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیک) سیکنڈ ڈویژن ہے۔ اوروہ کا ہے۔ مگر نہایت شریف۔ سید ہے۔ علاوہ انیس، سرمنڈوا کے عشقیہ شعر نہیں کہتا۔

آخری سات لفظوں میں اس نے ان کی شخصیت کا خلاصہ نکال کے رکھ دیا۔ اور وہ ڈھے گئے۔ انہوں نے بڑی لجاجت سے پوچھا، کیا کوئی alternative بندوبست نہیں ہو سکتا؟

تحصیلدار چڑاؤنی ہنسی ہنسا۔ کہنے لگا، ضرور ہو سکتا ہے۔ وہ آئٹرنیٹیو بند و بست یہ ہے کہ آپ کی تنخواہ وہی پچیس روپے رہے، اور اسی میں آپ میرے بچوں کو بھی پڑھائیں گے۔ آیا خیال شریف میں؟ بر خور دار! ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی۔ میں آپ کے ہاتھ میں دو کبوتر دیتا ہوں۔ آپ یہ تک تو بتا نہیں سکتے کہ مادہ کون سی ہے!

ان کے جی میں تو بہت آئی کہ پلٹ کر جواب دے کہ کولمبس صاحب! اگر اسی ڈسکوری کا نام دنیا دیکھنا ہے تو یہ کام تو کبوتر کہیں بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے! اتنے میں تحصیلدار دو تین دفعہ زور زور سے کھانسا اور ہال میں دور ایک کونے میں دبا کر د اور قانون گو لیک کر بشارت کے پاس آیا اور ان کی ٹھڈی میں ہاتھ دیتے ہوئے کہنے لگا، آپ سرکار کے سامنے کیسی چمکانی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ عزت کسے نصیب ہوتی ہے۔ سرکار جھوٹوں بھی اشارہ کر دے تو لکھنؤ یونیورسٹی کے سارے پروفیسر ہاتھ باندھے سر کے بل چل کے آئیں۔ سرکار کو تین دفعہ ڈپٹی کلکٹری آفر ہو چکی ہے، مگر سرکار نے ہر دفعہ پائے حقارت سے ٹھکرا دی کہ میں خود غرضی پر اتر آؤں اور ڈپٹی کلکٹر بن کر چلا جاؤں تو تحصیل دھیرج گنج کا عملہ اور رعایا کہے گی، سرکار! ہمیں بیچ منجہ دار میں کس پہ چھوڑے جاتے ہو؟

بشارت دم بخود رہ گئے۔ مرد ایسے موقعوں پر خون کر دیتے ہیں اور نامرد خود کشی۔ انہوں نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ نوکری کی، جو قتل اور خود کشی دونوں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

تحصیلدار نے زنانے سے اپنے صاحبزادگان کو بلوایا اور ان سے کہا، چچا جان کو آداب کرو۔ یہ کل سے تمہیں پڑھانے آئیں گے۔ بڑے اور چھوٹے لڑکے نے آداب کیا۔ منجھلے نے داعیں ہاتھ سے اوک بنایا اور جھک جھک کے دو دفعہ آداب کرنے کے بعد جب تیسری دفعہ رکوع میں گیا تو ساتھ ہی منہ بھی چڑایا۔

اب تحصیلدار کا موڈ بدل چکا تھا۔ لڑکے قطار بنا کر واپس چلے گئے تو وہ بشارت سے کہنے لگا ”پرسوں جغرافیہ ٹیچر کی اسامی کے لئے انٹرویو ہیں۔ میں آپ کو سلیکشن کمیٹی کا ممبر نامزد کرتا ہوں۔ دینیات کا ٹیچر اس لائق نہیں کہ کمیٹی کا ممبر رہے۔ مولیٰ جتن کو مطلع کر دیا جائے گا۔“ یہ سنتے ہی بشارت کے گد گدیاں ہونے لگیں۔ اس وقت کوئی انہیں وائسرائے بنا دیتا تب بھی

اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اب وہ بھی انٹرویو میں اچھے اچھوں کو خوب رگیدیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ میاں، تم ڈگریاں بغل میں دبائے افلاطون بنے پھرتے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ دنیا گول کیوں بنائی گئی ہے؟ بڑا مزہ آئے گا۔ یہ عزت کس کو نصیب ہوتی ہے کہ خود بلا وجہ ذلیل ہونے کے فوراً بعد دوسروں کو بلا وجہ ذلیل کر کے حساب برابر کر دے۔ ان کی گھائل انا کے سارے گھاؤ پل بھر میں بھر گئے۔

مارے خوشی کے وہ یہ وضاحت کرنی بھول گئے کہ بندہ ہر انٹرویو کے بعد نہ آواز لگائے گا، نہ گھنٹہ بجائے گا۔ چلنے لگے تو تحصیلدار نے گرد آور قانون کو کو آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا اور اس نے پندرہ سیر گندم اور ایک ہانڈی پیسوسی کی ساتھ کر دی۔ اسے یہ بھی بہایت کر دی کہ کل اتالیق صاحب کے گھر جو اسے کی ایک گاڑی ڈلوادینا۔ اور یہ کار میں کسی پنی گر کو بھیج دینا کہ ہاتھوں ہاتھ ٹٹنی پنا دے۔ اس زمانے میں جو لوگ خُس کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ جو اسے کے کانٹوں کی ٹٹنی پر اکٹفا کرتے تھے۔ اور جو اس قابل بھی نہ ہوتے وہ خُس کی پنکھیا پر کوری ٹھلیا کا پانی چھڑک لیتے۔ اسے جھلتے جھلتے جب نیند کا جھوٹا آنا تو خُس خانہ و بر قاب کی خوابناک خنکیوں میں اترتے چلے جاتے۔

۵

اردو پیچر کے فرائض غیر منصبی

اسکے دن علی الصبح بشارت اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ مولوی مظفر نے ان سے تحریر چارج رپورٹ لی کہ آج صبح فدوی نے باضابطہ چارج سنبھال لیا۔ ”چارج“ بہت جامع اور دھوکے میں ڈالنے والا لفظ ہے، ورنہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ جو چیزیں ان کے چارج میں دی گئیں وہ بغیر چارج کے بھی کچھ ایسی غیر محفوظ نہ تھیں:

کھادی کا ڈسٹر (ڈسٹر عدد) مہرودہ (دستی پنکھا - ۱ عدد) رجسٹر حاضری (۱ عدد) سفالی مٹی کی دوات (۲ عدد) -

مولوی مظفر نے بلیک بورڈ کا ڈسٹر ان کی تحویل میں دیتے ہوئے تنبیہ کی تھی کہ دیکھا گیا ہے کہ ماسٹر صاحبان چاک کے معاملے میں بہت فصول خرچی کرتے ہیں۔ لہذا مجلس منتظمہ نے

فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماسٹر صاحبان چاک خود خرید کر لائیں گے۔ کھجور کے پنکھے کے بارے میں بھی انہوں نے مطلع کیا کہ گرمیوں میں ایک مہیا کیا جائے گا۔ ماسٹر بالکل لاپرواہ واقع ہوئے ہیں۔ دو ہفتے میں ہی ساری بنائی اُدھڑ کے جھوترے ٹکل آتے ہیں۔ نیز، اکثر ماسٹر صاحبان چھٹی کے دن اسکول کا پنکھا گھر میں استعمال کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ بعضے کاہل الوجود بھی ہیں۔ اسی کی ڈنڈی سے لونڈوں کو مارتے ہیں۔ حالانکہ دو قدم پر نیم کا درخت بیکار کھڑا ہے۔ اور ہاں مولوی مظفر نے ایک چوبی ہولڈر بھی ان کی تحویل میں دیا جو ان کے پیشروؤں نے غالباً مسواک کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کا بالائی حصہ عالم فکر میں مسلسل دانتوں تلے رہنے کے باعث جھڑ گیا تھا۔ بشارت کو اس بے جا استعمال پر بہت غصہ آیا، اس لیے کہ اب وہ اس سے کمر بند نہیں ڈال سکتے تھے۔

چارج مکمل ہونے کے بعد بشارت نے کورس کی کتابیں مانگیں تو مولوی مظفر نے مطلع کیا کہ مجلس منتظمہ کے ریزولوشن نمبر ۵، مجریہ ۳ فروری ۱۹۳۵ کی رُو سے ماسٹر کو کورس کی کتابیں اپنی جیب سے خرید کر لانی ہوں گی۔ بشارت نے جل کر پوچھا ”سب؟ یعنی کہ پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک؟“ فرمایا ”تو کیا آپ کا خیال ہے کہ پہلی جماعت کے قاعدے سے آپ ڈل کا امتحان دلوادیں گے؟“

مولوی مظفر نے چلتے چلتے یہ اطلاع بھی دی کہ مجلس منتظمہ بیجا اخراجات کم کرنے کی غرض سے ڈرل ماسٹر کی پوسٹ ختم کر رہی ہے۔ ”خالی گھنٹوں میں آپ پڑے پڑے کیا کریں گے؟ اسٹاف روم ٹھالی ماسٹروں کے اینڈ نے اور لوٹیں لکانے کے لیے نہیں ہے۔ خالی گھنٹوں میں ڈرل کر ادیا کیجیے۔ (پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بادی بھی چھٹ جائے گی۔ جو ان آدمی کو چاق چوند رہنا چاہیے۔“ بشارت نے کھر درے اختصار سے جواب دیا ”مجھے ڈرل نہیں آتی۔“ بہت شفیق اور شیریں لہجے میں جواب دیا ”کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی بھی ماں کے پیٹ سے ڈرل کرتا ہوا پیدا نہیں ہوتا۔ کسی بھی طالب علم سے کہیے۔ سکھا دے گا۔ آپ تو ماشاء اللہ سے ذہین آدمی ہیں۔ بہت جلد سیکھ جائیں گے۔ آپ ٹیپو سلطان اور طارق، فاتح اندلس کے نام لیوا ہیں۔“

بشارت بڑی محنت اور لگن سے لڑکوں کو اردو پڑھا رہے تھے کہ دو ڈھائی ہفتے بعد مولوی مظفر نے اپنے دفتر میں طلب کیا اور فرمایا کہ آپ الحمد للہ مسلمان کے فرزند ہیں، جیسا کہ آپ نے درخواست میں لکھا تھا۔ اب جلد از جلد نماز جنازہ اور نیاز دینا سیکھ لیجیے۔ کور دیہ ہے۔ وقت بے

وقت ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ نماز جنازہ تو کورس میں بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو مکتب میں غسلِ میت بھی لکپل سری تھا۔ دینیات کے ٹیچر کی بیوی پر بارہ ہنگی میں جن دوبارہ سوار ہو گیا ہے۔ اماوس کی راتوں میں چارپائی الٹ دیتا ہے۔ اسے اتارنے جا رہا ہے۔ پچھلے سال ایک پڑوسی کا جبرٹا اور دو دانت توڑ کے آیا تھا۔ اس کی جگہ آپ کو کام کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے اس حرام خور کی عوضی کرنے آسمان سے فرشتے تو اترنے سے رہے۔

تین چار دن کا بھلاو اوسے کر مولوی مظفر نے پوچھا، بر خوردار آپ اتوار کو کیا کرتے رہتے ہیں؟ بشارت نے جواب دیا، کچھ نہیں۔ فرمایا، تو یوں کہیے فقط سانس لیتے رہتے ہیں۔ یہ تو بڑی معیوب بات ہے۔ سر محمد اقبال نے فرمایا ہے، کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ جوان آدمی کو اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ جمعہ کو اسکول کی جلدی چٹھی ہو جاتی ہے۔ بعد نماز جمعہ یتیم خانے کی خط و کتابت دیکھ لیا کیجیے۔ آپ تو گھر کے آدمی ہیں۔ آپ سے کیا پردہ؟ آپ کی تنخواہیں دراصل یتیم خانے کے چندے ہی سے دی جاتی ہیں۔ تین مہینے سے لگی ہوئی ہیں۔ میرے پاس الدین کا چراغ تو ہے نہیں۔ دراصل یتیموں پر اتنا خرچ نہیں آتا جتنا آپ حضرات پر! اتوار کو یتیم خانے کے چندے کے لیے اپنی سائیکل لے کر محل جایا کیجئے۔ کار خیر بھی ہے۔ اور آپ کو بیکاری کی لعنت سے نجات مل جائے گی سوا لگ۔ آس پاس کے دیہات میں الحمد للہ مسلمانوں کے کافی گھر ہیں۔ تلاش کرنے سے خدا مل جاتا ہے، معطی کس کھیت کی کاجر مولیٰ ہیں۔

بشارت ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ”معطی“ کو کیسے تلاش اور شناخت کر س گے کہ اتنے میں سر پر دوسرا بم گرا۔ مولوی مظفر نے کہا کہ چندے کے علاوہ گرد و نواح کے دیہات سے موزوں یتیم بھی تلاش کر کے لانے ہوں گے!

آئیڈیل یتیم کا حلیہ

یتیم جمع کرنا بشارت کو چندہ جمع کرنے سے بھی زیادہ دشوار نظر آیا۔ اس لیے کہ مولیٰ جن نے یہ سچ لکھا دی کہ یتیم تندرست، مسنڈے نہ ہوں۔ صورت سے بھی مسکین معلوم ہونے چاہئیں۔ خوش خوراک نہ ہوں۔ نہ اتنے چھوٹے ٹوئیاں کہ چونچ میں چو کا دینا پڑے۔ نہ اتنے ڈھوکے ڈھو اور پیٹو کہ روٹیوں کی تھئی کی تھئی ٹھوہر جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ پر ایسے نگہ بندن بھی نہ ہوں کہ کال پہ ایک مچھر کا سایہ بھی پڑ جائے تو شہزادہ کلفام کو ملیں یا ہو جائے۔ پھر

بجائے دودھ پلاؤ تو ایک ہی سانس میں بالٹی کی بالٹی ڈکوس جائیں۔ بعضا بعضا لونڈا گھٹنے تک پولا ہوتا ہے۔ لڑکے باہر سے لاغرمگر اندر سے بالکل تندرست ہونے چاہئیں۔ نہ ایسے نازک کہ پانی بھرنے کنوئیں پہ بھیجو تو ڈول کے ساتھ یوسف بے کارواں خود بھی کچھے کچھے کنوئیں کے اندر چلے جا رہے ہیں۔ بھرا کھڑا سر پہ رکھتے ہی کتھکوں نچنیوں کی طرح کمر لچکا رہے ہیں۔ روز ایک گھڑا توڑ رہے ہیں۔ جب دیکھو حرام کے جنے ثبوت میں ٹوٹے گھڑے کا منہ لیے چلے آ رہے ہیں۔ اے مجھے کیا دکھا رہا ہے؟ یہ ہنسلی اپنی میا بہنا کو پہنا۔ میا نہ قد اور درمیانہ عمر کے ہوں۔ اتنے بڑے اور ڈھیٹ نہ ہوں کہ تھپڑ مارو تو ہاتھ گھٹنے بھر تک جھنجھٹاتا رہے اور ان حرامیوں کا کمال بھی بیگانہ ہو۔ جاڑے میں زیادہ جاڑا نہ لگتا ہو۔ یہ نہیں کہ ذرا سی سردی بڑھ جائے تو سارے قصبے میں کانپتے، کپکپاتے، ککھٹاتے پھر رہے ہیں اور یتیم خانے کو مفت میں بدنام کر رہے ہیں۔ اور ہاں یہ ضرور تصدیق کر لیں کہ رات کو بستر میں پیشاب نہ کرتے ہوں۔ خاندان میں فی اور سر میں لیکھیں نہ ہوں۔ اٹھان کے بارے میں مولیٰ مجن نے وضاحت کی کہ وہ اتنی معتدل بلکہ مفقود ہو کہ ہر سال جوتے اور کپڑے تنگ نہ ہوں۔ اندھے، کانے، لولے، لنگڑے، گونگے، بہرے نہ ہوں، مگر لگتے ہوں۔ لونڈے خوش شکل ہرگز نہ ہوں۔ منہ پہ مہاسے اور ناک لمبی نہ ہو۔ ایسے لونڈے آگے چل کر لوطی مکتے ہیں۔ وہ آئیڈیل یتیم کا خلیہ بیان کرنے لگے تو بار بار بشارت کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے آرٹسٹ پور ٹریٹ بناتے وقت ماڈل کا چہرہ دیکھ دیکھ کر کینوس پر آؤٹ لائن بناتا ہے۔ وہ بولتے رہے، لیکن بشارت کا دھیان کہیں اور تھا۔ ان کے ذہن میں ایک سے ایک منحوس تصویر ابھر رہی تھی۔ بلکہ tableau کہنا چاہیے، جس میں وہ خود کو کسی طرح فٹ نہیں کر پار رہے تھے۔

مثنوی مولانا روم اور یتیم خانے کا بینڈ

پہلا منظر: ٹرین کا کارڈ ہری جھنڈی ہاتھ میں لیے سیٹی بجا رہا ہے۔ چھ سات لڑکے لپک کر چلتی ٹرین کے تھرڈ کلاس کپارٹمنٹ میں چڑھتے ہیں، جس سے ابھی ابھی ایک سرمہ اور سلامیت بیچنے والا اُترا ہے۔ سب نیکر پہنے ہوئے ہیں۔ صرف ایک لڑکے کی قمیص کے بٹن سلامت ہیں، لیکن آپس کی لڑائی میں حریف اس کی داہنی آستین جڑ سے نوچ کر لے گیا۔ کسی کے پیر میں جوتا نہیں، لیکن ٹوپی سب پہنے ہوئے ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں بڑا سا فریم ہے۔ جس میں ضلع کے ایک گنگنام لیڈر کا سر ٹیگٹ جڑا ہوا ہے۔ کپارٹمنٹ میں کھتے ہی لڑکوں نے کہنیوں اور دھکوں سے اپنی جگہ بنالی۔ جیسے ہی ٹرین سگنل سے آگے بھکی، سب

سے بڑے لڑکے نے ریز مکاری سے بھرا ہوا ٹین کا گولک جھنجھنے کی طرح بجانا شروع کیا۔ ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ ماؤں کی گود میں روتے ہوئے بچے سہم کر دودھ پینے لگے اور دودھ پیتے ہوئے بچے دودھ چھوڑ کر رونے لگے۔ مردوں نے سامنے بیٹھی عورت کو گھورنا اور اس کے میاں نے اونگھنا چھوڑ دیا۔ جب سب مسافر اپنا اپنا مشغل روک کر لڑکے کی طرف متوجہ ہو گئے تو اس نے اپنا گولک راگ بند کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اپنے منہ آسمان کی طرف کر لئے اور آسمانی طاقتوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کے ثبوت میں سب نے ایک ساتھ آنکھوں کی پتلیاں اتنی اوپر چڑھا لیں کہ صرف سفیدی دکھائی دینے لگی۔ پھر سب مل کر انتہائی منحوس لے میں کورس میں گمانے لگے:

ہماری بھی فریاد سن لیجیے
ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں یتیم خانے کے جو لڑکے داخل ہوئے ان سب کی آواز سن پھٹ کر کبھی کی بالغ ہو چکی تھیں۔ صرف ایک کے کنٹھ نہیں پھوٹے تھے یہی لڑکا چیل جیسی آواز میں کورس کو lead کر رہا تھا۔ اس زمانے میں پشاور سے ٹراونکور اور کلکتے سے کراچی تک ریل میں سفر کرنے والا کوئی مسافر ہو مگر جو اس نحوستوں سے لبریز گمانے اور اس کی خانہ برباد لے سے نا آشنا ہو۔ جب سے برصغیر میں ریل اور یتیم خانے آئے ہیں، یہی ایک دھن چل رہی ہے۔ اسی طرح برصغیر ہند و پاکستان میں کوئی آدم بیزار اور مردم آزار شخص مثنوی مولانا روم کی ایسی اُسطو خُو دُوُس * مولویانہ دھن کمپوز کر گیا ہے کہ پانچ سو سال سے اوپر گزر گئے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ شعر کو اس طرح ناک سے ماکر صرف وہی مولوی پڑھ سکتا ہے جو گمانے کو واقعی حرام سمجھ کر گمانا ہو۔ کسی شخص کو گمانے، تصوف، فارسی اور مولوی، چاروں سے بیک وقت متنفر کرنا ہو تو مثنوی کے دو شعر اس دھن میں سنوادیجیے۔ ”سنادیجیے“ ہم نے اس لیے نہیں کہا کہ یہ لے صرف ایسے شخص کے گلے سے نکل سکتی ہے جس نے زندگی میں کسی ایرانی کو فارسی بولتے نہ سنا ہو اور جس کے گلے سے مفت کی مرغی کے علاوہ کوئی چیز نہ اتری ہو۔

* اُسطو خُو دُوُس: اس کے لغوی معنی تو ظاہر ہے کچھ اور ہیں۔ مرزا یہ لفظ اس کی صوتیاتی نحوست اور کٹھن پن کے سبب اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔ جس مفہوم کو یہاں ادا کرنا مقصود ہے وہ کسی اور لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ یقین نہ آئے تو آپ اس کی جگہ کوئی اور لفظ بڑھ کر دیکھ لیں۔ ویسے لغت میں اس کے معنی ہیں: نزلے اور پاگل پن کی ایک دوا جسے اطباء دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں!

دوسرا منظر: یتیم خانے کا بینڈ بچ رہا ہے۔ آگے آگے سر کو دائیں بائیں جھلاتا بینڈ ماسٹر چل رہا ہے۔ جس طرح پہلوان، فوج کے جوان اور بے کہی لڑکیاں سینہ نکال کے چلتی ہیں، اسی طرح یہ پیٹ نکال کے چل رہا ہے۔ کچھ لڑکوں کے ہاتھ میں پیتل کے بھونپو نما ہابے ہیں جو جلیبی اور Angry Young Men کی طرح پیچ و تاب کھانے کے بالآخر بڑی آنت کی شکل میں اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ یوں تو ان باجوں کی ٹوٹی لڑکوں نے اپنے ہونٹوں سے لکار کھی ہے، لیکن انہیں پھونکنے، دھونکنے کا غریبوں میں دم در دکھاں۔ لہذا بیشتر وقت ڈھول اور بانسری ہی بکتی رہتی ہے۔ بعض اوقات بانسری کی بھی سانس اکڑ جاتی ہے اور تنہا ڈھول سارے آرکسٹرا کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ایسا بینڈ باجا تو خدا دشمن کی شادی میں بھی نہ بجوائے۔ بینڈ کی اُجاڑ دھن بھی بڑے صغیر کے طول و عرض میں ایک ہی تھی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے بینڈ میں چند دلچسپ فرق تھے۔ مثلاً یہی کہ مسلمان بالعموم میجرے نہیں بجاتے تھے۔ اور ہندوؤں کے اناتھ آشرم کے بینڈ میں ڈھول بجانے والا اتنی مستی سے گھوم گھوم کے ڈھول نہیں پیٹتا تھا کہ ترکی ٹوپی کا پھندا ہر ضرب پر ۳۶۰ ڈگری کا چکر لگائے۔ ہندو یتیم لڑکے پھندا نے کے بجائے اپنی اصلی چوٹیاں استعمال کرتے تھے۔ دوم، ہندوؤں میں یہ بینڈ صرف اناتھ آشرم کے یتیم بجاتے تھے۔ مسلمانوں میں یتیم ہونے کی شرط نہیں تھی۔ چنانچہ کراچی کے بعض اسکولوں میں ہم نے اسکول بینڈ کو اسپورٹس ڈسے پر marching songs بھی اسی دھن میں بجاتے سنا ہے :

ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے، ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے۔

کچھ علاج اس کا، ”شہنشاہِ غزل“! ہے کہ نہیں؟

اس لائن (ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے) کی خوبی یہ ہے کہ اس کے سات الفاظ، چار اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہیں اور یہ چاروں ہی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے بھی / اک روز / ماں باپ / تھے۔ آپ کسی بھی بڑوپر زور دے کر پڑھیں، بے کسی اور غوست کا ایک نیا پرت ابھرے گا۔ حدیہ کہ تنہا ”تھے“ بھی پوری لائن کے تاکید معنی، رُخ اور لہجہ بدل کے رکھ دے گا۔ تھے ے ے ے! ایسے چونکھے مصرعے بڑے بڑے شاعروں کو نصیب نہیں ہوتے۔ البتہ مہدی حسن اپنی کائی کی سے شعر کے جس لفظ کو چاہیں کلیدی بنا دیتے ہیں۔ ان میں جہاں ایک ہزار ایک خوبیاں ہیں وہاں ایک بڑی عادت یہ پڑ گئی ہے کہ اکثر اپنی سخن فہمی کا

ثبوت دینے کے لیے شعر کا کوئی سالفظ جس پر انہیں کلیدی ہونے کا شبہ ہو جائے ، پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ الپ روک کے سامعین کو نوٹس دیتے ہیں کہ اب ذرا جگر تمام کے میٹھو۔ گنجینہ معنی کا طلسم دکھانا ہوں۔ پھر آدھ گھنٹے تک اس لفظ کو جھنجھوڑتے ، بھنبھوڑتے ہیں۔ اسے طرح طرح سے پٹختیاں دے کر ثابت کرتے ہیں کہ سارا مفہوم اس ایک لفظ میں بند ہے۔ باقی تمام الفاظ فقط طبلہ بجانے کے لیے ہیں۔ یعنی صرف شعر کا وزن پورا کرنے اور ٹھیک لگانے کے لیے۔ مقصد یہ جنانا ہوتا ہے کہ میں شعر سمجھ کر ہی نہیں ، سمجھا سمجھا کر کارہا ہوں۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں نے خود سمجھے بغیر ہی سمجھا سمجھا کے گانا شروع کر دیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ مہدی حسن کبھی اس لفظ کو کھدے ڈالتے ہوئے راگ اور غزل کی No-man's-land (نہ تیری نہ میری زمین) میں چھوڑ آتے ہیں۔ اور کبھی کبڈی! کبڈی! کہتے ہوئے اسے اپنے پالے میں لے آتے ہیں۔ پھر فری اسٹائل میں اس کے مختلف حصوں کو اپنی طاقت اور سامعین کی برداشت کی حد تک توڑتے ، مروڑتے اور کھینچتے ہیں۔ وہ بے دم ہو کے ست چھوڑ دے تو اسے پھینچنے لگتے ہیں۔ ابھی ، لمبی سے گنگری کے بعد ، عجیب سامنہ بنائے ، اسے پیپول پیپول کے دیکھ رہے تھے اور اپنی ہی لذت سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ ذرا دیر میں اس کی ہڈی تک چھوڑ کے طبلہ نواز کے سامنے پھینک دی کہ استاد ، اب کچھ دیر بجل بندی ہو جائے۔ کبھی حرفِ سادہ کے راگ انگ جی بھر کے جھنجھوڑنے کے بعد اس کی چھاتی پہ اپنے کڑھے ہوئے ریشمی کرتے ، زنبہن واسکٹ اور ہارمونیم سمیت پڑھ جاتے ہیں۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو چوم چاٹ کے واپس لٹال دیتے ہیں:

چمٹے رہو سینے سے ابھی رات پڑی ہے

اور پھر وہ ساعتِ نایاب بھی آتی ہے جب یہ راگ بھوگی ، اس کے منہ میں اپنی زبان اس طرح رکھ دیتا ہے کہ راگنی چیخ اٹھتی ہے:

تم اپنی زبان مرے منہ میں رکھو ، جیسے ہسپتال سے میری جان کھینچتے ہو

بالآخر گھنٹوں رگیدنے کے بعد اسے تھپڑ مار کے چھوڑ دیتے ہیں کہ ”جا! اب کے چھوڑ دیا۔ آئندہ یاروں کے سامنے اس طرح نہ آئیو۔“

جس کو ہودہ بن و دل عزیز میرے گلے میں آئے کیوں

اچھا! آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں

بشارت کا مقرر تو بحیثیت اردو ٹیچر ہوا تھا، لیکن انہیں ٹیچروں کی کمی کے سبب تقریباً سبھی مضامین پڑھانے پڑتے تھے، سوائے دینیات کے۔ جامع مسجد دھیرج گنج کے پیش امام نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جس شخص کے گھر میں کتا ہو، وہ اگر دینیات پڑھائے تو پڑھنے والوں پر غُسل واجب ہو جاتا ہے! بشارت کی ریاضی، جو میٹری اور انگریزی بہت کمزور تھی، لیکن وہ اس مینڈی کیپ سے ذرا جو پریشان ہوتے ہوں۔ پڑھانے کا گرا انہوں نے اپنے استاد ماسٹر فاخر حسین سے سیکھا تھا۔ ماسٹر فاخر حسین کا اپنا مضمون (بزعم خود) تاریخ تھا۔ لیکن انہیں اکثر ماسٹر مینڈی لال، انگلش ٹیچر کی کلاس بھی لیننی پڑتی تھی۔ ماسٹر مینڈی لال کا گروہ اور گریڈ دونوں جواب دے چکے تھے۔ اکثر دیکھا کہ جس دن نويس دسویں کلاس کی گریڈ کی کلاس ہوتی، وہ گھربھیٹھ جاتا۔ اس کے گردے میں گریڈ کا درواٹھتا تھا۔ سب ٹیچر اپنے مضمون کے علاوہ کوئی اور مضمون پڑھانے سے پکھاتے تھے۔ ماسٹر فاخر حسین واحد استاد تھے جو ہر مضمون پڑھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، حالانکہ انہوں نے بی۔ اے ”وایا بھٹنڈہ“ کیا تھا۔ مطلب یہ کہ پہلے مشی فاضل کیا۔ انگلش گریڈ انہیں بالکل نہیں آتی تھی۔ وہ چاہتے تو انگریزی کا سارا گنٹھ ہنس بول کر یا پنہ و انصاع میں گزار سکتے تھے۔ لیکن ان کا ضمیر ایسی دفع الوقتی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے استادوں کی طرح لڑکوں کو مصروف رکھنے کی غرض سے وہ املا بھی لکھوا سکتے تھے۔ مگر اس حیلے کو وہ اپنے تجربہ علمی اور منصب عالمانہ کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس بھاری پتھر کو سب چوم کر چھوڑ دیتے، اسے یہ گلے میں ڈال کر بحر علوم میں کود پڑتے۔ پہلے گریڈ کی اہمیت پر لیکچر دیتے ہوئے یہ بنیادی نکتہ بیان کرتے کہ ہماری کائی کی بنیاد طبلے پر ہے۔ گفتگو کی بنیاد گھالی پر۔ اسی طرح انگریزی کی اساس گریڈ ہے۔ اگر کمال حاصل کرنا ہے تو پہلے بنیاد مضبوط کرو۔ ماسٹر فاخر حسین کی اپنی انگریزی کی عمارت فن تعمیر کے کمال کا نادر نمونہ اور یکے از ہفت عجائبات عالم تھی۔ مطلب یہ کہ بغیر نیو کی تھی۔ بیشتر جگہ تو چھت بھی نہیں تھی۔ اور جہاں تھی، اسے چمکا ڈر کی طرح اپنے پیروں کی اڑواڑ* سے تھام رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی بھی اردو ہی میں پڑھائی جاتی تھی۔ لہذا کچھ گرتی ہوئی دیواروں کو اردو اشعار کے بر محل پختے تھامے ہوئے تھے۔ بہت ہی مجھے اور کسے ہوئے ماسٹر تھے۔ سخت سے سخت مقام سے آسان گزر جاتے تھے۔ مثلاً parsing کروا رہے ہیں۔ اپنی دانست میں نہایت آسان سوال سے ابتدا کرتے۔ بلیک

ورڈ ٹو go لکھتے اور لڑکوں سے پوچھتے، اچھا بتاؤ یہ کیا ہے؟ ایک لڑکا ہاتھ اٹھا کر جواب دیتا، Simple infinitive۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے فرماتے، بالکل ٹھیک۔ لیکن دیکھتے کہ دوسرا اٹھا ہوا ہاتھ ابھی نہیں گرا۔ اس سے پوچھتے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ وہ کہتا، نہیں سر! noun infinitive ہے! فرماتے، اچھا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ کلاس کا سب سے ذہین لڑکا ابھی تک ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اس سے کہتے، آپ کا سگنل ابھی تک ڈاؤن نہیں ہوا۔ کہیے، کہیے! وہ کہتا یہ Gerundial infinitive ہے جو reflexive verb سے مختلف ہوتا ہے۔ Nesfield گریمر میں لکھا ہے۔ اس مرحلے پر ماسٹر فاخر حسین پر واضح ہو جاتا کہ

گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

لیکن بہت سبج اور نکتہ فہم انداز میں فرماتے، اچھا! تو گویا آپ اس لحاظ سے کہہ رہے ہیں! اتنے میں نظر اس لڑکے کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی جو ایک کانوینٹ سے آیا تھا اور فر فرانگریزی بولتا تھا۔ اس سے پوچھا، Well! Well! Well! اس نے جواب دیا:

Sir! I am afraid, this is an intransitive verb.

فرمایا، اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں! پھر آئی ایم افریڈ کے محاورے سے ناواقفیت کے سبب بڑے مشفقانہ انداز میں پوچھا، عزیز من! اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟

موصوف اکثر فرماتے کہ انسان کو علمی تحقیق و تفتحص کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ خود انہوں نے ساری عمر بارہ دری میں گزاری۔ اب ایسے استاد کہاں سے لائیں جن کی لاعلمی پر بھی پیار آتا تھا۔

ماسٹر فاخر حسین سادہ دِلانِ سلف اور اساتذہ پیشین کی حاضر جوابی کا آخری نمونہ تھے۔ ہر چند کہ ان کا علم مستحضر نہیں تھا، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہ ہو۔

بشارت اکثر کہتے ہیں ”ماسٹر فاخر حسین کا مبلغ علم مجھ جیسے نالائق شاگردوں تک سے پوشیدہ نہ تھا۔ میں زندگی میں بڑے بڑے پروفیسروں اور جید عالموں سے ملا ہوں۔ لیکن مجھے آج بھی چوائس دی جائے تو میں ماسٹر فاخر حسین ہی سے پڑھنا پسند کروں گا۔ صاحب، وہ آدمی تھا۔“ کتاب نہیں، زندگی پڑھاتا تھا۔“

۶

سید سید لوگ کہیں ہیں ، سید کیا تم سا ہو گا؟

اب اس خاکے میں خواری کے مختلف شیڈ اور جزئیات بھرنا ہم آپ کے قیاس و تخیّل پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ ان حالات میں جیسا وقت گزر سکتا تھا، ویسا گزر رہا تھا ۔ دسمبر میں اسکول کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، جس کی اتنے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ مولیٰ مجن کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ استادوں کی پڑھی ہوئی تنخواہوں کی ادائیگی تو درکنار، اس موضوع پر جھوٹ بھی بول سکیں ۔ دسمبر کا مہینہ سالانہ قومی جلسوں، مرغابی کے شکار، بڑے دن پر ”صاحب لوگوں“ کو ڈالیاں بھیجنے، پتنگ اڑانے اور مالِ محرم سے آتش، مجنوں اور کتے کھانے اور ان کے نتائج سے مایوس ہونے کا زمانہ ہوتا تھا۔ ۳۰ نومبر کو مولیٰ مجن نے بشارت کو بلوایا تو وہ یہ سمجھے کہ شاید دستِ خاص سے تجلیے میں تنخواہ دس کے تاکہ اور پیچروں کو کانوں کان خبر نہ ہو ۔ مگر وہ چھوٹتے ہی بولے کہ بر خوردار، آپ اپنے اشعار میں پرانی بہو بیٹیوں کے بارے میں اپنے منصوبوں کا اظہار کرنے کے بجائے قومی جذبہ کیوں نہیں ابھارتے؟ اپنے مولانا حالی پانی پتی* نے کیا کہا ہے ایسی شاعری کے بارے میں؟ (چٹکی بجاتے ہوئے) کیا ہے وہ شعر؟ اماں، وہی سنڈاس والی بات؟

بشارت نے مری مری آواز میں شعر پڑھا:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عقونٹ میں سنڈاس ہے جس سے بہتر

*اپنے مولانا حالی: حالی اور سر سید احمد خاں کو وہ بوجہ اپنے مولانا حالی اور اپنے سر سید کہتے تھے ۔ سر سید کا تلفظ اضافت کے ساتھ یعنی ”سرے سید“ فرماتے ۔ حالی کو تو وہ ایک لحاظ سے اپنا ”مگر ائیں“ سمجھتے، لیکن سر سید کو اپنا ہم پیشہ و ہمسرہ گرا دیتے تھے ۔ اسانہ اور اہل غرض انہیں دھیرج کنج کا سر سید کہتے تو مولیٰ مجن اسے سر سید کے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ۔ سر سید پر انہیں یہ فضیلت بھی حاصل تھی کہ ان کے یعنی سر سید کے کالج فنڈ میں تو ان کی لاپرواہی کے سبب ایک خزانچی نے غبن کر لیا تھا، جب کہ مولیٰ مجن کا کنٹرول استاسخت تھا کہ خود ان کے سوا کسی اور کو غبن کرنے کا سلیقہ و اختیار نہ تھا۔ اور مولانا حالی سے انہوں نے عین دشتے نکالے تھے ۔ اول، حالی بھی انہی کی طرح گلے میں مفلر ڈالے رہتے تھے ۔ دوم، حالی بھی انہی کی طرح اپنے دل میں قوم کا درد رکھتے تھے ۔ سوم، حالی سے ان کا ایک ازار ہندی رشتہ یہ نکلا کہ ان کی پہلی بیوی پانی پت کی تھیں ۔ یہ دعویٰ یوں بھی درست معلوم ہوتا تھا کہ دوسری شادی کے بعد (اہل) خانہ جنگی کے سبب ان کی زندگی پانی پت کا منیدان بن کر رہ گئی تھی، جس میں فتح ہمیشہ ہتھینوں کی ہوتی تھی!

ان کی اہلیہ اور مولانا حالی کی مشترک غلطیاں

شعر سن کر فرمایا ”جزاک اللہ! آپ کے ہاتھ میں اللہ نے شعر گوئی کا ہنر دیا ہے۔ اسے کام میں لائیے۔ سالانہ جلسے کے لیے یتیموں پر ایک زور دار نظم لکھئے۔ مسلم قوم کی بے حسی، سائنس پر مسلمانوں کے احسانات، سرسید کی قربانیاں، سلطنتِ عثمانیہ میں امن چین کا دور دورہ، چندے کی اہمیت، فتح اندلس اور تحصیلدار صاحب کی کارکردگی کا ذکر ہونا چاہیے۔ پہلے مجھے سنا دیجئے گا۔ وقت کم ہے۔“

بشارت نے کہا ”معاف کیجیے۔ میں غزل کا شاعر ہوں۔ غزل میں یہ مضامین نہیں باندھ سکتے۔“

غضب ناک ہو کر بولے ”معاف کیجیے۔ کیا غزل میں صرف پرانی بہو بیٹیاں باندھی جا سکتی ہیں؟ تو پھر سنیے۔ پچھلے سال جوار دو ٹیچر تھا وہ دُسمس اسی بات پہ ہوا۔ وہ بھی آپ کی طرح شاعری کرتا تھا۔ میں نے کہا تقسیمِ انعامات کے جلسے میں بڑے بڑے لوگ آدیس گے۔ ہر معطیٰ اور بڑے آدمی کی آمد پر پانچ منٹ تک یتیم خانے کا مینڈ بکے گا۔ اب ذرا یتیموں کی حالتِ زار اور یتیم خانے کے فوائد اور خدمات پر ایک پھر کتنی ہوئی چیز ہو جائے۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ گا کے پڑھنا۔ عین جلسے والے دن منمنانا ہوا آیا۔ کہنے لگا، بہت سرمار، پر بات نہیں بنی۔ ان دنوں استحضار نہیں ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا بلا ہوتی ہے؟ بولا، طبیعت حاضر نہیں ہے۔ میں نے کہا، اماں، حد ہو گئی۔ گویا اب ہر چیز قناتِ ملازم کی طبیعت کے لیے بھی ایک علیحدہ رجسٹر حاضری رکھنا پڑے گا۔ کہنے لگا، بہت شرمندہ ہوں۔ ایک دوسرے شاعر کی نظم، حسبِ حال، ترنم سے پڑھ دوں گا۔ میں نے کہا، چلو، کوئی بات نہیں۔ وہ بھی چلے گی۔ باپ رے باپ! اس نے توجہ ہی کر دی۔ بھرے جلسے میں اپنے مولانا حالی پانی پتی کی ”مناجاتِ بیوہ“ کے بند کے بند پڑھ ڈالے۔ ڈاؤس پر میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھ سے، کہنی کے ٹھوکے سے، کھنکھار کے، بھتیہرے اشارے کیے کہ بندۂ خدا! اب تو بس کر۔ حد یہ کہ میں نے دائیں کوٹھے پر چنگی لی تو بایاں بھی میری طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ اسکول کی بڑی بچہ ہوئی۔ سب منہ پہ رومال رکھے ہنستے رہے، مگر وہ آسمان کی طرف منہ کر کے رانڈ بیواؤں کی جان کو روتا رہا۔ ایک میراثی نے جس کے ذریعے میں نے رقعے تقسیم کروائے تھے، مجھے بتایا کہ ”مناجاتِ بیوہ“ میں اس بے حیائے دو تین سُر راگ مالکونس کے بھی لگا دیے۔ لوگوں نے دل

میں کہا ہو گا کہ شاید میں مولانا حالی کی آڑ میں ودھوا آشرم یا بیوہ خانہ کھولنے کے لیے زمین ہموار کر رہا ہوں۔ بعد کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا تو کہنے لگا، سب کے دیوان کھنگال ڈالے، یتیموں پر کوئی نظم نہیں ملی۔ ستم یہ کہ میر تقی میر جو خود بچنے میں یتیم ہو گئے تھے، مثنوی در تعریف مادہ سگ اور موہنی نام کی بلی پر تو نظم لکھ گئے، مگر معصوم یتیموں پر پُھوٹے منہ سے ایک مصرع کہہ کے نہ دیا۔ اسی طرح مرزا غالب نے قصیدے لکھے، سہرے لکھے، بیسنی روٹی، ڈومنی اور چھالیا کی طرح میں پے در پے شعر کہے۔ حد یہ کہ دو کوڑی کی سپاری کو ”سرِ پستانِ پر سِزاد“ سے بھڑادیا، مگر یتیمی کے بارے میں کم از کم نسخہ حمیدہ میں تو مجھے ایک شعر بھی نہیں ملا۔ جب ہر دیوان سے مایوس ہو گیا تو اچانک خیال آیا کہ یتیموں اور بیواؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مضمون واحد، مظلومیت مشترک۔ اندر بس حالات، فدوی نے ”مناجات بیوہ“ پڑھ دی۔ شاہکار نظم ہے۔ تین سال سے انٹرنس کے امتحان میں اس پر برابر سوال آرہے ہیں۔ ”چنانچہ اندر بس حالات میں نے بھی فدوی کو اس کے شاہکار اور چولی دامن سمیت کھڑے کھڑے دُسمس کر دیا۔ کچھ دن بعد اس حرام خور نے میرے خلاف انسپکٹر آف اسکولز کو عرضداشت جڑ دی کہ میں مولانا حالی کے کلام کو نفش سمجھتا ہوں! نیز، میں نے اس سے اپنے غسل کے لئے پانچ مرتبہ بالٹی میں پانی منگوایا۔ سراسر جھوٹ بولا۔ میں نے پندرہ بیس دفعہ منگوایا تھا۔ یہ بھی جھوٹ کہ بالٹی میں منگوایا تھا۔ گھڑے میں بھر کے چمکاتا لایا تھا۔ وجہ غسل کے بارے میں بھی رکیک اور حاسدانہ حملے کیے۔ خیر، ایسی سُناری چوٹوں سے تو یاروں کا بال بھی پیکا نہیں ہوتا۔ پر محکمہ تعلیمات نے مجھ سے اب تحریری جواب طلب کیا ہے کہ ”آپ کو مولانا حالی کی مسدس اور مناجات بیوہ پر کیا اعتراض ہے، جب کہ سرکار نے اسے کورس میں بھی داخل کر رکھا ہے۔ ان حصوں کی نشان دہی کیجیے جن کو آپ قابل اعتراض گردانتے ہیں۔“ اب آپ میری نمک پر آگئے ہیں تو اس کا جواب بھی لکھ دیجیے۔ مگر اعتراض ایسے ہونے چاہئیں کہ منہ پھر جائے۔ اٹھائے نہ اٹھیں۔ دو چار غلطیاں زبان کی بھی نکال دیجیے گا۔ آخر کو بانی پت کے تھے۔ پانی پت پن نہیں جاتا۔ میرے گھر میں سے بھی وہیں کی ہیں۔ ان سے گفتگو کر کے آپ پر مولانا کی زبان دانی کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

ڈیڑھی اٹھکی والے لوگ

مولوی مظفر کی خامیاں بالکل آشکارا، مگر خوبیاں محابوں سے پوشیدہ تھیں۔ وہ

بشارت کے اندازے اور اندیشے سے کہیں زیادہ ذہین اور کائیاں ٹکے ۔ ایسے ٹھوٹ جاہل بھی نہیں تھے جیسا کہ ان کے دشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ جہاں دیدہ ، مزاج شناس ، حکام رس ، سخت گیر۔ رہن سہن میں ایک سادگی اور سادگی میں ایک ٹیڑھ ۔ عقد ثانی کے علاوہ کوئی کبیرہ بد پرہیزی ان سے منسوب نہ تھی ۔ کانوں اور قول کے کپٹے ، مگر دھن کے پکے تھے ۔ انہی کا حوصلہ تھا کہ دس بارہ سال سے وسائل کے بغیر لستم پشتم اسکول چلا رہے تھے ۔ اسے چلانے کے لیے ان کے ضابطہ اخلاق میں ہر قسم کی دھاندلی روا تھی ۔ ان کے طریق کار میں عیب بھالنے کے لئے زیادہ ذہین یا عالم الغیب بلکہ عالم العیب ہونے کی شرط نہ تھی کہ وہ بالکل عیاں تھے ، مگر جو کام وہ کر گئے وہ ہر ایک کے بس کا روک نہیں ۔ اکثر فرماتے کہ ”صاحبزادے ، سیدھی انگلیوں کھی نہیں ٹکلتا۔“ مگر ایسے لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ کھی نکال چکنے کے بعد بھی ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہی رہتی ہیں ۔ اور انگلیاں ٹیڑھی رکھنے میں جومزہ انہیں آتا ہے وہ سچ پوچھے تو کھی نکال کر کھانے میں بھی نہیں آتا۔ یہ حضرات التیات کے دوران آشہدُ اَن لاِ اِلٰہِ اِلَّا اللہ پڑھتے وقت اللہ کے وجود اور وحدانیت کی شہادت بھی ٹیڑھی انگلی ہی سے دیتے ہیں!

۷

رانڈ کڑھی

اسکول کی مالی حالت خراب بنائی جاتی تھی ۔ ماسٹروں سے آئے دن دردمندانہ اپیل کی جاتی کہ آپ دل کھول کر چندہ اور عطیات دس تاکہ آپ کو تنخواہیں دی جاسکیں ۔ پانچ چھ مہینے کی ملازمت کے دوران میں انہیں علی الحساب کل ساٹھ روپے ملتے تھے جو اسکول کی اکاؤنٹ کی کتابوں میں ان کے نام بطور قرضِ حسہ دکھائے گئے تھے ۔ اب انہیں تنخواہ کا تقاضا کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا ، اس لیے کہ قرضِ حسہ بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔ ادھر تنخواہ جتنی چڑھتی جاتی ، اتنا ہی مولیٰ تجن کا لہجہ ریشم اور باتیں پچھے دار ہوتی جاتیں ۔ ایک دن بشارت نے دبے الفاظ میں تقاضا کیا تو کہنے لگے ”برخوردار“ میں مثل تمہارے باپ کے ہوں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ، تم اس کو ردہ میں اتنے روپے کا کیا کرو گے؟ چھوٹے چھٹانک آدمی ہو ۔ اکیلے گھر میں بے تحاشا نقدی رکھنا جو کھم کا کام ہے ۔ رات کو تمہاری طرف سے مجھے ڈر ہی لگا رہتا ہے ۔ سلطانہ ڈاکو نے تباہی مچا رکھی ہے۔“

بہر حال ، اس تقاضے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ دوسرے دن سے انہوں نے ان کے گھر ایک

منٹکی چھاچھ روزانہ بھیجی شروع کر دی ۔

تحصیلدار نے روپے پیسے سے تو کبھی سلوک نہیں کیا ، البتہ ایک دو پنگیر پالک یا چنے کا ساگ ، کبھی ہرن کی ران کبھی ایک گھڑا ساول یا دو چار بھیلیاں تازہ گڑ کی ساتھ کر دیتا تھا۔ عید پر ایک ہانڈی سندیلے کے لڈوؤں کی اور بقر عید پر ایک بوک بکرے کی سری بھی دی ۔ اترقی مگر میوں میں چار تربوز پھٹی بوری میں ڈلو کر ساتھ کر دیے ۔ ہر قدم پر نکل نکل پڑتے تھے ۔ ایک کو پکڑتے تو دوسرا لڑھک کر کسی اور سمت بدراہ ہو جاتا۔ جب باری باری سب ترخ گئے تو آدھے رستے میں ہی بوری ایک پیلاؤ کے پاس پٹک کے چلے آئے ۔ ان کے بہتے شیرے کو ایک پیاسا سانڈ جو پنڈت جگل کشور نے اپنے والد کی یاد میں چھوڑ رکھا تھا اس وقت تک انہماک سے چانتا رہا جب تک کہ ایک اٹھ پچھیا نے اس کی توجہ کو خوب سے خوب ترکی طرف منعطف نہ کر دیا ۔

جنوری کی مہاوٹ میں ان کے خُس پوش مکان کا چھتر ٹپکنے لگا تو تحصیلدار نے دو کاٹری پتی کے پوٹے اور استر کے لیے سرکیاں مفت ڈلوادیں ۔ اور چار چھتر نندیہ کار میں پکڑ کے لگا دیے ۔ قصبے کے تمام چھتر بارش ، دھوپ اور دھوس سے سیاہ پڑ گئے تھے ۔ اب صرف ان کا چھتر سنہرا تھا۔ بارش کے بعد چھکلی دھوپ ٹھکتی تو اس پر کرن کرن اشرفیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ۔ اس کے علاوہ تحصیلدار نے لحاف کے لیے باریک دھنکی ہوئی روٹی کی ایک بوری اور مرغابی کے پروں کا ایک تکیہ بھی بھیجا جس کے غلاف پر نازو نے ایک مگلاب کا پھول کاڑھا تھا ۔ (بشارت اس تکیے پر اٹے یعنی پیٹ کے بل سوتے تھے ۔۔۔ پھول پر ناک اور ہونٹ رکھ کر) تحصیل کے دو اب خانے (کانچی ہاؤس) میں ایک شورہ پشت چودھری کی دودھیل بکری کو آوارہ اور لاوارث قرار دے کر دو ہفتے سے بند کر رکھا تھا ۔ جب اس کے دانے اور چارے کا سرکاری خرچ اس کی قیمت سے تجاوز کر گیا تو اس کی زنجیر بشارت کے ہاتھ میں پکڑادی کہ آج سے تمہاری ہوئی ۔ مگر انہوں نے دووہوں سے قبول نہیں کی ۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے ہی چھاچھ پی پی کے اور رائڈ کڑھی * کھا کھا کے میری تو آنکھیں پیٹلی اور شاعری پتلی پڑ گئی ہے ۔ اب مزید کسی رقیق شے کی گنجائش نہیں ۔ دوم ، میں خود تو روپے اور روٹی کے بغیر بھی شاعری اور ڈیوٹی انجام دے سکتا ہوں ، لیکن بکری ان حالات میں دودھ تو درکنار مینٹکی بھی نہیں دے سکتی ۔

* رائڈ کڑھی: وہ کڑھی جو اپنے ختم کو کھا جائے یعنی جس میں پٹھکیاں نہ ہوں ۔

بشارت نے ایک دفعہ یہ شکایت کی کہ مجھے روزانہ دھوپ میں تین میل پیدل چل کر آنا پڑتا ہے تو تحصیلدار نے اسی وقت ایک فخران کی سواری میں لگانے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ اریل فخر اس نے نیلام میں آری ٹرانسپورٹ سے خریدا تھا۔ اب بڑھاپے میں صرف اس لائق رہ گیا تھا کہ شورہ پشت جاٹوں، بیکار سے بچنے والے چاروں اور لکان اور مفت دودھ نہ دینے والے کاشتکاروں کا منہ کالا کر کے اس پر قصبے میں گشت لگوائی جاتی تھی۔ پیچھے ڈھول تاشے اور میجرے بجوائے جاتے تاکہ فخر بدکتا رہے۔ اس پر سے گر کر ایک معتبوب گھسیارے کی، جس نے مفت گھاس دینے میں پس و پیش کیا تھا، بڑھ کی بڑی ٹوٹ گئی، جس سے وہ بالکل مغلوب ہو گیا۔ سواری کی بہ نسبت بشارت کو پیدل چلنا کہیں زیادہ باوقار و پُر عافیت نظر آیا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر لارڈ ولزلی ہمرکاب نہ ہوتا تو تین میل کی مسافت بہت کھتی۔ وہ راستے بھراس سے باتیں کرتے جاتے۔ اس کی طرف سے جواب اور ہنکار ابھی خود ہی بھرتے۔ پھر جیسے ہی نازو کا خیال آتا ان کی ساری تھکن اور کوفت دور ہو جاتی۔ ڈگ کی لمبائی آپ ہی آپ بڑھ جاتی۔ وہ تحصیلدار کے نٹ کھٹ لڑکوں کو اس وقت تک پڑھاتے رہے جب تک کہ وہ واقعہ پیش نہ آیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ قصبے میں وہ اتالیق صاحب کہلاتے تھے۔ اور اس حیثیت سے ہر جگہ ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اہل معاملہ کو تحصیلدار سے سفارش کروانی ہوتی تو لارڈ ولزلی تک کے لاڈ کرتے۔ وہ رشوت کی دودھ جلیبی کھا کھا کے استاموٹا اور کابل ہو گیا کہ صرف ڈم ہلاتا تھا۔ بھونکنے میں اب اسے آکس اور خوف آنے لگا تھا۔ اس کا ”کوٹ“ ایسا چکنے لگا جیسا ریس کے گھوڑوں کا ہوتا ہے۔ قصبے میں وہ لاٹ جلیجی کہلاتا تھا۔ جلنے والے البتہ بشارت کو تحصیلدار کا شیوہ کہتے تھے! نازو نے جاڑے میں ولزلی کو اپنی پرانی صدری قطع و برید کر کے پہنادی تو لوگ اترن پر ہاتھ پھیر پھیر کر کتے سے شفقت فرمانے لگے۔ مولیٰ مجن کو ایک بری عادت یہ تھی کہ استاد پڑھا رہے ہوتے تو درانا کلاس روم میں داخل ہو جاتے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ٹھیک پڑھا رہے ہیں یا نہیں! لیکن بشارت کی کلاس میں کبھی نہیں آتے تھے اس لیے کہ ان کے دروازے پر ولزلی پہرہ دیتا رہتا تھا۔

واقفیت بڑھی اور بشارت شکار میں تحصیلدار کی اردلی میں رہنے لگے تو ولزلی جھیل میں تیر کر زخمی مرغابی پکڑنا سیکھ گیا۔ تحصیلدار نے کئی مرتبہ فرمائش کی، یہ کتاب مجھے دے دو۔ بشارت ہر دفعہ اپنی طرف اشارہ کر کے ٹال جاتے کہ یہ سب حضوری، مع اپنے کتے کے، آپ کا

غلام ہے۔ آپ کہاں اس کی ٹھہل سیوا، ہنسنے کی کھکھیڑ میں پڑیں گے۔ جس دن سے تحصیلدار نے ایک قیمتی کالر لکھنؤ سے منگوا کر اسے پہنایا تو اس کا شمارشہ کے مصاحبوں میں ہونے لگا اور بشارت شہر میں اترتے پھرنے لگے۔ لیکن اس کے شریف النسل ہونے میں کوئی کلام نہ تھا کہ اس کا pointer جد ٹیپو (کلاں) الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک انگریز جج کا پروردہ تھا۔ وہ جب اٹھلستان جانے لگا تو اسے اپنے ریڈر کو بخش دیا۔ ولنلی اسی کی اولاد تھا جو دھیرج گنج آکریوں مکی مکی خراب و خوار ہو رہا تھا۔

مولیٰ تجن کو ولنلی زہر لگتا تھا۔ فرماتے تھے کہ ”اول تو کتنے کی ذات ہے۔ کتنا اصحاب کہف کا ہوتب بھی کتنا ہی رہتا ہے۔ پھر اسے تو ایسا ٹرین کیا ہے کہ واللہ صرف اشرافوں کو کاٹتا ہے!“ اس میں شک نہیں کہ جب وہ مولیٰ تجن پہ بھونکتا تو بہت ہی پیارا لگتا تھا۔ اب وہ واقعی اتنا ٹرین ہو گیا تھا کہ بشارت حکم دیتے تو اسٹاف روم سے ان کا رولر من میں دبا کر لے آتا۔ مولیٰ تجن کا بیان تھا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس پلید کو رجسٹر حاضری لے جاتے دیکھا! (لیکن غالباً تحصیلدار اور rabies کے ڈر سے کچھ نہ بولے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ کتے پر ڈھیلا کھینچ کر مارنے سے پہلے یہ ضرور تحقیق کر لو کہ اس کا مالک کون ہے۔)

اطوار و طریقہ واردات کے لحاظ سے ولنلی دوسرے کتوں سے بالکل مختلف تھا۔ گھر میں کوئی اجنبی داخل ہو تو کچھ نہیں کہتا تھا۔ لیکن جب وہ واپس جانا چاہتا تو کسی طرح نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کی ٹانگ اپنے جبرے کے زنبور میں پھنسا کر کھڑا ہو جاتا۔

ٹیچر حضرات یتیم خانے کو کھا گئے !

رفتہ رفتہ مولیٰ تجن نے قریض حسنہ سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور خود بھی کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ ایک دن بشارت چاک میں لت پت، ڈسٹر ہاتھ میں اور رجسٹر بغل میں دبائے کلاس روم سے نکل رہے تھے کہ مولیٰ تجن انہیں آستین پکڑ کے اپنے دفتر میں لے گئے اور اُٹے سر ہو گئے۔ غالباً ”حملہ کرنے میں پہل بہترین دفاع ہے“ والی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ کہنے لگے ”بشارت میاں، ایک مدت سے آپ کی تنخواہ چڑھی ہوئی ہے۔ اور آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اسکول ان حالوں کو پہنچ گیا۔ کچھ اُپائے کیجیے۔ یتیم خانے کے چندے کے مد سے ٹیچروں کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ ٹیچر حضرات یتیم خانے کو کھا گئے! ڈرتا ہوں آپ صاحبان کو یتیموں کی آہ نہ لگ جائے۔“ بشارت یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ کہنے لگے ”سات اٹھ مہینے

ہونے کو آئے۔ کل ساٹھ ستر روپے ملے ہیں۔ دو دفعہ گھر سے منی آرڈر منگوا چکا ہوں۔ اگر اس پر بھی یتیموں کی آہ لگنے کا اندیشہ ہے تو اپنی نوکری تہ کر کے رکھئے۔ یہ کہہ کر انہوں نے وہیں چارج دے دیا۔ مطلب یہ کہ ڈسٹر اور رجسٹر حاضری مولیٰ مجن کو پکڑا دیا۔

مولیٰ مجن نے یکلخت پیتراہد لا اور ڈسٹران کی تحویل میں واپس دے کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولے ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، برخوردار؟ قسم ہے وحدہ لا شریک کی! وہ رقم جسے آپ اپنے حسابوں ساٹھ ستر تارہے ہیں، وہ بھی یتیموں کا پیٹ کاٹ کر، زکوٰۃ اور صدقات کی مد سے نکال کر آپ کی نذر کی تھی۔ اس کا آپ یہ صلہ دے رہے ہیں! سرسید کو بھی آخری عمر میں ایسے ہی صدمے اٹھانے پڑے تھے جن سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ میں سخت جان ہوں۔ خیر۔ ذرا صبر سے کام لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو بقرعید کی کھالوں سے سارا حساب یک ششت بیباق کر دوں گا۔ یتیموں کا حال آپ پر روشن ہے۔ غریب کندھوں پہ چڑھ چڑھ کے میونسپلٹی کی لائینوں سے پکلی دوپٹلی تیل نکالتے ہیں تب کہیں رات کو پڑھ پاتے ہیں۔ میونسپلٹی والوں نے تاڑ کے برابر اونچی بلٹیوں پہ لائینیں لٹکا دی ہیں تاکہ ان کے نیچے کوئی پڑھ نہ سکے۔ اب کوئی ان الدین چراغ کی اولادوں سے پوچھے کہ تم نے لائین لٹکائی ہے یا اپنے بھانوس سوانیزے پر آفتاب ٹانگا ہے۔ معصوم بچے اس کی اندھی روشنی میں کیا تمہارے باپ کا کفن سٹیں گے۔ آپ کے آنے سے تین چار سال پہلے ایک یتیم لونڈا بلی پر سے ایسا گرا کہ ہاتھ اور ٹانگ کی ہڈی کچی مکڑی کی طرح ٹوٹ گئی۔ عبدالسلام کمنگر نے جوڑنے کی بہتیری کوشش کی، مگر پیپ پڑ گئی۔ کانپور لے جا کر، دست بخیر، یہاں سے (گھٹنے کے اوپر سے) ٹانگ کٹوائی پڑی۔ سیدھا ہاتھ جڑنے کو توجڑ گیا، مگر اس طرح جیسے قرابت داروں میں ناچاقی کے بعد ٹوٹا ہوا تعلق جوڑا جاتا ہے۔ ہاتھ کی کمان سی بن گئی۔ دونوں سروں پر تار باندھ دس تو اس گز سے سارنگی بجا سکتا تھا۔ لولا لنگڑا لونڈا رفتہ رفتہ بری صحبت میں پڑ گیا۔ میں نے لنگڑ دین کو کان پکڑ کے جمال باہر کیا تو کانپور میں فقیروں کی ٹولی میں جاشامل ہوا۔ اور دوسرے لونڈوں کو بھی بہکانے لگا کہ ”یار! تم بھی بلی پر سے چھلانگ لگا کے ادھر آ جاؤ۔ بڑے مزے ہیں۔ یہاں برتن نہیں مانگھنے پڑتے۔ کھا پھاڑ پھاڑ کے آموختہ نہیں سنانا پڑتا۔ رات کو کسی کے پیر نہیں دابنے پڑتے۔ روز روز سویم کے چنے پڑھ پڑھ کے خود ہی کھانے نہیں پڑتے۔ صبح کو ٹلے سے دانت نہیں مانگھنے پڑتے۔ میڑی پینے کے لیے بار بار لوٹالے کے پاخانے نہیں جانا پڑتا۔ بے دفعے (جتنی دفعہ) چاہو دھڑلے سے پیو اور دھوئیں کی کاڑی (ریل) کی طرح بھک بھک کرتے پھرو۔ غرض کہ یہاں

عیش ہی عیش ہیں - کچھ بھی حرمزگی کرو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ "بزرگوں نے کہا ہے کہ یہ اطوار ولد الزمان کی پہچان ہیں - تو میں کہہ یہ رہا تھا، برخوردار، کہ یہ آپ کا اسکول ہے - آپ کا اپنا یتیم خانہ - میں اندھا نہیں ہوں - آپ جس لگن اور تندہی سے کام کر رہے ہیں وہ اندھے کو بھی نظر آتی ہے - آپ زندگی میں بہت آگے جائیں گے - اگر اسی طرح کام کرتے رہے تو انشاء اللہ العزیز میس پیچیس برس میں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو جائیں گے - میں ٹمہرا جاہل آدمی - میں تو ہیڈ ماسٹر بننے سے رہا - اسکول کا احوال آپ کے سامنے ہے - چندہ دینے والوں کی تعداد گھٹ کر اتنی رہ گئی ہے کہ سرسید بھی ہوتے تو نواب محسن الملک کا اور اپنا سر پیٹ لیتے - مگر آپ سب مجھی پہ غصہ اتارتے ہیں - میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں - اکیلا چننا بھاڑ تو کیا خود کو بھی نہیں پھوڑ سکتا - ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول اور یتیم خانے کو امرا، رؤسا، تعلقہ داروں اور آس پاس کے شہروں میں روشناس کرایا جائے - لوگوں کو کسی بہانے بلایا جائے - ایک یتیم کا چہرہ دکھانا ہزار وعظوں اور لاکھ اشتہاروں سے زیادہ اثر رکھتا ہے - یہ تو کارِ خیر ہے - کوئی سرکس یا آفا حشر کا کھیل تو ہے نہیں کہ اشتہار دیکھتے ہی لوگ ٹوٹ پڑیں - یقین جانئے جب سے ٹیچر صاحبان کی تنخواہیں رکی ہیں، میری نیند اڑ گئی ہے - برابر صلاح مشورے کر رہا ہوں - آپ کو بھی کئی بار تاکید کر چکا ہوں کہ اللہ اپنی تنخواہوں کی ادائیگی کی کوئی ترکیب جلد از جلد نکالیے - بہت غور و خوض کے بعد اب آپ ہی کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے - اسکول کی مشہوری کے لئے ایک شاندار مشاعرہ ہونا از حد ضروری ہے - لوگ آج بھی دحیرج کنج کو کاؤں سمجھتے ہیں - ابھی کل ہی ایک پوسٹ کارڈ ملا - پتے میں بمقام موضع دحیرج کنج لکھا تھا - موضع دحیرج کنج! واللہ! خون کھولنے لگا - لوگ عرصے تک علیگڑھ کو بھی کاؤں ہی سمجھتے رہے، تاوقتیکہ وہاں بائیسکوپ شروع نہ ہوا اور موٹر کار کے ایکسی ڈنٹ میں پہلا آدمی نہ مرا۔

تقسیم کار کے باب میں انہوں نے وضاحت فرمادی کہ بشارت کے ذمے صرف شاعروں کو لانا، لے جانا، قیام و طعام کا بند و بست، مشاعرے کی پہلشی اور مشاعرہ گاہ کا انتظام ہو گا۔ بقیہ تمام کام وہ تن تنہا انجام دے لیں گے - اس سے ان کی مراد صدارت تھی!

دھیرج گنج کا پہلا اور آخری مشاعرہ

مشاعرے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ عائد بن دھیرج گنج کو مدعو کرنا، مصرع طرح اور شعرا کا انتخاب، شاعروں کو کانپور سے آخری ٹرین سے بصد احترام لانا اور مشاعرے کے بعد پہلی ٹرین سے دفان کرنا، مشاعرے سے پہلے اور غزل پڑھنے تک ان کی مفت خاطر مدارت کسی اور سے کروانا۔۔۔ اور اسی قسم کے فرائض جو سزا کا درجہ رکھتے تھے بشارت کے ذمے کیے گئے۔ شاعروں اور ان کے اپنے آنے جانے کا ریل اور آگے کا کرایہ اور دھیرج گنج میں قیام و طعام، پان سکرٹ اور متفرق اخراجات کے لیے مولیٰ مجن نے بشارت کو دس روپے دیے اور تاکید کی کہ آخر میں خرچ سے جو رقم بچ رہے وہ ان کو مشاعرے کے دوسرے روز مع رسیدات و گوشوارہ اخراجات واپس کر دی جائے۔ انہوں نے سختی سے یہ ہدایت بھی کی کہ شاعروں کو آٹھ آنے کا ٹکٹ خود خرید کر دینا۔ نقد کرایہ ہرگز نہ دینا۔ بشارت یہ پوچھنے ہی والے تھے کہ شاعروں کے ہاتھ خرچ، نذر نذرانے کا کیا ہو گا کہ مولیٰ مجن نے از خود یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ فرمایا شعراے کرام سے یتیم خانے اور اسکول کے چندے کے لیے اپیل ضرور کیجیے گا۔ انہیں شعر سننے میں ذرا حجاب نہیں آتا تو آپ کو کار خیر میں کاہے کی شرم۔ اگر آپ نے پھو پڑین سے کام نہ لیا تو ہر شاعر سے کچھ نہ کچھ وصول ہو سکتا ہے۔ مگر جو کچھ وصول کرنا ہے مشاعرے سے پہلے ہی دھر والینا۔ غزل پڑھنے کے بعد ہرگز قابو میں نہیں آئیں گے۔ رات گئی بات گئی والا مضمون ہے۔ اور جو شاعریہ کہے کہ وہ اٹھتی بھی نہیں دے سکتا تو واللہ اسے تو ہمارے یتیم خانے میں ہونا چاہیے۔ کانپور میں بے کار پڑا کیا کر رہا ہے؟

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ ان تمام انتظامی امور کے سلسلے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ سو اس کی ایک نہایت معقول وجہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کو ملازم رکھتے وقت مولیٰ مجن نے صرف ایک شرط لگائی تھی۔ وہ یہ کہ ہیڈ ماسٹر اسکول کے معاملات میں قطعی دخل نہیں دے گا۔

اسے خود نمائی کہیے یا نا تجربہ کاری، بشارت نے مشاعرے کے لیے جو مصرع طرح انتخاب کیا وہ اپنی ہی تازہ غزل سے لیا گیا تھا۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ تو یہ نظر آیا کہ مفت میں شہرت ہو جائے گی۔ دوسرے، انہیں مشاعرے کے لیے علیحدہ غزل پر مغز ماری نہیں کرنی

پڑے گی۔ یہ سوچ سوچ کر ان کے دل میں کد مگدی ہوتی رہی کہ اچھے اچھے شاعران کے مصرع پر گرہ لگائیں گے۔ بہت زور ماریں گے۔ گھنٹوں فکرِ سخن میں کبھی پیر پٹنیں گے۔ کبھی دل کو، کبھی سر کو پکڑیں گے اور شعر ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکڑ کے بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے اٹھارہ شاعروں کو شرکت کے لیے آمادہ کر لیا، جن میں جوہر چغتائی الہ آبادی، کاشف کانپوری اور نشور واحدی بھی شامل تھے، جو از راہِ شفقت و خورد نوازی رضامند ہو گئے تھے کہ بشارت کی نوکری کا سوال تھا۔ نشور واحدی اور جوہر الہ آبادی تو ان کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں کو انہوں نے اپنا مصرع طرح نہیں دیا، بلکہ غیر طرہی غزلیں پڑھنے کی درخواست کی۔ ایسا لگتا تھا کہ باقی ماندہ شعرا کے انتخاب میں انہوں نے صرف یہ الزام رکھا ہے کہ کوئی شاعر ایسا نہ آنے پائے جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی اندیشہ ہو کہ ان سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے۔

اِٹکا کس نے ایجاد کیا؟

ان سب شاعروں کو دو اکوں میں بٹھا کر وہ کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر لائے۔ جن قارئین کو دو اکوں میں اٹھارہ شاعروں کی ”سارڈینز“ بنانے میں زیادتی یا مبالغہ نظر آئے، انہوں نے غالباً نہ اِٹکے دیکھے ہیں، نہ شاعر۔ یہ تو کانپور تھا، ورنہ علی گڑھ ہوتا تو ایک ہی اِٹکا کافی تھا۔ قارئین کی آسانی کے لیے ہم اس نادر الوجود اور محیر العقول سواری کا سرسری سا خاکہ کھینچے دیتے ہیں۔ پہلے غسلِ میت کے تختے کو کاٹ کے چوکور اور چورس کر لیں۔ پھر اس میں دو مختلف سائز کے بالکل چوکور پھیٹے اس یقین کے ساتھ لگا دیں کہ ان کے چلنے سے علی گڑھ کی سڑکیں ہموار ہو جائیں گی اور اس عمل سے یہ خود بھی گول ہو جائیں گے۔ تختہ سڑک کے گڑھوں کی بالائی سطح سے چھ ساڑھے چھ فٹ اونچا ہونا چاہیے تاکہ سواروں کے لٹکے ہوئے پیروں اور پیدل چلنے والوں کے سروں کی سطح ایک ہو جائے۔ چھوٹے پھیٹے کا قطر کم از کم پانچ فٹ ہو۔ پھیٹے میں سورج کی شعاعوں کی مانند جو لکڑیاں لگی ہوتی ہیں وہ اتنی مضبوط ہونی چاہئیں کہ مٹی سواری ان پر پاؤں رکھ کر تختے تک ہائی جمپ کر سکے۔ پاؤں کے دھکے سے پھیٹے کو بھی اسٹارٹ ملے گا۔ اس کے بعد تختے میں دو بانسوں کے بم* لگا کر ان میں ایک عدد لاغر گھوڑے کو لٹکا دیں، جس کی پسلیاں دور سے گرن کر سواریاں اپنا اطمینان کر لیں کہ پوری ہیں۔ لیجیے اِٹکا تیار ہے۔ اس کے مذکورہ بالا چار اجزائے تحریری کا بقیہ حال آگے آئے گا۔

* بم: اِٹکے اور تانکے کے آگے لگانے والی لکڑی جس میں کھوڑا جوستے ہیں۔

نہاری ، رساول ، جلی اور دھواں لگی فیرنی ، محاورے ، ساون کے پکوان ، امرتوں میں جھولے ، ارہر کی دال ، ریشمی ڈلائی ، غرارے ، دوپٹی ٹوپی ، آٹھا اول اور زبان کے شعری طرح اِکا بھی یوپی کی خاصے کی چیزوں میں شمار ہوتا ہے ۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک اپنے قیام علی گڑھ کے دوران ہم بھی اِکے میں سوار و خوار ہو چکے ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ اِکا کسی گھوڑے نے ایجاد کیا تھا ۔ اسی لئے اس کے ڈیزائن میں یہ حکمت پوشیدہ رکھی کہ گھوڑے سے زیادہ مشقت سواری کو اٹھانی پڑے ۔ اِکے کی خوبی یہ تھی کہ زائد سوار یوں کا بوجھ گھوڑے پر نہیں پڑتا تھا ، بلکہ ان سوار یوں پر پڑتا جن کی گود میں وہ آکر بیٹھتی جاتی تھیں (+) ۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مغربی ”بیلے“ میں بعض ایسے نازک مقام آتے ہیں کہ ڈانسر صرف پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑی ہو کر ناپتی چلی جاتی ہے ۔ سارے جسم کا بوجھ انگوٹھے پر ہوتا ہے اور چہرے پر کرب کے آثار کے بجائے مسکراہٹ کھیلتی ہے ۔ ایسی ہی مسرت بھری مہارت اور مہارت بھری مسرت کا مظاہرہ علی گڑھ میں دیکھا جہاں یونیورسٹی کے لڑکے اِکے کے تختے سے باہر نکلی ہوئی بے پردہ رکیل پر صرف ہاتھ کے انگوٹھے کے بل آکر بیٹھے گرلز کالج اور نمائش کا طواف کرتے تھے ۔ زندگی میں کامیابی کا گُر بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاں انگوٹھا دھرنے کو جگہ مل جائے ، وہاں خود کو سمو چا دھانس دو ۔

سرک کوٹنے کے انجن سے تصادم

سواریاں ایک دوسرے کے جسم کے curves میں گنڈلی مار کے بیٹھ جاتی تھیں ۔ اِکا جب گھوڑے اور سوار یوں سمیت کسی کھلے ہوئے مین ہول کے اندر داخل ہونے میں ناکام رہتا تو ، بقول دلی والوں کے ، جانمیں سی گھل جاتیں ۔ سوار یوں کے ہاتھ پاؤں اس طرح کھتے اور ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہوتے تھے جیسے دھلائی کے بعد واشنگ مشین میں کپڑوں کی آستینیں اور ازار بند ۔ اگر کسی ایک کو اترنا ہو تو سب سوار یوں کو اپنی اپنی گرہ اور پینچنی کھولنی پڑتی ، جب کہیں جا کے وہ جان بار اس استخوانی شکنجے سے آزاد ہو کر چھ فٹ کی بلندی سے اُڑوں

(+) حضرت جوش ملیح آبادی ایسے اِکوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم تک کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوانظر آنے لگے“ ۔

غیر متوازن طرزِ زیان سے قطعِ نظر ، قابلِ غور نکتہ یہ کہ تحقیر کے آخری درجہ پر نہ رنڈی فائز ہے نہ بھڑوا ۔

دیہاتی ہے!

حالت میں پھلانگ لگاتا۔ اعضا یا ہم دگر خلاط ملا ہونے کے علاوہ ایسے سُن ہو جاتے تھے کہ اگر کسی کی پنڈلی میں خارش ہو تو وہ کجا کجھا کے خون کر دیتا، مگر خارش مٹنے کا نام نہ لیتی۔ اس لیے کہ کجائی ہوئی پنڈلی کسی اور کی ہوتی تھی۔ اگے کا اگر ایکسی ڈسٹ ہوتا تو اسے یا بالائین سواروں کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ اس لیے کہ اول تو اگے میں ایسی کوئی چیز یا پُرزہ نہیں ہوتا کہ اس کے ٹوٹ جانے یا نہ ہونے سے اگے کی عدم کارکردگی میں مزید فرق آئے۔ دوم، ٹکرانے والی کاریاں یا ٹیکل اس کے تختے کے نیچے سے ایسی رسان سے نکل جاتی کہ گھوڑے تک کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ گرہ گیر سواروں کا کپٹے کا گتھا جوں کا توں زمین پر گد سے رگبی کے scrum کی طرح آن پڑتا کہ مجال ہے ایک بھی سواری علیحدہ ہو جائے۔ ایسا ہی منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۴۴ میں علی گڑھ میں دیکھا۔ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ ہم ایک عدیلیڈ خریدنے نکلے تھے جو ان دنوں نایاب تھا۔ ایک ایک دکان پر پوچھتے پھر رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بیچ سڑک پر سات اٹھ سیاہ پیراشوٹ پر اباندہ کے اتر رہے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک اگے کا، جس میں گرلز کالج کی لڑکیاں سوار تھیں، سڑک کوٹنے کے انجن کے ساتھ پیڈ آن کوئی ٹرن ہو گیا ہے اور لڑکیاں ہوا بھرے برقعوں کی مدد سے اگے کی بلندیوں سے باجماعت لینڈ کر رہی ہیں۔ اور لڑکے ترکی ٹوپیاں پہنے، سیاہ شیر وانیوں کے بٹن نرخرے تک بند کیے، زخمیوں کو اٹھانے اور ابتدائی غیر طبی امداد، انسانی ہمدردی، دُکھی انسانیت کی خدمت اور معاشقے کے لیے تیار و امیدوار کھڑے ہیں۔

سوار س پاوری کی گالی سے اسٹارٹ

اگے کے پچھلے حصے میں اتنی سواریاں لدی، ٹنگی، انگی اور لٹکی ہوتی تھیں کہ اگر گھوڑے کو ٹھوکر لگ جائے یا منقہات سے بے ہوش ہو جائے، تب بھی زمین پر نہیں گر سکتا تھا، اس لیے کہ پچھلی سواریاں اپنے اُلا سے اسے بے ہوش ہونے کے بعد بھی کڑی حالت میں رکھتی تھیں۔ تختے پر گد کی دستور نہیں تھا۔ جیسی چمک اس تختے پر نظر آئی ویسی آج تک قیمتی سے قیمتی لکڑی پر بھی نہیں دیکھی۔ وجہ یہ کہ پالش کا طریقہ قدرے مختلف تھا۔ اس پر روزانہ، کم از کم دس گیارہ گھنٹے مسلسل، پوسٹ گریجویٹ کولہوں سے پالش کی جاتی تھی۔ (جنویر انڈر گریجویٹ کو تو سینئر پوسٹ گریجویٹ کی گود میں جگہ ملتی تھی) اتنے چلنے اور پھسلنے تختے پر اگر گد کی چمکا دی جاتی تو پہلے ہی جھٹکے میں سواریاں اُڑن گدیے پر slide کر کے glide کرتی ہوئی راہگیروں کے سروں پر لینڈ کرتیں۔ سواری کو اگے کا ڈنڈا پکڑ کر سڑک پر گھسٹتے

ہوئے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس سے اگے کی رفتار سست پڑنے کا احتمال تھا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اگلا گھوڑے کی طاقت سے چلتا تھا، کیوں کہ ہوتا یہ تھا کہ اگے والا نیچے اتر کر اسے ایک دھکے اور سو ہارس پاور کی کمالی سے اسٹارٹ کرتا اور اسی کے زور سے یہ لڑھکتا رہتا تھا۔ گھوڑے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اگے کو آگے لڑھکنے سے روک سکے۔

”خوشامید!“۔۔۔ صحیح املا

دھیرج گنج کے پلیٹ فارم کو اسکول کے بچوں نے رنگ برنگی جھنڈیوں سے اس طرح سجایا تھا جیسے پھول ہماں، بچی کا منہ دھلائے بغیر بالوں میں شوخ رہن باندھ دیتی ہے۔ ٹرین سے اترتے ہی ہر شاعر کو گیندے کا بار پہنا کر گلاب کا ایک ایک پھول اور اونٹن دودھ کا مگلاس پیش کیا گیا جسے ہاتھ میں لیتے ہی وہ ہلہلا کر پوچھتا، کہاں رکھتوں؟ استقبال کرنے والوں نے بیچیس میل اور ایک گھنٹے دور کانپور سے آنے والوں سے پوچھا، ”سفر کیسا رہا؟ کانپور کا موسم کیسا ہے؟ ہاتھ منہ دھو کے تین چار گھنٹے سو لیں تو سفر کمر تھکان اتر جائے گی۔“ جواباً مہمانوں نے دریافت کیا ”یہاں مغرب کس وقت ہوتی ہے؟ دھیرج گنج والے تو مہمان نوازی کے لیے مشہور ہیں۔ یہاں کی کون سی سوغات مشہور ہے؟ روپے میں گے مرغیں آتی ہیں؟ کیا یہاں کے مسلمان اتنے ہی پسماندہ ہیں جتنے باقی ماندہ ہندوستان کے؟“

اٹھارہ شاعر اور پانچ مصرع اٹھانے والے جو ایک شاعر اپنے ہمراہ لایا تھا، دو بجے کی ٹرین سے دھیرج گنج پہنچے۔ ٹرین کی آمد سے تین گھنٹے پہلے ہی پلیٹ فارم پر یتیم خانہ شاعر الاسلام کا بینڈ بجا شروع ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی وہ آن کر رکی تو کبھی ڈھول، کبھی بانسری اور کبھی ہاتھی کی سونڈ جیسا باجا (ٹرمپٹ) بند ہو جاتا۔ اور کبھی تینوں ہی خاموش ہو جاتے۔ صرف بینڈ ماسٹر چھڑی ہلاتا رہتا۔ وجہ یہ کہ ان سازوں کو بجانے والے لڑکوں نے اس سے پہلے انجن کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں بار بار اتنے محو ہو جاتے کہ بجانے کی سمدھ نہ رہتی۔ انجن ان کے اتنے قریب آکر رکا تھا کہ ایک ایک پراسرار پُرزہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ سیٹی بجانے والا آدھ کوئلہ جھونکے کا سیلچ، بالٹر کے دھکے پختے کوئلوں کا تیز اور انگریزی دواؤں کی بو جیسا بھبکتا جھونکا۔ شعلوں کی آچے سے لہنگوانڈین ڈرائیور کا متمتا لال چقندر چہرہ اور کلائی پر گدی ہوئی نیلی میم۔ مسلمان خلاصی کے سر پر بندھا ہوا سیاہ رومال اور چہرے پر کوئلے کی زیرہا دھاریاں۔ پھیتے سے بڑی ہوئی لمبی سلاخ جو بالکل ان کے ہاتھ کی طرح چلتی جسے وہ آگے پیچھے

ہلاتے ہوئے چھک چھک کرتے ریل چلاتے تھے۔ انجن کی ٹوٹی سے اُبلتی، شور مچاتی اسٹیم کا چہرے پر اسپرے۔ ان بچوں نے دھوئیں کے مرغولوں کو مٹیالے سے ہلکا سرمئی اور سرمئی سے کاڑھا کاڑھا سیاہ ہوتے دیکھا۔ گلے میں اس کی کڑواہٹ انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ گھنگرالے دھوس کا سیاہ اڑدبا پھنکارہ س مارتا آخری ڈبے سے بھی آگے نکل کر اب پیچ و تاب کھاتا آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ بینڈ بجانے والے بچے خاموش، بالکل خاموش ہو کر، قریب، بالکل قریب سے انجن کی سیٹی کو بجتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو جاتے وقت اپنی آنکھیں وہیں چھوڑ جاتے، اگر ان بچوں سے بینڈ ہی بچوانا تھا تو بغیر انجن کی ٹرین لانی چاہیے تھی۔

شعراءِ کرام اسٹیشن سے میل تانگوں اور پہلیوں میں قصبے لائے گئے۔ وہ ہر دس منٹ بعد گاڑی بان سے پوچھتے کہ قصبہ اتنی دور کیوں بنایا گیا ہے؟ میلوں کے سینکڑوں پر نئی سنگوٹیاں اور گلے میں گھنگھر و پڑے تھے۔ ایک میل کے پٹھے پر مہندی سے ”خوشامد“ لکھا تھا۔ غلط املا کی سزا میل کو مل رہی تھی۔ مطلب یہ کہ گاڑی بان بار بار خ کے نقطے میں آر* جیمو رہا تھا۔ ویسے ہمارے خیال میں وزیروں اور بڑے آدمیوں کے استقبال کے لیے جوبینر، خیر مقدمی دروازے اور محرابیں بنائی جاتی ہیں، ان پر خوش آمدید کا یہی املا (خوشامد) ہونا چاہیے کہ سارے کھٹ راگ کا اصل مقصد مدعا یہی تو ہے۔ میل تانگوں کے پیچھے، ڈرل ماسٹر کی قیادت میں اسکول کے تمام اساتذہ اور ان کے پیچھے قدم ملائے لڑکوں کے والد صاحبان۔ آگے آگے بینڈ بجتا جا رہا تھا۔ بینڈ کے آگے ایک لڑکا چل رہا تھا جس کے ہاتھ میں یتیم خانہ شمع الاسلام کا سیاہ پرچم تھا، جس پر آسمان کو دھکی آمیز لہجے میں مخاطب کر کے باطل سے نہ دبنے کے الٹی میٹم کے بعد اہل زمین کو اپنے انجام سے ڈرنے اور یتیم خانے کو دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ پرچموں کی تاریخ میں یہ پہلا پرچم تھا جس پر لعن طعن اور کچھ کرنے کی بھی تلقین کی گئی تھی، ورنہ نادان چند رنگ برنگی پٹیوں اور دھاریوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ جلوس کے پیچھے پیچھے لارڈ ولزلی کی سربراہی میں سارے قصبے کے تنگ دھڑنگ بچے اور کتے دوڑ رہے تھے۔ کچھ شقہ شاعروں نے بینڈ پر اعتراض کیا تو ڈرل ماسٹر نے انہیں یہ کہہ کر چپکا کر دیا کہ اگر اب بینڈ بجنابند ہوا تو کتے آلیں گے۔

سندھن تیری گھوڑی چنے کے کھیت میں

بینڈ ماسٹر کو بشارت نے ایک ہفتے پہلے ہدایت کر دی تھی کہ ”خدا کے واسطے! تم اپنی

* آر: وہ نوکلی کیل جو میلوں کو ہانکنے کی لکڑی کے سرے پر لگی ہوتی ہے۔

اسطوخودوس منحوس ماتی دُھن نہ بجانا۔ خوشی کا موقع ہے۔ کسی پیئیر فُل ٹیون، کاریہر سل کر لو۔ ابھی تو دن پڑے ہیں۔“ چنانچہ پہلے تو مینڈ نے ۱۹۲۵ کے گراموفون ریکارڈ کا مشہور گانا بجایا:

بیٹا جٹا! جٹا! تھوڑی آگ لادے

آگ لادے، تمباکو لادے

لادے تھوڑا پانی

بیٹا جٹا! جٹا! تھوڑی آگ لادے

اور اب ہزما سٹرز وائس کے ایک اور مقبول عام ریکارڈ کی اس سے بھی زیادہ ”پیئیر فُل“ دُھن بجا رہا تھا۔ یہ ہٹ گانا ۱۹۳۰ میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ان بچوں میں ہم بھی شامل تھے۔
سمدھن! تیری گھوڑی چنے کے کھیت میں!

یہ معلومات فراہم کرنے کے بعد، دوسرے مصرع میں موصوفہ کو مذکورہ بالا مقام یعنی چنے کے کھیت میں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ گانا ہم نے لگ بھگ پچاس برس پہلے سنا تھا، جب ہم نے سمدھن تو درکنار، چنے کا کھیت بھی نہیں دیکھا تھا۔ سمدھن کی بے لگام گھوڑی تو ظاہر ہے کھیت میں ہرے بھرے چنوں کے لالچ میں گئی ہوگی، مگر یہ عقدہ آج تک نہ کھلا کہ سمدھی صاحب خود پرانے کھیت میں کیا کر رہے تھے۔ آج بھی ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ گیت میں مرکزی کردار گھوڑی کا ہے یا سمدھن کا۔ ہڑونگے پن اور چال چلن سے متعلق گیت کے چند بول ایسے تھے کہ پتا نہیں چلتا تھا روئے سخن گھوڑی کی طرف ہے یا سمدھن کی جانب۔ اسی طرح کچھ بول اتنے سچے، شہد اور تنومند تھے کہ گمان ہوتا تھا کسی گھوڑے نے بقلم خود لکھے ہیں۔ یاد رہے کہ سمدھن کو صبح کی بھولی ہوئی گھوڑی کو پکڑنے کا لالچ دے کر شام کو کھیت میں بلایا جا رہا ہے۔ مگر یہ نہیں کھلتا کہ سمدھی صاحب سمدھن کو آیا اس لیے بلارہے ہیں کہ دونوں مل کر گھوڑی پر بیٹھیں گے یا تینوں مل کر بونٹ کھائیں گے۔

انہی پتھروں پہ چل کر۔۔۔

اٹھارہ شاعروں کا جلوس اسکول کے سامنے سے گزرا تو ایک رہتکے سے ۱۸ توپوں کی سلامی اتاری گئی۔ یہ ایک چھوٹی سی پنچاستی توپ تھی جو نارمل حالات میں پیدائش اور ختنوں کے موقع پر چلائی جاتی تھی۔ اس کے چلتے ہی سارے قصبے کے کتے، بچے، کوئے، مرغیاں اور

مور کورس میں چٹکھاڑنے لگے۔ بڑی بوڑھیوں نے گھبرا کر ”دین جاگے، کُفر بھاگے“ کہا۔ خود وہ مٹی توپ بھی اپنے چلنے پر اتنی متعجب اور وحشت زدہ تھی کہ دیر تک ناچی ناچی پھری۔ شاعروں کو حیثیت دار کاشتکاروں کے ہاں ٹھیرایا گیا، جو اپنے اپنے مہمان کو اسکول سے گھر لے گئے۔ ایک کاشتکار تو اپنے حصے کے مہمان کی سواری کے لیے ٹٹو اور راستے کے شغل کے لیے ناریل کی کڑکڑی بھی لایا تھا۔ قصبے میں جو گئے پُنے آسودہ حال مسلمان گھرانے تھے ان سے مولیٰ بچن کی نہیں بنتی تھی۔ لہذا شاعروں کے قیام و طعام کا بند و بست کاشتکاروں اور چودھریوں کے ہاں کیا گیا، جس کا تصوّر ہی شاعروں کی نیند اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ شعر و شاعری اور ناولوں میں دیہاتی زندگی کو romanticise کر کے اس کے خلوص، سادگی، قناعت اور مناظر قدرت پر سرُحُسن اور دُحُنوان اور بات ہے، لیکن سچ کُج کسی کسان کے نیم پختہ یا مٹی کمارے کے گھر میں ٹھیرنا کسی شہری اشلکپول کے بس کا روگ نہیں۔ کسان سے بغل گیر ہونے سے پہلے اس کے دُحور دُنگر، فُچی کے فُنگر پر نٹ والے دھات کے کلاس، جن ہاتھوں نے اُپلے تھاپے انہی ہاتھوں سے پکائی ہوئی روٹی، ہل، دراتی اور مٹی سے کھدوائے ہوئے ہاتھ، باتوں میں پیارا اور پیاز کی مہک، اور مکھن پلائی ہوئی مونچھ۔۔۔ ان سب سے بیک وقت گلے ملنا پڑتا ہے۔ انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ۔

۹

رسالہ در مدح و مذمت طوائف

یعنی

در دفاع خود

کلام اور اولاد کی شان نزول

اس قصباتی مشاعرے میں جو دحیرج کنج کا آخری یادگار مشاعرہ ثابت ہوا، ۱۸ بیرونی شاعروں کے علاوہ ۳۳ مقامی اور مضافاتی شعرا شرکت کے لیے بلائے گئے یا بن بلائے آئے۔ باہر

سے آنے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اس لالچ میں آئے تھے کہ نقد معاوضہ نہ سہی ، کاؤں ہے ، کچھ نہیں تو سبزیاں ، فصل کے میوے ، پھل پھلاری کے ٹوکریے ، پانچ چھ مرغیوں کا جھبا تو منتظمین مشاعرہ ضرور ساتھ کر دیں گے ۔ دھیرج گنج میں کچھ منتفقی نوجوان ایسے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گرد و نواح میں تین چار مشاعرے درہم برہم کر چکے ہیں ۔ ان کی مشکلیں بشارت نے عجیب انداز سے کیں ۔ ان کے ایک پرانے لنگوٹھے تھے ، جنہوں نے میٹرک میں چار پانچ دفعہ فیل ہونے کے بعد ممتحنوں کی ہٹ دھرمی اور جوہر ناشناسی سے عاجز آکر محکمہ چٹنگی میں ملازمت اختیار کر لی تھی ۔ موصوف کو اس سے اپنے تزکیہ نفس کے علاوہ اس بدنام محکمے کو بھی سزا دینی مقصود تھی ۔ چٹنگی کی فضا کو انہوں نے شاعری کے لیے نہایت موزوں و سازگار پایا ۔ موجودہ صورتِ حال سے اس درجہ مطمئن و مسرور تھے کہ اسی پوسٹ سے رٹائر ہونے کے آرزو مند تھے ۔ کثیر العیال تھے ۔ نہایت بسیار و بدیدہ گو ۔ جو اشعار کی شان نزول تھی ، وہی اولاد کی ۔ مطلب یہ کہ دونوں کے ورود و بہتات کا بہتان مبدع فیاض پر لگاتے تھے ۔ عام سا جملہ بھی ان پر ردیف قافیے کے ساتھ اترتا تھا ۔ مثر بولنے اور لکھنے میں ان کو اتنی ہی الجھن ہوتی تھی جتنی ہاشما کو شعر کہنے میں ۔

وہ شاعری کرتے تھے ، مگر مشاعروں سے بیزار و منتفر ۔ فرماتے تھے ”آج کل جس طرح شعر کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح داد دی جاتی ہے ۔ یعنی مطلب سمجھے بغیر ۔ صحیح داد دینا تو درکنار ، اب تو لوگوں کو ڈھنگ سے ہٹ کر نا بھی نہیں آتا ۔ شعر مشاعرے میں سننے سننے کی چیز نہیں ۔ تنہائی میں پڑھنے ، سمجھنے ، سننے اور سہنے کی چیز ہے ۔ کلام کتابی شکل میں ہو تو لوگ شاعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ میں میر کے کلیات سے ایک دو نہیں ، سودو سواشعار ایسے نکال کے دکھا سکتا ہوں جو وہ کسی مشاعرے میں پڑھ دیتے تو عزتِ سادات اور دستار ہی نہیں ، سر بھی سلامت لے کے نہ لوٹتے۔“ انہیں میر کے صرف یہی اشعار یاد تھے ۔ دیگر اساتذہ کے بھی صرف وہ اشعار یاد کر رکھے تھے جن میں ان کے نزدیک کوئی سقم تھا ۔ ان صاحب سے بشارت پانچ چھ غیر طرحی غزلیں کہلوا کے لے آئے اور ان مشاعرہ بگاڑ نوجوانوں میں تقسیم کر دیں کہ تم بھی پڑھنا۔ اور یہ ترکیب کار گر رہی ۔ دیکھا گیا ہے کہ جس شاعر کو دوسرے نالائق شاعروں سے داد لینے کی توقع ہو وہ انہیں ہٹ نہیں کیا کرتا ۔ چوریاں بند کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ چور کو تھانیدار مقرر کر دو ۔ ہمیں اس میں اس فائدے کے علاوہ کہ وہ دوسروں کو چوری نہیں کرنے دے گا ، ایک اور فرق نظر آتا ہے ۔ وہ یہ کہ پہلے جو مال وہ اندھیری راتوں میں نقب لگا

کے بڑی مصیبتوں سے حاصل کرتا تھا وہ اب مالکان خود تھانے میں رشوت کی شکل میں لا کر برضا و رغبت پیش کر دے گے۔

بین السطور سے بین السطور تک

اسی پروگرام کے تحت پانچ تازہ غیر طرحی غزلیں حکیم احسان اللہ تسلیم سے اس وعدے پر لکھوا لائے کہ جاڑے میں ان کے (حکیم صاحب کے) مالِ محکم کے لیے پچاس تلیر، بیس تتر، پانچ ہریل اور دو قازنس نذر کر دے گے۔ اور بقرعید پر پانچ خسی بکرے آدھے داموں دھیرج گنج سے خرید کر اور حلوہ کنجشک کے لیے ایک سو ایک نہایت بدچلن چڑوں کے مغز اور ایک درجن سیاہ ریگستانی بچھو (زندہ) خود پکڑ کر رؤسا و والیان ریاست کی مہبتی ادویات کے لیے بھجوائیں گے۔ * حکیم احسان اللہ تسلیم مول گنج کی طوائفوں کے طبیب خاص تو تھے ہی، کانے کے لیے انہیں فرماشی غزلیں بھی لکھ کر دیتے تھے۔ کسی طوائف کے پیہم بھاری ہوتے تو اس کے لیے بطور خاص بہت چھوٹی بحر میں رواں غزل کہتے، تاکہ ٹھیکا اور ٹھکانا پڑے۔ ویسے اس زمانے میں طوائفیں عموماً داغ اور فقیر، بہادر شاہ ظفر کا کلام کاتے تھے۔ حکیم صاحب کسی طوائف پر مائل بہ کرم ہوتے تو مقطع میں اس کا نام ڈال کر غزل اسی کو بخش دیتے۔ بعض طوائفیں مثلاً مشتری، ڈلاری، زہرہ معتبر شاعروں سے غزلیں کہلاتیں اور نہ صرف کانے کی بلکہ غزل کہنے کی بھی داد پاتیں۔ حکیم تسلیم طوائفوں کے تلفظ کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ بقیہ چیزیں ماورائے اصلاح تھیں۔ مطلب یہ کہ گواصلح طلب تھیں، لیکن ناقابل اصلاح۔ تاہم اس زمانے میں طوائفوں اور ان کے پرستاروں کی اصلاح کرنا ادبی فیشن میں داخل تھا۔ حقیقت میں یہ سماجی سے زیادہ خود مصنف کا نفسیاتی مسئلہ ہوتا تھا، جس کا catharsis (تطہیر) ممکن ہو یا نہ ہو، اس کا بیان خالی از علت و لذت نہ تھا۔ ذکرِ گناہ، علِ گناہ سے کہیں زیادہ لذت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ طویل ہو اور جسمانی اور معنوی دونوں لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایلی زولا کی Nana، رسوا کی امراؤ جان ادا، ٹولوزا ٹریک (Toulouse-Lautrec) اور دیکھا (Degas) کی کسبیوں اور قبحہ خانوں کی تصویریں جنسی حقیقت نگاری کے سلسلے کی پہلی کڑی ہیں، جب کہ

* ہم نے بشارت سے پوچھا، بھائی، تم نے اتنے سارے چرندے، پرندے اور گزندے زندہ پکڑ کر مہینا کرنے کی ہمت کیسے بھری؟ بولے، جب مجھے سرے سے کچھ پہلانی ہی نہیں کرنا تھا تو پھر! the more the merrier پھر انہوں نے ہمیں تسلی دی کہ یہ جھوٹ انہوں نے غلطی سے نہیں بولا، عادتاً بولا تھا!

قاری سرفراز حسین کی ”شہید رعنا“ سے ناصحانہ رنگینی کے ایک دوسرے مریض و ملذذ سلسلے کا آغاز ہوتا ہے، جس کی کڑیاں قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط کی خطیبانہ رومانیت اور زہرِ بحث زندگی سے عالمانہ لاعلمی، غلام عباس کی ”آئندہ“ کی پرکار سادگی اور منٹو (+) کی بظاہر کھردری حقیقت نگاری لیکن اصلاً inverted romanticism (معکوس رومانیت) سے جا ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں طوائف سے متعلق رومانی کہانیوں کی نوعیت بالعموم تحفۃ الطوائف کی سی ہوتی ہے۔ ان میں طوائف سے متعلق تمام طفلانہ حیرتوں، خوش گمانیوں، سُنی سنائی باتوں اور رومانی تصورات --- جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے --- سب کا انبارِ گراں بار اس طور لگایا جاتا ہے کہ ہر طرف الفاظ کے طوطا مینا پُچھ کتے چپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ زندہ طوائف کہیں نظر نہیں آتی۔ رومانی ملبے تلے اس کے کھنگھرو کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ اس طوائف کا خمیر عنفوانِ شباب کی مہاسوں بھری ادھ کچری جذباتیت سے اٹھا ہے، جس کی مہک ریسرچ اسکالروں کی رگوں میں دوڑتی پھرتی روشنائی کو مد توں گرمائی رہے گی۔ اس شہرِ آرزو و نژاد طوائف نے اپنی chastity belt کی چابی دریا میں پھینک دی ہے اور اب اسے کسی سے --- حدیہ کہ خود مصنف اور اپنے آپ سے بھی کوئی خطرہ نہیں۔

وہ سر سے ہے تانا خنِ پا، نامِ خدا، برف

بات ساٹھ ستر سال پرانی لگتی ہے، مگر آج بھی اتنی ہی سچ ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ طوائف کو ذلیل اور قابلِ نفرتین گردانتے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے ذکر و تصور میں ایک نیابتی لذت (vicarious pleasure) بھی محسوس کیے بغیر نہ رہتے۔ معاشرے اور طوائف کی اصلاح کے بہانے اس کی زندگی کی تصویر کشی میں ان دونوں متناقض بورژوا جذبوں کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس صدی کے پہلے نصف حصے کا شعر و ادب، بالخصوص فکشن، طوائف کے ساتھ اسی love-hate یعنی دُلا و دھتکار کے اوتار بدلتے تعلق کا عکس ہے۔ اس نے ایک ڈویمانی کو جنم دیا جس میں مذمت بھی مزے لینے کا حیلہ بن جاتی ہے۔ حقیقت نگاری کے پردے میں جتنی داد طوائف کو اردو فکشن لکھنے والوں سے ملی اتنی اپنے شبینہ مکاہوں سے بھی نہ ملی ہو گی۔ البتہ انگریزی فکشن پچھلے تیس برسوں میں بین السطور کا گھونٹ اٹھا کر کھلم کھلا

(+) منٹو ذخیرہ ”الکھک“ بھی تھا۔ کوئے ملامت کے طواف کی اس غریب کو نہ فرصت اور طاقت تھی، نہ استطاعت اور ہوش۔ اسے اس کو پچے کا استہابی ذائقہ تجربہ تھا جتنا ریاض خیر آبادی کو شراب خانے کا۔ ہمارے یہاں شاید یہ استہا ضروری بھی نہیں۔

بین السطور پر اتر آئی۔

قبلہ چوں پیر شود ۔۔۔

مول گنج میں وحیدن بائی کے کوٹھے پر ایک بزرگ جو ہل ہل کر سل پر مسالا پیستے ہوئے دیکھے گئے ، ان کے بارے میں یار لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ تیس برس پہلے جمعہ کی نماز کے بعد وحیدن بائی کے چال چلن کی اصلاح کی نیت سے کوٹھے کے زینے پر چڑھے تھے ۔ مگر اس وقت اس قتالہ عالم کی بھری جوانی تھی ۔ لہذا ان کا مشن بہت طول کھینچ گیا:

کارِ جواں دراز ہے ، اب مرا انتظار کر

وحیدن بائی جب فرسٹ کلاس کرکٹ سے رٹائر ہوئی اور اس مُزن گناہ سے توبہ کرنے کا متکلف کیا جس کے لائق اب وہ ویسے بھی نہیں رہی تھی تو قبلہ عالم کی داڑھی سفید ہو کر ناف تک آگئی تھی ۔ اب وہ اس کی میٹھیوں کے باورچی خانے کے انتظام اور غزلوں اور کاکہوں کے انتخاب میں مرد دیتے تھے ۔ قبلہ چوں پیر شود ۔۔۔ الخ ۔ ۱۹۳۱ میں وہ حج بیت اللہ کو گئی تو یہ نوسو چوبیس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے اس کے ہم رکاب تھے ۔

جو پیدا کسی گھر میں ہوتی تھی دختر

حکیم احسان اللہ تسلیم کا دعویٰ تھا کہ امارت ، طبابت اور شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے ۔ البتہ اول الذکر میں نمایاں کمی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے ۔ ان کے دادا حکیم اختشام حسین رعنا کی قنوج میں اتنی بڑی زمینداری تھی کہ ایک نقشے میں نہیں آتی تھی! اس کا ذکر بڑے فخر و غلو سے کرتے ۔ اب نقشے ان کے اور متعلقہ زمینیں مہاجن کے قبضے میں تھیں ۔ حکیم احسان اللہ تسلیم رنگین مزاج رُو سا کا بھی علاج کرتے تھے ۔ فقط قارورہ دیکھ کر رئیس کا نام بتا دیتے ۔ اور رئیس کی نبض پہ اٹھکی رکھتے ہی یہ نشاندہی کر دیتے کہ مرض کے جراثیم کس کوٹھے کے آوردہ پروردہ ہیں ۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ کسی طوائف کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو رونا پیٹنا مچ جاتا ہے ۔ حکیم تسلیم کے پاس خاندانی میاض کا ایک ایسا مجرب نسخہ تھا کہ شرطیہ لڑکی پیدا ہوتی تھی ۔ یہ سفوف اس رات کے راجہ یا تماش بین خصوصی کو چپکے سے پان میں ڈال کر کھلادیا جاتا تھا۔ نسخے کے تیر بہدف ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کاپور میں کسی کی ذاتی بیوی کے ہاں بھی لڑکی پیدا ہوتی تو وہ میاں کے سر ہو جاتی تھی کہ ہونہ ہو ، تم وہیں سے پان کھا کر آئے تھے!

طوائف کتنی بھی حسین و جمیل اور دشمنِ ایمان و ہوش ہو ، حکیم صاحب کی نیت صرف اس کے پیسے پر بگڑتی تھی ۔ طوائفیں ان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں ۔ اور کہنے والے یہاں تک کہتے تھے کہ ان کے مرنے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں تاکہ سنگِ مرمر کا مزار بنوائیں اور برس کے برس دھوم دھام سے غُرس منائیں ۔

بھکشوؤں کی فینٹسی

مول کچ کا ذکر اوپر کی سطور اور کانپور سے متعلق دوسرے خاکوں میں جا بجا، بلکہ جاوے جا آیا ہے۔ اس محلے میں طوائفیں رہتی تھیں ۔ لہذا تھوڑی سی معذرتی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے ۔ یہ بشارت کا دل پسند موضوع ہے ، جس سے ہمارے قارئین بخوبی واقف و منقص ہو چکے ہوں گے ۔ وہ ہر پتھر کے اس کے ذکر اذکار سے اپنی سنجیدہ گفتگو میں کھنڈت ڈالتے رہتے ہیں ، حالاں کہ بے شک و شبہ وہ دوسرے زمرے کے آدمی ہیں ۔

بازار سے گزرا ہوں ، خریدار نہیں ہوں

جیسے بعض الہجہ لوگوں کو یہ بیکاپ پتی اچھل آتی ہے ، اسی طرح ان کی گفتگو میں طوائف ۔۔۔ موقع دیکھ نہ محل ۔۔۔ چٹم سے آن کھڑی ہوتی ہے ۔ تہجد گزار ہیں ۔ کبھی کے نانا دادا بن گئے ، مگر طوائف ہے کہ کسی طور ان کے سسٹم سے ٹکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتی ۔ ایک دفعہ ہم نے آڑے ہاتھوں لیا ۔ ہم نے کہا ، حضرت ، پرانی داستانوں میں ہیرا اور دیو کی جان کسی طوطے میں ہوتی ہے ۔ مگر آپ کی ہر طوطا کہانی میں طوطے کی جان طوائف میں اٹکی ہوتی ہے! کہنے لگے ، ارے صاحب! میری داستان پر خاک ڈالیے ۔ یہ دیکھیے کہ آج کل کی فکشن اور فلموں میں ہیرا اور ہیروئن سے کون سے مغلیں پڑھوائی جا رہی ہیں ۔ جس نسخے کے مطابق پہلے طوائف کہانی میں ڈالی جاتی تھی ، اب اس ضمن میں شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو زحمت دی جاتی ہے ۔ پڑھنے والے اور فلم دیکھنے والے آج بھی طوائف کو اس طرح اُچک لیتے ہیں جیسے مریض حکیموں کے نسخے میں سے مُنتقی!

عرض کیا، یہ طبی تشبیہ تو طوائف سے بھی زیادہ ancient (پراچین ۔ قدیم) ہے ۔ کون سمجھے گا؟ فرمایا، طوائف کو سمجھنے کے لیے طبِ یونانی سے واقفیت ضروری ہے ۔ اور اس کی الٹ بھی درست ہے ۔ طب اور طوائف ہمارے ہاں بد قسمتی سے لازم و ۔۔۔ ملزمہ ہیں ۔

اور بشارت کچھ غلط نہیں کہتے۔ شاید آج اس کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل ہو۔ طوائف اس دنگلاتے ہوئے معاشرے کے آسودہ حال طبقے کے اعصاب پر ممنوعہ لذت کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ کچھ اس دور ہی سے مختص نہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے دنیا کے سب سے قدیم پیشے کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ایک مقررہ تاریخ تک تمام طوائفیں نکاح کر لیں، ورنہ ان سب کو کشتی میں بھر کر جمنامیں ڈلو دیا جائے گا۔ بیشتر طوائفیں غرقابی کو بانڈی چولہے پر اور مگر مجھ کے جبرے کو ایسے شوہروں پر ترجیح دیتی تھیں جو پیار بھی کرتے ہیں تو فرض عبادت کی طرح۔ یعنی بڑی پابندی کے ساتھ اور بڑی بے دلی اور بے رغبتی کے ساتھ! معدودے چند طوائفوں نے اس دھندے کو خیر باد کہہ کر بہ کراہت نکاح کر لیے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک عقدِ ناکہانی اور ہے

اب ذرا اس کے دوسو برس بعد کی ایک جھلک ”تذکرہ غوثیہ“ میں ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے مؤلف مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اپنے لائق صد احترام پیر و مرشد کے بارے میں ایک معتبر روایت نقل کرتے ہیں: ”ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہلی کی زینت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے، ہمارے دوست کبیل پوش (یوسف خاں کبیل پوش، مصنف تاریخ یوسفی / عجائباتِ فرنگ جوار دو کا اولین سفر نامہ انگلستان ہے) نے ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے۔ چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا اور آپ چنپت ہو گئے۔ پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ پکوا یا ہو گا۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ یوں ہی بٹھا کر چل دیا ہے۔ ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ کم بخت کیوں لایا۔ دو گھڑی بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب! میں آپ کی بھڑک مٹانے یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہ اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور کھانا کھلایا۔“

یاد رہے کہ کبیل پوش ایک آزاد منش، من موچی آدمی تھا۔ یہ قفسہ اس وقت کا ہے جب پیر و مرشد کی صحبت میں اس کی قلبِ مابیت ہو چکی تھی۔ قیاس کیجیے، جس کی خزاں کا یہ رنگ ہو اس کی بہار کیسی رہی ہوگی!

اخیر میں ، اس لطیفے کے تھمنا ڈیڑھ سو سال بعد کے ایک ناخنی نقش * پر بھی اُچٹی سی ہکا ڈالتے چلیں ۔ جوش جیسا قادر الکلام ، عالی نسب ، خوش ذوق اور نفاست پسند شاعر جب نشاطِ ہستی اور مسرتِ بے نہایت کی تصویر کھینچتا ہے تو دیکھیے اس کا قلم غزہ رقم کیا کُل کھلاتا ہے :

کو لھے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات

کو لھے پہ ہاتھ رکھ کر تھرکنے میں چنداں مضائقہ نہیں ، بشرطیکہ کولنا اپنا ہی ہو ۔ دوم ، تھرکنا پیشہ ورانہ فرائض میں داخل ہو ۔ شوقیہ یا اضطراری نہ ہو ۔ مطلب یہ کہ کوئی کو لھے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ مگر اس سے ذات پہچانی جاتی ہے ۔

تو خدا آپ کا بھلا کرے ۔۔۔ اور مجھے معاف کرے ۔۔۔ مول گنج یسواؤں کا چکلہ تھا۔ اس زمانے میں بھی لوگوں کا چال چلن استہابی خراب تھا جتنا اب ہے ، مگر بینائی ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ کسبویں کی بستی کو آج کل کی طرح ”بازارِ حسن“ کہنے لگیں ۔ چکلے کو چکلاہی کہتے تھے۔ دنیا میں کہیں اور بد صورت رنڈیوں کے کوٹھوں اور بے ڈول بے ہنگم جسم کے ساتھ جنسی امراض سیچنے والیوں کی چٹ کوٹھریوں کو اس طرح گلیم اڑ نہیں کیا گیا۔ ”بازارِ حسن“ کی رومانی اصطلاح آگے چل کر ان ادیبوں نے عام کی جو کبھی زنانِ زو دیاب کی بکر منڈی کے پاس سے بھی نہیں گزرے تھے ۔ لیکن ذاتی تجربہ غالباً استناضوری بھی نہیں ۔ ریاض خیر آبادی ساری عمر شراب کی تعریف میں شعر کہتے رہے ، جب کہ ان کی مشروباتی بد پرہیزی کبھی شرت اور سکج بین سے آگے نہیں بڑھی ۔ دور کیوں جائیں ، خود ہمارے ہم عصر شعرا مقتل ، پچانسی گھاٹ ، جلاؤ اور رسی کے بارے میں لپچانے والی باتیں کرتے رہے ہیں ۔ اس کے لیے پچانسی یافتہ ہونا ضروری نہیں ۔ دادِ عیش دینے اور کوچہ شب فروشاں کے طواف کی ہمت یا استطاعت نہ ہو تو ”ہوس سینوں میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں“ ۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہی تصویروں کے رنگ زیادہ چوکے اور خطوط کہیں زیادہ دلکش ہوتے ہیں ۔ کیوں ؟ محض اس لیے کہ خیالی ہوتے ہیں ! اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے frescoes (دیواری تصویریں) اور مجسمے اس کی کلاسیکی مثال ہیں ۔ کیسے بحرے پُرے بدن بنائے ہیں بنانے والوں نے ۔ اور بنانے پر آئے تو بناتے ہی چلے گئے ۔ گداڑہیکر تراشنے

چلے تو ہر sensuous لکیر بل کھاتی، گد راتی چلی گئی۔ سیدھی سبک لکیریں آپ کو مشکل ہی سے نظر آئیں گی۔ حد یہ کہ ناک تک سیدھی نہیں۔ بھاری بدن کی ان عورتوں اور افسروں کے نقوش اپنے نقاش کے آشوبِ تخیل کی چغلی کھاتے ہیں: نارنگی کی قاش ایسے ہونٹ۔ سہار سے زیادہ بھری بھری چھاتیاں جو خود سنگ تراش سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ باہر کو نکلے ہوئے بھاری کولے جن پر ماکر رکھ دیں تو ہر قدم پر پانی، دیکھنے والوں کے دل کی طرح بانس اچھلتا جائے۔ ان گولائیوں کے خم و پیچ کے بیچ بل کھاتی کمر۔ اور پیٹ جیسے جوار بھاٹے میں پیچھے ہٹی ہر۔ پھر وہ ٹانگیں جن کی تشبیہ کے لیے سنسکرت شاعر کو کیلے کے تے کا سہارا لینا پڑا۔۔۔ اس وصل آشنا اور نامحجوب بدن کو اور اس کے حد آرزو تک exaggerated خطوط اور کھل کھیلنے ابھاروں کو ان ترسے ہوئے برہمچاریوں اور بھکشوؤں نے بنایا اور بنوایا ہے جن پر بھوک پلاس حرام تھا اور جنہوں نے عورت کو صرف فینٹسی اور سُننے میں دیکھا تھا۔ اور جب کبھی وہ سُننے میں اتنے قریب آ جاتی کہ اس کے بدن کی آنج سے اپنے ہومیں الاؤ بھڑک اٹھتا تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور وہ ہتھیلی سے آنکھیں ملتے ہوئے سنگلاخ چٹانوں پر اپنے اپنے خواب لکھنے شروع کر دیتے۔

وہ صورت گر کچھ خوابوں کے

مغرب کا سارا Erotic Art اور porn اور رابہب کی فینٹسی کے آگے بالکل پچکانا اور پتلی چھانچھ لگتا ہے۔ ایسے چھتار بدن اور شاخ نہال آرزو کے یہ دھیان و حوہ میں پکے نار پھل * صرف اور صرف وہ تیاگی اور بھکشو بنا سکتے تھے جو اپنی اپنی یثودھرا کو سوتا چھوڑ کر حقیقت اور نروان کی تلاش میں نکلے تھے، پر ساری زندگی بھیگی سیلی تارک گچھاؤں میں جہاں خواب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، پہاڑ کا سینہ کاٹ کاٹ کے اپنا خواب یعنی عورت برآمد کرتے رہے! برس دو برس، جگ دو جگ کی بات نہیں، ان گیانیوں نے پورے ایک ہزار برس اسی متھن کلا (+) میں بتا دیے۔ پھر جب ساری چٹانیں ختم ہو گئیں اور ایک ایک پتھر نے

* نار پھل: کلات، چھب تھنی اور چھاتیوں کے لیے قدیم اردو میں یہ لفظ بہت عام تھا۔ افسوس کہ بہت سے اور خوبصورت لفظوں کی طرح یہ بھی لسانی و ہابیت (puritanism) اور نیک چڑھی ناسخیت کی نذر ہو گیا۔ (+) متھن کلا: قارئین متھن کے معنی لغت میں تلاش کرنے کی بجائے راجندر سنگھ سیدی کی، اسی عنوان کی شاہکار کہانی ”متھن“ ملاحظہ فرمائیں۔ سیدی نے سنگ خارا کا پورا پہاڑ کاٹ کر ایک بت تراشا ہے۔ اور اس قوت اور (بقیہ نوٹ اسکے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

ان کے جیون سوہن کاروپ دھار لیا اور وہ نشیمنت ہو کے اندھیری گچھاؤں سے باہر نکلے تو دیکھا کہ دھرم اور ستیہ کا سورج تو کبھی کا ڈوب چکا اور باہر اب ان کے لیے جنم جنم کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔ سو وہ باہر کے اندھیرے اور ہا ہا کار سے دہشت کھا کے آنکھوں پہ دونوں ہاتھ رکھے پھر سے بھیت کے جانے پہچانے اندھیرے میں چلے گئے ۔

صدیوں روپ سروپ اور شرمکار رس کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والے تپسوی تو مٹی تھے ، سو مٹی میں جا ملے ۔ ان کے خواب باقی رہ گئے ۔ ایسے خواب دیکھنے والے ، ایسے بھٹکنے اور بھٹکانے والے اب کہاں آئیں گے ۔

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہان میں غالب
جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

دیکھیے بات میں بات بلکہ خرافات نکل آئی ۔ مطلب یہ کہ بات حکیم احسان اللہ تسلیم سے شروع ہوئی اور کوٹھے کوٹھے چڑھتی اترتی ، اجنتا اور ایلورا تک پہنچ گئی ۔ کیا کیجیے ، ہمارے یار طرہ دار کا یہی انداز گفتگو ہے ۔ چاند اور سورج کی کرنوں سے چادر بن کر رکھ دیتے ہیں ۔

ہم نے اس باب میں ان کے خیالات کو حتی الوسع انہی کے الفاظ اور توجہ کو بھٹکانے والے انداز میں یکجا کر دیا ہے ۔ اپنی طرف سے کوئی حک و اضافہ نہیں کیا ۔ وہ اکثر کہتے ہیں ”آپ میرے زمانے کے کھٹے کھٹے ماحول ، پاکیزہ محرومیوں اور آرزو مند پاکیزگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ آپ کی اور میری عمر میں ایک نسل کا ۔۔۔ بیس سال کا ۔۔۔ تفاوت ہے۔“

بجا کہتے ہیں ۔ ان کی اور ہماری نسل کے درمیان طوائف حائل ہے ۔

۱۰

مشاعرہ کس نے لُٹا؟

جوہر الہ آبادی ، کاشف کانپوری اور نشور واحدی کو چھوڑ کر ، باقی ماندہ مقامی اور مہمان شاعروں کو تقدیم و تاخیر سے پڑھوانے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا نکلا ، کیوں کہ سبھی ایک دوسرے کے

ضررت کاری سے تراشا ہے کہ محال ہے تیشہ ایک ہی جگہ دوبارہ لگ تو جائے ۔

Erotic Art کا اردو مترادف مجھے معلوم نہیں ۔ اس لیے سِرِ دست یہ اصطلاح وضع کرنی پڑی ۔

ہم پلہ تھے اور ایسی برابر کی ٹکڑ تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کم لغو شعر کون کہتا ہے ، تاکہ اس کو بعد میں پڑھوایا جائے ۔ بہر حال ، اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا گیا کہ شعرا کو حروف تہجی کی الٹی ترتیب سے پڑھوایا گیا ، یعنی پہلے یا اور نگینوی کو اپنی ہوٹنگ کروانے کی دعوت دی گئی ۔ سیدھی ترتیب میں یہ قباحت تھی کہ ان کے استاد محترم جو ہر الہ آبادی کو ان سے بھی پہلے پڑھنا پڑتا۔

مشاعرہ گاہ میں ایک ہڑونگ مچی تھی ۔ خلاف توقع و تخمینہ گرد و نواح کے دیہات سے لوگ جوق در جوق آئے ۔ دریاں اور پانی کم پڑ گیا ۔ سننے میں آیا کہ مولیٰ مجن کے مخالفوں نے یہ اشغلا چھوڑا ہے کہ محفل کے اختتام پر لڈوؤں اور کچوروں کا تبرک اور ملیریا اور رانی کھیت (مرغیوں کی مہلک بیماری) کی دوا کی پڑیاں تقسیم ہوں گی ۔ ایک دیہاتی اپنی دس بارہ بیمار مرغیاں جھابے میں ڈال کے لے آیا تھا کہ صبح تک بچنے کی آس نہیں تھی ۔ اسی طرح ایک کاشتکار اپنی جوان بھینس کو نہلا دھلا کر بڑی امیدوں سے ہمراہ لایا تھا ۔ اس کے کٹے ہی کٹے ہوتے تھے ۔ مادہ بچہ نہیں ہوتا تھا ۔ اسے کسی نے اطلاع دی تھی کہ شاعروں کے میلے میں طواغفوں والے حکیم احسان اللہ تسلیم آنے والے ہیں ۔ سامعین کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جنہوں نے اس سے قبل مشاعرہ اور شاعر نہیں دیکھے تھے ۔ مشاعرہ خاصی دیر سے یعنی دس بجے شروع ہوا جو دیہات کے دو بجے کے عل کے برابر تھا ۔ جو نوجوان والنٹیئر (جنہیں دھیرج گنج والے بالم بیئر کہتے تھے) روشنی کے احتظام کے انچارج تھے ، انہوں نے مارے جوش کے چھ بجے ہی ہنڈے روشن کر دیے ، جو نوبے تک اپنی بہار جانفزا دکھا کے کُل ہو گئے ۔ ان میں دوبارہ تیل اور ہوا بھرنے اور اس عل کے دوران آوارہ لونڈوں کو حسب مراتب و شرارت کاؤڈم کالیاں دے دے کر پرے ہٹانے میں ایک گھنٹہ لگ گیا ۔ ایسا شور و غل تھا کہ کان پڑی کالی سنائی نہیں دیتی تھی ۔ تحصیلدار کو اسی دن کلکٹر نے طلب کر لیا ۔ اس کی غیر موجودگی سے لونڈوں ہاٹیوں کو اور شہ ملی ۔ رات کے بارہ بجے تک صرف ستائیس شاعروں کا جھگٹان ہوا ۔ صدر مشاعرہ مولیٰ مجن کو کسی ظالم نے داد دینے کا انوکھا طریقہ سکھایا تھا ۔ وہ ”سبحان اللہ ! واہ وا! کہنے کے بجائے ہر شعر پر ”مکڑر ارشاد“ کہتے ۔ نتیجہ یہ کہ ۲۷ شاعر ۵۴ کے برابر ہو گئے! ہوٹنگ بھی دوسے ضرب ہو گئی ۔ قادر بارہ بنکوی کے تو مطلع پر ہی سامعین نے متبوسریر اٹھالیا ۔ وہ عاجز آ کر کہنے لگا ”حضرات! سنیے تو ! شعر پڑھا ہے ۔ کالی تو نہیں دی!“ اس پر حاضرین اور بے قابو ہو گئے ۔ قادر بارہ بنکوی نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ایک شخص سے بیڑی مانگ کر بڑے اطمینان

سے سنگالی اور باوازل بلند کہا ”آپ حضرات کو ذری قرار آئے تو دوسرا شعر عرض کروں۔“ بقول مرزا اردو شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جو سامعین نے لوٹ لیا۔

ساغر جالونوی

رات کے بارہ کا عل ہوما۔ چار سو سامعین کا طوطی بول رہا تھا۔ مشاعرے کے شور و شغب سے سہم کر کاؤں کی سرحد پر گیدڑوں تک نے بولنا بند کر دیا۔ ایک مقامی شاعر خود کو ہر شعر پر ہٹ کر وا کے گردن ڈالے جا رہا تھا کہ ایک صاحب چاندنی پر گھٹنوں کے بل چلتے صدر مشاعرہ تک پہنچے۔ دائیں ہاتھ سے آداب کیا اور بائیں سے اپنی مٹن چاپ مونچھ کو، جو کچڑی ہو چلی تھی، تاؤ دیتے رہے۔ انہوں نے درخواست کی کہ میں ایک غریب، غریب الدیار آدمی ہوں* مجھے بھی کلام ناقص سنانے کی اجازت دی جائے۔ (ایک آواز آئی، ناقص صاب کا کلام سنوائے) موصوف نے خبردار کیا کہ اگر پڑھوانے میں دیہر کی گئی تو ان کے مدارج خود بخود بلند ہوتے چلے جائیں گے اور وہ استادوں سے پہلو مارنے لگیں گے۔ انہیں اجازت مل گئی، جس پر انہوں نے کھڑے ہو کر حاضرین کو، دائیں بائیں اور سامنے گھوم کر تین دفعہ آداب کیا۔ ان کی کریم رنگ کی ٹسر کی اپکن اتنی لمبی تھی کہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے پاجامہ پہن رکھا ہے یا نہیں۔ سیاہ نخل کی ٹیڑھی ٹوپی بھیڑ بھڑکے میں سیدھی ہو گئی تو انہوں نے اسے اتار کر اس میں پھونک ماری اور تھنکار کر اور بھی ٹیڑھے زاویے سے سر پر جمالی۔

مشاعرے کے دوران یہ صاحب چھٹی صف میں بیٹھے عجیب انداز سے ”اے سبحان اللہ! اے سبحان اللہ!“ کہہ کر داد دے رہے تھے۔ جب سب تالی بجاتی بند کر دیتے تو یہ شروع ہو جاتے۔ اور اس انداز سے بجاتے گویا روٹی پکا رہے ہیں۔ فرشی آداب و تسلیمات کے بعد وہ اپنی میاض لانے کے لیے اپکن اس طرح اوپر اٹھائے اپنی نشست تک واپس گئے جیسے خود بین و خود آرا خواتین بھری برسات اور چہمتی منظروں کی سہتی سہتی بوچھاڑ میں صرف اتنے گہرے پانی سے بچنے کے لیے جس میں چیونٹی بھی نہ ڈوب سکے، اپنے پائینچے دو دو بالشت اوپر اٹھائے ایک

* ہر ہند کہ ان کا وطن جالون (خورد) وہاں سے کل اٹھارہ میل دور تھا مگر اگلے وختوں میں آدمی اپنی میونسپلٹی کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہی خود کو غریب الوطن کہنے لگتا تھا۔ اور وطن سے مراد صرف شہر یا قصبہ ہوتی تھی۔ صوبے یا ضلع کو کوئی بھی اپنا وطن نہیں کہتا تھا۔

گوارا ناگواری کے ساتھ چلتی ہیں اور دیکھنے والے قدم قدم پہ دعا کرتے ہیں کہ
الہی یہ گمشاد و دن تو برے

اپنی نشست سے انہوں نے میاض اٹھائی جو دراصل اسکول کا ایک پرانا رجسٹر حاضری تھا جس میں امتحان کی پرانی کاپیوں کے خالی اوراق پر لکھی ہوئی غزلیات رکھ لی تھیں۔ اسے سینے سے لٹائے وہ صاحب واپس صدر مشاعرہ کے پہلو میں اپنا کلام سنانے پہنچے۔ ہوشنگ تھی کہ کسی طرح بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ ایسی ہوشنگ نہیں دیکھی کہ شاعر کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد بھی زوروں سے جاری رہے۔ انہوں نے اپنی از کار رنٹہ جیبی گھڑی ایک دفعہ بیٹھنے سے پہلے اور ایک دفعہ بیٹھنے کے بعد بغور دیکھی۔ پھر اسے ڈگڈگی کی طرح ہلایا اور کان سے لٹا کر دیکھا کہ اب بھی بند ہے یا حکم پیل سے چل پڑی۔ اس سے فراغت پائی تو حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا، حضرات! آپ کے چننے سے میرے تو گلے میں خراش پڑ گئی!

ان صاحب نے صدر اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک خاص وجہ سے غیر طرحی غزل پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مگر بوجہ وہ وجہ بتانا نہیں چاہتا! اس پر حاضرین نے شور مچایا، وجہ بتاؤ، وجہ بتاؤ، نہیں تو بدحوہ کر جاؤ! اصرار بڑھا تو ان صاحب نے اپنی اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے غیر طرحی غزل پڑھنے کی یہ وجہ بتائی کہ جو مصرع طرح دیا گیا ہے، اس میں سکتہ پڑتا ہے۔ ثبوت میں انہوں نے تقطیع کر کے دکھادی۔ مرض بروزن فرض باندھا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ مشاعرہ یادگار رہے گا کہ آج کی رات شعرائے کانپور نے غلط العام تعلقہ کو شہرت عام اور بقائے دوام بخش دی۔ سامعین کی آخری صف سے ایک باریش بزرگ نے اٹھ کر نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ یہ مزید چٹکاری چھوڑی کہ الف بھی گرتا ہے!

یہ سننا تھا کہ شاعروں پر الف ایسے گرا جیسے فالج گرتا ہے۔ سکتے میں آگئے۔ سامعین نے آسمان، مصرع طرح اور شاعروں کو اپنے سینگوں پر اٹھا لیا۔ مولیٰ مجنن نے اٹھکی کے اشارے سے مولوی بادل (فارسی ٹیچر) کو بلا کر کان میں پوچھا کہ الف کیسے گرتا ہے؟ وہ پہلے تو چکرائے، پھر مثال میں مصرع طرح پڑھ کے سنا دیا کہ یوں! ایک ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جو ہر الہ آبادی کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر شاعروں کے کہنے کی باری اب ختم ہو چکی تھی۔ پھبتیوں، ٹھٹھوں اور کالیوں کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا عالم تھا کہ اگر اس وقت زمین پھٹ جاتی تو بشارت خود کو مع شعرائے دبستان کانپور اور مولیٰ مجنن کاؤتیکے سمیت اس میں سما جانے کے لیے بخوشی آفر کر دیتے۔

اس شاعر و محترض نے اپنا تخلص ساغر جالونوی بتایا۔

مشاعرہ کیسے لوثا گیا

لوگ بڑی دیر سے اکتائے بیٹھے تھے۔ ساغر جالونوی کے دھماکہ خیز اعتراض سے اونگھتے مشاعرے میں جان ہی نہیں، ہیجان آگیا۔ اس وقت کس کو ہوش تھا کہ اعتراض کی صحت پر غور کرتا۔ ہمارے ہاں ناچ گانا، حکمرانی اور مشاعرہ اکٹل کھرے فن ہیں۔ ان کا سارا مزہ اور بنیاد ہی solo performance پر ہے۔ اسی لیے سیاست میں نعرے اور جلوس اور مشاعرے میں داد اور ہوشنگ ہماری ضرورت، روایت اور سیفٹی والوؤ بن گئے۔ ہمارے ہاں شرکتِ سامعین (audience participation) کی لے دے کے یہی ایک قابلِ قبول صورت ہے جس پر قدغن نہیں۔

دو ہنڈوں کا تیل پندرہ منٹ پہلے ختم ہو چکا تھا۔ کچھ ہنڈوں میں وقت پر ہوا نہیں بھری گئی۔ وہ پُھس کر کے بجھ گئے۔ ساغر جالونوی کے اعتراض کے بعد کسی شرارتی نے باقی ماندہ ہنڈوں کو جھڑھڑایا۔ ان کے مینٹل جھڑتے ہی اندھیرا ہو گیا۔ اب مار پیٹ شروع ہوئی۔ لیکن ایسا گھپ اندھیرا کہ ہاتھ کو شاعر سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ بے قصور سامعین پٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ نام بلکہ تخلص لے لے کر کالیاں دے رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے صدا لگائی، بھائیو! ہٹو! بھاگو! بچو! رنڈیوں والے حکیم صاب کی بھینس رسی شڑا گئی ہے! یہ سنتے ہی کھمسان کی جھگڑ پڑی۔ اندھیری رات میں کالی بھینس تو کسی کو دکھائی نہیں دی، لیکن لاٹھیوں سے مسلح مگر دہشت زدہ دیہاتی سامعین نے ایک دوسرے کو بھینس سمجھ کر خوب دُھنائی کی۔ لیکن یہ آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ پُرانے والوں نے ایسے گھپ اندھیرے میں تمام نئے جوتے کیسے شناخت کر لیے۔ اور جوتوں پر ہی موقوف نہیں، ہر چیز جو پُرانی جاسکتی تھی پُرانی گئی۔۔۔۔۔ پانوں کی چاندی کی تھالی، درجنوں انگوچھے، ساغر جالونوی کی دُگنے سائز کی اچکن جس کے نیچے کرتا یا بنیان نہیں تھا، ایک جازم، تمام چاندیاں، یتیم خانے کے چندے کی چوٹی، حندو پتی مع قفل فولادی، یتیم خانے کا سیاہ پرچم، صدر مشاعرہ کا نمٹلی کاؤتیکہ اور آنکھوں پر لگی عینک، ایک پٹواری کے گلے میں لٹکی ہوئی چاندی کی خلال اور کان کا میل نکالنے کی مٹی ڈوٹی، خواجہ قمر الدین کی جیب میں پڑے ہوئے آٹھ روپے، عطر میں بسا ریشمی رومال اور

پڑوسی کی بیوی کے نام مہکتا خط* ——— حد یہ کہ کوئی گستاخ ان کی ٹانگوں سے پیوست چوڑی دار کارِ شیمی ازار بند ایک ہی جھٹکے میں کھینچ کر لے گیا۔ ایک شخص بچھا ہوا ہنڈا سر پہ اٹھا کے لے گیا۔ مانا کہ اندھیرے میں کسی نے سر پر لے جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا، مگر ہنڈا لے جانے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ بیمار مرغیوں کے صرف چند پر پرے رہ گئے۔ ساغر جالونوی کا بیان تھا کہ کسی نابکار نے اس کی مونچھ تک اکھاڑ کر لے جانے کی کوشش کی جسے اس نے اپنی ہر وقت چیخ سے ناکام بنادیا۔ غرض کہ قطع نظر اس سے کہ کار آمد ہے یا نہیں، جس کا جس چیز پر ہاتھ پڑا، اسے اٹھا کے، اتار کے، نوچ کے، پھاڑ کے، اکھاڑ کے لے گیا۔ حد یہ کہ تحصیلدار کے پیش کار منشی بنواری لال ماتھر کے زیر استعمال ڈینچرز بھی! فقط ایک چیز ایسی تھی جس کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ شاعر اپنی اپنی بیاضیں جس جگہ چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ دوسرے دن تک وہیں پڑی رہیں۔

باہر سے آئے ہوئے دیہاتیوں نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ بھی مشاعرے کے اختتامیہ آداب میں داخل ہے، مار پیٹ اور لوٹ کھسوٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بعد کو بہت دن تک ہر آئے گئے سے بڑے اشتیاق سے پوچھتے رہے کہ اب دوسرا مشاعرہ کب ہو گا۔

کئی پُشتوں کی نالائقی کا نچوڑ

یہ شاعر جو بھونچال لایا، بلکہ جس نے سارا مشاعرہ اپنی مونچھوں پر اٹھالیا، بشارت کا خانساں نکلا (+)، پرانی ٹوپی اور اُترن کی اپکن کا خلعت اسے گزشتہ عید پر ملتا تھا۔ راہ چلتوں کو پکڑ پکڑ کے اپنا کلام سناتا۔ سننے والا دہیتا تو اسے کھینچ کر لپٹا لیتا۔ داد نہ دیتا تو خود آگے بڑھ کر اس سے لپٹ جاتا۔ اپنے کلام کے الہامی ہونے میں اسے کوئی شبہ نہ تھا۔ شبہ اوروں کو بھی

* چینی اور چرائی ہوئی اشیاء میں فقط یہی چیز تھی جو دوسرے دن برآمد ہوئی۔ یہی نہیں، اس کی نقول قبے میں گھر گھر تقسیم ہوئیں۔

(+) ممکن ہے ہمارے بعض قارئین کو اس میں غلو کا شبہ نظر آئے کہ اس کتاب کا ہر تیسرا کردار شاعر ہے یا کم از کم تخلص کا ذمہ جملہ ضرور رکھتا ہے پھر تا ہے۔ اس کی وضاحت اور دفاع میں ہم حضرت رئیس امرہوی کا قول فیصل نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں ”ہمارے معاشرے میں تخلص رکھنا اور ٹک بند کرنا لازمہ تصور کیا جاتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں بے تخلص کے خاندانی شخص کو ذمہ لکنا بھینسایا بے سینگوں کا میل تصور کیا جاتا تھا۔ امارت، فارغ البالی اور اقبال مندی کا دور کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ اور اب ہمارے بزرگوں کے لیے لطفِ معاشرت اور لطافتِ معاشرہ صرف شرطِ بازی اور شرطِ ازی میں رہ گئی تھی۔“

نہیں تھا، کیوں کہ محض عقل یا خالی خولی علم کے زور سے کوئی شخص ایسے تمام و کمال خراب شعر نہیں کہہ سکتا تھا۔ دو مصرعوں میں اتنے سارے فنی نقائص و اسقام کو اتنی آسانی سے سمو دینا تائید غیبی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ فکر سخن میں اکثر یہ بھی ہوا کہ ابھی مصرع پر ٹھیک سے گرہ بھی نہیں لگی تھی کہ ہنڈیا دھواں دینے لگی۔ سالن کے بچے لگ گئے۔ پانچویں جماعت تک تعلیم پائی تھی، جو اس کی ذاتی ضروریات اور سہار سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اپنی مختصر سی انگریزی لفظیات اور تازہ شعر کو ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اگر آپ اس سے دس منٹ بھی بات کریں تو اسے انگریزی کے جتنے بھی الفاظ آتے تھے وہ سب آپ پر داغ دیتا۔ اپنے تئیں ساغر صاحب کہلاتا، لیکن گھر میں جب خانسماں کے فرائض انجام دے رہا ہوتا تو اپنے نام عبدالقیوم سے پکارا جانا پسند کرتا۔ ساغر کہہ کر بلائیں تو بہت بُرا مانتا تھا۔ کہتا تھا، نوکری میں ہاتھ بیچا ہے، تخلص نہیں بیچا۔ خانسماں گیری میں بھی تعلیٰ شاعرانہ سے باز نہ آتا۔ خود کو واجد علی شاہ، تاجدار اودھ، کا خاندانی رکبدار بتاتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں فارسی میں لکھی ڈیڑھ سو سالہ پرانی خاندانی بیاض دیکھ دیکھ کر کھانا پکاتا ہوں۔ اس کے ہاتھ کا بد مزہ سالن در حقیقت کئی پشتوں کی جمع شدہ نالائقی کا نچوڑ ہوتا تھا۔

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اس کا دعویٰ تھا کہ میں ایک سو ایک قسم کے پلاؤپکاسکتا ہوں۔ اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ بشارت ہر اتوار کو پلاؤپکواتے تھے۔ سال بھر میں کم از کم باون مرتبہ تو ضرور پکایا ہو گا۔ ہر دفعہ ایک مختلف طریقے سے خراب کرتا تھا۔ صرف وہ کھانے ٹھیک پکاتا تھا جن کو مزید خراب کرنا معمولی قابلیت رکھنے والے آدمی کے بس کا کام نہیں۔ یا ایسے کھانے جو پہلے ہی کسی کھانے کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ مثلاً کچھڑی، آلو کا بھرتا، لگی ہوئی فیرفی، شب دیگ، کچڑا، ارہر کی دال، اور منتجن جس میں میٹھے چاولوں کے ساتھ گوشت اور نیبو کی تُرشنی ڈالی جاتی ہے۔ پھوپھڑ عورتوں کی طرح کھانے کی تمام خرابیوں کو مرچ سے اور کلام کی جملہ خامیوں کو ترنم سے دور کر دیتا تھا۔ میٹھا بالکل نہیں پکاسکتا تھا، اس لیے کہ اس میں مرچ ڈالنے کا رواج نہیں۔ اکثر چاندنی راتوں میں جغرافیہ ٹیچر کو اسی کے بیخوبہ پر اپنی غزلیں کا کے سناتا، جنہیں سن کر وہ اپنی محبوبہ کو جس کی شادی مراد آباد میں ایک پیتل کے اکالداں بنانے والے سے ہو گئی تھی، یاد کر کر کے کھرج میں روتا تھا۔ کھانے کی جو طرز ساغر نے بغیر کسی کاوش کے ایجاد کی تھی، اس سے گریہ کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔

بشارت نے ایک دن چھیڑا کہ بھئی، تم ایسی مشکل زمینوں میں ایسے اچھے شعر نکالتے ہو۔ پھر خانساں گیری کا ہے کو کرتے ہو؟ کہنے لگا، آپ نے میرے دل کی بات پوچھ لی۔ اچھا کھانا پکانے کے بعد جو روحانی انشراح ہوتا ہے وہ شعر کے بعد نہیں ہوتا۔ کس واسطے کہ کھانا پکانے میں اوزان کا کہیں زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کھانے والا جسے برا کہہ دے اسے برا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کھانا پکانے میں محنت بھی زیادہ پڑتی ہے۔ اسی لیے تو آج تک کسی شاعر نے باورچی کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔

شاعری کو ساغر جالونوی نے کبھی ذریعہ عزت نہیں سمجھا، جس کی ایک وجہ تو غالباً یہ تھی کہ شاعری کی وجہ سے اکثر اس کی بے عزتی ہوتی رہتی تھی۔ فنِ طباطبائی میں جتنا دماغ دار تھا، شاعری کے باب میں اتنی ہی کسر نفسی سے کام لیتا تھا۔ اکثر بڑے کھلے دل سے اعتراف کرتا کہ غالب اردو میں فارسی شعر مجھ سے بہتر کہہ لیتا تھا۔ میر کو مجھ سے کہیں زیادہ تنخواہ اور داد ملی۔ دیانت داری سے اتنا تسلیم کرنے کے بعد یہ اضافہ ضرور کرتا، حضور! وہ زمانے اور تھے۔ اسانہ صرف شعر کہتے اور شاگردوں کی غزلیں بناتے تھے، کوئی ان سے چپاتی نہیں بنواتا تھا۔

یہ کون حضرت آتش کا ہم زباں نکلا

اس میں شک نہیں کہ بعضاً بعضاً شعر بڑا دم پخت نکالتا تھا۔ کچھ شعر تو واقعی ایسے تھے کہ میر و آتش بھی ان پر ناز کرتے، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ انہیں کے تھے! خود کو کیے از تلامیذ الرحمن اور اپنے کلام کو الہامی بتاتا تھا۔ چنانچہ ایک عرصے تک اس کے نیاز مند اسی خوش گمانی میں رہے کہ سرقہ نہیں، الہام میں توارد ہو جاتا ہے۔ ردولی میں ایک دفعہ اپنی تازہ غزل پڑھ رہا تھا کہ کسی گستاخ نے بھرے مشاعرے میں ٹوک دیا کہ یہ شعر تو ناخن کا ہے۔ سرقہ ہے، سرقہ! ذرا جو گھبرایا ہو۔ الٹا مسکرایا۔ کہنے لگا ”غلط! بالکل غلط! آتش کا ہے!“

پھر اپنی میاض صدرِ مشاعرہ کی ناک کے نیچے بڑھاتے ہوئے بولا ”حضور! ملاحظہ فرما لیجیے“۔ یہ شعر میاض میں inverted commas (اٹے واوین) میں لکھا ہے۔ اور آگے آتش کا نام بھی دیا ہے ”صدرِ مشاعرہ نے اس کی تصدیق کی اور اعتراض کرنے والا اپنا سامنہ لے کے رہ گیا۔

ساغر اپنے وطن مالوف جالون خور کی نسبت سے پیار میں ساغر خور دکھلاتا تھا۔ مگر وہ خود اپنا رشتہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری سے جوڑتا اور زبان کے معاملے میں دلی والوں اور اہل

پنجاب سے انتہائی تعصب برتتا تھا۔ چنانچہ صرف شعرائے لکھنؤ کے کلام سے سرقہ کرتا تھا۔

۱۱

ترے کو چے سے ہم نکلے

ہنگامے کے بعد کسی کو مہمان شاعروں کا ہوش نہ رہا۔ جس کے جہاں سینک سہائے وہیں چلا گیا۔ اور جو خود اس لائق نہ تھا اسے دوسرے اپنے سینگوں پر اٹھا کے لے گئے۔ کچھ رات کی ہڑوٹ کی خفت، کچھ روبیہ نہ ہونے کے سبب بد انتظامی، بشارت اس لائق نہ رہے کہ صبح شاعروں کو منہ دکھا سکیں۔ مولیٰ مجت کے ”علی الحساب“ دیے ہوئے دس روپے کبھی کے چٹنی ہو چکے تھے۔ بلکہ وہ اپنی گرہ سے بہتر روپے خرچ کر چکے تھے اور اب اتنی استطاعت نہیں رہی تھی کہ شاعروں کو واپسی کے ٹکٹ دلوا سکیں۔ منہ پر انگو چھا ڈال کر ٹھپتے چھپاتے دینیات ٹیچر کے خالی گھر گئے۔ ولزلی ان کے دم کے ساتھ لگا تھا۔ تالا توڑ گھر میں داخل ہوئے اور دن بھر منہ چھپائے پڑے رہے۔ سہ پہر کو ولزلی کو زنجیر اتار کر باہر کر دیا کہ بیٹا جا۔ آج خود ہی جہاں جی چاہے فراغت کر آ۔ بچہ ہوئے شعرائے کانپور کا غول پہلے تو ان کی تلاش میں گھر گھر جھانکتا پھرا۔ آخر تھک ہار کر پایادہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ سو دو سو قدم چلے ہوں گے کہ لوگ ساتھ آتے گئے اور باقاعدہ جلوس بن گیا۔ قصبے کے تمام نیم برہنہ بچے، ایک مکمل برہنہ پاگل (جسے اس زمانے کے عام عقیدے کے مطابق لوگ مجذوب سمجھ کر سٹے کا نمبر اور قسمت کا حال پوچھتے تھے) اور میونسپل حدود میں کاٹنے والے تمام کتے انہیں اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ جلوس کے آخر میں ایک سادھو بھوت رمائے، بھنگ پیے اور تین کٹ کھنی بٹخیں بھی اکڑے

ہوئے فوجیوں کی ceremonial چال یعنی اپنی ہی چال ——— goose step ———

چلتی شریک ہنگامہ تھیں۔ راستے میں گھروں میں آٹا گوند حتی، سانی بناتی، روتے ہوئے بچے کا منہ غذائی غدود سے بند کرتی اور لپائی پٹائی کرتی ہوئی عورتیں اپنا اپنا کام چھوڑ کر، سنے ہوئے ہاتھوں کے طوطے سے بنائے جلوس دیکھنے کھڑی ہو گئیں۔ ایک بندر والا بھی اپنے بندر اور بندریا کی تسی پکڑے یہ تماشا دیکھنے کھڑا ہو گیا۔ بندر اور لڑکے بار بار طرح طرح کے منہ بنا کر ایک دوسرے پر خونخواتے ہوئے لپکتے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کی نقل اُتار رہا ہے۔

آتے وقت جن نازک مزاجوں نے اس پر ناک بھوس چڑھائی تھی کہ ہمیں میل کاٹیوں میں لا کر لایا گیا، انہیں اب جاتے وقت یہ شکایت تھی کہ بیدل کھدڑے گئے۔ چلتی ٹرین

میں چڑھتے چڑھتے حیرت کانپوری ایک قلی سے یہ کہہ گئے کہ اس نابکار، ناہنجار (بشارت) سے یہ کہہ دینا کہ ذرا دھیرج گنج سے باہر نکل - تجھ سے کانپور میں منٹ لیں گے - سب شاعروں نے اپنی جیب سے واپسی کے ٹکٹ خریدے، سوائے اس شاعر کے جو اپنے ساتھ پانچ مصرع اٹھانے والے لایا تھا - یہ صاحب اپنے مصرع برداروں سمیت آدھے راستے ہی میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں اتار لیے گئے - پلیٹ فارم پر چند دردمند مسلمانوں نے چندہ کر کے ٹکٹ چیکر کو رشوت دی، تب کہیں ان کو رہائی ملی - ٹکٹ چیکر مسلمان تھا، ورنہ کوئی اور ہوتا تو چھوٹوں کے ہتھکڑی ڈلوادیتا -

بات اک رات کی

صرف ”بے عزت شدہ“ شعرا ہی نہیں، کانپور کی ساری شاعر برادری بشارت کے خون کی پیاسی تھی - ان شاعروں نے ان کے خلاف استاپر ویسینڈ آکیا کہ چند ایک نثر نگار بھی ان کو کچا چبا جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے - کانپور میں ہر جگہ اس مشاعرے کے چرچے تھے - دھیرج گنج جانے والے شاعروں نے اپنی ذلت و خواری کی جو داستانیں، بڑھا پڑھا کر بیان کیں وہ اگر سچ نہیں بھی تھیں تب بھی سننے والے دل سے چاہتے تھے کہ خدا کرے سچ ہی ہوں کہ وہ اسی سلوک کے مستحق تھے - لوگ کرید کرید کے تفصیلات سنتے - ایک شکایت ہو تو بیان کریں - اب کھانے ہی کو لیجیے - ہر شاعر کو شکایت تھی کہ رات کا کھانا ہمیں دن دھاڑے چار بجے اسی کاشتکار کے ہاں کھلوا گیا جس کے ہاں سُلوا یا گیا - ظاہر ہے ہر کاشتکار نے مختلف قسم کا کھانا کھلایا - چنانچہ جتنی اقسام کے کھانے تھے اتنی ہی اقسام کے امراض معدہ میں شاعروں نے خود کو مبتلا بتلایا - حیرت کانپوری نے شکایت کی کہ میں نے غسل کے لیے گرم پانی مانگا تو چودھرائن نے گھونٹ اٹھا کے مجھے نزدیک ترین کنوئس کا راستہ بتا دیا - اس یقین دہانی کے ساتھ کہ اس میں سے گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم پانی نکلتا ہے! چودھری نے تو کنایت غایت غسل بھی دریافت کی - (یہ اس زمانے کا بہت عام اور بھونڈا مذاق تھا) اور جب میں نے غسل کیے بغیر اپکن پہن لی اور مشاعرے میں جانے لگا تو چودھری نے میری گود میں اپنا دو ماہ کا تنگ دھڑنگ فرزند دے کر زبردستی تصدیق چاہی کہ نومولود اپنے باپ پر پڑا ہے - میرا کیا جاتا تھا - میں نے کہہ دیا، ہاں! اور بڑی شفقت سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا، جس سے مشتعل ہو کر اس نے میری اپکن پر پیشاب کر دیا - اسی اپکن کو پہنے پہنے میں نے مقامی شعرا کو گلے لگایا -

پھر فرمایا کہ بندہ آبرو ہتھیلی پہ رکھے، ایک بجے مشاعرے سے لوٹا۔ تین بجے تک چارپائی کے اوپر کھٹمل اور نیچے چوہے کللیں کرتے رہے۔ تین بجتے ہی گھر میں ”صبح ہو گئی!“ صبح ہو گئی!“ کا شور مچ گیا۔ اور یہ شکایت تو سب نے کی کہ صبح چار بجے ہی ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا اور ایک ایک لوٹا ہاتھ میں پکڑا کے جھڑی کی جھاڑیوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔ حیرت کا پوری نے پروٹسٹ کیا تو انہیں نومو لوڈ کے پوٹڑے کے نیچے سے ایک چادر گھسیٹ کر پکڑا دی گئی کہ ایسا ہی ہے تو یہ اوڑھ لینا! شاعروں کا دعویٰ تھا کہ اس دن ہم نے گاؤں کے مرغوں کو کچی نیند اٹھا کر اذانیں دلوائیں!

کچھ نے شکایت کی کہ ہمیں ”ٹھوس“ ناشتہ نہیں دیا گیا۔ نہار منہ فٹ بھر لمبے گلاس میں نمکین چھاچھ پلا کر رخصت کر دیا۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کی کھاٹ کے پائے سے بندھی ہوئی ایک بکری ساری رات مینگنی کرتی رہی۔ منہ اندھیرے اسی کا دودھ دوہ کر انہیں پیش کر دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلوک تو کوئی بکرا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ خروش شاہ جہاں پوری نے کہا کہ ان کے سرخانے رات کے ڈھائی بجے سے چکی چلنی شروع ہو گئی۔ چکی پسینے والی دونوں لڑکیاں ہنس ہنس کے جوگیت گا رہی تھیں وہ دیور بھوج اور تندوئی اور سلج کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق تھا، جس سے ان کی نیند اور نیت میں خلل واقع ہوا۔ اعجاز امرہوی نے کہا کہ بھانت بھانت کے پرندوں نے صبح چار بجے سے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ ایسے میں کوئی شریف آدمی سو ہی نہیں سکتا۔

مجنوب متھراوی کو شکایت تھی کہ انہیں کچے صحن میں جامن کے بیڑ تلے چمچروں کی چھاؤں میں سلایا گیا۔ پُروا کے ہر فرحت بخش جھونکے کے ساتھ رات بھر ان کے سر پر جامنیں ٹپکتی رہیں۔ صبح اٹھ کر انہوں نے شکایت کی تو صاحب خانہ کے میٹرک فیل لوٹڈے نے کہا، غلط! جامنیں نہیں۔ پتھلینڈے تھے۔ میں نے خود لکھنؤ والوں کو پتھلینڈے کہتے سنا ہے۔ مجنوب متھراوی کے بیان کے مطابق ان کی چارپائی کے پاس کھوٹے سے بندھی ہوئی بھینس رات بھر ڈراتی رہی۔ کچر دم ایک پتہ دیا جو سیدھا ان کی چھاتی پر آن کر گرتا اگر وہ کمال چابکدستی سے بچ میں ہی کچھ نہ لے لیتے شیدا جاڑ چوی نے اپنی بے عزتی میں بھی یکتائی اور فخر و مباہات کا پہلو نکال لیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ جیسی بے مثال بے عزتی ان کی ہوئی ایسی تو ایشیا بھر میں کبھی کسی شاعر کی نہیں ہوئی۔ رعنا سیتا پوری ثم کا کوری نے شکوفہ چھوڑا کہ جس گھر میں مجھے سلایا گیا، بلکہ یوں کہیے کہ رات بھر جگایا گیا، اس میں ایک ضدی بچہ ساری رات شیر مادر کے لیے اور اس کا باپ

موخر الذکر کے لیے چلتا رہا۔ انگر کانپوری جانشین مائل دہلوی بولے کہ ان کا کاشتکار میزبان ہر آدمہ گھنٹے بعد اٹھ اٹھ کر ان سے پوچھتا رہا کہ ”جناب عالی، کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ نیند تو ٹھیک آ رہی ہے نا؟“

غرض کہ جتنے منہ ان سے دگنی گنتی شکایتیں۔ ہر شاعر اس طرح شکایت کر رہا تھا گویا اس کے ساتھ کسی منظم سازش کے تحت ذاتی ظلم ہوا ہے۔ حالانکہ ہوا ہوا یا کچھ نہیں۔ ہوا صرف یہ کہ ان شہری تلامیذ الرحمن نے دیہات کی زندگی کو پہلی مرتبہ۔۔۔۔۔ اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔۔۔۔۔ ذرا قریب سے دیکھ لیا اور پلٹا اٹھے۔ ان پر پہلی مرتبہ کھلا کہ شہر سے صرف چند میل کی اوٹ میں انسان کیوں کر جیتے ہیں۔ اور اب ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہی کچھ ہے تو کا ہے کو جیتے ہیں۔

سکتے نکلو الو!

کچھ دن بعد یہ بھی سننے میں آیا کہ جن طرحی غزل پڑھنے والوں کی بے عزتی ہوئی تھی انہوں نے تہیہ کیا ہے کہ آئندہ جب تک کسی استاد کے دیوان میں خود اپنی آنکھ سے مصرع طرح نہ دیکھ لیں، ہر گز ہرگز اس زمین میں شعر نہیں نکالیں گے۔ ان میں سے دو شاعروں نے ساغر جالونوی سے اصلاح لینی اور غزلیں بنوانی شروع کر دیں۔ ادھر استاد انگر کانپوری جانشین مائل دہلوی کی دکان خوب چمکی۔ ان کے سامنے اب روزانہ درجنوں نئے شاگرد زانوئے تلمذ تہ کرنے لگے کہ انہوں نے اصلاح کی ایک مخصوص صنف میں اسپیشلائز کر لیا تھا۔ وہ صرف سیکتے نکالتے تھے اور اس طرح نکالتے تھے جیسے پہلوان لات مار کر کرکے چک نکال دیتے ہیں۔ یا جس طرح بارش میں بھیگنے سے بان کی اکڑی ہوئی چارپائی پر محلے بھر کے لونڈوں کو کُودا کر اس کی کان نکلی جاتی ہے۔ اس طرح کان تو محل جاتی ہے، لیکن لونڈوں کو پرانی چارپائی پر کودنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔

مائی ڈیر مولوی ججن!

دن تو جوں توں کاٹا، لیکن شام پڑتے ہی بشارت ایک قریبی گاؤں سک گئے۔ وہاں اپنے ایک واقف کار کے ہاں (جس نے چند ماہ پیشتر ایک یتیم تلاش کرنے میں مدد دی تھی) انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ ابھی جو توں کے تسے بھی نہیں کھولے تھے کہ اپنے ہر جاتے والے کو مختلف ذرائع سے اپنے انتہائی خفیہ زیر زمین محل وقوع سے آسما کرنے کا انتظام کیا۔ انہوں نے دحیرج گنج میں سوا سال رورو کے گزارا تھا۔ دیہات میں وقت بھی بیل گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ انہیں اپنی قوت برداشت پر تعجب ہونے لگا۔ رزق کی سب راہیں مسدود نظر آئیں تو

ناگوارا رفتہ رفتہ گوارا ہو جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان کا کوئی اسکول ایسا نہیں بچا جس کا نام انہیں معلوم ہو اور جہاں انہوں نے درخواست نہ دی ہو۔ آسام کے ایک مسلم اسکول میں انہیں جمناسٹک ماسٹر تک کی ملازمت نہ ملی۔ چارپانچ جگہ اپنے خرچ پر جا کر انٹرویو میں بھی ناکام ہو چکے تھے۔ ہر ناکامی کے بعد انہیں معاشرے میں ایک نئی خرابی نظر آنے لگی جسے صرف خونی انقلاب سے دور کیا جاسکتا تھا، لیکن جب کچھ دن بعد ایک دوست کے توسط سے سندیلہ کے ہائی اسکول میں مقرر کا خط ملا تو دل نے بے اختیار کہا کہ میاں!

ایسا کہاں خراب جہاں خراب ہے

دس بارہ مرتبہ خط پڑھنے اور ہر باز نئی مسرت کشید کرنے کے بعد انہوں نے چار لائن والے کاغذ پر خط شکست میں استعفیٰ لکھ کر مولیٰ جتن کو بھجوا دیا۔ ایک ہی جھگٹے میں بیڑی اتار پھینکی۔ اسے رقم کرتے ہوئے وہ آزادی کے ایک بھک سے اُڑا دینے والے نشتے سے سرشار ہو گئے۔ چنانچہ ”عرض“ کی رکی دم رعونت سے بل کھا کر رض کی آنکھ میں گھس گئی اور ”استعفیٰ“ کی سی نے ہیکڑی سے پیرپسار دیے۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد وہ انگریزی میں اپنے دستخط کی جلیبی سی بنانے لگے تھے۔ آج فضل مولا سے وہ جلیبی، امرتی بن گئی! مولیٰ جتن کو خط کا مضمون پڑھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ سوادِ خط کے ہر شوشے سے سرکشی، ہر مرکز سے تکبر اور ایک ایک دائرے سے استعفیٰ ٹپک رہا تھا۔ بشارت نے لفافے کو حقارت میں لعابِ دہن ملا کر اس طرح بند کیا گویا مولیٰ جتن کے منہ پر تھوک رہے ہوں۔ دستخط کرنے کے بعد سرکاری ہولڈر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اپنے آقائے ولی نعمت مولوی سید محمد مظفر کو حضور فیض گنجور یا مکرمی و معظّمی لکھنے کے بجائے جب انہوں نے اردو خط میں مائی ڈیئر مولوی جتن لکھا تو وہ کاٹا جوسوا سال میں ان کے تلوے کو چھیدتا ہوا تالو تک پہنچ چکا تھا، بکھلت نکل گیا۔ اور اب انہیں اس پر تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے پھٹیچر آدمی سے وہ سوا سال تک اس طرح اپنی اوقات خراب کرواتے رہے! انہیں ہو کیا گیا تھا؟ خود مولیٰ جتن کو بھی غالباً اُس کا احساس تھا۔ اس لیے کہ جب بشارت انہیں خدا کے حوالے کرنے گئے، مطلب یہ کہ خدا حافظ کہنے گئے تو موصوف نے ہاتھ تو ملایا، آنکھیں نہ ملا سکے، جب کہ بشارت کا یہ حال تھا کہ ”آداب عرض“ بھی اس طرح کہا کہ ہلچے میں ہزار کالیوں کا غبار بھراتھا۔

بشارت نے بہت سوچا۔ ناز کو تحفے میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وقتِ رخصت اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ اس

نے کہا، اللہ! میں اس کا کیا کروں گی؟ پھر وہ اپنی کوٹھری میں گئی اور چند منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے انگوٹھی میں اپنے گھنگنارے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر انہیں لوٹا دی۔ وہ دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

تم تو اتنے بھی نہیں جتنا ہے قد تلوار کا!

سندیلا ہائی اسکول میں اور توسب کچھ ٹھیک تھا، لیکن میٹرک میں تین چار پر اہم لڑکے عمر میں ان سے بھی تین چار برس بڑے تھے۔ یہ لڑکے جو ہر کلاس میں دو دو تین تین سال دم لیتے میٹرک تک پہنچتے تھے اپنی عمر سے اتنے محبوب نہیں تھے جتنے کہ خود بشارت۔ جیسے وہ گولا جو اس کلاس میں قدم رکھتے ہی ان کے حلق میں پھنس جاتا تھا، تحلیل ہوا اور اسکول میں ان کے پیر جھے، انہوں نے اپنے ایک دوست سے جو لکھنؤ سے تازہ تازہ ایل ایل بی کر کے آیا تھا، مولوی مظفر کو ایک قانونی نوٹس بھجوا دیا کہ میرے مؤکل کی دس مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیجیے، ورنہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی جس سے اسکول کی جملہ بے ضابطگیوں اور بدعنوانیوں کا طشت ازبام ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔

اس کے جواب میں دو ہفتے بعد مولوی مظفر کی جانب سے ان کے وکیل کار جسٹریڈ نوٹس آیا کہ مشاعرے کے سلسلے میں جو ”رقومات“ آپ کو وقتاً فوقتاً علی الحساب دست گرداں دی گئیں، ان کا حساب دیے بغیر آپ فرار ہو گئے۔ آپ اس واجب الادا رقم میں سے اپنے واجبات وضع کر کے، بقیہ رقم فوراً بذریعہ منی آرڈر میرے مؤکل کو بھیج دیجیے۔ مشاعرے کے اخراجات کا گوشوارہ مع اصل رسیدات ہواپسی ڈاک ارسال کر سں۔ شاعروں کو جو معاوضہ، بھتہ، اور سفر خرچ دیا گیا اس کی رسیدات بھی منسلک کر سں۔ بصورت دیگر وجہ ظاہر کر سں کہ کیوں نہ آپ کے خلاف عدالت مجاز میں چارہ جوئی کی جائے۔ ہر خرچہ آپ کے ذمہ ہو گا۔ نیز شاعروں کے استقبال کے دوران آپ نے یتیم خانے کے مینڈے سے اپنی ایک غزل بھجوائی جس کے ایک سے زائد اشعار فحش تھے۔ مزید برآں، وزن سے گرے ہوئے مصرع طرح دینے سے اسکول کی تعلیمی شہرت اور اہلیان دحیرج گنج کی املاک منقولہ کو جو نقصان پہنچا اس کا ہر جانہ قرار واقعی وصول کرنے کا حق مجلس منتظمہ محفوظ رکھتی ہے۔ نوٹس میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر رقم واپس نہ کی گئی تو بدرجہ مجبوری خیانت مجرمانہ کے کیس کی پوری تفصیلات سے سندیلا اسکول کے منتظمین اور گورنمنٹ کے محکمہ تعلیمات کو آگاہ کر دیا جائے گا۔

نوٹس سے تین دن پہلے مولیٰ مجن نے ایک ٹیچر کی زبانی بشارت کو کہلا بھیجا کہ بر خودار! تم ابھی بچے ہو۔ گر وگھنٹال سے کاہے کو ابھتے ہو۔ ابھی تو نام خدا تمہارے گولیاں اور ٹکلی ڈنڈا کھیلنے اور چاری گود میں بیٹھ کر عیدی مانگنے کے دن ہیں۔ اگر ٹکری تو پر خچے اڑا دوں گا۔

سگِ مردم گزیدہ

بشارت کی رہی سہی مدافعت کا لڑکھانا قلعہ ڈھانے کے لیے مولیٰ مجن نے نوٹس کے آخری پیرا گراف میں ایک ٹائم بم رکھوا دیا۔ لکھا تھا کہ جہاں آپ نے محکمہ تعلیمات کو اپنے خط کی منقل ارسال کی، وہاں اس کے علم میں یہ بات بھی لانی چاہیے تھی کہ آپ نے اپنے کتے کا نام سرکار برطانیہ کے گورنر جنرل کی تذلیل و تحقیر کی نیت سے لارڈ وولزی رکھا۔ آپ کو بارہا وار تک دی گئی مگر آپ حکومت کے خلاف ایک لینڈی کتے کے ذریعے نفرت اور بغاوت کے جذبات کو ہوا دینے پر مُصر رہے جس کی شہادت قصبہ کا پتہ دینے کو تیار ہے۔ نیز بغاوت اور انگریز دشمنی کے جنون میں آپ اپنے تئیں فخریہ اور علانیہ ٹیپو کہلاتے تھے!

بشارت سکتے ہیں آگئے۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا؟

وہ دیر تک اداس اور فکر مند بیٹھے رہے۔ وولزی ان کے پیروں پر اپنا سر رکھے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ وقفے وقفے سے آنکھ کھول کر انہیں دیکھ لیتا تھا۔ ان کا جی ذرا ہلکا ہوا تو وہ دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پیار سے زیادہ احساس تشکر کے ساتھ۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پتھر کی چوٹ کا نشان نہ ہو۔

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ ”یہ بے تنگ و نام ہے!“

مولیٰ مجن نے اس نوٹس کی کاپی اطلاعاً ان تمام شعرا کو بھیجی جنہوں نے اس یادگار مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ تین چار کو چھوڑ کر سب کے سب شاعر بشارت کے پیچھے پڑ گئے کہ لاؤ ہمارے حصے کی رقم۔ ایک خستہ حال شاعر تو کو سنوں پر اتر آیا۔ کہنے لگا، جو دوسرے شاعر بھائیوں کے گلے پہ چھری پھیر کے معاوضہ ہڑپ کر جائے، اللہ کرے اس کی قبر میں کیڑے اور شعر میں سکتے پڑیں۔ اب وہ کس کس کو سمجھانے جائے کہ مشاعرے کی مد میں انہیں کل دس روپے دیے گئے تھے۔ ایک دل جلے نے توحہ کر دی۔ اسی زمین میں ان کی بھوکہ کر ان کے سابق خانسماں ساغر جالونوی کے پاس بغرض اصلاح بھیجی، جو اس تک حلال نے یہ کہہ کر لوٹا دی کہ ہم تاجدار اودھ، جانِ عالم واجد علی شاہ پینا کے خاندانی رکابدار ہیں۔ ہمارا اصول ہے کہ ایک دفعہ جس

کاٹھک کھالیا، اس کے خلاف کبھی ہماری زبان اور قلم سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکتا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا غبن کیوں نہ کر لے۔

تپش ڈبائیوی نے اڑا دیا کہ بشارت کے والد نے اسی پیسے سے نیا ہار مونیم خریدا ہے، جس کی آواز دوسرے محلے تک سنائی دیتی ہے۔ اس ساز کے پردے میں غبن بول رہا ہے! بشارت کے استاد حضرت جوہر الہ آبادی نے کھل کر خیانت مجرمانہ کا الزام تو نہیں لگایا، لیکن انہیں ایک گھنٹے تک ایمانداری کے فضائل پر لیکچر دیتے رہے۔

نصیحت میں نصیحت!

سچ پوچھیے تو انہیں ایمانداری کا پہلا سبق، لغوی اور معنوی دونوں اعتبار سے، جوہر الہ آبادی نے ہی پڑھایا تھا۔ ہمارا اشارہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی نظم ”ایماندار لڑکا“ کی طرف ہے۔ یہ نظم دراصل ایک ایماندار لڑکے کا قصیدہ ہے جو ہمیں بھی پڑھایا گیا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن اس لڑکے نے پڑوسی کے خالی گھر میں تازہ تازہ بیر ڈلیا میں رکھے دیکھے۔ کھانے کو بے تحاشا جی چاہا لیکن بڑوں کی نصیحت اور ایمانداری کا جذبہ بیر چرا کر کھانے کی خواہش پر غالب آیا۔ بہادر لڑکے نے بیروں کو پُچھو اتناک نہیں۔ نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

واہ واہ! شاہاش لڑکے واہ واہ!

تو جو اندروں سے بازی لے گیا!

ہائے! کیسے اچھے زمانے اور کیسے بھلے اور بھولے لوگ تھے کہ چوری اور بد نییتی کی مثال دینے کے لیے بیروں سے زیادہ قیمتی اور لذیذ شے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے! کھٹ مٹھے بیروں سے زیادہ بڑی اور بُری TEMPTATION ہماری دکھیاری نسل کے لڑکوں کو اس زمانے میں دستیاب بھی نہ تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے ہمیں یوں ہی خیال آیا کہ اگر اب ہمیں نئی پود کے لڑکوں کو نیک چلنی کی تلقین کرنی ہو تو چوری اور بد نییتی کی کون سی مثال دیں گے جس سے بات ان کے دل میں اُتر جائے۔ معاً ایک ماڈرن مثال ذہن میں آئی جس پر ہم یہ داستان ختم کرتے ہیں:

مثال: ایماندار لڑکے نے ایک الماری میں بُلُو فلم اور Cannabis کے سگرٹ رکھے دیکھے۔ وہ انہیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس لیے کہ کئی مرتبہ گرید اسکول میں اپنی کلاس کے لڑکوں کے بستوں میں دیکھ چکا تھا۔ ان کی لذت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مگر وہ اس وقت نشہ

نصیحتِ پدری سے سرشار تھا۔ سونگھ کر چھوڑ دیے۔

وضاحت: درحقیقت اس کی تین وہمیں تھیں۔ اول، اس کے ڈیڈی کی نصیحت تھی کہ کبھی چوری نہ کرنا۔ دوم، ڈیڈی نے یہ بھی نصیحت کی تھی کہ بیٹا! فسق و فجور کے قریب نہ جانا۔ نظر ہمیشہ نیچی رکھنا۔ سب سے باؤلانشہ آنکھ کا نشہ ہوتا ہے۔ اور سب سے گندہ گناہ آنکھ کا گناہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ واحد گناہ ہے جس میں بُزدلی اور نامردی بھی شامل ہوتی ہے۔ کبھی کوئی برا خیال دل میں آ بھی جائے تو فوراً اپنے پیرو مُرشد کا اور اگر تم بے پیر ہو تو خاندان کے کسی بزرگ کی صورت کا تصور باندھ لینا۔ چنانچہ ایماندار لڑکے کی چشمِ تصور کے سامنے اس وقت اپنے ڈیڈی کی شبیہ تھی۔

اور تیسری وجہ یہ کہ مذکورہ بالا دونوں ممنوعہ اشیا اس کے ڈیڈی کی الماری میں رکھی تھیں!

واہ وا! شاباش! لڑکے واہ وا!

تُو بزرگوں سے بھی بازی لے گیا!